﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (القرآن)

گلدستۂ احادیث

(حصۂ سوم)

تصحیح وتنقیح شدہ جدید ایڈیشن (۲۰۱۶ء)

جس میں حدیث پاک کے اصلاحی مضامین کو دلکش عناوین، مناسب آیات، برمحل احادیث، عبرت آموز واقعات اور اشعار کے ساتھ پرسوز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان شاءاللہ اس گلدستہ سے زندگی کے بے آب وگیاہ میدان میں علم وعمل اور رشد وہدایت کے خوشگوار اور سدابہار پھول کھل اُٹھیں گے۔

مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

استاذ: دارالعلوم بڑودا، گجرات

ومجازِ صحبت

عارف باللہ شیخ الزماں

حضرت مولانا محمد قمرالزماں صاحب الہ آبادی مدظلہ العالی

تفصیلات

نام کتاب : گلدستۂ احادیث (حصہ سوم)

مؤلفہ : مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

تصحیح وتنقیح : قاری ناظر حسین صاحب ہتھوڑوی فلاحی مدظلہ
استاذ: دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر، گجرات

کمپیوٹر کتابت : رشید احمد آچھودی (فون: 09428689113)

طبع رابع : ۱۴۳۷ھ مطابق: ۲۰۱۶ء

تعدادِ صفحات : ۶۶۰

کتاب مندرجۂ ذیل جگہوں پر دستیاب ہے۔

(۱) مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی (09825315073)

(۲) مکتبہ دارالمعارف الٰہ آباد، بی/ ۶۳۹ وصی آباد، الٰہ آباد، یوپی، ۲۱۱۰۰۳

(۳) Farid Book Depot Pvt Ltd
No.2158, M P Street, Darya Ganj, Delhi 110002
Phone: +911123289786, 23289159, 23280786
Mobile: 09910518950,

اجمالی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

تفصیلی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

کلماتِ تقدیم

از: مؤلفِ کتاب

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ الْكَرِیْمَ، لِیَهْدِیَنَا إِلیٰ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ، وَ صَلّٰی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ عَلیٰ اٰلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ أَجْمَعِیْنَ، وَ مَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلیٰ یَوْمِ الدِّیْنِ، أَمَّا بَعْدُ......

اللہ جل شانہ کے بے انتہاء انعامات میں سے ایک اہم انعام واحسان یہ ہے کہ جب کبھی انسانیت راہِ ہدایت سے بھٹک کر ضلالت و جہالت اور نفسانیت وشیطانیت کا شکار ہوئی تو ان کی صلاح وفلاح کے لیے خود ان ہی میں سے اپنے کچھ مخصوص بندوں کو منتخب فرما کر نبوت ورسالت سے سرفراز فرمایا، اس سنہرے سلسلہ کی پہلی کڑی حضرت آدم علیہ السلام ہیں، تو آخری کڑی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تا قیامت انسانوں کی ہدایت اور ابدی سعادت کے لیے ہادی ومعلم بنا کر اپنے اس آخری پیام وکلام کے ساتھ مبعوث فرمایا جس کے بعد کسی اور پیام وکلام کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وہدایت تا قیامت انسانیت کے لیے کافی وشافی ہے، اس حقیقت کا اعلان رب العالمین کے فرمان قرآنِ ذی شان میں بڑی شان سے کیا گیا:

﴿اَلْیَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدة: ۳)

''آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی (خاص) نعمت (ہدایت وغیرہ) پوری کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لیے) پسند کر لیا۔''

قرآن کریم کی یہ آیت بڑی اہمیت کی حامل ہے، وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول سن ہجری ۱۰ میں حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں حالت وقوف میں

جبل رحمت کے قریب یوم جمعہ بعد نمازِ عصر ہوا، حضرت عمرؓ سے کسی یہودی نے ایک مرتبہ کہا کہ امیر المؤمنین! قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ اتنی عظیم الشان ہے کہ اگر یہودیوں پر وہ آیت نازل ہوتی تو ہم اس آیت کے نازل ہونے والے دن کو عید بنا لیتے۔

آپ رضی اللہ عنہٗ نے پوچھا: ''کس آیت کے متعلق تم کہتے ہو؟'' کہنے لگا: ''سورۂ مائدہ کی مذکورہ آیت'' تب آپؓ نے فرمایا: ''جس روز یہ آیت نازل ہوئی وہ دن تو جمعہ اور یوم عرفہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی سے مبارک اور گویا دوہری عید کا دِن تھا، لہٰذا ہمیں کوئی نئی عید کا دن منانے کی ضرورت ہی نہیں۔'' نیز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ ''یہ آیت کریمہ نزولِ احکام قرآنیہ کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے، اس کے بعد اور کوئی آیت احکام کے متعلق نازل نہیں ہوئی، صرف ترغیب وترہیب سے متعلق چند آیتیں ہیں، جن کا نزول اس آیت کریمہ کے بعد بتلایا گیا ہے، اس عظیم الشان آیتِ قرآن کے نازل ہونے کے بعد حضرات صحابہؓ تو تکمیل دین، اتمامِ نعمت اور انتخابِ دین اسلام اور اس کی قبولیت کی بشارت سن کر نہایت خوش ہوگئے، مگر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ خوش ہونے کے بجائے رنجیدہ وکبیدہ ہوکر رونے لگے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ دریافت فرمائی، تو عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آیت کریمہ سے اشارہ ملتا ہے کہ اب تکمیل کے ساتھ ارسال کی ضرورت بھی پوری ہوچکی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان آپ کا قیام بہت ہی کم ہوگا، آپ رحلت فرمانے والے ہیں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فراست فاروقی کی تصدیق فرمائی۔ (ابن کثیر، بحر محیط وغیرہ) اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہٗ نے ظاہر فرمایا تھا کہ اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے صرف اکیاسی دن کے بعد ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔

ارشاد ربانی: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ إِنَّهُم مَّيِّتُوْنَ﴾ (الزمر: ۳۰) کے مطابق حضور اکرم ﷺ تو اپنی طبعی عمر گزار کر اس دارِ فانی سے جوارِ رحمت میں پہونچ گئے، لیکن انسانی زندگی کی

دینی ودنیوی، ملی وقومی، انفرادی واجتماعی، سیاسی وسماجی اور اخروی غرض ہر طرح کی دائمی رہنمائی اور سعادت ابدی کے لیے اپنے پیچھے قرآن وحدیث (کتاب وسنت) کی شکل میں دائمی ہدایت وابدی سعادت کے دوسرچشمے چھوڑ گئے۔ قرآن فرمانِ الٰہی کا سرچشمہ ومجموعہ ہے تو حدیث فرمانِ نبوی کا سرچشمہ ومجموعہ ہے، جہاں تک قرآنِ کریم کی بات ہے تو بلاشبہ یہ لفظاً ومعنًی کلام الٰہی ہے، محض علمی، فکری یا فلسفی کتاب نہیں، جس کا مقصد صرف علم وفکر کی تعمیر وتشکیل ہو، نہ کوئی آسمانی تبرک ہے جسے عبادت خانوں، مسجدوں اور طاقوں میں سجا کر برکت حاصل کرنے کی نیت سے رکھا جائے، نہ ہی کوئی اسلامی وتاریخی یادگار ہے جسے اسلامی ادارے یا عالمی میوزیم میں نمائش کے لیے رکھا جائے، بلکہ یہ کلام الٰہی دراصل وہ دستورِ زندگی ہے جس میں سعادتِ ابدی وفلاحِ دارین کا راز مضمر ہے، پھر اس کا اصل موضوع چوں کہ مخلوق کی ہدایت وسعادت ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے اپنے اس کلام میں تا قیامت انسانیت کی ہدایت وسعادت کے تمام ضروری وبنیادی احکام اصولی واجمالی طور پر اپنے مخصوص اور معجزانہ انداز میں بیان فرمادیے، لیکن ظاہر ہے کہ قرآن کی ان اصولی واجمالی ہدایات کو حالات پر منطبق کرنا، اصول سے فروع تک پہنچنا اور زندگی کی ایک ایک ضرورت کے لیے تفصیل وتشریح کے ساتھ قواعد وضوابط مرتب کرنا سب کے بس کی بات نہیں، لہٰذا اس کی تفسیر وتفصیل کا کارِ عظیم صاحب قرآنِ کریم رحمۃ للعالمین ﷺ کے سپرد کیا گیا، چناں چہ فرمایا:

﴿وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (النحل: ٤٤)

’’اور ہم نے آپ پر یہ قرآن نازل کیا، تاکہ آپ لوگوں کے سامنے ان باتوں کی مکمل تشریح کردیں جو ان کے واسطے اتاری گئی ہیں اور تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیں۔‘‘

اس فرمانِ عظیم الشان کے پیش نظر مفسر اعظم رحمت عالم ﷺ نے ساری زندگی اپنے اقوال وافعال اور احوال کے ذریعہ مرضی الٰہی کے مطابق قرآنی علوم اور احکام کی تشریح وتفصیل فرمائی، آپ ﷺ نے کلام الٰہی کی اپنے قول وعمل سے جو تشریح وتفسیر اور تفہیم وتفصیل

عین منشاء ربانی کے موافق فرمائی ہے اسی کو حدیث نبوی کہا جاتا ہے، تو حدیث نبوی درحقیقت کلام الٰہی کی تشریح کا نام ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم احکامِ قرآنی کے اجمال کی تشریح وتفسیر نہ فرماتے تو ہم ﴿أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ اور ﴿وَ أَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ وغیرہ جیسے احکام پر نہ عمل کر سکتے تھے، نہ ان کا مطلب سمجھ سکتے، حدیث نبوی کے بغیر کلام الٰہی کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا آسان نہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''حدیث کی ایک شان تو یہ ہے کہ وہ قرآن کی تشریح وتفسیر ہے، لیکن دوسری شان یہ بھی ہے کہ وہ فقہ کا متن بھی ہے، یعنی حدیث قرآن سے لیتی ہے اور فقہ کو دیتی ہے، اگر حدیث درمیان میں نہ ہو تو نہ احکام قرآنیہ حل ہو سکتے ہیں، نہ مسائل فقہیہ، اس لیے اسلام میں احادیث طیبہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ خیر القرون ہی سے حضرات صحابہ کرامؓ ومحدثین عظامؒ نے احادیث طیبہ کے اس سدابہار گلدستہ کی اپنی جانوں سے زیادہ حفاظت فرما کر ارشادِ نبوی ''حَدِّثُوا عَنِّي'' (مسلم:۲/ ٦٠) کے تحت عظیم امانت وسعادت سمجھ کر اپنے بعد والوں تک منتقل کرنے کا اس قدر احتیاط کے ساتھ اہتمام فرمایا کہ انسانی تاریخ کسی بھی زمانہ میں اس کی نظیر اور مثال پیش نہیں کر سکتی، یہ ان ہی کی نا قابل فراموش کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کا قرآن پہنچا وہاں وہاں نبی ﷺ کا فرمان بھی ضرور پہنچا، اور آج گلشن اسلام میں جوامع وسنن، مسانید ومعاجم اور مستدرکات کی صورت میں صدیاں گزر جانے کے باوجود گلدستۂ احادیث من وعن محفوظ وموجود ہے، اگر انسانیت گلدستۂ احادیث سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی روح اور جان کو معطر کر کے دائمی ہدایت وابدی سعادت حاصل کرنا چاہے تو بلاشبہ سبھی کے لیے ساری زندگی اس کا موقع ہے، ہاں مگر اس کے لیے ایمان کے بعد بنیادی طور پر تین باتوں کا اہتمام ضروری ہوگا:

(۱) تصحیح نیت۔ (۲) حضور ﷺ کی عظمت ومحبت۔ (۳) آداب کی رعایت۔

جہاں تک تصحیح نیت کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے بغیر کوئی نیک اور مباح عمل مقبول نہیں۔
اسلامی علوم میں احادیث طیبہ کا تو خیر اپنا ایک بلند مقام و مرتبہ ہے، ہمارے اکابر نے تو نصاب میں شامل دنیوی علوم کی کتابوں کو بھی نیک نیتی سے ہی پڑھایا ہے، چناں چہ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرّس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کے متعلق منقول ہے کہ آپؒ منطق کی کتاب ''قطبی'' پڑھا رہے تھے کہ کسی صاحب نے آکر ایصالِ ثواب کی درخواست کی، تو آپؒ نے سبق کے بعد طلبہ سے فرمایا کہ'' آج کا سبق فلاں صاحب کو بخش دیں، اس لیے کہ کتاب اگرچہ منطق کی ہے، لیکن ہم نے اسے بھی ثواب ہی کی نیت سے پڑھا پڑھایا ہے۔'' اس لیے دیگر علوم واعمال صالحہ کے علاوہ احادیث طیبہ کو بھی پڑھنے پڑھانے، سننے سنانے، نشرواشاعت یا کسی بھی جہت سے خدمت کا مقصد اور نیت یہی ہو کہ من جانب اللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کی ہدایت وسعادت کے لیے جو تعلیم دی، وہ عملی طور پر ہماری زندگی میں رچ بس جائے اور ہماری زندگی نبوی ہدایت کے عین مطابق بن جائے، اس لیے کہ تصحیح نیت کے بغیر احادیث طیبہ سے استفادہ نہیں ہوسکتا۔

تصحیح نیت کے ساتھ حضور ﷺ کی صحیح و سچی محبت وعظمت بھی ضروری ہے، کیوں کہ انسانی فطرت وطبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ اسی کے کلام سے متاثر اور مستفید ہوتی ہے جس کی عقیدت وعظمت اس کے دل میں ہو۔ اس حقیقت کا مشاہدہ عام زندگی میں بھی ہر کوئی کر سکتا ہے، چناں چہ کسی بزرگ کے مریدین اور معتقدین کو دیکھا ہوگا کہ وہ ان کی عظمت اور قدرومنزلت کی وجہ سے ان کے ملفوظات اور ارشادات کو پڑھتے سنتے ہیں تو ان کا غیر معمولی اثر لیتے ہیں اور بعض باتوں پر جھوم جھوم اٹھتے ہیں، لیکن ان کی وہی باتیں کسی ایسے شخص کے سامنے بیان کی جائیں جس کا دل ان کی عظمت وعقیدت سے خالی ہو تو اس کے لیے ان میں کوئی خاص اثر اور کشش نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ جب تک صاحب کلام کی عظمت وعقیدت دل میں نہ ہو اس کے کلام سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ احادیث طیبہ کا تعلق چوں کہ براہِ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہے، اس لیے آپ ﷺ کی صحیح و سچی محبت

وعظمت بھی نہایت ہی ضروری ہے۔ جہاں تک تعلق ہے آداب کی رعایت کا، تو اس کے لیے علم حدیث کے پڑھنے پڑھانے والوں کو اتنا سوچ لینا چاہیے کہ یہ کائنات کی اس عظیم ہستی کا کلام ہے کہ

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

ہمارے محدثین کا تو یہ معمول رہا ہے کہ حدیث پڑھنے پڑھانے سے پہلے غسل یا کم از کم وضو ضرور فرماتے، پھر خوشبو لگا کر نہایت ادب واحترام کے ساتھ درسِ حدیث میں اس طرح مشغول ہوتے گویا مجلس نبوی لگی ہے اور حضور ﷺ سے احادیث براہِ راست سن رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ روحانی وایمانی حلاوت محسوس ہی نہیں کی جاسکتی جو رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کے مشک آگیں کلام میں رکھی ہے۔

غرض ایک مومن جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث طیبہ سے کما حقہ استفادہ ورہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ان تین بنیادی شرائط وآداب کی رعایت اور پابندی کرنا ضروری ہے، ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ بعض نام نہاد مفکرین کی طرح مستشرقین نے بھی علم حدیث میں مہارت حاصل کر کے بڑی خدمت انجام دی، لیکن اس کے باوجود انہیں وہ ہدایت اور ابدی سعادت نصیب نہ ہوئی جس کے لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم وہادی بنا کر بھیجا گیا، وجہ یہ تھی کہ ان کی نیت درست نہ تھی، نہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح و سچی محبت وعقیدت تھی اور نہ انہوں نے آدابِ حدیث کی رعایت کی، ان کا اصل مقصد تعمیر نہیں بلکہ تخریب تھا، وہ لوگ علم حدیث میں مہارت اس لیے حاصل کرتے ہیں تا کہ ذخیرۂ احادیث میں اعتراضات کے پہلوؤں کو ڈھونڈ کر نمایاں کرسکیں اور حدیث کے طالبین صادقین کے دلوں میں شکوک وشبہات کے بیج بوسکیں، نتیجہ یہ نکلا کہ بعض جہتوں سے وہ لوگ فن حدیث کے ماہر اور بظاہر خادم تو بن گئے، مگر صالح اور سعادت مند نہ بن سکے۔ العیاذ

باللہ۔اس کے برعکس بحمد اللہ ہمارے علماءِ محدثین نے اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ان آداب وشرائط کی مکمل رعایت کے ساتھ احادیث طیبہ کو اپنا مرکز توجہ بنا کر اس کی تعلیم وتعلیم اور نشر واشاعت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں، اور ہر زمانہ میں اس کے تقاضے کے مطابق ماحول ومزاج کو پرکھتے ہوئے احادیث طیبہ کے بحرنا پیدا کنار سے گراں قدر موتی چن چن کر نئے نئے مجموعے اور گلدستے امت کے سامنے پیش فرماتے رہے۔ جزاهم الله عنا وعن جميع الأمة.

جی چاہتا ہے قدم چومتے چلیں ☆ کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گزر گئے

صاحبو! ہمارے اسلاف کی اصل میراث تو علم واخلاص اور وفا وتقوی ہی ہے، مگر افسوس کہ آج ہماری زندگی میں یہ باتیں بہت کم رہ گئی ہیں، نہایت ہی پست قسم کے جذبات واغراض نے ہم پر قبضہ کرلیا ہے، یہ باتیں کسی اور میں ہوں یا نہ ہوں، میں اپنے اندر ضرور محسوس کرتا ہوں، لیکن میں رحمت الٰہی سے مایوس بھی نہیں؛ کیوں کہ وہی تو ہے جو مردوں میں بھی جان ڈال دیتا ہے، ﴿اعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ وہ اپنے فضل خاص سے ہمارے مردہ قلوب کو ایمان واخلاص اور اپنی محبت ورضا سے زندہ فرما کر ہمیں بھی خدامِ دین میں شامل فرما سکتا ہے، اور یہ اس کی بندہ نوازی نہیں تو اور کیا ہے کہ اس حقیر سراپا تقصیر کو بھی کسی درجہ میں احادیث طیبہ کی نشر واشاعت اور خدمت کی سعادت عطا فرمادی۔ الحمد لله علىٰ ذلك.

رب العزت کی عنایت سے ہماری محمدی مسجد میں ہر بدھ کو بعد نمازِ فجر درسِ حدیث شریف ہوتا ہے، اسی سے ان بیان کردہ احادیث طیبہ پر مستقل اصلاحی مضامین تحریر کرنے کا داعیہ پیدا ہو۔ چناں چہ اس سلسلہ میں احقر نے ریاض الحدیث سے مختلف پھول لے کر احادیث کا ایک گلدستہ پیش کرنے کے لیے اولاً ہر حدیث پر ایک عنوان قائم کیا، پھر اسی کو محور بنا کر اس مضمون سے متعلق آیاتِ قرآنیہ اور دیگر احادیث نبویہ سے مدد لیتے ہوئے مذکور حدیث کی تشریح عصر حاضر کے تقاضے اور ذہن کو سامنے رکھ کر کرنے کی کوشش کی، جس سے

امت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے زندگی کے تمام گوشوں میں صاحب قرآن ﷺ کے قول وعمل سے رہنمائی حاصل کرنا آسان ہو جائے اور امت مرحومہ ابدی سعادت کی حقدار بن جائے۔

اس سے قبل بھی اللہ جل شانہ کی عنایت سے دو گلدستے منظر عام پر آ کر ۔بحمد اللہ۔ مفید ثابت ہوئے تو مزید ہمت پیدا ہوئی، لہٰذا اپنی کم مائیگی کے اعتراف کے ساتھ یہ تیسرا گلدستہ بھی سابق سے لاحق کیا جا رہا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ سَعيًا مَشْكُورًا. آمین.

وہ اک کرن ہدایت کی جو آفتابِ نبوت سے نکل کر آئی ہے
زہے قسمت! سینہ بہ سینہ اب میرے بھی سینے میں آئی ہے

جن صاحبوں کو ان گلدستوں میں کوئی خلافِ حق اور غلط بات نظر آئے وہ برائے عنایت بلا تکلف احقر کو مطلع فرما دیں۔

ان شاء اللہ خلافِ حق اور غلط واضح ہو جانے کے بعد اسے قبول کرنے میں بالکل تامل نہیں کیا جائے گا، بلکہ ممنونیت کے ساتھ اصلاح کی جائے گی۔ اللّٰهم أَرِنا الحقَّ حقًا وارزُقنَا اتباعَه وأَرِنا الباطلَ باطلاً وارْزُقنا اجتِنَابَهٗ. آمین.

اخیر میں اے رب کریم! تیرے گھر میں بیٹھ کر اس مبارک گھڑی میں دست بدعا ہوں کہ جیسا تو نے اب تک اپنے فضل خاص کا معاملہ فرما کر ستاری فرمائی، آئندہ بھی تا ابد ایسا ہی معاملہ فرما، اور ہمارے ساتھ ہمارے والدین، اولاد، ازواج، متعلقین ومحسنین اور جمیع امت کو اپنی بارگاہ میں قبولیت عطا فرما کر سعادتِ دارین وفلاحِ دارین نصیب فرما۔ إِنَّكَ عَلىٰ مَا تَشَاءُ قديرٌ وَ بِالإِجَابَةِ جَدِيْرٌ.

عاصی پر از معاصی، طالب رحمت الٰہی، ابوخلیق محمد شفیق، جعل السعادۃ لہٗ خیر رفیق

۲۷/ رجب المرجب/۱۴۳۴ھ

مطابق: ۷/ جون/۲۰۱۳ء/ بروز جمعہ

محمدی مسجد، تاندلجہ، بڑودا، گجرات، انڈیا

تاثرات ودعائیہ کلمات

از: مبلغ اسلام، صاحب پیغام حق وصداقت، حسن خلق کے پیکر جمیل علامہ سید عبدالمجید ندیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

عزیزم مکرم مفتی محمد شفیق بڑودوی (گجرات، انڈیا) کی تحریری کاوشوں گلدستۂ مواعظ حصہ اول اور گلدستۂ احادیث حصہ اوّل، دوم، سوم کا حرمین شریفین میں قیام کے دوران اجمالی مطالعہ کیا، عزیز موصوف منزلِ علم وحکمت کے نوخیز مسافر ہیں، مگر مجموعی طور پر زبان وقلم میں بہت حد تک ثقاہت وپختگی قابل تحسین ہے، اگر ان کا یہ قلمی سفر جاری رہا تو آنے والے دنوں میں فرزندانِ اسلام کو ایک اچھا مصنف میسر آجائے گا، یہ بات انتہائی حوصلہ افزا ہے کہ ہمارے عزیز موصوف سلمہٗ نے جب اپنے شاندار ماضی اور اس کے بعد کے ادوار سے علمی خوشہ چینی کی ہے، تو اسلاف کی نسبت اور ان کے مربوط وموسوم حوالوں سے خوب انصاف کیا ہے، قلمی سفر میں یہ قابل تقلید دیانت ہے کہ آپ کسی کی بات کا حوالہ دیں تو ان کا نام لے کر دیں۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے عزیز کو اس سلسلۂ خیر کی تقدیم واشاعت میں خوب توفیق دے اور ان کی تحریروں سے عامۃ المسلمین کے عقائد کا تحفظ اور اخلاق واعمال میں نکھار آئے۔

دعا گو

عبدالمجید ندیم

نزیل: مسجد نبوی، مدینہ منورہ

۲۱/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۲ھ

مطابق: ۲۱/ اگست/ ۲۰۱۱ء/ بروز اتوار، بعد العصر

کلماتِ بابرکات

از

حضرت اقدس فقیہ الملت مفتی عبدالرحمٰن صاحب مدظلہ العالی

(مفتیٔ اعظم بنگلہ دیش وخلیفہ حضرت شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ)

صوبۂ گجرات برصغیر کا وہ صوبہ ہے جہاں سے اہل خیر کا سلسلہ ہزار سال پہلے سے چل پڑا اور تاحال جاری ہے، امید ہے کہ قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، اسی طرح اہل علم کا سلسلہ بھی جب سے چل پڑا وہ تاحال باقی ہے۔

اس سلسلہ کے روحانی فرزندوں میں مفتی محمد شفیق صاحب کا نام قابل ذکر ہے، جنہوں نے حال ہی میں ''گلدستۂ احادیث'' کے نام سے چالیس چالیس احادیث کی عمدہ اور بہترین تشریح کے ذریعہ حدیث کے خدمت گاروں میں اپنا نام بھی شامل کردیا، میں نے ''گلدستۂ احادیث'' کی پہلی جلد کا رمضان المبارک/۱۴۳۲ھ میں حرمین شریفین کے سفر کے دوران مطالعہ کیا، یہ گلدستۂ احادیث نہ صرف عوام کے لیے مفید ہے بلکہ علماءِ کرام اور طلبہ عظام بھی اس سے مستفید ہوسکتے ہیں۔

نیز ان کی دوسری تصنیف گلدستۂ مواعظ کے پہلے حصہ کو دیکھنے کا موقع ملا، اس کتاب سے ہر طبقہ کے حضرات مستفید ہوسکتے ہیں، خصوصاً وہ واعظین کرام جو دعوت وتبلیغ کی نسبت سے کتاب وسنت کی روشنی میں اصلاحِ معاشرہ کی غرض سے کام کررہے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو دین وآخرت میں بہترین بدلہ عطا فرمائیں۔

والسلام

(حضرت اقدس فقیہ الملت) مفتی عبدالرحمٰن

بانی ورئیس: مرکز الفکر الاسلامی، بنگلہ دیش

صدر: مرکزی دارالافتاء، بنگلہ دیش، بسوندرا گلشن، ڈھاکہ

کلماتِ طیبات

از

حضرت اقدس امیر الہند مولانا قاری محمد عثمان صاحب مدظلہ العالی

(استاذِ حدیث دار العلوم دیو بند وصدر جمعیت علماءِ ہند)

حضورِ اقدس جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو خداوند قدوس نے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جماعت میں ایک خاص امتیاز عطا فرمایا ہے کہ آپ ﷺ کو خاتم النبیین بنایا اور آپ ﷺ کے ذریعہ علومِ نبوت کی تکمیل فرمادی، تا کہ قیامت تک آنے والے جن و بشر اپنے باری تعالیٰ کی مرضیات و نامرضیات کا علم حاصل کر سکیں، اسی لیے ان علومِ نبوت (قرآنِ کریم و احادیث شریفہ) کی حفاظت کے لیے بظاہرِ اسباب باری تعالیٰ نے حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مقدس جماعت کو منتخب فرمایا، امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اس اوّلین طبقہ نے امتیازی شان کے ساتھ حضرت خاتم النبیین ﷺ کے اس علمی ورثہ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اس کے بعد تابعین و تبع تابعین اور بعد کے طبقات کو یہ توفیق ملتی رہی کہ وہ اس کی حتی الامکان مکمل حفاظت کریں۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ملت اسلامیہ کے پاس قرآنِ کریم کے ساتھ ساتھ احادیث مبارکہ کے بڑے بڑے ذخیرے کتب مدوّنہ کی شکل میں موجود ہیں، مگر ان سے استفادہ کرنا ہر شخص کے لیے مشکل ہے، اس لیے ہر زمانہ کے علماء و مصلحین نے ذخیرۂ احادیث سے اپنے اپنے ذوق کے مطابق احادیث کا انتخاب اور ان کی ضروری تشریح کر کے عام لوگوں کے فائدہ کے لیے مجموعہ شائع کیا ہے۔

اس زرّیں سلسلہ کی اہم کڑی محترم جناب مولانا محمد شفیق صدیقی (شاہ بھائی)

بڑودوی زید مجدہم کی مرتب فرمودہ تالیف ''گلدستۂ احادیث'' نامی کتاب ہے۔

موصوف محترم نے اپنی یہ کتاب راقم الحروف کو عنایت فرما کر کرم فرمایا، راقم الحروف نے اس کی دونوں جلدوں کے بعض مضامین سے بالاستیعاب استفادہ کیا، دیگر مضامین سے بھی جستہ جستہ استفادہ کیا۔

اس سے اندازہ ہوا کہ مؤلف نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ احادیث کا انتخاب کر کے اہل سنت والجماعت واکابر دیوبند کے منہج کے موافق ان احادیث کی تشریح فرمائی، اور اس دوران قابل اعتماد حضرات علماء و مشائخ کے ملفوظات وتحقیقات نقل کر کے کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

خداوندِ قدوس مؤلف موصوف کی اس اہم دینی وعلمی خدمت کو قبول فرمائیں اور مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

محمد عثمان منصور پوری
خادم تدریس: دارالعلوم دیوبند
۲۲/ ذی الحجہ/۱۴۳۴ھ
مطابق: ۲۸/ اکتوبر/۲۰۱۳ء

کلماتِ تبریک

از

حضرت اقدس مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی مدظلہ العالی

(جانشین شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ)

جناب الحاج مولانا محمد شفیق صاحب زیدت عنایتہم،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کی کتاب ''گلدستۂ احادیث'' جو آپ عنایت کر گئے تھے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس سلسلہ میں آپ کو خط لکھوادوں، لیکن بندے کی طبیعت مسلسل خراب چل رہی ہے، بار بار ارادہ کرنے کے بعد میرے عزیز، میرے مجاز ورفیق سفر مولوی اویس مظاہری گجراتی نے کئی دفعہ اس کی رسید لکھنے کا تقاضا کیا، آپ کی تشریف آوری میری بیماری کے دوران ہوئی تھی، باوجود ارادہ کے اس کے متعلق خط نہ لکھ سکا، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو امت کے لیے نافع فرمائے اور اس سے طلبۂ عزیز کو زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ آپ کے قلم میں زور عطا فرمائے، اس کتاب کو امت کے قارئین کے لیے نافع فرمائے،

فقط والسلام۔

(اسی کے ساتھ ایک اور خط میں تحریر فرمایا ہے): ''بندہ بعافیت ہے، امید ہے کہ آپ بھی بعافیت ہوں گے، آپ کی کتاب ''گلدستۂ احادیث'' بیماری کے دنوں میں سرہانے رکھی رہتی ہے، اس کی فہرست دیکھ کر گاہے گاہے کوئی نہ کوئی حصہ پڑھتا رہتا ہوں، عزیزی اویس مظاہری کل جا رہے ہیں، جی چاہا کہ آپ کو سو نسخوں کا آرڈر دے دوں، علی الحساب ایک ہزار روپئے ارسال ہیں، باقی ان شاء اللہ کتابیں آنے پر ارسال کروں گا، اللہ کرے بندے کی طبیعت ٹھیک ہو جائے، آپ سے بھی دعا کی درخواست ہے۔''

فقط والسلام

محمد طلحہ کاندھلوی

۲۶/ ربیع الاول/ ۱۴۳۵ھ

کلماتِ تہنیت

از: جامع المعقول والمنقول حضرت اقدس مولانا مفتی عبداللہ صاحب مظاہری دامت برکاتہم
(بانی وشیخ الحدیث: جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، گجرات، انڈیا)

الُحَمُدُ لِأَهُلِهِ، وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ أَهُلِهَا، أما بعد......

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن امتیازی اوصاف وکمالات سے سرفراز فرمایا ہے ان میں ایک زبان و بیان بھی ہے، زبان ہی خیالات وافکار کے اظہار واصلاح اور رہنمائی کا کامیاب ترین وسیلہ ہے، جس کے ذریعہ ہر قوم کے ہادی نے انسانیت کو ظلمت وضلالت سے نکالا ہے اور یہی پیغمبروں کی سنت رہی ہے۔

الحمدللہ، اس مؤثر ترین وکارآمد وسیلہ کو علماءِ عظام نے ہر زمانہ میں اپنایا ہے اور اپنا رہے ہیں، جن میں مولانا محمد شفیق بن مولانا صدیق صاحب (شاہ بھائی) بڑودوی (استاذِ دارالعلوم بڑودا) زیدا قبالہٗ بھی ہیں۔ آں محترم کی تالیف کردہ کتاب ''گلدستۂ احادیث'' (جلد ثالث) وقت کے فاسد ماحول اور بگڑے ہوئے معاشرے کی سنت نبوی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، آں محترم کے ایماء پر مختلف مقامات پر نگاہ ڈالی، ماشاءاللہ محترم نے بڑے سلیقے سے مواد جمع کیا ہے، جس میں زبان کی سلاست جو عصر حاضر کے عین مطابق ہے ان شاءاللہ ہر عام وخاص کے لیے مفید ثابت ہوگی، خصوصاً طالبانِ علومِ نبوت کے لیے ایک عمدہ مجموعہ کی شکل میں تحقیقی مواد پنہاں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سابق دونوں جلدوں کی طرح جلدِ ہٰذا کو بھی نافع بنائے اور قبولِ عام و خاص فرمائے، نیز موصوف کو اس میدان میں جواں مردی سے کام کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے اور مزید علمی خدمات کی توفیق بخشے۔ آمین۔

فقط والسلام

طالب دعا

(جامع المعقول والمنقول) مفتی عبداللہ صاحب مظاہری

بانی: جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، بھروچ، گجرات، الہند

۱۷/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۵ھ

مطابق: ۱۶/ جون/ ۲۰۱۴ء

(۱)

توحید کی عظمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عُبَادَۃَ بۡنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: "سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوۡلُ: "مَنۡ شَہِدَ أَنۡ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوۡلُ اللّٰہِ، حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ النَّارَ".

(رواہ مسلم، مشکوۃ/ص:۱۵/کتاب الإیمان/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ میں نے خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، فرمایا کہ "جو کوئی (صدق دل سے) شہادت دے توحید کی یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت و بندگی کے لائق نہیں، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں، تو اللہ اس پر دوزخ حرام کر دیتا ہے"۔

توحید کی حقیقت وحیثیت

اللہ تعالیٰ کو دل سے اس کی ذات اور مخصوص صفات میں یکتا و تنہا ماننا توحید کہلاتا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے ہر قانون کو قولاً، فعلاً اور حالاً تسلیم کیا جائے، یہ دین اسلام کی اساس اور بنیاد ہونے کے ساتھ ساتھ روحِ کائنات بھی ہے، اس لیے تمام عقائد، ارکان اور اعمال کی درستی بھی اسی توحید پر موقوف ہے، اگر توحید خالص اور اپنی حقیقی صورت میں موجود ہے تو رسالت، آخرت، جنت، جہنم وغیرہ پر ایمان بھی درست اور شریعت اسلامی کے

ارکان واعمال کی ادائیگی بھی حقیقی واخروی اعتبار سے نتیجہ خیز اور ثمر آفریں ہوگی، اس کے بغیر سب بے کار ہیں، جیسے جسم انسانی میں جو حیثیت دل کی ہے کہ اس کے سدھار اور بگاڑ پر جسم کا سدھار اور بگاڑ موقوف ہے، دین الٰہی میں وہی حیثیت توحید کی ہے، اگر توحید درست تو عقائد بھی درست اور اعمال بھی مقبول، لیکن خدانخواستہ توحید میں شرک کی ملاوٹ ہے تو کوئی عقیدہ وعمل قبول نہیں، کیوں کہ توحید دین حق کی اساس، بنیاد اور روح ہے، اگر دین اسلام کو جسم تسلیم کیا جائے تو توحید اس کی روح ہے، اگر دین کو آنکھ تصور کیا جائے تو نقطۂ بصارت توحید ہے، اگر دین کو کان تصور کیا جائے تو نقطۂ سماعت توحید ہے، اگر توحید کو زبان تصور کیا جائے تو نقطۂ گویائی اور فصاحت توحید ہے۔ غرض! اسلام کے شجرۂ طیبہ کی اصل اور جڑ توحید ہے، دیگر عقائد واعمال صالحہ اس کی شاخیں ہیں، اگر کسی درخت کی جڑ مضبوط ہے تو آندھی اور طوفان اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے، لیکن اگر جڑ ہی کمزور اور کھوکھلی ہے تو پھر معمولی ہوا کے جھونکے بھی اسے ضائع کر دیتے ہیں، حدیث مذکور سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جو شخص دل سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور اکرم ﷺ کی رسالت کی گواہی دے، پھر زبان سے اس کا اقرار اور عمل سے اظہار کرے تو اس پر ہمیشہ کے لیے دوزخ حرام کر دی جائے گی۔

کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی گواہی دینے والا بچہ جب بڑا ہوا تو قحط سالی سے بدحال ہو کر سیدنا یوسف علیہ السلام کے دربار میں آیا اور اپنی پہچان دے کر معمول سے زیادہ غلہ کا مطالبہ کیا، حضرت یوسف علیہ السلام کو جب معلوم ہوا کہ اسی بچہ نے میری پاک دامنی کی گواہی دی تھی تو آپ علیہ السلام نے خوش ہو کر اسے خوب نوازا۔

حضرت اقدس پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مدظلہ فرماتے ہیں کہ ’’اس کے بعد حق تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام سے فرمایا: ’’پیارے یوسف! جس طرح آپ نے دنیا میں اپنی عفت کی گواہی دینے والے کو خوب نوازا ہے اسی طرح میں بھی آخرت میں اپنی وحدانیت کی گواہی دینے والے کو خوب نوازوں گا۔‘‘ (مستفاد از: سورۂ یوسف/ ۱۰۱ فوائد/ ص: ۱۹۶)

اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کی اس طرح نوازش کی بہترین مثال ایک حدیث قدسی بھی ہے جس کو حدیث ''بطاقہ'' بھی کہتے ہیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ/ص:۴۸۶/ باب الحساب والقصاص والمیراث)

توحید خالص سے ہوگی اخروی نجات:

نیز ایک اور حدیث پاک کے واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ''سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ میں دربارِ رسالت میں حاضر ہوا، تو آپ ﷺ اس وقت سفید کپڑا (چادر) اوڑھے ہوئے سوئے تھے، میں نے خوابِ راحت میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا، لہٰذا واپس چلا گیا، پھر کچھ دیر کے بعد جب حاضر خدمت ہوا تو آپ ﷺ اس وقت بیدار ہو چکے تھے، اس موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص بھی ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کی شہادت دے، پھر اسی عقیدۂ توحید پر اس کی موت آجائے تو وہ موحد جنت میں ضرور جائے گا۔'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہٗ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اور اگر چہ اس نے چوری کی ہو؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ'' ہاں، اگر چہ اس نے زنا کیا ہو، اگر چہ اس نے چوری کی ہو، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہٗ کو بڑا تعجب ہوا، فرماتے ہیں کہ میں نے پھر عرض کیا: ''اگر چہ اس نے زنا کیا ہو، اگر چہ اس نے چوری کی ہو؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا: ہاں، ہاں، اگر چہ اس (موحد) نے زنا کیا ہو، اگر چہ اس نے چوری کی ہو، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہٗ نے مزید اطمینان قلب کے لیے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! توحید و رسالت کی گواہی دینے والا مرنے کے بعد جنت میں ضرور جائے گا؟ اگر چہ اس نے زنا کیا ہو، اور اگر چہ اس نے چوری کی ہو؟'' اب کی بار آپ ﷺ نے فرمایا: ''وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ، عَلٰى رَغْمِ أَنْفِ أَبِىْ ذَرٍّ''. (صحيحين، مشكوٰة/ص:١٤/كتاب الإيمان/الفصل الأول) ہاں، اگر چہ اس نے زنا کیا ہو اور اگر چہ اس نے چوری کی ہو، ''عَلٰى رَغْمِ أَنْفِ أَبِىْ ذَرٍّ'' یہ ایک خاص محاورہ ہے،

جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ یہ فیصلہ (توحید خالص پر اخروی نجات والا) تمھیں ناگوار ہو اور تم چاہو کہ ایسا نہ ہو، تب بھی یہ ہو کر رہے گا۔

شراحِ حدیث نے اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''جو شخص دین توحید پر صدقِ دل سے ایمان رکھتا ہوگا وہ بھی ضرور جنت میں جائے گا، اب اگر بالفرض ایمان کے باوجود اس نے گناہ بھی کیے ہوں گے، تو اگر کسی وجہ سے وہ معافی کا مستحق ہوگا، تب تو حق تعالیٰ گناہوں کو معاف فرما کر بغیر حساب ہی کے جنت میں داخل فرما دیں گے، لیکن اگر وہ معافی کا مستحق نہ ہوگا تو پھر گناہوں کی سزا پانے کے بعد ضرور جنت میں جائے گا۔'' بہر حال (عقیدۂ توحید اور) دین اسلام پر صدق دل سے ایمان رکھنے والا موحد بندہ جنت میں ضرور بالضرور جائے گا، اگر چہ دوزخ کی سزا بھگتنے کے بعد ہی کیوں نہ ہو، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہٗ کی روایت کا مطلب اور مفہوم یہی ہے۔ (معارف الحدیث: ۱/۱۰۲)

اس لیے مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ:

باز گرد از کفر سُوئے دینِ حق ☆ ورنہ در نارِ ابد مانی خلق

کفر سے ایمان اور دین حق کی طرف اور شرک سے توحید خالص کی طرف آ جا، ورنہ قیامت کے دن دوزخ کی ابدی آگ میں بدحال ہو جائے گا۔ (العیاذ باللہ العظیم)

توحید انبیاءِ کرام علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد:

اور چوں کہ توحید تقاضائے فطرت ہے، اس لیے ہر نبی نے بنیادی طور پر اپنی امت کو توحید ہی کی دعوت دی، اور از آدم علیہ السلام تا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد یہی رہا ہے۔ قرآن میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انبیاء و رسل کو جس کام پر مامور کیا وہ یہ تھا کہ

﴿أَنْ أَنْذِرُوْا أَنَّهٗ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُوْنِ﴾ (النحل: ۲)

''اے گروہ پیغمبراں! اپنی امتوں کو اس بات سے باخبر کر دو کہ میرے سوا کوئی معبود

نہیں، مجھ ہی سے ڈرو۔'' اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سارے انبیاء ورسل علیہم السلام کا دین ایک اوران کی دعوت توحید تھی، لہٰذا آج جو یہ کہا جاتا ہے کہ سارے مذاہب ایک ہیں، یہ غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ سب کا مذہب (اور دین) ایک ہے۔ بقولِ شاعر:

مالک تو سب کا ایک، لیکن مالک کا کوئی ایک
ہزاروں میں نہ ملے گا، لاکھوں میں دیکھ!

دنیا کے سب سے پہلے انسان ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام مالک کے ایک سچے موحد بندے تھے، آپ علیہ السلام نے توحید ہی کی تعلیم دی اور آپ کے بعد تمام انبیاء ورسل علیہم السلام نے بھی توحید ہی سے اپنی دعوت کا آغاز کرتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ

﴿وَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَاحِدٌ لَا إِلٰهَ إِلَّاهُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾ (البقرة: ۱۶۳)

تمہارا معبود ایک ہی ہے، تمہارا مقصود اللہ ہی ہے، ہر جگہ موجود اللہ ہی ہے، حاجت روا اور مشکل کشا اللہ ہی ہے، نفع اور نقصان کا خالق، زندگی اور موت کا مالک اللہ ہی ہے۔ قرآنِ کریم کی اعلیٰ اور مرکزی تعلیم بھی توحید ہی ہے، سینکڑوں کیا، ہزاروں آیتوں میں اس مضمون کو دہرایا ہے، کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی کم وبیش ۲۶۰۰ آیتوں میں توحید کو مختلف انداز اور عناوین سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ایک ہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، نہ ذات میں، نہ (مخصوص) صفات میں، سب اسی کے محتاج اور وہ کسی کا محتاج نہیں، سب حادث وفانی ہیں، وہی قدیم اور باقی ہے، اقوام وملل کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام نے ہر حال میں اپنی اپنی امتوں کو توحید کی یہی عالمگیر دعوت پیش فرمائی، بقول علامہ اقبالؒ:

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

لیکن چند خوش نصیبوں کے علاوہ اکثروں نے اس سے اعراض کیا، اخیر میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسی اساسی اور بنیادی مسئلہ کو کفار ومشرکین کے سامنے پیش کیا، تو خوش نصیبوں نے کلمۂ توحید کا اقرار کیا، اور بدنصیبوں نے انکار کیا، اب جس نے اقرار کیا وہ ابوبکرؓ بنا اور جس نے انکار کیا وہ ابوجہل بنا، یہ بھی تو مقدر کی بات ہے نا، جی! حضرت پرتاپ گڑھیؒ فرماتے ہیں کہ

یوں تو اس قادر وقیوم کی رحمت ہے عام
پر مقدر سے ملا کرتا ہے توحید کا جام

غزوۂ خیبر کا ایک واقعہ:

پھر یہ کوئی محض شاعرانہ مبالغہ نہیں، بلکہ ایک ناقابل انکار واقعہ اور حقیقت ہے، جس کی بے شمار مثالیں تاریخ اسلام میں ملتی ہیں، مثلاً غزوۂ خیبر کا ایک واقعہ ہے، جس میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ یہودیوں کے سب سے بڑے قلعے خیبر پر حملہ آور ہوئے تھے اور وہاں کا محاصرہ کیا تھا، کیوں کہ ان یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کی تھیں، اس طویل محاصرہ کے دوران ایک یہودی چرواہا جس کا نام تاریخ میں اسود راعی بتایا گیا ہے، اس کے دل میں خیال آیا کہ حضرت محمد ﷺ اتنا بڑا لشکر لے کر اتنا بڑا فاصلہ طے کر کے اور اتنی مشقتیں اٹھا کر اس خیبر پر حملہ آور ہو رہے ہیں، تو آخر ان کی بنیادی دعوت کیا ہے؟ ان کا پیغام کیا ہے؟ اور وہ کیا چاہتے ہیں؟ اس نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے جب یہ سوالات کیے، تو انہوں نے خود اسلامی عقائد کی تشریح کرنے کے بجائے فرمایا کہ تم ہمارے سردار یعنی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر خود مل لو اور ان ہی سے یہ سوالات کرو، وہ جواب میں تمہیں تفصیل کے ساتھ اپنی بنیادی دعوت اور پیغام بتا دیں گے، اسود راعی کے لیے یہ بات انتہائی حیرت انگیز تھی، اس لیے کہ وہ کبھی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی لشکر کا سپہ سالار کسی فوج کا بڑا افسر یا کسی مملکت کا فرمانروا اسے بنفس نفیس

اپنے دربار میں حاضری کی اجازت دے اور باریابی کا شرف بخشے، اس لیے اسود نے تعجب سے کہا کہ میں ان سے کیسے مل سکتا ہوں جب کہ میں ایک ادنیٰ چرواہا ہوں، صحابیٔ رسول ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے سردار غریبوں کے انتہائی ہمدرد اور غم گسار ہیں، ان کی بزم اور محفل میں امیر وغریب، حاکم ومحکوم اور راعی ورعیت کے درمیان کوئی فرق وامتیاز نہیں ہوتا، انسانی رشتہ سے سب برابر ہوتے ہیں، یہ سن کر وہ حیرانی کے عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا اور ڈرتے ڈرتے حاضر خدمت ہوکر یہ سوال کیا کہ ''آپ کی بنیادی دعوت کیا ہے؟'' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں مختصراً اس کو عقیدۂ توحید سمجھایا، اس پر وہ کہنے لگا کہ اگر کوئی شخص اس عقیدۂ توحید کا قائل ہوجائے اور آپ کے ساتھ شامل ہوجائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کلمۂ توحید پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوجانے کے بعد ہم تمہیں اپنے سینے سے لگائیں گے اور تمہیں بھی وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں، (علاوہ ازیں مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے جنت نصیب ہوگی) اسود راعی نے بڑی حیرانی کے عالم میں کہا کہ میں ایک معمولی درجہ کا چرواہا، میرا رنگ سیاہ اور جسم پر میل کچیل جمع ہے جس کی وجہ سے بد بو اٹھ رہی ہے، ایسی حالت میں آپ لوگ مجھے کیسے سینے سے لگائیں گے؟ اور مجھے مسلمانوں کے برابر کا درجہ اور مقام کیسے دیں گے؟ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یقین دلایا اور مطمئن کیا تو اس نے توحید کی طرف رغبت ظاہر کی، مگر کلمۂ توحید پڑھنے سے پہلے مزید ایک سوال یہ کیا کہ ''میری اس سیاہ فامی اور جسمانی بدبو کا کوئی علاج ہے؟'' جواباً آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اگر تم اس عقیدۂ توحید کو قبول کرلو تو خواہ دنیا میں تمہاری اس جسمانی سیاہی کا کوئی علاج نہ ہو سکے، لیکن مرنے کے بعد اس توحید کی برکت سے تمہاری جسمانی سیاہی سفیدی اور روشنی میں تبدیل ہوجائے گی اور جسمانی بدبو خوشبو سے'' اس نے کہا کہ اگر یہ واقعہ ہے تو پھر ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـهُ وَ أَشْهَـدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ'' یہ کہہ کر وہ مسلمان ہوگیا، پھر پوچھا کہ حضور! اب مجھے یہ بتائیے کہ میرے ذمہ کیا فریضہ عائد ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ

یوں تو اسلام کے بہت سے فرائض ہیں، لیکن اس وقت نہ تو نماز کا وقت ہے کہ تمہیں اس فریضہ کا حکم دیا جائے، نہ روزہ کا مہینہ ہے کہ تمہیں اس فریضہ کا حکم دیا جائے، نہ زکوٰۃ تم پر واجب ہے کہ اس فریضہ کا تمہیں حکم دیا جائے اور نہ ہی حج کا موسم ہے کہ تمہیں اس فریضہ سے متعلق حکم دیا جائے، اس وقت تو ایک ہی عبادت اور فریضہ اللہ تعالیٰ کے لیے انجام دینا ہے، اور وہ ہے جہاد، حضرت اسود راعی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''حضور! اگر میں جہاد میں شہید ہوگیا تو میرا انجام کیا ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ تم اگر جہاد فی سبیل اللہ میں مارے گئے تو شہید ہوکر سیدھے جنت میں جاؤ گے'' یہ سن کر حضرت اسود راعی رضی اللہ عنہ نے اپنی بکریوں کو خیبر کی طرف ہنکارا اور لشکر اسلام میں شامل ہوکر بڑی دیر تک دشمنوں سے لڑتے رہے، حتیٰ کہ جب خیبر فتح ہوگیا اور حضور ﷺ شہداء کی لاشوں کا معاینہ کرنے کے لیے نکلے، تو ان ہی لاشوں میں ایک لاش حضرت اسود راعی رضی اللہ عنہ کی بھی تھی، دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور فرمایا: ''یہ ایسا خوش نصیب ہے جس نے نہ اپنی زندگی میں کوئی سجدہ کیا، نہ ایک پیسہ کی سخاوت کی اور نہ ہی (جہاد کے علاوہ) اور کوئی عبادت انجام دی، لیکن میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ یہ سیدھا جنت میں پہنچ گیا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے چہرے کی سیاہی کو نور سے اور جسم کی بدبو کو خوشبو سے بدل دیا۔''

کلمۂ توحید کی برکت اور اہمیت:

حضرت شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہٗ اپنی نثری تقریر میں اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ''اس (دعوت توحید کو قبول کرنے اور) کلمۂ توحید کو پڑھنے کے بعد انسانی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہوجاتا ہے، یعنی جو شخص اس سے پہلے کافر تھا وہ اس کلمۂ توحید کے پڑھ لینے کے بعد مسلمان ہوجاتا ہے، پہلے جو شخص اللہ کا مبغوض تھا اس کلمۂ توحید کو پڑھ کر وہ اللہ کا محبوب بن جاتا ہے، پہلے جو شخص دائمی جہنم کا مستحق تھا تو اب کلمۂ توحید کو پڑھ کر دائمی جنت کا حقدار بن جاتا ہے، اور اگر میں یہ کہوں تو اس میں کوئی مبالغہ

نہیں ہوگا کہ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جو انسان کو ایک ہی لمحہ میں جہنم کے ساتوں طبقات سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ درجے میں داخل کرا دیتا ہے تو مذکورہ واقعہ سے اس کا ایک عملی ثبوت فراہم ہوتا ہے‘‘۔ (مستفاد از: ’’تقاریر عثمانی‘‘ ص:۶ تا ۱۰)

علاوہ ازیں حدیث شریف میں ہے:

’’عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ’’أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِیْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِّنْ قَلْبِهٖ أَوْ نَفْسِهٖ‘‘. (بخاری، مشکوٰۃ /ص: ٤٨٩ / باب الحوض والشفاعة)

’’قیامت کے دن میری شفاعت سے سب سے زیادہ فائدہ اس شخص کو ہوگا جس نے خالص دل کی گہرائیوں سے لا الہ الا اللہ کہا ہوگا، قلب کا لفظ فرمایا یا نفس کا۔‘‘ یعنی جس نے دعوت توحید کو قبول کر کے کلمۂ توحید پڑھا ہو، خواہ اس کے اچھے اور برے اعمال خلط ملط ہوں، مگر ہر ایمان والا امتی قیامت میں ضرور کامیاب ہوگا۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کلمہ کی بدولت اتنا زبردست انقلاب انسانی زندگی اور اس کے انجام میں پیدا ہوتا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ کلمہ کوئی منتر یا طلسم (یعنی جادو) ہے کہ اس کے پڑھ لینے کے بعد انسان عذابِ الٰہی سے محفوظ ہو جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کلمہ نہ کوئی منتر ہے نہ طلسم، بلکہ یہ ایک معاہدہ اور اقرار ہے جو ایک موحد اپنے رب سے کرتا ہے، وہ اس طرح کہ جب بندہ کلمۂ توحید میں ’’لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ‘‘ کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر معبود سے بری ہوتا ہوں، اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سچا پیغمبر مانتا ہوں۔ اس معاہدہ کا مطلب یہ ہے کہ میں پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق اس طرح گذارنے کی کوشش کروں گا جس طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتلا کر گئے، کلمۂ توحید پڑھنے کے بعد سارا انقلاب اس معاہدہ کی بدولت پیدا ہوتا ہے، اور اسی معاہدہ کا نام

شریعت مطہرہ میں ''توحید'' ہے۔

توحید انسانیت کے لیے اتحاد واتفاق کا باعث ہے:

اس توحید کا نقد نفع یہ ہے کہ اس سے اتفاق واتحاد پیدا ہوتا ہے، اس لیے کہ توحید اتحاد کا مرکز ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ نے اگست ۲۰۱۱ء ماہ مبارک ۱۴۳۲ھ میں سفرِ عمرہ کے دوران حرم میں اس عاجز سے ارشاد فرمایا: ''توحید انسانیت کے لیے مرکزیت کا باعث بھی ہے، قرآن کریم جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت کی ترغیب دیتا ہے تو اس کا روئے سخن پوری انسانیت کی طرف ہوتا ہے، کائنات کے عالمی سفر میں انسانی وحدت و یکجہتی کے لیے عقیدۂ توحید ہی قدرِ مشترک ہے، صاحب قرآن ﷺ اسی قدرِ مشترک کی طرف اہل کتاب کو متوجہ کرتے ہوئے دعوتِ اتحاد دے چکے ہیں:

﴿ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران : ٦٤)

توحید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جس معاشرے اور سماج میں عقیدۂ توحید بے داغ ہوگا وہ معاشرہ تفریق وانتشار سے محفوظ ہوگا، اور جہاں شرک کے جراثیم ہوں گے وہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گا، توحید جوڑتی ہے اور شرک توڑتا ہے، توحید کی فطرت میں وحدت ہے اور شرک کی جبلت میں تفریق وانتشار ہے''۔ اسی لیے کسی شاعر نے کہا ہے نا! کہ

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

توحید کی قسمیں:

پھر اس توحید کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: ایک توحید اعتقادی۔ دوسری توحید

عملی۔ (دونوں کا ذکر اجمالاً آ گیا) توحید اعتقادی کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اس بات پر دل سے یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہیں ہے، زندگی اور موت اسی کے قبضہ میں ہے۔

توحید کی اس قسم کے دو جزو ہیں: (۱) توحید ربوبیت۔ (۲) توحید الوہیت۔ توحید ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا اور ساری کائنات کا رب اور خالق و مالک مانے۔ یاد رکھو! توحید کی اس قسم کو تو دہریوں کے علاوہ ہر ایک نے مانا ہے، جس کی طرف قرآن نے کئی جگہ اشارہ کیا ہے، لیکن صرف توحید ربوبیت کو تسلیم کرنا ہی کافی نہیں، بلکہ نجاتِ اخروی کے لیے دین اسلام میں داخل ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر آخرت میں دائمی عذابِ الٰہی سے نجات پانا ممکن نہیں۔ نیز توحید ربوبیت کے ساتھ توحید الوہیت بھی ضروری ہے، اور توحید الوہیت کا مطلب یہ ہے کہ اس بات پر دل سے یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا معبود و مسجود ہے، وہی حاجت روا ہے، وہی مشکل کشا ہے، وہی اولاد اور رزق دینے والا ہے، سارے اختیارات اسی کے پاس ہیں، عزت و ذلت کا مالک وہی ہے، وہ اپنی ذات اور مخصوص صفات میں اکیلا اور تن تنہا ہے، اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں، یہ توحید اعتقادی اسی وقت کامل ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات و (مخصوص) صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے، یعنی توحید ربوبیت اور توحید الوہیت دونوں پر ایمان لایا جائے، اس میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو معاملہ بڑا خطرناک ہو جائے گا۔

توحید کی دوسری قسم ''توحید عملی'' ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ توحید اعتقادی انسان کی عملی زندگی میں اس طرح رچ بس جائے کہ وہ ہر آن اور زندگی کے ہر شعبے میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھے کہ میں نے ''کلمۂ توحید'' یعنی ''لا إله إلا الله محمد رسول الله'' پڑھنے کے بعد اپنے پروردگار سے زندگی بھر اس کی بندگی اور اس کے رسول ﷺ کی غلامی کا معاہدہ اور اقرار کیا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اب میں زندگی بھر اسے نبھائے رہوں اور اللہ تعالیٰ اور

اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی سے بچوں، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام اور ان کی مرضی وناراضگی علم کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی، لہٰذا علماء وصلحاء کی صحبت میں رہ کر علم حاصل کریں اور عمل کرنا سیکھیں، پھر اگر خدانخواستہ اس میں کوئی کمی کوتاہی ہوجائے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور سچی پکی توبہ کریں، یہی توحید کا تقاضا ہے اور اسی میں انسانیت کی نجاتِ اخروی مضمر ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں توحید کے تقاضوں کو صحیح طور پر سمجھ کر پوری زندگی ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور دارین میں اس کے تمام ثمرات ونتائج سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

۲/ رمضان المبارک/۱۴۳۲ھ

مطابق: ۳/ اگست/ ۲۰۱۱ء/ بروز بدھ (بزم صدیقی)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

☆......☆......☆

(۲)
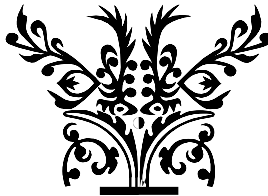
آسان دین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ الدِّیۡنَ یُسۡرٌ، وَلَنۡ یُّشَادَّ الدِّیۡنَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهٗ، فَسَدِّدُوۡا وَقَارِبُوۡا، وَأَبۡشِرُوۡا واسۡتَعِیۡنُوۡا بِالۡغَدۡوَةِ وَالرَّوۡحَةِ وَشَيۡءٍ مِّنَ الدَّلۡجَةِ". (رواہ البخاری، مشکوٰۃ/ص: ۱۱۰)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ دین (اسلام سراسر آسان ہی) آسان ہے، اور اس دین سے کوئی سختی کر کے مقابلہ نہیں کرسکتا، مگر یہ کہ دین اس پر غالب آجائے گا۔ (یعنی زائد کام جو شروع کیا ہے اس کو ادا نہیں کرسکتا) لہٰذا دینی امور میں میانہ روی اختیار کرو، اپنی بساط کے مطابق عمل کرو اور خوش رہو (اللہ تعالیٰ کے اکرام وانعام کے ساتھ) اور اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرو صبح اور شام اور رات کے آخری حصہ میں۔

دین اسلام سب سے زیادہ آسان دین ہے:

اللہ تعالیٰ کا جو حکم زندگی کے جس شعبے سے متعلق ہے اسے رحمت عالم ﷺ کے طریقے کے مطابق پورا کرنے کا نام دین ہے، دین اسلام کے جتنے بھی احکام ہیں ان میں

کوئی بھی حکم ایسا نہیں ہے جو کسی کے لیے دشوار ہو، اس لیے اہل اسلام کا حقائق کی روشنی میں یہ دعویٰ ہے جو عقل و نقل ہر اعتبار سے بالکل ثابت اور صحیح ہے کہ اس دنیا میں موجود تمام ادیان و مذاہب اور ملل میں دین اسلام سب سے زیادہ آسان دین ہے، اس کے ثبوت کے لیے اگر دنیا والے صرف اسلامی عبادات پر غور کریں تو ہر سنجیدہ اور سمجھدار انسان اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے کہ واقعی اسلام سب سے آسان دین ہے؛ کیوں کہ ایک سلسلہ ہے انعاماتِ الٰہی کا، اور دوسرا سلسلہ ہے عباداتِ اسلامی کا، حقیقت یہ ہے کہ انعاماتِ الٰہی کے مقابلہ میں عباداتِ اسلامی تو کچھ بھی نہیں ہیں، اس لیے کہ جہاں تک تعلق ہے انعاماتِ الٰہی کا تو وہ بے حد وحساب ہیں، اور انسان کی پیدائش سے لے کر موت کے بعد تک اس کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کہتا ہے:

﴿ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا ﴾ (إبراهيم: ٣٤)

''کائناتِ ارضی وسماوی میں بکھری ہوئی اس کی نعمتوں کو تم سب مل کر بھی گننا چاہو تو یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔'' مثلاً دیکھئے کہ ایک بچہ اپنی پیدائش سے قبل جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو وہاں تین تین اندھیروں میں بھی حق تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے اس کی تخلیق وتکمیل کا انتظام فرماتے ہیں، چناں چہ فرمایا:

﴿ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ﴾ (الزمر: ٦)

اس کے بعد جب اس نے ماں کے پیٹ سے دنیا کے پیٹ میں قدم رکھا تو اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ اس میں کچھ شعور اور سمجھداری نہ تھی، فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا﴾ (النحل: ٧٨)

ترجمہ: ''اور اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا اس حال میں تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔''

چناں چہ اس وقت بچہ نہ بول سکتا ہے، نہ اشارہ کر سکتا ہے اور نہ اپنی کسی طرح کی

کوئی ضرورت پوری کرسکتا ہے، لیکن اس وقت بھی پرورش اور تربیت کے سارے انتظامات کو بخیر وخوبی انجام دینے کے لیے والدین کو اور خصوصاً ماں کو حق تعالیٰ نے مجسم رحمت بنادیا، اس کی چھاتیوں میں اس کے لیے دودھ پیدا کر کے اس کے دل میں شفقت ورحمت پیدا کردی، جس کی وجہ سے وہ بچہ کی ہر طرح سے حفاظت وضرورت کا نظم کرتی ہے، یہ سب حق تعالیٰ کی نعمتیں اور نوازشیں نہیں تو اور کیا ہیں؟ پھر زندہ رہنے کے لیے ہوا، پانی، خوراک، پوشاک اور دیگر ضروریات کا وقت پر سہولت سے انتظام ہوتا گیا اور اس طرح اگر وہ بچہ رفتہ رفتہ زندگی کے سارے مراحل طے کرتے ہوئے حق تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مطیع اور فرماں بردار انسان بن کر زندگی گذار دیتا ہے، تو موت کے بعد بھی ان نعمتوں اور نوازشوں کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے جاری رہتا ہے، ان انعاماتِ الٰہیہ کے مقابلہ میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایک انسان ہمہ وقت بغیر کسی انقطاع کے مسلسل یادِ الٰہی میں رہے اور عباداتِ الٰہی کا تسلسل قائم رہے، جب کہ ہماری حالت وہ ہے جس کو شاعر نے کہا کہ:

صرف تسبیح کے دانوں سے تو نے کام لیا
گناہ تو بے حساب کیے اور گن گن کے اس کا نام لیا

دین اسلام کے احکام آسان ہیں:

لیکن دین اسلام نے انسان کو نہ اس کا پابند کیا، نہ حکم دیا، اور جن احکام واعمال کا حکم دیا تو وہ بچپن میں نہیں، بلکہ بالغ اور جوان ہونے کے بعد، اور وہ بھی نہایت ہی آسان ہیں، جن کو ہر شخص بسہولت ادا کرسکتا ہے، چناں چہ ایمانیات کے تعلق سے دین اسلام کا حکم ہے کہ جس ذاتِ باری نے ہمیں وجود بخشا، ظاہری وباطنی ہر اعتبار سے ہماری تربیت کا انتظام کیا اور ہمارے لیے اپنے فضل سے نعمتوں اور نوازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری فرمایا، اسی وحدہ لاشریک لہٗ کو اپنا خالق ومالک، معبود ومسجود، حاجت روا اور مشکل کشا مانو، اس کے علاوہ دیگر ایمانیات پر دل سے یقین اور زبان سے ان کا اقرار کرتے ہوئے پوری زندگی عملی طور پر

اس پر جمے رہو، اور یہ کوئی مشکل نہیں، ہر صاحبِ توفیق کے لیے آسان ہے۔

اور عبادات میں نماز کے متعلق غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ عظیم الشان اجر وثواب والی عبادت ہونے کے باوجود ہر وقت فرض نہیں، بلکہ دن رات میں صرف پانچ مرتبہ فرض ہے، اور ان میں بھی اوقاتِ نشاط (خوشی اور شادمانی کے اوقات) کا لحاظ رکھا گیا، روزانہ کے چوبیس گھنٹوں میں سے نماز کے ان اوقات کو اگر شمار کیا جائے تو مشکل سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی مدت بنتی ہے، گویا حق تعالیٰ نے ہر وقت نماز کی اس عبادت کو فرض کرنے کے بجائے صرف ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہی اپنی بارگاہ میں حاضری دینے کے لیے فرمایا، اور باقی سارے وقت میں کار وبار اور آرام کی اجازت دے دی، اس میں بھی اگر ہم شریعت اسلامی کی ہدایات کا لحاظ رکھیں تو یہ کھانا، کمانا اور کام وآرام سب عبادت بن جائیں۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ

بے حکمِ شرع آب خوردن خطا ست
وگر خوں بفتوی بریزی روا ست

یعنی شریعت کی اجازت کے بغیر پانی پینا بھی غلطی اور گناہ ہے، لیکن شریعت کی ہدایت اور دائرہ میں رہتے ہوئے تو خون بہانا، یعنی جہاد وقربانی وغیرہ جائز بلکہ عبادت ہے۔

دین اسلام کا ایک اہم حکم نماز اور اس کی آسانی:

صاحبو! حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے احکام پر سمجھ کر صحیح عمل کیا جائے تو دنیا بھی دین اور عادت بھی عبادت بن جاتی ہے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہمت کر کے اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگتے ہوئے عمل شروع کریں، تو ان شاء اللہ کسی عمل میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، مثلاً دیکھیے کہ نماز ایک اہم حکم ہے، اس حکم میں کس قدر سہولت رکھی گئی ہے اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی نمازی مجبوری یا بیماری کی وجہ سے وضو نہیں کرسکتا تو اس وقت پاکی حاصل کرنے کے لیے حکم ہے کہ وہ مٹی سے تیمّم کرلے:

﴿ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰى أَوْ عَلٰى سَفَرٍ أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَآئِطِ أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ أَيْدِيْكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا﴾ (النساء : ٤٣)

ترجمہ: اور اگر تم بیمار ہو، یا کہیں سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی استنجاء سے آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمّم کر لو، یعنی ملو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو، بے شک اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے، بڑے بخشنے والے ہیں۔

تیمّم سے بھی اسی طرح طہارت اور پاکی حاصل ہو جاتی ہے جس طرح غسل اور وضو سے ہو جاتی ہے، اور ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں آتی، یہ آسانی نہیں تو اور کیا ہے؟ سچ ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج:۷۸)

''اور اللہ تعالیٰ نے دین کے بارے میں تم پر کوئی حرج (تنگی) نہیں رکھا۔''

اور نبی کریم ﷺ نے سچ ہی فرمایا کہ ''إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ'' یقیناً دین سراپا آسانی ہے۔

پھر اگر کوئی نمازی مجبوری یا بیماری کی وجہ سے کھڑا ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو اس کے لیے بیٹھ کر حتیٰ کہ لیٹ کر ادا کرنے کی بھی گنجائش ہے، نیز مسجد کی حاضری اور جماعت کی پابندی بھی اس کے لیے ضروری نہیں ہے، اسی کے ساتھ نماز حالت سفر میں ہے تو اس وقت بھی اس کے لیے خاص رعایتیں اور سہولتیں ہیں کہ سنن مؤکدہ غیر مؤکدہ کے درجہ میں ہو جاتی ہیں، اور چار رکعت والی فرض نمازیں اس کے حق میں دو رکعت والی بن جاتی ہیں، ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ''سفر میں نماز ہاف (Half) (آدھی) ہے اور جماعت معاف ہے۔'' مسافر کے لیے یہ آسانی بھی ہے کہ اگر وہ سواری پر سوار ہونے کی حالت میں نوافل ادا کرنا چاہے تو استقبالِ قبلہ ضروری نہیں، کیوں کہ

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (البقرة : ١١٥)

''اور پورب اور پچھّم اللہ ہی کی ملک ہیں، سو تم جس طرف بھی رُخ کرو تو وہاں اللہ

کی ذات (توجہ) موجود ہے۔'' یہ آسانی نہیں تو اور کیا ہے؟

دینِ اسلام کے دیگر احکام اور ان میں آسانیاں:

اس کے علاوہ اسلام کی دوسری عمومی عبادت روزہ کو دیکھ لیجیے کہ وہ سال بھر میں صرف ایک مہینہ فرض ہے، اور وہ بھی دن میں، رات کو روزہ نہیں ہوتا، پھر سحری جس میں کھانا بند کیا جاتا ہے تو اس میں تاخیر افضل ہے، اور افطاری جس میں کھانا کھایا جاتا ہے تو اس میں تعجیل (جلدی کرنا) افضل ہے۔

اور اگر کوئی روزہ دار سفر یا مرض کی وجہ سے فی الحال روزہ نہ رکھنا چاہے تو گنجائش ہے، حکم ہے کہ بعد میں قضا کرلے:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (البقرة: ١٨٤)

''پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا کہیں سفر میں ہو تو اس پر دوسرے دنوں سے گنتی کو پورا کرنا ہے۔'' یعنی مریض اور مسافر بعد میں قضا کرسکتے ہیں، اور اگر بعد میں قضا کا موقع بھی نہ ملا تو فدیہ ہے (ایک روزہ کا فدیہ صدقۂ فطر کی مقدار ہے) یہ آسانی نہیں تو اور کیا ہے؟

صدق اللّٰه ورسوله: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ اور ''إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ''.

رہی بات زکوٰۃ اور حج کی، تو وہ ہر ایک پر فرض نہیں، بلکہ مسلمانوں کے مالداروں پر خاص شرائط پائے جانے کے بعد فرض ہیں، زکوٰۃ کے متعلق حکم ہے کہ جو مالدار صاحب نصاب ہو، یعنی مال کی ایک خاص مقدار اس کی ملکیت میں ہو، اور مال بھی ہر طرح کا نہیں، بلکہ وہی جو نامی ہو، یعنی جس میں اضافہ اور بڑھوتری ہوسکتی ہو، اس مال پر بھی پورے سال میں زکوٰۃ صرف ایک ہی مرتبہ فرض ہے، وہ بھی سارا مال نہیں، بلکہ اس کی بہت معمولی مقدار، پھر اس میں بھی یہ رعایت ہے کہ اپنے اور گھر والوں کے سارے جائز اور ضروری اخراجات اور قرضہ جات نکالنے کے بعد اگر نصاب باقی رہتا ہے تو زکوٰۃ فرض ہے، ورنہ نہیں، پھر عجیب بات یہ ہے کہ اجر وثواب اس وقت زیادہ رکھا جس وقت مالِ زکوٰۃ سے اپنے اعزہ واحباب

اور اقرباء و رشتہ داروں کی مدد کی جائے، گویا جن کی خبر گیری ہماری اخلاقی ذمہ داری تھی ان پر مالِ زکوٰۃ نہ صرف یہ کہ خرچ کرنے کی اجازت دی، بلکہ اس میں اجر و ثواب کا اضافہ بھی فرما دیا، یہ آسانی نہیں تو اور کیا ہے؟ صدقت یا رب العالمین: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِي الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ﴾ وصدق رسولك النبي الكريم: "إِنَّ الدِّيۡنَ يُسۡرٌ".

اور حج کا حکم یہ ہے کہ مالدار صاحب استطاعت مسلمان پر پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ إِلَيۡهِ سَبِيۡلًا﴾ (آل عمران: ۹۷)

مطلب یہ ہے کہ حج ان ہی لوگوں پر فرض ہے جن کے پاس مالی، جسمانی اور قانونی اعتبار سے استطاعت اور وسعت ہو، معلوم ہوا کہ جن اعمال و عبادات کی ادائیگی سب کے بس میں تھی وہ سب پر فرض کی گئیں، لیکن زکوٰۃ اور حج، صدقۂ فطر اور قربانی وغیرہ ادا کرنا غریبوں کے بس میں نہ تھا، لہٰذا وہ صرف مالداروں پر فرض ہوئیں، یہ آسانی نہیں تو اور کیا ہے؟ صدق اللّٰہ ورسولہ: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِي الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ﴾ اور "إِنَّ الدِّيۡنَ يُسۡرٌ".

آسان احکام کی ادائیگی پر عظیم بشارت اور حدیث پاک کا ایک واقعہ:

پھر عجیب بات یہ ہے کہ ان آسان اعمال، احکام اور عبادات کی صحیح ادائیگی پر ہر مسلمان کے لیے کامیابی کی بشارت ہے، چناں چہ حدیث شریف میں بالکل ابتداءِ اسلام کا ایک واقعہ منقول ہے، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل نجد کا ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا کہ حضور! مجھے اسلام کے وہ خاص احکام بتلائیے جن پر عمل کرنا بحیثیت مسلمان ہونے کے میرے لیے اور ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، اس موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دن رات میں صرف پانچ ہی نمازیں فرض کی گئی ہیں، لہٰذا ان کا اہتمام کیا کیجیے!'' اس نے عرض کیا کہ ''ان کے علاوہ اور کوئی نماز بھی فرض ہے؟'' ''فَقَالَ لَا، إِلَّا أَنۡ تَطَوَّعَ'' فرمایا: ''فرض تو بس یہی پانچ نمازیں

ہیں، باقی نفل ہیں جن کا تمہیں اختیار ہے'' چاہو تو فرض کے علاوہ زائد نوافل پڑھو اور مزید اجر وثواب حاصل کرو، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''پورے سال میں ایک مہینہ رمضان کے روزے فرض کیے گئے'' عرض کیا: ''حضور! رمضان کے علاوہ اور کوئی روزہ بھی فرض ہے؟'' فرمایا نہیں، فرض تو بس رمضان ہی کے روزے ہیں، مگر تمہیں اختیار ہے کہ اس کے علاوہ نفلی روزے رکھو تو وہ قربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فریضۂ زکوٰۃ کا تذکرہ فرمایا تو اس نے عرض کیا کہ ''زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ فرض ہے؟'' فرمایا: ''نہیں، البتہ اگر تم اپنے دل کی خوشی سے نفلی صدقہ دو تو اس کا مزید اجر وثواب ملے گا'' اس وقت چوں کہ حج فرض نہیں ہوا تھا اس لیے اس کا ذکر نہیں فرمایا، اور وہ شخص یہ کہتا ہوا واپس لوٹ گیا کہ ''مجھے حضور اکرم ﷺ نے جو کچھ بتلایا ہے، میں اس تعلیم وہدایت کا پورا پورا اتباع کروں گا، اور اپنی طبیعت وچاہت سے اس میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں کروں گا'' تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''أَفْلَحَ الرَّجُلُ إِنْ صَدَقَ''. (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص: ۱۳) ''اگر یہ شخص اپنے قول میں سچا ہے تو کامیاب ہوگا۔''

غور کیجیے گا! اس حدیث میں حضور ﷺ نے محض فرائض کی ادائیگی پر کامیابی کی خوش خبری دی، یعنی وہ احکام جن کا تعلق فرائض سے ہے، اور جو نہایت آسان ہیں، جب ان کی ادائیگی پر یہ بشارت ہے تو سنن ومستحبات جو فرائض کے لیے تکمیل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان پر عمل کرنا تو مزید حصولِ فلاح کا سبب ہوگا۔

جن کی فطرت فاسد ہو وہ آسان دین کو بھی مشکل سمجھتے ہیں:

پھر یہ ان احکامات واعمال کی بات ہے جن کا تعلق مامورات سے ہے، یعنی کرنے اور حکم بجالانے سے ہے، لیکن جن احکامات واعمال کا تعلق منہیات سے ہے، یعنی نہ کرنے اور بچنے سے ہے، تو خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ دین اسلام میں فضولیات، خرافات اور گناہ ومعصیات کو چھوڑ کر جتنی بھی انسانی ضروریات کی چیزیں اور باتیں ہیں ان سب کی اجازت

ہے، حتیٰ کہ ایک انسان کے لیے آسائش (راحت، وسہولت) وآرائش (زیب وزینت) کی بھی اجازت ہے، دنیا کی وہ ساری چیزیں جن میں لطف اور لذت وراحت ہے جائز حدود کی پابندی کے ساتھ ہمارے لیے حلال کردی گئیں، چناں چہ فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الأعراف:۳۲)

یعنی حق تعالیٰ نے اس دنیا میں زینت وسہولت کا جو سامان پیدا کیا اس کو کس نے حرام کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں تمہارے لیے حلال اور طیب ہیں، ان چیزوں کو جائز حدود میں رہتے ہوئے استعمال کرو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، منع صرف ان ہی باتوں سے کیا گیا جو ایک انسان کے لیے دنیوی اور اخروی اعتبار سے ہلاکت اور نقصان کا ذریعہ تھیں، آپ دین اسلام کے ایک ایک حکم پر غور کرکے دیکھ لیں، یہی نظر آئے گا کہ ہر حکم میں ہماری خیر خواہی وآسانی کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، ہمیں کسی ایسی بات کا حکم ہی نہیں دیا گیا جو ہم سے نہ ہوسکے، فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة:۲۸۲) ''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلّف نہیں بناتے مگر جتنی اس کی گنجائش ہے۔'' اسی کے ساتھ توبہ کا دروازہ بھی کھلا رکھا گیا، تاکہ اگر بالفرض دین وشریعت پر چلتے ہوئے کوئی گناہ ہوجائے تو ہم معافی مانگ لیں، اور حق تعالیٰ ہمیں معاف فرماکر پھر اپنے وفادار بندوں میں شامل کرلیں۔

یہ ہے آسان دین، عمل کرے جس کا جی چاہے
نہ عمل کرنا ہو آتشِ دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے

صاحبو! ان حقائق سے واضح ہوگیا کہ اگر طبیعت میں فساد اور ٹیڑھا پن نہ ہو تو واقعی دین اسلام نہایت آسان دین ہے، مشکل کچھ بھی نہیں۔

ہر شخص اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق عمل کرسکتا ہے، یا یوں کہئے کہ دین اسلام پر عمل کرنا ہر ایک کے بس کی بات ہے، امیر فقیر، حاکم محکوم، خادم مخدوم، مرد وعورت، جوان بوڑھا، مزدور، معذور، غرض ہر طبقہ اور اس کا ہر فرد ہر حال میں ہر وقت دین اسلام کے احکام پر

عمل کرسکتا ہے؛ کیوں کہ اس کے احکام ہر شخص کی وسعت اور گنجائش کے مطابق ہی ہیں، کسی کے لیے کسی حکم میں خواہ مخواہ کی تنگی و سختی نہیں، اسی کو رب العالمین نے فرمایا: ﴿وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج : ۷۸) ''اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔'' یعنی تمہاری ملت و شریعت میں کوئی تنگی و دشواری نہیں ہے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی فرماتے ہیں: ''إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ'' کہ دین اسلام بہت ہی آسان دین ہے۔

دین اسلام کے احکام میں آسانی کا مطلب:

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ سہولت کا یہ مطلب نہیں کہ عبادات و احکام کی ادائیگی میں ادنیٰ محنت و مشقت بھی نہیں، بلکہ اس محنت و مشقت کی نفی ہے جسے عرفِ عام میں دشوار اور تکلیف دہ سمجھا جاتا ہے، شریعت میں ایسی کوئی عبادت و حکم ہے ہی نہیں۔ اسی لیے فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرة : ۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتے ہیں اور تمہارے ساتھ دشواری نہیں چاہتے۔''

ہاں جن کی فطرت ہی فاسد ہو انہیں آسان دین بھی مشکل لگتا ہے، جیسے بیمار آدمی کو اچھی اور عمدہ غذا بھی اچھی نہیں لگتی، ٹھیک یہی حال ان لوگوں کا ہے جن کی طبیعت فاسد ہے، ورنہ دین اسلام فی نفسہٖ ایک آسان دین ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں موت تک اس پر عمل کرنا آسان ہے۔

مجاہدات کی حقیقت:

لیکن اس جگہ قرآن وحدیث کی اس تشریح کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضراتِ صحابہؓ وصلحاء کی زندگی میں بکثرت مجاہدات سے سوال پیدا ہوتا ہے ہے کہ جب دین اسلام اور اس کے احکام آسان ہیں تو ان مجاہدات کی کیا ضرورت تھی؟ اس سلسلہ میں علامہ شاطبیؒ نے فرمایا کہ ''دو طرح کے لوگ ہیں، ایک وہ جن کی صحت ایسے مجاہدات برداشت کرنے کی متحمل

نہیں، جیسا کہ اکثر عوام کا تقریباً یہی حال ہے، اس صورت میں آسانی وسہولت والے پہلو کو مدنظر رکھنا اور رخصت ورعایت پر عمل کرنا ہی کمالِ دانشمندی ہے، دوسرے جن کی صحت ایسی ہے کہ مجاہدات ان کے لیے آسان بلکہ باعث نشاط اور راحت جاں ہیں، اگرچہ ایسے لوگ خواص میں بھی بہت کم رہ گئے ہیں، ان کے لیے یہ مجاہدات فرض تو نہیں البتہ چند شرائط کے ساتھ جائز ہیں:

(۱) ان مجاہدات سے طبیعت پر ایسی گرانی اور بوجھ محسوس نہ ہو جس سے عبادت اور حضورِ قلب میں خلل واقع ہو۔

(۲) ان مجاہدات کی وجہ سے دوسری اہم عبادات فوت نہ ہوتی ہوں۔

(۳) ان مجاہدات سے حقوق العباد ضائع نہ ہوتے ہوں۔

(۴) ان مجاہدات کے سامنے شرعی رخصت وسہولت کو فضول اور ان سے فائدہ اٹھانے والوں کو حقیر نہ سمجھا جاتا ہو۔

(۵) ان مجاہدات کے ذریعہ کسی غیر واجب کو واجب اور غیر ضروری کو ضروری نہ سمجھا جاتا ہو۔

(۶) ان مجاہدات میں کمیت کے بجائے کیفیت پر زور دیا جاتا ہو، یعنی کثرتِ عبادات یا تلاوت کے بجائے ادائیگیٔ ارکان اور تدبر وغیرہ پر توجہ دی جاتی ہو۔

(۷) ان مجاہدات کو حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اعمال سے بڑھا ہوا اور خود کو عیاذاً باللہ ان سے بڑھ کر خیال نہ کیا جاتا ہو، تو یہ مجاہدات ان کے حق میں اختیاری ہیں جن کی گنجائش ہے۔ (درس بخاری افادات شیخ الاسلام حضرت مدنی از: پیام رسالت/ص:۴۴)

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں اور توفیق عمل دیں۔ آمین۔

”اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

(۳)

سمع وطاعت
(سننے اور ماننے) کی اہمیت وحقیقت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلسَّمۡعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الۡمَرۡءِ الۡمُسۡلِمِ فِيۡمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، مَالَمۡ يُؤۡمَرۡ بِمَعۡصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعۡصِيَةٍ، فَلَا سَمۡعَ وَلَا طَاعَةَ". (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص:۳۱۹/کتاب الإمارة والقضاء/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: "سننا اور اطاعت کرنا مسلمان پر لازم ہے، ہر اس چیز میں جس کو وہ پسند کرتا ہو اور جس کو ناپسند کرتا ہو، جب تک کہ کسی گناہ کا حکم نہ دیا جائے، پس جب اسے کسی گناہ کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے، نہ ماننا ہے۔

سننا، احکامِ الٰہی میں بنیادی عمل:

اللہ رب العزت کے جتنے بھی احکام کتاب وسنت میں بیان کیے جاتے ہیں، خواہ

ان کا تعلق اوامر سے ہو یا نواہی سے، ان میں نہایت اہم اور بنیادی عمل سننا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کو فہم وفراست اور عقیدت واطاعت کے جذبے سے سنا جائے، اس عمل کو بنیادی حیثیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ انسان کے دین کی ابتداء وآغاز ہی سننے کے عمل سے ہوا ہے۔ جس کی تفصیل کتاب وسنت کی روشنی میں اس طرح ہے کہ اللہ جل شانہ نے ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارنے کے بعد وادیٔ نعمان (جو میدانِ عرفات کے نام سے معروف ومشہور ہے) میں ان کی قیامت تک کی ذرّیت (اولاد) کو نکالا، جو چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی شکل میں تھی، اور پشت در پشت ان کی نسل سے جو مخلوق پیدا ہونے والی تھی سب کو پیدا فرمایا، اور ان کی وہی صورتیں بنادیں جو بعد میں عالم ظہور (دنیا) میں پیدا ہونے والی تھیں، پھر حق تعالیٰ نے ان کو بولنے کی قوت عطا فرمائی، اس کے بعد ان سے عہد لیا اور انہیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا۔ (جیسا کہ مشکوٰۃ/ص:۲۴ میں مسند احمد کے حوالہ سے موجود ہے) اور یہ کوئی ناممکن بات بھی نہیں، آج کل جدید آلات اور ایٹمی توانائی کے ذریعہ جو چیزیں ذرّات کی صورت میں بن رہی ہیں اور کمپیوٹر میں بڑی ہو کر سامنے آرہی ہیں انہوں نے ثابت کردیا کہ بڑی سے بڑی چیز کو ایک نقطہ کی سی شکل دی جاسکتی ہے اور اس میں اس کے اعضاء موجود ہوسکتے ہیں۔

﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کی شاندار تشریح:

قرآن کریم نے اس کا تذکرہ یوں فرمایا:

﴿ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي ادَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلٰى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴾ (الأعراف:۱۷۲)

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو خود ان ہی پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے: کیوں

نہیں، (آپ ضرور ہمارے رب ہیں) ہم اقرار کرتے ہیں کبھی قیامت کے دِن کہنے لگو کہ ہم کو اس کی خبر نہ تھی۔

ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؔ نے اس آیت کریمہ کی اپنے منفرد انداز میں بڑی شاندار تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ ''اور جب وعدہ لیا تیرے رب نے ''مِنُ بَنِیُ آدَمَ'' اولادِ آدم سے، ''مِنَ الْمُوْمِنِیْنَ'' نہیں فرمایا، ''مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' نہیں فرمایا، ''مِنَ الْأَوْلِیَـاءِ وَ الْـمُتَّقِیْنَ'' نہیں فرمایا۔ ''مِنُ بَنِیُ آدَمَ'' ......روئے زمین پر آنے والے تمام انسانوں کی روحیں، بلاامتیازِ فکرونظر، بلاامتیازِ رنگ ونسل، بلاامتیازِ لسان ووطن تمام انسانوں کی روحیں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے جمع کیں، گوروں کی، کالوں کی، عربوں کی، عجمیوں کی، فرمانبرداروں کی، نافرمانوں کی، سعادت مندوں کی، شقاوت پسندوں کی، یکجائیوں کی روحیں، ہرجائیوں کی روحیں، دنیا میں بٹنے والے، مختلف فکرونظر میں تقسیم ہونے والے، مختلف علاقوں اور قبائل کی طرف منسوب ہونے والے تمام انسانوں کی روحیں اس نے جمع کیں، انسانی ارواح کے اس عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے رب العالمین نے فرمایا: ''اے اولادِ آدم! میں تمہیں انسانی شرافت کا تاج پہنا کر دنیا میں بھیجنے والا ہوں، اور ساری کائنات کو تمہارے لیے مسخر کرنے والا ہوں، تم دنیا میں جا کر میرے مہمان بنو گے، میں تمہارا میزبان بنوں گا، زمین کو تمہارے لیے بچھونا بناؤں گا، آسمان کو تمہارے لیے چھت بناؤں گا، مسخر کردوں گا زمین کو تمہارے لیے، وہ زمین جس میں فولاد جیسی سخت چیز بھی دفن کی جائے تو زمین کی نمی اور برودت چند دنوں کے بعد فولاد کو بھی خاک بنا دیتی ہے، لیکن میں اسے بھی تمہارے لیے مسخر کردوں گا، جب تم اسی زمین میں اپنا دانہ دفن کرو گے تو وہ اسے خاک نہیں بنائے گی، گلزار بنا کر تمہارے ایک دانے کو کئی دانوں میں بدل کر تمہاری امانت واپس کردے گی، آسمان کے دامن میں ایسے چراغ جلادوں گا، ایسے بلب روشن کردوں گا جو قیامت تک فیوز نہیں ہوں گے، ماہانہ بل بھی نہیں آئے گا۔''

﴿أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَّخَلَقْنٰكُمْ أَزْوَاجًا ۝

وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا۝ وَ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا۝ وَّأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا۝﴾

(النبأ : ٦ تا ١٦)

ستاروں کو تابانی عطا کروں گا تمہارے لیے، چاند کو لمعانی عطا کروں گا تمہارے لیے، سورج کو درخشانی عطا کروں گا تمہارے لیے، ستارے چمکیں گے، سبزے لہکیں گے، گلشن مہکیں گے، عنادل چہکیں گے، راتوں کو اندھیرا دوں گا تمہارے لیے، صبح کو سویرا عطا کروں گا تمہارے لیے، ندیوں کو روانی عطا کروں گا تمہارے لیے، سمندروں کو تلاطم عطا کروں گا تمہارے لیے، دریاؤں کو بہاؤ عطا کروں گا تمہارے لیے، بادلوں کے قافلے رواں دواں رہیں گے تمہارے لیے، میں تمہاری ضرورتوں سے آگاہ رہوں گا، جہاں ضرورت ہوگی وہیں برسیں گے، اور برسیں گے بھی اس انداز میں کہ بادل کا سینہ چھلنی کر کے بوند بوند برساؤں گا، کہ اگر آسمان سے پرنالے جاری ہو جائیں گے تو تمہاری سجائی ہوئی زمین خراب ہو کر رہ جائے گی، میں پانی پہنچاؤں گا، لیکن تمہاری محنت کو بھی رائیگاں نہیں ہونے دوں گا، قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿ أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ﴾ (الواقعة : ٦٩)

’’کیا تم نے اس کو بادل سے برسایا یا ہم ہی برسانے والے ہیں؟‘‘

فطرت قدم قدم پر انسان کو آگاہ کرتی ہے کہ سب کچھ تو نہیں، سب کچھ وہ ہے، کامل تو بس وہی ہے، قرآنِ کریم نے اور بھی بے شمار نعمتوں کا تذکرہ کیا، رب العالمین نے فرمایا کہ یہ ساری نعمتیں عطا کر کے میں تمہیں دنیا میں بھیجوں گا اور دنیا میں بھیج کر بھی تنہا نہیں چھوڑوں گا، ہر قدم پر میری رحمت تمہاری نگراں اور پاسبان ہوگی، اب تم بتاؤ! دنیا میں جا کر کہیں مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟ ’’أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟‘‘ تمہارا رب کون ہوگا؟ کس کے آگے جبین جھکاؤ گے؟ اللہ ہی کے آگے۔ کس کو ہر جگہ موجود سمجھ کر ڈرو گے؟ اللہ ہی کو۔ کس کے

آگے دامن پھیلاؤ گے؟ اللہ ہی کے آگے۔ کس سے اولاد مانگو گے؟ اللہ ہی سے۔ کس سے دستگیری، کارسازی اور مشکل کشائی کی دعائیں کرو گے؟ اللہ ہی سے۔ "أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟" کیا میں تمہارا رب ہوں کہ نہیں؟ تمام انسانی روحوں نے اعتراف واقرار کیا: "بَلٰی" اے محسن اعظم! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تو ہی ہمارا رب ہے، انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی حق تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا وعدہ لیا ہے۔"

مومن کی پہچان:

ظاہر ہے کہ یہ ارشادِ باری ارواحِ انسانی نے سب سے پہلے سنا تبھی تو جواب میں توحید ربانی کا اقرار کرتے ہوئے کہا کہ ﴿بَلیٰ﴾۔

بس ثابت ہو گیا کہ آغاز سننے سے ہوا، یہ الگ بات ہے کہ اہل سعادت نے تو برضائے قلبی ربوبیت باری کا اقرار کیا اور اہل شقاوت نے بہ کراہت خاطر منافقت کے ساتھ اقرار کیا۔ جیسا کہ علماءِ مفسرین نے آیت کریمہ: ﴿وَلَهٗٓ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا﴾ کا یہی مطلب مراد لیا ہے۔ (تفسیر مظہری، از گلدستۂ تفاسیر/ ج:۲/ ص:۶۱۳)

شاید یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد بھی سنتے تو سبھی ہیں، لیکن مومن اور منافق و کافر کے سننے میں بڑا فرق ہے، کافر و منافق کا حال تو یہ ہے کہ وہ سب کی سنتے ہیں، رب کی نہیں سنتے، مطلب یہ ہے کہ سننے کے بعد مانتے نہیں، اس لیے قرآن کہتا ہے ان کا سننا نہ سننا سب برابر ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ﴾

(قرآنِ کریم نے اہل ایمان سے فرمایا کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا، حالاں کہ وہ سنتے نہیں؛ کیوں کہ وہ سنی ان سنی کر دیتے ہیں، یہ بدترین قسم کے لوگ ہیں:

﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾

”بلا شبہ روئے زمین پر چلنے پھرنے والوں میں اللہ کے نزدیک سب سے برے وہ لوگ ہیں جو (حق بولنے سے) گونگے اور (حق سننے سے) بہرے ہیں (اور حق کو) سمجھتے ہی نہیں۔“

﴿وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ﴾ (الأنفال: ۲۱ تا ۲۴)

”اور اگر حق تعالیٰ کے علم میں ہوتا کہ ان میں خیر کی کوئی رمق اور حق کی طلب) ہے تو ضرور انہیں (ایسا) سننے کی توفیق دیتا۔“ (جو فہم وفراست اور عقیدت واطاعت کے ساتھ ہو اور ان کے لیے دارین کے اعتبار سے مفید ہو)

یہ تو کافر اور منافق کا حال ہے، جب کہ مومن کی شان اور پہچان ﴿سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا﴾ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے جس وقت جو حکم دیا جائے خواہ حکم دینے اور سنانے والا کوئی ہو! اسے ماننا، سمجھنا اور عمل کرنا شرعی اعتبار سے ہر مومن پر فرض ہے، جیسا کہ حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا کہ:

”اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، مَالَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ“.

(اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ حاکم وقت اور امیر وعالم کی بات) سننا اور اطاعت کرنا ہر مومن پر لازم ہے، خواہ وہ حکم اس کی پسند اور طبیعت کے مطابق ہو یا نہ ہو، البتہ اگر کسی خلافِ شرع بات کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا واجب ہے، نہ اطاعت کرنا۔ (بلکہ اس موقع پر نہ سننا اور نہ ماننا ضروری ہے، لیکن بغاوت اس وقت بھی روا نہیں) اور قرآن کے مطابق یہ مومن کی پہچان ہے، مومن حکم الٰہی اور شریعت اسلامی کے آگے فانی دنیا کے مادی نفع ونقصان کو سوچنے کے بجائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کو سنتے ہی سر تسلیم خم کر دیتا ہے، ایک مومن اور غیر مومن میں یہی تو فرق ہے کہ مومن صرف سر کے کان

ہی سے نہیں بلکہ دل کے کان سے سنتا ہے؛ کیوں کہ سر کے کان سے تو ہر کوئی سنتا ہے، اس لیے قرآنِ کریم نے مومن کی پہچان بیان کرتے ہوئے ﴿سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا﴾ فرما کر محلِ تعریف میں (تعریفی انداز میں) اس کا ذکر کیا ہے۔

دانائے رومؒ فرماتے ہیں:

ایں سخن از گوشِ دل باید شنود ☆ گوشِ گِل ایں جا ندارد ہیچ سود
گوشِ گِل باجملہ حیواں ہمدست ☆ گوشِ دل مخصوصِ نسلِ آدم است

یعنی وعظ و نصیحت اور شریعت کی باتیں گوشِ دل سے سننی چاہیے؛ کیوں کہ مٹی کے کان سے سننے میں کچھ فائدہ نہیں ہے، اور مٹی (سر) کے کان، انسان اور حیوان سب میں پائے جاتے ہیں، مگر دل کے کان اولادِ آدم (مومن) کے ساتھ مخصوص ہیں، اور یہی مومن کی پہچان ہے کہ وہ گوشِ دل سے سنتا ہے اور مانتا ہے۔

ایک نکتہ

غور کیجئے کہ آیت کریمہ میں مومن کی جن دو صفتوں کا ذکر ہے ان میں سننے کی صفت کو صفت طاعت سے پہلے بیان فرمایا، ﴿سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا﴾ ہم نے سنا اور مانا، اسی طرح جہاں تخلیق انسانی کا تذکرہ ہوا وہاں پر پیدائش کے بعد جو بنیادی نعمتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں بھی سننے کی نعمت کو پہلے بیان فرمایا:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ (الدھر:۲)

”ہم نے انسان کو ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا، پھر ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔“ ان حقائق سے معلوم ہوا کہ زندگی کا ابتدائی اور بنیادی عمل سننا ہے، اس کے بعد ماننا ہے اور وہی اطاعت گزار اور شکر گزار ہوئے جنہوں نے صحیح معنیٰ میں سنا، اور جنہوں نے صحیح معنیٰ میں سنا ہی نہیں وہ نہ اطاعت گزار ہوئے نہ شکر گزار، قرآنِ کریم میں آگے جو بات بیان فرمائی گئی اس سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے:

﴿ إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّ إِمَّا كَفُوْرًا﴾ (الدھر : ۳)

’’پھر ہم نے انسان کو (کتاب اللہ اور رجال اللہ کے واسطے سے) حق راہ بتائی، اب یا تو وہ شکر گزار بنے گا یا ناشکرا۔‘‘

عجیب بات یہ ہے کہ یہاں سننے کی صفت کے مقابل جو صفت ذکر کی گئی وہ ہے ﴿شَاكِرًا﴾ اور دیکھنے کی صفت کے مقابل ﴿كَافِرًا﴾ کا ذکر ہے، تو اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جن کا مزاج صحیح معنی میں سننے کا ہے وہ شکر گزار ہوتے ہیں، اور جن کا مزاج سننے کا نہیں بلکہ دیکھ کر ماننے کا ہے وہ عموماً کافر و ناشکرے ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قیامت میں کافر جب اپنی آنکھوں سے عذابِ الٰہی کا نظارہ کریں گے تب کہیں گے:

﴿ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوْقِنُوْنَ﴾ (السجدة:۱۲)

’’اے ہمارے رب! ہم نے دیکھا اور سنا، اب ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دیجئے، ہمیں یقین آ گیا۔‘‘ دیکھئے ترتیب الٹ گئی، ظاہر ہے کہ جنھوں نے دنیا میں سن کر نہ مانا ہوگا قیامت میں ان کا دیکھ کر ماننا انہیں کوئی نفع نہ دے گا، جب یہ حقیقت سامنے آئے گی تو وہ افسوس کرتے ہوئے کہیں گے:

﴿ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ أَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ (الملك:۱۰)

کاش ہم اہلِ حق کی باتوں کو عناد کے بغیر گوشِ (دل و) قبول سے سنتے اور سنی ہوئی دلیلوں سے جو حقانیت ثابت ہو رہی تھی اس کو مان لیتے، تو آج ہم جلنے والی آگ اور عذابِ الٰہی میں نہ ہوتے۔

سننے والوں کے لیے بشارت:

بس ثابت ہوا کہ (صحیح معنی میں فہم و فراست اور عقیدت و طاعت کے جذبے سے) سننا مومن کی شان اور سعادت مندی کی پہچان ہے، اور نہ سننا بے توفیقی اور محرومی کی

نشانی ہے۔اور جو سنتے ہی نہیں وہ نہ صرف یہ کہ عمل سے محروم رہتے ہیں، بلکہ علم سے بھی محروم رہتے ہیں؛ کیوں کہ علم کا راستہ اور حصولِ علم کا ذریعہ بھی یہی ہے کہ انسان علم کی باتوں کو سنے، جیسا کہ حدیث پاک سے اس طرف اشارہ ملتا ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" تَسْمَعُوْنَ وَيُسْمَعُ مِنْكُمْ، وَيُسْمَعُ مِمَّنْ يَسْمَعُ مِنْكُمْ". (أبوداود/ج:۲/ص:۵۱۵/کتاب العلم/ باب فضل نشر العلم)

رحمت عالم ﷺ نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ "تم علم کی باتیں مجھ سے سنتے ہو (اور اس طرح اپنے علم میں اضافہ کرتے ہو) اور پھر میرے بعد تم سے وہ سنا جائے گا، اور اس کے بعد پھر اس سے سنا جائے گا جو تم سے سنے گا۔" (اور یہ سلسلہ اس طرح جاری رہے گا) اور جو سننے سے محروم رہیں گے وہ علم سے بھی محروم رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ سننے والوں کا علم بھی بہت محدود ہوتا ہے، آپ دیکھئے کہ کافر صحیح معنی میں سننے سے محروم ہے، اس لیے اس کا علم بھی بہت محدود ہوتا ہے، اس کی فکر ونظر بھی نہایت محدود ہوتی ہے، حیات دنیوی کے دائرہ سے آگے جاتی ہی نہیں، جب کہ مومن کی فکر ونظر دوررس ہوتی ہے؛ کیوں کہ سننا اس کی شان اور پہچان ہے، پھر کانوں کا امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ وہ بعد میں آنے والے خطرات سے بھی سننے والے کو محفوظ رکھتے ہیں، اس لیے ایک مومن جس کی شان و پہچان ﴿سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا﴾ ہے وہ دنیا کے علاوہ پچھلا عالم جو اس دنیا کے بعد ہے وہاں کے خطرات سے بھی محفوظ رہتا ہے، اسی لیے قرآن کریم نے سننے والوں کو خوشخبری سنائی:

﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰهُمُ اللّٰهُ وَأُولٰٓئِكَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ (الزمر: ۱۷-۱۸)

"محبوبم! آپ بشارت دے دیجئے میرے ان بندوں کو جو (اگر سب کی باتیں) سنتے (بھی ہیں مگر مانتے ہیں حق اور رب ہی کی) ہیں پھر ان میں (بھی) بہتر سے بہتر باتوں کا اتباع کرتے ہیں، وہی ہیں ہدایت یافتہ اور وہی ہیں عقلمند۔"

صاحبو! یہاں قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو صحیح سننے کا ذوق رکھتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو خوش قسمت ہیں، احکامِ شریعت کو فہم وفراست اور عقیدت واطاعت کے جذبے سے سن کر عمل کرتے ہیں انہیں بشارت دیتے ہوئے سب سے پہلے تو اپنا بندہ فرمایا، دوسرے ان کی ہدایت کی شہادت دی، ظاہر ہے کہ ہدایت سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوسکتی ہے؟ اور تیسری بات عقل کے خالق ومالک نے یہ فرمائی کہ اصل میں عقلمند لوگ بھی یہی ہیں۔ الغرض یہ ساری بشارتیں احکامِ الٰہی کو سننے اور ماننے پر ملتی ہیں۔

یہ کوئی معمولی بشارتیں نہیں بلکہ بہت عظیم بشارتیں ہیں، گویا سننے اور ماننے والوں کو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کا تعلق نصیب ہوتا ہے؛ کیوں کہ کسی صاحب نظر کا قول مشہور ہے کہ ”مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ“ جس کا تعلق اس عظیم ہستی سے قائم ہوجاتا ہے جس کے زیر حکم چیونٹی سے لے کر جبرئیل علیہ السلام تک، مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب اور آسمان وزمین کی ساری مخلوق ہے، جب اس کے احکام کو سن کر اس کی اطاعت کی جاتی ہے تو اس کی طرف سے نقد انعام یہ بھی ملتا ہے کہ پھر کائنات کی ساری مخلوق اس کی سنتی اور مانتی ہے۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد از حکم تو ہیچ

تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی اور روگردانی نہ کر، کہ کائنات کی کوئی چیز پھر تیرے حکم سے منہ نہ موڑے۔

ایک عبرتناک واقعہ:

اس سلسلہ میں حیاۃ الصحابہ والصلحاء میں بہت سے عبرت ناک واقعات ملتے ہیں، مثلاً تاریخ میں حضرت عقبہ بن نافع رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ملتا ہے جو صحابی تو نہ تھے، لیکن تابعی ضرور تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد حکومت میں انہیں شمالی افریقہ کے

باقی ماندہ حصے کی فتح کی مہم سونپ دی تھی، یہ اپنے دس ہزار ساتھیوں کے ساتھ مصر سے نکل کر دادِ شجاعت دیتے ہوئے تونس تک پہنچ گئے، اور یہاں قیروان کا مشہور شہر بسایا، جس کا واقعہ یہ ہے کہ جس جگہ آج قیروان آباد ہے وہاں بہت گھنا جنگل تھا، جو درندوں سے بھرا ہوا تھا، حضرت عقبہ بن نافعؒ نے بربریوں کے شہر میں رہنے کے بجائے مسلمانوں کے لیے الگ شہر بسانے کے لیے یہ جگہ منتخب کی، تاکہ یہاں مسلمان مکمل اعتماد کے ساتھ اپنی قوت بڑھا سکیں، آپؒ نے لشکر اسلام میں موجود اٹھارہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع فرما کر دعا کی اور اس کے بعد یہ آواز لگائی:

"أَيَّتُهَا السِّبَاعُ وَالْحَشَرَاتُ! نَحْنُ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، اِرْحَلُوْا عَنَّا، فَإِنَّا نَازِلُوْنَ، فَمَنْ وَجَدْنَاهُ بَعْدُ قَتَلْنَاهُ".

"اے درندو اور کیڑو! ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب ہیں، ہم یہاں ایک شہر بسانا چاہتے ہیں، لہٰذا تم یہاں سے کوچ کر جاؤ، اس کے بعد تم میں سے جو کوئی یہاں نظر آئے گا ہم اسے قتل کر دیں گے۔" امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ "فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا شَيْءٌ إِلَّا خَرَجَ هَارِبًا". ان جانوروں میں سے کوئی نہیں بچا جو بھاگ نہ گیا ہو، یہاں تک کہ درندے بھی اپنے بچوں کو اٹھائے لے جا رہے تھے۔ مشہور مؤرخ اور جغرافیہ دان علامہ زکریا بن محمد قزوینیؒ لکھتے ہیں کہ اس حیرت انگیز نظارہ کو دیکھ کر بربری لوگ مسلمان ہو گئے، اس کے بعد حضرت عقبہ بن نافع رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس جنگل کو کاٹ کر شہر "قیروان" آباد کیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳/۵۳۳، الکامل لابن الاثیر: ۳/۱۸۴، تاریخ الطبری: ۴/۱۷۸، آثار البلاد للقزوینی/ص: ۲۴۲، القیروان از: جہانِ دیدہ/ص ۱۰۶)

اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور شریعت مطہرہ کی باتیں صحیح معنی میں سنیں تو ان کی بھی سنی گئی، آج جب ہم سنیں گے ہی نہیں تو ہماری کیسے سنی جائے گی، اس لیے عقیدت و اطاعت کے جذبہ سے احکام شریعت کو سننا چاہیے، پھر اس کی اطاعت کرنی چاہیے، تب ہی ہم اللہ تعالیٰ کی

نصرت اور بشارت کے حق دار بن سکتے ہیں، اس کے لیے ایک دعا کا اہتمام بھی مفید ثابت ہوگا: " اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهٗ". (کنز العمال حدیث نمبر: ۲٦۹۹۱) ''اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے بنا دیجئے جو سنی ہوئی باتوں میں سے اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔

خلاصہ :

یہ ہے کہ احکام الٰہی کو گوشِ ہوش سے سن کر ان کے مطابق عمل کرنا مومن کی شان اور پہچان ہے، اس کے برخلاف جو لوگ احکام الٰہی کو سننے اور ماننے کے بجائے ان سے سرکشی اور روگردانی کا معاملہ کرتے ہیں ان کے لیے بڑی سخت وعیدیں ہیں۔

حق تعالیٰ ہم سب کی اور پوری امت کی حفاظت فرمائیں اور صحیح سننے اور احکام شریعت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

۱۸/ ذوالقعدہ/۱۴۳۳ھ

مطابق: ۱۷/ اکتوبر ۲۰۱۲ء/ قبل الجمعۃ (بزم صدیقی)

" اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ"

☆......☆......☆
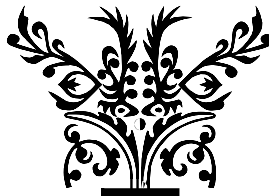
(۴)

نیت کی اہمیت اور اس کے نتائج

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عُمَرَ بۡنِ الۡخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ”إِنَّمَا الۡأَعۡمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِاِمۡرِئٍ مَّا نَوٰی، فَمَنۡ كَانَتۡ هِجۡرَتُهٗ إِلَی اللّٰہِ وَرَسُوۡلِهٖ فَهِجۡرَتُهٗ إِلَی اللّٰہِ وَرَسُوۡلِهٖ، وَمَنۡ كَانَتۡ هِجۡرَتُهٗ إِلٰی دُنۡيَا يُصِيۡبُهَا، أَوِ امۡرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا، فَهِجۡرَتُهٗ إِلٰی مَا هَاجَرَ إِلَيۡهِ“. (متفق علیه، مشکوۃ/ص:۱۱)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ کا فرمان ہے کہ ”تمام ہی اعمال (مقصودہ واصلیہ) کا دار و مدار (باعتبارِ ثواب عند الاحناف و باعتبارِ صحت عند الشوافع) نیتوں پر ہے، اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق نتیجہ (اور پھل) ملتا ہے، اب جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کی (مطلب یہ ہے کہ ان کی رضا جوئی اور خوشنودی کے علاوہ اور کوئی غرض نہ تھی) تو اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی کی طرف ہوئی، (اس سچے مہاجر کو اس کا اجر ضرور ملے گا) لیکن اگر کسی شخص نے (ہجرت جیسے دینی عمل کو) کسی دنیوی غرض کے لیے (مثلاً) کسی عورت سے نکاح کرنے کے خاطر ہجرت والا عمل کیا، (تو ظاہر ہے اس کی یہ ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ) کے لیے نہیں ہوئی، لہٰذا اس نے) جس (دوسری) غرض سے ہجرت کی، عند اللہ

اس کی ہجرت اسی کے لیے مانی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ ظاہری عمل کے ساتھ باطنی نیت کو دیکھ کر فیصلہ فرماتے ہیں:

اللہ رب العزت نے اس دنیا کو ہمارے لیے ''عالم ظاہر'' بنایا ہے، اسی لیے ہمارے حواس اور سمجھ بوجھ کا دائرہ بھی یہاں صرف ظاہر اور مظاہر ہی تک محدود ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں ہم ہر شخص کا صرف ظاہری حال چال دیکھ کر ہی اس کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کر سکتے ہیں، جس میں خطا کا امکان بھی ہوتا ہے، سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ''نَحْنُ نَحْكُمُ بِالظَّاهِرِ وَاللّٰهُ يَتَوَلَّى السَّرَائِرَ'' (معارف الحدیث: ۱/ ۵۵) یعنی ہم اسی کے مکلّف ہیں کہ ظاہر کے مطابق فیصلہ کریں؛ کیوں کہ دلوں کا مخفی حال (اور مآل) تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، ہم لوگوں کے ظاہری احوال واعمال کو تو دیکھ سکتے ہیں، مگر ان کی نیتوں اور دل کے ارادوں کو نہیں دیکھ سکتے اور نہیں جان سکتے، دل کے بھیدوں اور سینے کے رازوں کو معلوم کرنے سے آج دورِ حاضر میں آلاتِ جدیدہ کے وجود میں آنے کے باوجود بھی ہم یقیناً قاصر ہیں، یہ صفت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، وہی عالم الغیب والشہادۃ اور علیم بذات الصدور ہے، فرمایا:

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ﴾ (المؤمن: ۱۹)

وہ لوگوں کے ظاہری احوال واعمال کے ساتھ ان کی باطنی کیفیات اور دلوں کی نیتوں کو بھی خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ پھر حدیث میں ہے کہ اسی کے مطابق وہ فیصلہ کرتا ہے، اس کے یہاں انسان کے ظاہری عمل کے ساتھ ساتھ باطنی نیتوں اور دل کے ارادوں کو بھی دیکھا جاتا ہے، اور اسی کے مطابق اس عمل کی مقبولیت یا مردودیت کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اس لیے کہتے ہیں کہ ''نیت کتنی ہی اچھی ہو، دنیا تو ہمیں اپنے دکھلاوے سے جانتی ہے، لیکن دکھلاوا بظاہر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ تو ہمیں اپنی نیتوں ہی سے جانتا ہے۔''

نیت عمل کی روح ہے:

اس مضمون کو حدیث مذکور میں اس طرح بیان فرمایا کہ ”إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“ یہ فرمان نہایت جامع اور عظیم الشان ہے، اس میں ہمارے آقا ﷺ کا اصل منشا امت پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ حسن نیت ہے تو نہایت آسان عمل جس میں نہ کوئی خاص محنت کرنی پڑتی ہے نہ مال و وقت خرچ ہوتا ہے، مگر اس نیت کی اہمیت اس قدر ہے کہ اس کا نمبر عمل سے بھی پہلے ہے، بلکہ یہ تمام ہی مباح اور جائز امور و اعمال کی روح ہے، اور ان کے صلاح وفساد، مقبولیت و مردودیت اور اجر و وزر کا انحصار اور دار و مدار بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسی پر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے اعمال ایسے ہیں جو اخلاصِ نیت کے بغیر بے کار اور عبث ہیں، یعنی جس عمل میں اخلاص نہیں وہ عادت ہے، عبادت نہیں؛ کیوں کہ حسن نیت عبادت کو عادت سے جدا کر دیتی ہے، یا عادت کو عبادت بنا دیتی ہے، مثلاً ایک شخص بغیر نیت کے صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک بھوکا، پیاسا اور بیوی سے دور رہنے کا عادی ہے، تو اس کے لیے کوئی اجر و ثواب نہیں، لیکن اگر یہی شخص روزہ کی نیت کر لے، تو اب اس کی یہ عادت عبادت بن جائے گی اور یہ شخص اجر و ثواب کا حقدار ہوگا، تو جس طرح روح کے بغیر جسم کی کوئی حیثیت نہیں اسی طرح اخلاصِ نیت کے بغیر (شرعی اعتبار سے) اعمال کی کوئی حیثیت نہیں۔

نیت پر اجر کا واقعہ:

اس کے برخلاف یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کو عمل کیے بغیر محض اخلاصِ نیت اور سچی طلب پر اجر و ثواب عطا کیا جائے، اسی لیے کہتے ہیں کہ دو چیزیں بڑی عجیب ہیں: (۱) نیت۔ (۲) توبہ۔ ان میں توبہ موجود (گناہ) کو معدوم بنا دیتی ہے، اور نیت معدوم (عمل) کو موجود بنا دیتی ہے۔ (مخزنِ اخلاق/ص:۱۴۸)

چناں چہ غزوۂ تبوک کے موقع پر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم معذور ہونے کی وجہ سے شرکت نہ فرما سکے، ان میں کچھ تو ایسے تھے جو جسمانی اعتبار سے تو معذور نہ تھے، بلکہ جہاد میں شرکت کے لیے تیار اور بے قرار تھے، مگر ان کے پاس سفر کے لیے سواری کا انتظام نہ تھا، وہ سفر طویل اور موسم سخت گرمی کا تھا، اس لیے انہوں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور! ہم آپ کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے اپنے دل سے پوری طرح تیار ہیں، لیکن سواری نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ہیں، لہٰذا آپ ہمیں سواری عنایت فرمائیں، ان طالبین صادقین اور مخلصین کا تذکرہ قرآنِ کریم نے کیا ہے:

﴿وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ﴾ "اور نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) جن کا حال یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس اس غرض سے آئے کہ تم انہیں کوئی سواری مہیا کر دو۔" ان کی صداقت کی دلیل یہ آیت ہے، جب انہوں نے اخلاصِ نیت اور سچی طلب کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سواری کا مطالبہ کیا، ﴿قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ﴾ "تم نے کہا: "میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر میں تمہیں سوار کر سکوں"، یعنی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں بھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہارے لیے سواری کا انتظام کر سکوں۔" "تَوَلَّوْا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ﴾ (التوبة: ۹۲) "تو وہ اس حالت میں واپس گئے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی تھیں کہ ان کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں۔" روایات میں ہے کہ یہ سات انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم تھے: حضرت سالم بن عمیر، حضرت عُلبہ بن زید، حضرت عبدالرحمٰن بن کعب، حضرت عمرو بن الحمام، حضرت عبداللہ بن مغفل، حضرت ہرمی بن عبداللہ اور حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہم۔ (روح المعانی، از: آسان ترجمۂ قرآن: ۱/۶۰۰)

غرض اس موقع پر وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو معذوری یا سواری نہ ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہو سکے تھے، اپنی غربت پر حسرت کرتے ہوئے رونے لگے کہ ہم میں اتنی

استطاعت کیوں نہ ہوئی کہ ہم بھی محبوبِ حقیقی کی راہ میں قربان ہونے کے لیے خود کو پیش کر سکتے، ان کی اس طلب اور حسن نیت کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور محض اخلاصِ نیت اور سچی طلب کی وجہ سے جہاد میں شرکت کے بغیر اس کا مکمل اجر وثواب عطا فرمادیا، حدیث صحیح میں ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مخلصین کے متعلق غزوۂ تبوک سے واپسی پر مجاہدین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں کہ تم جہاد فی سبیل اللہ کی وجہ سے جتنا ثواب حاصل کرو گے، وہ اس ثواب میں تمہارے ساتھ برابر شریک ہیں۔'' (نیت کی وجہ سے) (رواہ البخاری عن جابر رضی اللّٰہ عنہ) ان مخلصین نے غزوۂ تبوک اور جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت تو نہیں کی، مگر نیت تھی، اور اللہ رب العزت کے یہاں جزا وسزا کا فیصلہ نیت کے مطابق ہوتا ہے فرمایا: ''إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' لہٰذا انہیں اخلاصِ نیت اور طلب صادق کی وجہ سے مکمل اجر عطا کر دیا گیا، دانائے رومؒ فرماتے ہیں:

سید ''الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'' گفت
نیتِ خیرت بسے گلہا شگفت

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال (کا اجر) نیتوں سے ہے، تو ظاہر ہے کہ تمہاری اچھی نیت بہت سے پھول کھلا سکتی ہے، (اگر عمل سے قبل حسن نیت کا اہتمام کیا جائے)۔

جیسی نیت ویسی برکت:

اس عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ ''اچھی نیت کانٹوں کو پھول بنا دیتی ہے، اور بری نیت پھولوں کو کانٹے، مٹی کو سونا اور سونے کو مٹی، پتھر کو ہیرا اور ہیرے کو پتھر بنا دیتی ہے۔'' آگے حدیث میں اسی کو فرمایا: ''وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰى'' اس جملہ کو بعض نے اس طرح بھی روایت کیا کہ ''وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى'' بہرحال الفاظ جس طرح بھی ہوں، نفس مفہوم پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ دوسرا جملہ پہلے کی تاکید اور تشریح بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ اکثر

محدثین نے فرمایا، یا پھر مستقل ایک مضمون بھی ہوسکتا ہے، اگر اس کو پہلے جملہ کی تاکید مانتے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ جیسی نیت ویسی برکت، اچھی نیت کا نتیجہ اور ثمرہ اچھا اور بری کا برا ہے، دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نیت ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہے جو مٹی کو سونا اور سونے کو مٹی بنا دیتا ہے، جو دنیا کو دین اور دین کو دنیا بنا دیتا ہے، معمولی عمل کو قیمتی اور بڑے سے بڑے عمل کو بے قیمت بنا دیتا ہے، اسی کو حدیث پاک میں آگے مثال دے کر سمجھایا کہ "فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ......الخ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ العیاذ باللہ العظیم! اگر دین کا کوئی چھوٹا بڑا عمل دنیا کی نیت سے کیا، تو وہ دنیا بن جاتا ہے، لیکن اگر دنیا کا کوئی (مباح) کام (شرعی حدود میں رہتے ہوئے) کیا جائے، جیسے بیوی سے محبت اور صحبت کرنا وغیرہ، تو وہ دنیا کا کام بھی دین بن جاتا ہے، اسی طرح مثلاً ہجرت ہی کو لے لیجئے کہ یہ دین کا نہایت ہی بابرکت اور عظیم الشان فضیلت والا عمل ہے، مگر نیت کی برائی سے یہ عمل خالص دنیوی عمل کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور اجر وثواب سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں رہتا، یا مثلاً درس وتدریس، تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ دینی اعمال ایسے ہیں کہ اگر وہ نفع آخرت، دنیا میں دین کی اشاعت اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے خاطر کیے جائیں تو ان کے فضائل کا کیا کہنا؟ سبحان اللہ! نورٌ علی نور، آخرت میں نامۂ اعمال اجر وثواب سے پُر ہوگا، لیکن اگر العیاذ باللہ العظیم ان دینی اعمال سے دنیا کا نفع، اپنی شہرت اور ناموری مطلوب ہے تو یہاں دنیا میں تو من کی مرادیں پوری ہو جائیں گی، لیکن آخرت میں کوئی اجر نہیں ملے گا، قرآنِ کریم میں اس کا اشارہ ملتا ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَدْحُوْرًا ط وَمَنْ أَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُوْرًا﴾ (بنی إسرائیل: ۱۸-۱۹)

جو بندہ دنیوی منافع کا طلبگار ہے، اپنے اعمال کے ذریعہ دنیا ہی کا نفع چاہتا ہے، اپنی عبادتوں اور خدمتوں کا صلہ دنیا ہی میں چاہتا ہے، تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اسے دنیا

میں جتنا چاہیں گے دے دیں گے، (مگر اسی کے ساتھ یہ بھی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل کو فقر سے بھر دیں گے، جس کا اثر یہ ہوگا کہ اس کی دنیوی حاجتیں اور چاہتیں ختم نہ ہوں گی، پھر) اس کے لیے آخرت میں دوزخ ہے، اس کے برخلاف جو بندہ آخرت کا امیدوار ہے اور اپنے اعمال سے اجر آخرت کا ارادہ کرتا ہے، (گویا دنیا کے گوبر کے بجائے آخرت کے دودھ کا ارادہ کرتا ہے، تو بمقدارِ مقدر دنیا تو اسے بھی ملے گی، مگر غنائے قلب کے ساتھ، جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں ہے ص: ۴۵۴) پھر اس کے لیے اپنی مرضی سے نہیں، بلکہ جیسی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی ہے ایسی ہی کوشش کرتا ہے، اور وہ مومن بھی ہے، تو اس کی محنت اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قدر اور اعمال مقبول ہوں گے۔ ان آیاتِ مبارکہ سے جو مفہوم واضح ہوتا ہے وہ وہی ہے جس کو حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا گیا کہ ''عمل کرنے والے کو بھلائی اور برائی میں سے وہی ملتا ہے جس کی وہ نیت کرے، جیسی نیت ویسا نتیجہ، اچھی نیت پر اجر وثواب تو بری نیت پر وزر وعذاب۔ اس مضمون کو رحمت عالم ﷺ نے ایک اور موقع پر اس طرح بیان فرمایا کہ ''دنیا اپنی بھلائی اور برائی کے اعتبار سے چار طرح کے آدمیوں کے لیے ہے، ان میں سے دو کا تعلق علماء سے اور دو کا عوام سے ہے، اب جن دو کا تعلق علماء سے ہے ان میں:

(۱) ایک تو وہ آدمی ''رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالاً وعِلْمًا''، جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی عطا فرمایا اور (وہ) علم (نافع جو ہدایت کا حامل، نجات کا ضامن اور اخروی اعتبار سے بھی مفید ہے) بھی عطا فرمایا، جس کی وجہ سے وہ مالدار عالم دین اپنا مال مصارفِ خیر میں خلوصِ نیت کے ساتھ خرچ کرتا رہتا ہے، تو اس شخص کا اللہ رب العزت کے یہاں بڑا مقام ہے۔ اللّٰهم اجعلنا منهم.

(۲) دوسرا وہ آدمی ''رَزَقَهُ اللّٰهُ عِلْمًا، وَلَمْ يَرْزُقْهُ مَالاً، فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ'' جس کو اللہ رب العزت نے دولت علم سے تو نوازا، مگر مال نہیں دیا، جب یہ غریب عالم دین

اس مالدار عالم دین کو مصارفِ خیر میں خرچ کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا دلی جذبہ یہ ہوتا ہے کہ کاش! میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی اسے مصارفِ خیر میں لگاتا، چوں کہ یہ بندہ اپنی نیت میں اچھا اور سچا ہے، اس لیے اس کے متعلق حدیث میں ہے: ”فَأَجْرُهُمَا سَوَاءٌ“ اجروثواب کے اعتبار سے وہ مالدار عالم اور یہ غریب عالم دونوں برابر ہیں۔

اور جن دو طرح کے لوگوں کا تعلق عوام سے ہے ان میں:

(۳) تیسرا وہ آدمی ”رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالاً، وَلَمْ يَرْزُقْهُ عِلْمًا“، جس کو اللہ تعالیٰ نے مال تو دیا، مگر وہ (اس) علم سے (جو مقصود و مطلوب ہے اور جس پر قرآن وحدیث میں فضائل آئے ہیں، اس سے) محروم اور جاہل ہے، جس کے نتیجہ میں وہ مال نہ صحیح طرح کماتا ہے، نہ صحیح مصارف میں لگاتا ہے، بلکہ عیش پرستی اور خواہشاتِ نفسانی میں اپنا مال ضائع کرتا ہے، یہ (اہل دنیا کے نزدیک کتنا ہی اچھا اور بڑا کیوں نہ بن جائے، مگر) اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بدترین ہے۔

(۴) چوتھا وہ آدمی ”لَمْ يَرْزُقْهُ مَالاً وعِلْمًا“، جس کو نہ مال دیا نہ علم، وہ جاہل اور نادان تو ہے ہی، غریب اور نادار بھی ہے، مگر یہ بے وقوف جب دنیا کے مالدار عیش پرستوں کو رنگ ریلیاں مناتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی بھی نیت اور خواہش یہی ہوتی ہے کہ کاش! میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں خوب عیش کرتا، حدیث میں ہے: ”وِزْرُهُمَا سَوَاءٌ“ وہ جاہل عیش پرست مالدار اور یہ غریب جاہل دونوں وزر اور گناہ میں برابر ہیں۔ (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۴۵۱/ باب استحباب المال/ عن أبی کبشۃ الأنصاری رضی اللہ عنہ)

اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ جس کی جیسی نیت ویسا اس کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے، ”وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰى“.

کسی نیک کام میں جتنی نیتیں کرے ان کا مستقل اجر ملے گا:

لیکن یہ مطلب اس وقت ہوگا جب کہ اس دوسرے جملہ کو پہلے جملہ ”إِنَّمَا الْأَعْمَالُ

بِالنِّیَّاتِ“ کی تاکید اور تشریح مانتے ہیں، اور اگر اسے مستقل دوسرا مضمون مانیں اور یہی بہتر بھی ہے، تو اب مطلب یہ ہوگا کہ آدمی کسی نیک کام میں جتنی نیتیں کرے اللہ تعالیٰ سب ہی کا اجر وثواب عطا فرماتے ہیں، مثلاً ایک شخص تو وہ ہے جو مسجد میں صرف نماز کی نیت سے جاتا ہے، تو اس کو اسی کا ثواب ملے گا، لیکن دوسرا شخص وہ ہے جو مسجد میں جانے کی نیت تو کرتا ہی ہے، مگر اسی کے ساتھ اعتکاف کی، نماز سے قبل انتظارِ نماز میں بیٹھنے کی، ذکراللہ وتلاوتِ کلام اللہ کی، ذکر وفکر کی، مراقبہ ومحاسبہ کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی، تحصیل علم کی، تعلیم وتذکیر کی، معاصی سے حفاظت کی، مسلمان بھائیوں سے ملاقات اور ان کی خیر خبر کی، پھر راستہ میں بھولے بھٹکوں کو راستہ بتلانے کی، اسی طرح راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹانے کی اور اس طرح کی اور بھی متعدد نیتیں ایک ہی عمل میں جمع کر لیتا ہے؛ کیوں کہ علماءِ محققین کے اقوال کے مطابق صرف گھر سے مسجد آنے تک ۱۵۹ نیتیں ہوسکتی ہیں، اب ان میں سے جتنی نیتیں کیں، پھر نیت کے بعد ذرا ہمت سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال ہو کر توفیق عمل بھی ہوجاتی ہے، اسی لیے آیت کریمہ: ﴿إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾ (النساء :۳۵) کی تفسیر میں بعض مفسرین نے یہی فرمایا کہ نیت سبب توفیق ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے جن اعمال کا ارادہ کیا ان کی ادائیگی کا موقع نہیں مل سکا، تو ان شاء اللہ سچی اور اچھی نیت کی وجہ سے ان تمام اعمال کا جن کی نیتیں کی ہے اجر وثواب ملے گا، اسی کو فرمایا: ”وَإِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰی“ یا مثلاً مسجد میں جا کر دو رکعات نفل نماز میں تحیۃ الوضوء، تحیۃ المسجد، صلاۃ التوبہ اور صلاۃ الحاجہ وغیرہ کی نیتیں کیں، تو ان سب نمازوں کا مستقل ثواب اسے ملے گا، اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں، بقولِ شخصے:

تو وہ داتا ہے کہ دینے کے لیے
در تری رحمت کے ہر دم ہیں کھلے

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم نیک اور مباح عمل سے قبل اچھی نیتوں کا اہتمام کریں تو ہمارے نامۂ اعمال میں اجر وثواب کے ڈھیر لگ جائیں، اس لیے کہ اگر گناہِ بےلذت ہو

سکتا ہے تو اصلاحِ نیت اور اہتمامِ حسن نیت کے بعد نیکی بھی بے محنت ہوسکتی ہے، کہ محنت کچھ نہ کرنا پڑے اور مفت میں اجر وثواب ملے، اور یہ کام ایک سچے پکے مومن ہی کا ہوسکتا ہے، اسی لیے فرمایا: "نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ". (حديث نمبر: ۱٤۱ مسند شهاب/باب نية المؤمن، عن نواس بن سمعان، والبيهقی فی شعب الإيمان/ باب إخلاص العمل لله عزوجل وترك الرياء/حديث نمبر: ٦٤٤٤)

مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

نیتِ مومن بُود بہ از عمل ☆ ایں چنیں فرمود سلطانِ دُوَل

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مومن کی نیت تو عمل سے بھی بہتر ہوتی ہے۔" کیوں کہ عمل میں تو کچھ بھی ریا کا احتمال رہتا ہے، جب کہ نیت کا تعلق دل سے ہے، جس میں ریا کا احتمال نہیں ہوتا۔ نیز عمل میں تو مشقت اور محنت بھی ہوتی ہے، مگر نیت میں کوئی خاص محنت اور مشقت بھی نہیں، بس نیکی کا خیال آتے ہی اگر سچی نیت کر لی تو محض صدق نیت پر اللہ رب العزت کے یہاں اس کا اجر وثواب متعین ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اللہ رب العزت کے یہاں مومن کے عمل کے علاوہ اس کی نیت کی بھی بڑی قدر ہے۔

نیت پر اجر کا واقعہ:

چناں چہ ملا علی قاریؒ نے اسی حدیث شریف کے تحت شرحِ مشکوٰۃ میں ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں قحط سالی کے دور میں ایک غریب آدمی ریت کے ایک ٹیلے کے پاس سے گزرا، ٹیلے کو دیکھ کر دل میں نیکی کا یہ خیال آیا کہ کاش! ریت کا یہ ٹیلہ میرے لیے اناج اور غلہ کا ڈھیر بن جائے، تو میں وہ سارا کا سارا اللہ تعالیٰ کے محتاج بندوں کے درمیان تقسیم کر دوں، روایت میں ہے کہ اس کی سچی نیت اللہ تعالیٰ کو پسند آ گئی، فوراً وقت کے نبی علیہ السلام کے پاس وحی نازل فرمائی کہ "آپ اس مخلص کو یہ خوش خبری سنا دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری نیت کو قبول فرما لیا اور تمہیں اتنا ہی اجر وثواب عطا کر دیا جتنا ریت کے اس ٹیلے کے

برابر غلہ صدقہ کرنے پر ملتا ہے۔‘‘ (مرقاۃ:۱/۴۴)

الغرض شریعت میں نیت کا معاملہ نہایت اہم ہے، اسی پر اچھے برے نتائج مرتب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک مومن اچھی نیت ہی کی وجہ سے ہمیشہ جنت میں اور کافر بری نیت کی وجہ سے ہمیشہ جہنم میں رہے گا، لہٰذا تصحیح نیت کا بہت زیادہ اہتمام ہونا چاہیے۔ بلکہ حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحبؒ فرماتے تھے کہ ’’تصوف کی حقیقت تصحیح نیت کے سوا اور کچھ نہیں۔‘‘ جس کی ابتداء ’’إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ‘‘ سے ہوتی ہے، اور انتہاء ’’أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ‘‘ ہے۔

بس عمل سے قبل ذرا توجہ سے کام لیں تو تصحیح نیت اور ہمت سے عمل کرنے کے بعد ان شاء اللہ دنیا کا مباح کام بھی دین بن جائے گا، اور چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی بہت بڑا اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ خلوص اور تصحیح نیت کی دولت سے مالا مال فرما کر ہمیں اور ہمارے اعمال کو مقبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

’’اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ‘‘

☆......☆......☆
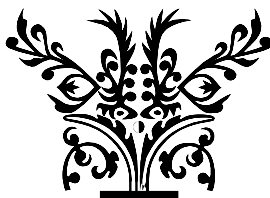
(۵)

نماز کے فضائل وخصائص قرآن وحدیث کی روشنی میں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلّٰى يُنَاجِيْ رَبَّهُ". (بخاری: ۱/ ۸۹)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہ تم میں سے جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے''۔

نماز کی اہمیت قرآنِ کریم کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ کے حضور قلب وقالب اور قول وعمل سے رحمت عالم ﷺ کے بتلائے ہوئے ایک خاص طریقے پر اپنی بندگی کا اظہار اور اس کی بے انتہاء عظمت کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی کے مظاہرہ کا نام نماز ہے، بلاشبہ یہ نماز اپنی عظمت شان اور فضائل وخصائص کے لحاظ سے تمام ہی دینی (بدنی) اعمال وعبادات میں خصوصی مقام اور خاص امتیاز رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں ایمان کے بعد جس قدر تاکید نماز کی آئی ہے، اور جتنے

اہتمام سے اس کے فضائل وخصائص اوراجروثواب کا ذکر آیا ہے کسی اورفرض وامر کا اس درجہ کثرت واہمیت کے ساتھ ذکر نہیں ملتا۔علماءِ محققین نے فرمایا کہ ''قرآنِ کریم میں ایک سو نو (۱۰۹) مقامات ایسے ہیں، جہاں صراحت کے ساتھ نماز کا ذکر آیا ہے، اوراشارۃً وکنایۃً جن مقامات میں نماز کا ذکر ہے وہ تقریباً سات سو (۷۰۰) ہیں''۔(ندائے منبرومحراب:۴/۱۶۲)

اوراحکامِ نماز کے متعلق جتنی تفصیلات قرآنِ کریم میں ہیں کسی دوسری عبادت کے متعلق اتنے تفصیلی احکام نہیں ہیں، دیکھئے،لباس کی طہارت کا حکم قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ (المدثر: ٤) ''اوراپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔''

وضو،غسل اور تیمّم کا حکم قرآنِ کریم میں ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلوٰةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ إِلىٰ الْمَرَافِقِ﴾ (المائدة :٦)

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک ہاتھ دھولو۔''

مسجد میں نماز پڑھنے اوراسے آباد کرنے کا حکم قرآنِ کریم میں ہے:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ وَ يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ (النور : ٣٦)

''جن گھروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔''

اور:

﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الآخِرِ﴾(التوبة : ١٧)

''اللہ کی مسجدوں کو تو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور پچھلے دِن پر ایمان رکھتے ہیں۔''

اوقاتِ نماز کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے:

﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِيْ السَّمٰوٰتِ

وَ الْأَرْضِ وَ عَشِيًّا وَ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾ (الروم: ۱۷-۱۸)

''لہٰذا اللہ ہی کی تسبیح کرو اس وقت بھی جب تم شام کرتے ہو اور اس وقت بھی جب تم صبح کرتے ہو، اور اسی کی خوبی ہے آسمانوں اور زمین میں اور پچھلے وقت اور جب تم دوپہر کرو۔'' آیت کریمہ میں ''حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ'' سے فجر اور ''حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ'' سے ظہر کا وقت مراد ہونا تو ظاہر ہے، ''عشی'' دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، بظاہر اس سے عصر مراد ہوگی، اور ''حِيْنَ تُمْسُوْنَ'' میں مغرب وعشاء دونوں شامل ہیں۔ (معالم، از قاموس الفقہ: ۲۳۳/۴)

نماز سے قبل اذان دی جاتی ہے، اس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے:

﴿وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ﴾ (المائدة: ۵۸)

''اور جب تم نماز کے لیے (لوگوں کو) پکارتے ہو۔''

نماز میں استقبالِ قبلہ شرط ہے، اس کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں ہے:

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ (البقرة: ۱۴۴)

''اور جہاں کہیں تم ہو اپنے چہروں کا رُخ (نماز پڑھتے ہوئے) اسی کی طرف رکھا کرو۔''

نماز کے قیام، رکوع، سجدہ اور تکبیر وتحمید کا ذکر مختلف مقامات پر قرآنِ کریم میں موجود ہے:

﴿وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ (الحج: ۲۶)

''اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اس گھر کی جگہ ٹھیک کردی اور (یہ ہدایت دی کہ) میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور میرے گھر کو ان لوگوں کے لیے پاک رکھنا جو (یہاں) طواف کریں اور عبادت کے لیے کھڑے ہوں اور رکوع سجدے بجالائیں۔''

نمازِ جمعہ کا ذکر قرآن میں ہے:

﴿إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ (الجمعة : ۹)

''جب تمہیں نماز کے لیے پکارا جائے۔''

نمازِ سفر کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے:

﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾(النساء: ۱۰۱)

''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کرلیا کرو۔''

نمازِ پنج وقتہ کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (النساء : ۱۰۳)

''بلاشبہ نماز مسلمانوں کے ذمہ ایسا فریضہ ہے جو وقت کی پابندی کے ساتھ لازم ہے۔''

نمازِ تہجد کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ (بنی إسرائیل:۷۹)

''اور رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھا کرو۔''

حتیٰ کہ نمازِ خوف کا ذکر بھی قرآنِ کریم میں ہے:

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾ (البقرة : ۲۳۹)

''اور اگر تمہیں دشمن کا خوف لاحق ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار ہونے کی حالت میں (نماز پڑھ لو)۔''

قرآنِ کریم میں نماز کا اتنی کثرت اور تفصیل سے ذکر آنا اس کی عظمت و اہمیت کی واضح دلیل ہے۔

نماز کی اہمیت حدیث شریف کی روشنی میں:

علاوہ ازیں احادیث طیبہ میں تو اتنی کثرت سے نماز کا ذکر آیا ہے کہ اس کا شمار بھی

مشکل ہے، غرض اس کی عظمت و اہمیت ہی کے پیش نظر ایک مشہور حدیث میں تو اسلام کے ارکانِ اربعہ میں سب سے اوّل درجہ ہی نماز کا ذکر فرمایا:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَ إِقَامِ الصَّلٰوةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ". (صحيحين، مشكوٰة/ص:۱۲/كتاب الإيمان)

یہاں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ استعارہ اسلام کو ایک ایسی عمارت سے تشبیہ دی جو چند ستونوں پر قائم ہے، فرمایا کہ اسلامی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے ان میں بنیادی چیز کا تعلق عقیدۂ توحید و رسالت سے ہے، یعنی یہ کہ اللہ رب العزت اپنی ذات اور (مخصوص) صفات میں یکتا و تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور حضرت محمد ﷺ اس کے سچے اور آخری رسول ہیں، اس کے بعد جن چار ارکان اور امور کا تذکرہ کیا ہے ان میں سب سے پہلے نماز، پھر زکوٰۃ، اس کے بعد حج اور صومِ رمضان کا بیان ہے۔ (اسلام کے فرائض تو اور بھی ہیں، لیکن اس کے ارکان یہی چار امور ہیں) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ توحید و رسالت (یعنی ایمان) کے بعد سب سے اوّل و افضل عمل (بدنی عبادات میں) نماز ہے، اس کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "سَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ:" أَيُّ الْأَعْمَالِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ؟" قَالَ:"الصَّلٰوةُ لِوَقْتِهَا،" قُلْتُ:"ثُمَّ أَيٌّ؟" قَالَ:"بِرُّ الْوَالِدَيْنِ،" قُلْتُ: "ثُمَّ أَيٌّ؟" قَالَ:"اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ......الخ" (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ۵۸/كتاب الصلوٰة)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے دریافت کیا کہ "دینی اعمال میں سب سے افضل عمل کونسا ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہو؟" فرمایا: ٹھیک (مستحب) وقت پر نماز پڑھنا، میں نے کہا: "پھر؟" فرمایا: "والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا" میں نے عرض کیا: "پھر؟" فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے راستہ

میں جہاد کرنا۔‘‘

حضرت سفیان بن عیینہؒ کا مقولہ ہے کہ ’’جس نے نمازِ پنج وقتہ اور اس کے بعد اپنے والدین کے لیے دعا کا اہتمام کیا، اس نے آیت کریمہ: ﴿أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ﴾ (لقمان: ۱٤) پر عمل کرلیا، یعنی اپنے رب اور والدین کا شکرادا کردیا۔‘‘

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان کے بعد سب سے افضل عمل نماز ہے۔ (مرقاۃ) بلکہ اگر یہ کہہ دیا جائے تو بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ نماز ایمان ہے، چناں چہ خود حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں نماز کو ایمان فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ (البقرة: ۱٤۳)

’’رب العالمین تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔‘‘ یہاں ایمان سے مراد نماز ہے، اسی لیے امام بخاریؒ نے ایک باب قائم فرمایا، جس کا عنوان یہ ہے:

”بَابٌ: الصَّلٰوةُ مِنَ الإِيمَانِ، وَقَوْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ يَعْنِي ”صَلٰوتَكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ“. (بخاری: ۱/۱٤)

یعنی یہ باب ہے اس بیان میں کہ نماز ایمان میں سے ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ میں ایمان سے مراد وہ نماز ہے جو کعبۃ اللہ کے پاس بیت المقدس کی طرف پڑھی گئی۔ اس کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ ’’صحیح بخاری میں بروایت ابن عازب رضی اللہ عنہما اور ترمذی میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ تحویل قبلہ کے بعد حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ’’یا رسول اللہ! اللہ رب العزت نے آپ کو قبلۂ ابراہیمی کی طرف پھیر دیا، یعنی بیت اللہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دے دیا، تو ہمارے ان بھائیوں کا کیا حال ہوگا جو بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے، اور ان کا انتقال ہوگیا، ان کی نماز صحیح ہوئی کہ نہیں؟‘‘ اس سوال پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ جس

میں فرمایا کہ حق تعالیٰ تمہارے ایمان یعنی نماز کو جو بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھی گئی اس کو ضائع نہ کرے گا۔ (معارف القرآن: ۱/۳۲۲ بالاختصار والتغیر)

نماز ترک کرنا ایمان کے منافی اور کافرانہ عمل ہے:

غور کیجئے! جب نماز ایمان ہے تو بے نمازی ضرور بے ایمان ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ". (رواه مسلم، مشكوٰة/ص: ۵۸)

"بندے اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے ہی کا فاصلہ ہے۔"

دوسری روایت میں ہے:

عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلْعَهْدُ الَّذِيْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ تَرْكُ الصَّلٰوةِ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ." (رواه أحمد والترمذی، مشكوٰة: ۵۸)

"ہمارے اور اسلام قبول کرنے والوں کے درمیان نماز کا عہد و میثاق ہے، (یعنی ہر مسلمان سے ہم نماز کا وعدہ لیتے ہیں) پس جب کوئی نماز چھوڑ دے تو گویا اس نے اسلام کی راہ چھوڑ کر کافرانہ طریقہ اختیار کیا۔" اس قسم کی کئی روایتوں میں ترکِ صلوٰۃ کو ایمان کے منافی عمل بتایا گیا ہے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "نماز ایمان کی ایسی اہم نشانی اور اسلام کا ایسا خاص الخاص شعار ہے کہ اس کا (دیدہ ودانستہ اور عمداً) چھوڑنا بظاہر اس بات کی علامت ہے کہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے تعلق نہیں رہا، اور اس نے خود کو ملت اسلامیہ سے الگ کر لیا، خاص کر رسول اللہ ﷺ کے عہد سعادت میں چوں کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی شخص مومن اور مسلمان ہونے کے بعد تارکِ نماز بھی ہوسکتا ہے، اس لیے اُس دور میں کسی کا تارکِ نماز ہونا اس کے مسلمان

نہ ہونے کی عام نشانی تھی، اور اس عاجز کا خیال ہے کہ جلیل القدر تابعی حضرت عبداللہ بن شقیقؒ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں جو یہ فرمایا کہ:

"كَانَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَا يَرَوْنَ شَيْئًا مِنَ الْأَعْمَالِ تَرْكُهٗ كُفْرٌ غَيْرَ الصَّلٰوةِ." (مشکوٰۃ/ص:۵۹، رواہ الترمذی)

''اصحابِ رسول ﷺ نماز کے سوا کسی بھی عمل کے ترک کرنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔'' تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دین کے دوسرے ارکان واعمال مثلاً روزہ، حج، زکاۃ، جہاد اور اسی طرح اخلاق ومعاملات وغیرہ ابواب کے احکام میں کوتاہی کرنے کو تو بس گناہ اور معصیت سمجھتے تھے، لیکن نماز چوں کہ ایمان کی نشانی اور اس کا عملی ثبوت ہے اور ملت اسلامیہ کا خاص الخاص شعار ہے، اس لیے اس کے ترک کو وہ دین اسلام سے بے تعلقی اور اسلامی ملت سے خروج کی علامت سمجھتے تھے۔'' واللہ اعلم۔

ان حدیثوں سے امام احمد بن حنبلؒ اور بعض دوسرے اکابر امت (جن میں شیخ عبد القادر جیلانیؒ بھی شامل ہیں) نے تو یہ سمجھا ہے کہ (جان بوجھ) نماز چھوڑ دینے سے آدمی قطعاً کافر اور مرتد ہو جاتا ہے، اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا، حتیٰ کہ اگر وہ اسی حالت میں مر جائے تو اس کی نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی، بہرحال اس کے احکام وہی ہوں گے جو مرتد کے ہوتے ہیں، گویا ان حضرات کے نزدیک کسی مسلمان کا نماز چھوڑ دینا بت یا صلیب کے سامنے سجدہ کرنے یا اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے کی طرح کا ایک عمل ہے، جس سے آدمی قطعاً کافر ہو جاتا ہے، خواہ اس کے عقیدہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی ہو، لیکن دوسرے ائمہ حق کی رائے (جن میں امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ النعمانؒ بھی شامل ہیں) یہ ہے کہ ترکِ نماز اگرچہ ایک کافرانہ عمل ہے، جس کی اسلام میں کسی کے لیے کوئی گنجائش نہیں، لیکن اگر کسی بدبخت نے صرف غفلت سے نماز چھوڑ دی ہے، مگر اس کے دل

میں نماز سے انکار اور عقیدہ میں کوئی انحراف پیدا نہیں ہوا ہے، تو اگر چہ وہ دنیا و آخرت میں سخت سزا کا مستحق ہے، لیکن اسلام اور ملت اسلامیہ سے اس کا تعلق بالکل ٹوٹ نہیں گیا ہے، اوراس پر مرتد کے احکام جاری نہیں ہوں گے، ان حضرات کے نزدیک مندرجہ بالا احادیث میں ترکِ نماز کو جو کفر کہا گیا ہے اس کا مطلب کافرانہ عمل ہے، اوراس گناہ کی انتہائی شدت اور خباثت ظاہر کرنے کے لیے یہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے، جس طرح کسی مضر غذا یا دوا کے لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ''یہ بالکل زہر ہے۔'' (معارف الحدیث/ ج:۳/ص:۱۱۰ تا ۱۱۲)

یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور لویرا گر اپنے کپڑے دھونے لگے، تو یوں کہیں گے کہ صاحب کپڑے دھورہے ہیں، مگر انہیں دھوبی تو نہیں کہہ سکتے، صاحب نے دھوبی کا کام کیا، دھوبی نہیں بن گئے، اسی طرح نماز ترک کرنا کافرانہ ومشرکانہ عمل ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الروم : ۳۱)

''اور نماز قائم کرو، اور ان لوگوں کے ساتھ شامل نہ ہو جو شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔'' اس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ نماز ترک کرنا مشرکانہ وکافرانہ عمل ہے، مگر ترکِ صلوٰۃ سے آدمی کافر ہوتا نہیں ہے۔

علاوہ ازیں بعض علماء نے فرمایا کہ ''ترکِ نماز کے ساتھ اگر صحبت کی گئی ہو تو اس حمل سے پیدا ہونے والا بچہ بھی عموماً نافرمان ہوتا ہے۔''

صاحبو! جس کے دل میں ایمان کا چراغ روشن ہے وہ کام کا نام لے کر نماز کو ہرگز ضائع نہیں کرسکتا، وہ نماز سے نہیں کہتا کہ مجھے کام ہے، بلکہ کام سے کہتا ہے کہ مجھے نماز پڑھنی ہے۔

ایک واقعہ:

چناں چہ کتابوں میں ایک واقعہ اللہ تعالیٰ کے ایک مقبول بندے ابو منصورؒ نامی

بزرگ کا ملتا ہے، آپؒ بادشاہِ وقت کے مقرب وزیر تھے، نماز کے ساتھ اوراد و وظائف بالخصوص نمازِ فجر کے بعد جوان کے معمولات تھے ان کے وہ بہت ہی زیادہ پابند تھے، اتفاق سے ایک مرتبہ بادشاہِ وقت کو کوئی کام پڑ گیا، جس کی وجہ سے اس نے ابومنصور کو بلوایا، مگر اس وقت وہ اپنے معمولات اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول تھے، اس لیے بات سنی اَن سنی کر دی اور معمولات میں مشغول رہے، ہر زمانہ میں حاسدین تو ہوا ہی کرتے ہیں، جن کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ اپنے دکھ سے وہ اتنا دکھی نہیں ہوتے جتنا دوسروں کے سکھ سے ہوتے ہیں، (العیاذ باللہ العظیم) ان حاسدین کو موقع ہاتھ آ گیا، خوب لگائی بجھائی سے بادشاہ کو بھڑکایا کہ بادشاہ سلامت! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ کے فرمان کی بھی کوئی پرواہ نہیں، حکم شاہی کی اتنی اہمیت بھی نہیں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حاضر ہو جائے، جب ابومنصور اپنے معمولات سے فارغ ہوکر حاضر ہوئے تو بادشاہ نے وجہِ تاخیر دریافت کی، حضرت نے بڑے اخلاص واطمینان سے جواب دیا کہ ''جناب عالی! میں اللہ تعالیٰ کا بندہ پہلے ہوں اور آپ کا ملازم بعد میں ہوں، اس لیے جب تک اس کی عبادت سے فارغ نہ ہو جاؤں آپ کی ملازمت کے لیے حاضر نہیں ہوسکتا۔'' بادشاہ اس جواب سے اتنا متاثر ہوا کہ آپ کا معتقد ہو گیا، کہنے لگا: ''آپ اپنی اسی روِش پر برقرار رہیے۔'' (ندائے منبر ومحراب: ۴/۱۹۰)

کردار کا تو غازی بن جا ☆ جیت نہ پائے کوئی ایسی بازی بن جا
توڑنے والے خود بنائیں گے تیری مسجد ☆ بس شرط ہے کہ تو نمازی بن جا

غرض! قرآنِ کریم میں نماز کو ایمان کہا تو حدیث شریف میں نماز کو ایمان کا سب سے اہم واوّل رکن اور افضل عمل قرار دیا، جس سے نماز کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

نماز کی عظمت قرآن وحدیث کی روشنی میں:

نماز کی اس اہمیت وعظمت ہی کے پیشِ نظر توحید ورسالت کے بعد رحمت عالم ﷺ کو سب سے پہلے جس چیز کا حکم ہوا اور باقاعدہ جس کی تعلیم دی گئی، وہ وضو اور نماز تھی، دیکھئے،

قرآنِ کریم کی دوسورتیں ہیں، سورۂ مزمل اور سورۂ مدثر، جن میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾ اُس کے معنی ہیں: ''اے چادر میں لپٹنے والے۔'' اور ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ کے معنی بھی یہی ہیں کہ ''اے لحاف میں لپٹنے والے''۔ علماء نے فرمایا کہ تبلیغ رسالت سے پہلے ابتداءِ وحی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی پیارے خطاب سے مخاطب کیا گیا؛ کیوں کہ اس وقت آپ دہشت کے مارے کپڑے میں لپٹے ہوئے تھے، اس پر حق تعالیٰ نے انسیت وملاطفت کے لیے اس پیارے عنوان سے خطاب فرمایا، یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک موقع پر حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''قُمْ یَا اَبَا تُرَاب!'' فرمایا تھا، جب کہ وہ گھر سے رنجیدہ ہوکر نکلے اور مسجد میں مٹی کے کچے فرش پر جا لیٹے تھے۔ تو قرآنِ کریم میں لفظ ''مزمل'' اور ''مدثر'' خود اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ آیت بالکل شروع اسلام اور نزولِ قرآن کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھی (جب کہ اس وقت پانچ نمازیں امت پر فرض نہیں ہوئی تھیں) ان میں آپ ﷺ کو نماز کا حکم دیا گیا۔ امام بغویؒ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہ ثابت کیا کہ ﴿قُمِ اللَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (المزمل:۲) سے معلوم ہوا کہ قیامِ لیل یعنی رات کی نماز حضور ﷺ اور تمام امت پر فرض تھی۔ (گلدستۂ تفاسیر: ۷/۴۳۳)

اور اس کے لیے آپ کو باقاعدہ نماز کی تعلیم بھی دی گئی، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ابتداءِ بعثت اور نزولِ وحی کے وقت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور وضو ونماز کی مجھ کو تعلیم دی''۔ (مسند احمد وابن ماجہ، سیرۃ المصطفیٰ: ۱/۱۵۳) یہاں علامہ سہیلیؒ فرماتے ہیں کہ آیت وضو باعتبارِ فرضیت مکی ہے، اور باعتبارِ تلاوت مدنی ہے، کیوں کہ آیت وضو کا نزول ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ہوا۔

دینِ الٰہی کا پہلا سبق ایمان کے بعد نماز ہے:

ان وضاحتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ''دینِ الٰہی کا پہلا سبق ایمان کے بعد نماز ہے'' اور قرآن کریم میں حق تعالیٰ کی طرف سے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے لیے اسی کا

حکم ملتا ہے، فرمایا ﴿قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ اٰمَنُوْا يُقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (إبراهيم: ۳۱) رب العالمین نے فرمایا کہ بیان تو میرا ہے، لیکن زبان آپ کی، "قُلْ"

میں ان ہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات ان کی
میں ان ہی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے، رات ان کی

محبوبم! کہہ دیجئے میرے ان بندوں سے جو ایمان لائے ہیں کہ وہ "نماز قائم کیا کریں۔" قرآنِ کریم میں ایسے کئی مقامات ہیں جہاں ایمان کے بعد ہی نماز کا حکم ہے، اسی لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایمان کے بعد نماز کی بہت زیادہ تاکید فرماتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیعت لیتے وقت بھی ایمان کے بعد نماز ہی کا حکم فرماتے، بخاری کے "باب البيعة على إقام الصلوة" میں ہے:

عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "بَايَعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى إِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ." (متفق عليه، مشكوٰة: ۴۲۳)

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "میں نے رحمت عالم ﷺ سے نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر بیعت کی"۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نماز اور زکوٰۃ کا تو اہتمام کرتے ہی تھے، مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا بھی بہت ہی زیادہ خیال فرماتے تھے، ایک مرتبہ ان کا ایک غلام ان کے لیے تین سو درہم کا ایک گھوڑا خرید کر لایا، آپ نے گھوڑا دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ زیادہ قیمت کا ہے، آپ اسی وقت بیچنے والے کے پاس گئے اور فرمایا: "تمہارا گھوڑا زیادہ قیمت کا تھا اور تم نے اس کی قیمت اتنی کم لی،" پھر آپ نے اس کو مزید پانچ سو درہم گھوڑے کے دیے اور فرمایا کہ یہ اس کی اصل قیمت ہے۔ (فتح الباری)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں:

"وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ أَوَّلَ مَا يَشْتَرِطُ بَعْدَ التَّوْحِيدِ إِقَامَةُ الصَّلٰوةِ".

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ عقیدۂ توحید کے بعد یعنی ایمان کے بعد سب سے پہلی شرط نماز کے متعلق کیا کرتے تھے۔“ اسی وجہ سے ہمارے اکابر بھی بیعت لیتے وقت توحید و رسالت کے اقرار کے بعد اقامتِ صلوٰۃ کا وعدہ لیتے ہیں۔

لفظِ صلوٰۃ کے ایک معنیٰ رحمت بھی ہیں:

بہر کیف قرآن وحدیث میں نماز کی بہت ہی زیادہ اہمیت وعظمت وارد ہوئی ہے، مزید نماز کی اہمیت وعظمت خود اس کی لفظی حقیقت میں غور کرنے سے بھی واضح ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ نماز کے لیے قرآن میں ”الصلوٰۃ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہ عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے اصلی حروف تین ہیں: صاد، لام اور واو، عربی زبان میں اس کے مختلف معانی آتے ہیں، اور عربی زبان کی خصوصیت ہے کہ بعض اوقات اس کے ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہوتے ہیں، پھر ان الفاظ کے لغوی، اصطلاحی اور شرعی معنی میں بسا اوقات مناسبت بھی ہوتی ہے، دیکھئے نماز کے لیے لفظِ ”صلوٰۃ“ ہے، اس مختصر لفظ کے بھی کئی معانی بیان کیے گئے ہیں، اور ہر ایک سے نماز کی اہمیت وعظمت قرآن وحدیث کی روشنی میں ثابت ہے۔ مثلاً قاموس الفقہ (ج:۴/ص:۲۳۱) میں فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ”صلوٰۃ“ کے اصل معنی عربی زبان میں ”رحمت“ کے ہیں، تو نماز رحمت الٰہی کی کلید (چابی) ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۵۳)

اے ایمان والو! اگر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنی ہے، اس کی رحمتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے اور اس کے غضب اور غصہ کو رحمت سے بدلنا ہے، تو اس کے لیے صبر اور نماز کا سہارا لیجئے، اور واقعی نماز کی یہی تاثیر ہے، اسی لیے حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کبھی حالات آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت الٰہی کی طلب کے لیے فوراً نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے:

عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ:" كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا حَزَبَهٗ أَمْرٌ صَلّٰى." (أبو داوٗد، مشكوٰة/ص:١١٧/ باب التطوع)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب کبھی آپ پر افکار یا رنج وغم کا ہجوم ہوتا تو آپ نماز پڑھتے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو حالات ومصائب میں اللہ تعالیٰ سے مدد اور اس کی رحمت طلب کرنے کے لیے ایک خاص نماز کی تلقین فرمائی، جس کا نام "صلوٰۃ الحاجۃ" ہے۔(ترمذی،مشکوٰۃ ص:۱۱۷) جو سب سے بہتر تعویذ ہے،تو نماز کی یہ بڑی اہم خاصیت ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ رب العزت کی رحمت متوجہ ہو جاتی ہے، اور یہ معلوم ہی ہے کہ جنت مقام رضا ورحمت ہے، اس لیے حدیث میں نماز کو مفتاح الجنۃ فرمایا:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلٰوةُ، وَمِفْتَاحُ الصَّلٰوةِ الطُّهُوْرُ". (رواه أحمد، مشكوٰة/ص: ٣٩)

معلوم ہوا کہ جنت کے دروازے کا تالا اسی کے لیے کھلے گا جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کرنے والی نماز کی چابی ہوگی، اور جو بے نمازی ہوگا اس کے لیے جنت کا دروازہ کیسے کھلے گا؟ کیوں کہ اس کے پاس نماز کی صورت میں رحمت الٰہی کی چابی ہی نہیں، غرض نماز رحمت الٰہی کی کلید ہے،اسی لیے نماز کو لفظِ "صلوٰۃ" سے تعبیر کیا گیا۔(واللہ اعلم)

لفظِ صلوٰۃ کے دوسرے معنیٰ "آگ جلانا" ہیں:

لفظ "صلوٰۃ" کے دوسرے معنی ہیں: "آگ جلانا"۔ اس لغوی معنی کو سن کر آپ حیران ہوئے ہوں گے، اور واقعی یہ بات تعجب کی ہے،لیکن داد دیجیے علماءِ امت کی مثبت سوچ کو! انہوں نے لفظِ "صلوٰۃ" کے اس لغوی اور اصطلاحی وشرعی معنی میں نہایت ہی حیرت انگیز طور پر مناسبت بیان فرمائی،فرماتے ہیں کہ "صلوٰۃ" کے معنی ہیں آگ جلانا، اب نماز کو "صلوٰۃ" اس لیے کہتے ہیں کہ نماز نمازی کے دل میں عشق الٰہی کی آگ جلاتی اور بھڑکاتی

ہے، اور رفتہ رفتہ کامل نماز نمازی کو اپنے مولیٰ کا عاشق بنا دیتی ہے، عارفین کا قول ہے کہ نماز عشقِ الٰہی کی عظیم دلیل ہے، اگر اللہ تعالیٰ کا عاشق بننا ہو تو نماز کے اہتمام کے بغیر ممکن نہیں ہے، نماز سے نمازی کے دل میں عشقِ الٰہی کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، پھر یہ آگ اس کے گناہوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، اور اس عاشقِ الٰہی کو گناہوں سے بچا کر متقی بنا دیتی ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (العنکبوت : ٤٥)

''بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔'' نماز اپنی حقیقت کے ساتھ اگر پڑھی جائے تو اس کی برکت سے نمازی کا دل عشقِ الٰہی سے روشن اور منور ہو جاتا ہے، پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اسے نیکیوں کی رغبت اور گناہوں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک حیرت انگیز واقعہ:

اس سلسلہ میں علامہ عبدالرحمٰن صفوریؒ نے دورِ فاروقی کا ایک حیرت انگیز واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شخص کسی نیک خاتون پر عاشق ہو گیا اور دن رات اس کے فراق میں بے قرار رہنے لگا، آخر ایک دن موقع پا کر اپنے عشق کا اظہار کر دیا، اور وصال (ملاپ) کا مطالبہ کیا، تو اس عورت نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے یہ کہا کہ ''ہمیں حاصل کرنے سے پہلے ایک کام کرنا ہوگا، اور وہ یہ کہ تم امیر المومنین سیدنا فاروق اعظم (رضی اللہ عنہ) کے پیچھے چالیس دن تک مسجدِ نبوی میں نماز باجماعت کا اہتمام کرو، پھر آگے دیکھا جائے گا۔'' ''مرتا کیا نہ کرتا''، بیچارہ عاشق جو ٹھہرا، اس نے شرط منظور کر لی اور مسجدِ نبوی میں پابندی سے نماز باجماعت ادا کرنے لگا، جوں جوں دن گذرتے گئے نماز کی برکتیں اس پر آشکارا (ظاہر) ہوتی چلی گئیں، حتیٰ کہ چالیس دن میں اس کے دل کی حالت ہی بدل گئی، پہلے اس کے دل میں عشقِ مجازی تھا، اب عشقِ الٰہی پیدا ہو گیا، پھر اس گناہ سے سچی توبہ کر کے وہ اللہ تعالیٰ کا عاشق بن گیا، کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو فرمایا:

"صَدَقَ اللّٰهُ العَظِيمُ فِيْ قَوْلِهٖ:﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾
(نزهة المجالس مترجم/ص: ۲۱۰)

"کہ بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔" اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا کہ نماز تو انسان کو برائی سے روکتی ہے، اس کے باوجود اگر کوئی نہ رکے تو یہ اس کی محرومی یا نماز میں کمی کی علامت ہے، ورنہ واقعی بندہ صحیح معنی میں خشوع وخضوع کے ساتھ اور سنت کے مطابق نماز اچھی طرح دھیان سے پڑھے تو اس سے نماز میں جان اور نمازی کے دل میں عشق الٰہی کی آگ روشن ہوتی ہے، اس وجہ سے بھی نماز کو لفظِ "صلوٰۃ" سے موسوم کیا گیا۔

لفظِ "صلوٰۃ" کے تیسرے معنیٰ "تعظیم کرنا" ہیں:

لفظ "صلوٰۃ" کے تیسرے معنی بھی بیان کیا گئے ہیں، اور وہ ہیں "تعظیم کرنا" اس لغوی معنی میں اگر ہم غور کریں تو یہ بھی اصطلاحی وشرعی معنی پر پوری طرح صادق آتا ہے، اس لیے کہ نمازی نماز کے دوران اپنی زبان اور نماز کے افعال وارکان کے ذریعہ بار بار اللہ جل شانہ کی تعظیم کرتا ہے اور اس کی عظمت کا اظہار کرتا ہے، بلکہ ایک نمازی جب نماز کی نیت کر کے "اللہ اکبر" کہتے ہوئے نماز کی ابتداء کرتا ہے تو اس تکبیر کو "تکبیر تحریمہ" کہا جاتا ہے، یعنی حرام کرنے والی؛ کیوں کہ نمازی نماز کے ذریعہ اپنے مولیٰ کے دربار میں حاضری دیتا ہے، جس کی وجہ سے اس پر دنیا کی ساری چیزیں اب "اللہ اکبر" کہتے ہی حرام ہو جاتی ہیں، دینی عبادات تو نماز کے علاوہ اور بھی ہیں، لیکن جو شان نماز کی ہے کسی اور عبادت کی ایسی نہیں، مثلاً روزہ بڑی اہم عبادت ہے، لیکن اس کی ادائیگی کے دوران آپ بول سکتے ہیں، معاملات طے کر سکتے ہیں وغیرہ، اسی طرح حج ایک افضل عبادت ہے، مگر اس کی ادائیگی کے دوران آپ چل پھر سکتے ہیں، کھا پی سکتے ہیں وغیرہ، اسی طرح زکوٰۃ بھی ایک عظیم عبادت ہے، لیکن اس کی ادائیگی میں بھی نماز کی طرح کوئی خاص قید نہیں، صرف نماز ایک ایسی عظیم

الشان عبادت ہے کہ اس میں تکبیر کہتے ہی نماز کے ارکان کے علاوہ کھانا، پینا، بولنا، چلنا، کسی سے بات چیت کرنا، حتیٰ کہ کسی اور کی طرف متوجہ ہونا سب حرام، بس ''اللہ اکبر'' کہتے ہی بندہ سب سے کٹ کر اپنے مولیٰ سے جڑ جاتا ہے، حق اور حکم بھی یہی ہے کہ بندہ اپنے مالک کے دربار میں اسی انہماک سے نماز میں کھڑا ہو، قرآن نے اس کو یوں فرمایا:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا﴾ (المزمل : ۸)

''اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور سب سے الگ ہو کر پورے کے پورے اسی کے ہو رہو۔''

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ فرماتے ہیں کہ ''اس آیت کریمہ میں تکبیر تحریمہ کی تعلیم کے ساتھ نماز کا ایک معنوی ادب بھی سکھایا گیا ہے، جس کو نماز کی جان کہنا چاہیے، یعنی یہ کہ تکبیر تحریمہ کہتے ہی ماسوا اللہ سے تعلقات کٹ جائیں اور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے تعلق رہے۔'' (کتاب الصلوٰۃ/ص: ۱۳۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ رضی اللہ عنہم اور صلحاء کی نماز اسی شان کی ہوتی تھی، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک جنگ میں آپ کی پنڈلی میں تیر کا چھوٹا سا ٹکڑا رہ گیا، جو آپ کو تکلیف دیتا تھا، جرّاح (اس زمانہ کے آپریشن کرنے والے) نے کوشش کی اس کو نکالنے کی، مگر آپ نے درد کی بنا پر اسے روک دیا، اس دوران جب نماز کا وقت ہوا تو آپ سب سے ہٹ کر رب کی طرف نماز میں مشغول ہو گئے، ساتھیوں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس کو نکلوا لیا اور آپ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ بعض علماء نے تکبیر تحریمہ کہتے وقت جو ہاتھ کانوں تک اٹھائے جاتے ہیں اس میں یہ نکتہ بیان فرمایا کہ انسان اپنے بے خبر ہونے کو کان پر ہاتھ رکھ کر بیان کرتا ہے، تو نماز میں نمازی ''اللہ اکبر'' کہہ کر تو زبان سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی بیان کرتا ہی ہے، ہاتھوں کے عمل سے بھی اپنے اللہ تعالیٰ کے برابر یا اس کے شریک و سہیم ہونے سے لاعلمی اور بے خبری کا اظہار کرتا ہے کہ میں نے کہیں اس سے بڑا کوئی سنا ہی نہیں، یا یہ کہ مجھے اس کے سوا

کسی کی کوئی خبر ہی نہیں۔ (احسن المواعظ/ص:۱۲۰)

''اللہ اکبر'' کہہ کر بندہ یہ اعلان و اظہار کرتا ہے کہ دنیا والو! کان کھول کر ہی نہیں دل کے دروازوں کو کھول کر اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ میرا اللہ سب سے بڑا ہے، اس سے بڑا نہ کوئی ہے نہ ہو سکتا ہے، یہ ''تکبیر'' اللہ تعالیٰ کی تعظیم بیان کرنے ہی کا نام ہے، جو اذان و اقامت اور نماز میں بار بار کہی جاتی ہے، اس کا مقصد یہی ہے کہ نمازی کے دل میں اپنے خالق و مالک کی عظمت و بڑائی اتر جائے، اس وجہ سے بھی نماز کو ''صلوٰۃ'' کہتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا بار بار اظہار کیا جاتا ہے، اور نماز کا ہر ہر رکن اس بات کا سبق دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ بڑائی اور تعظیم کا حقدار ہے۔ (واللہ اعلم)

نماز کی جامعیت قرآن وحدیث کی روشنی میں:

اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم بیان کرنا نہایت عظیم عبادت ہے، جیسا کہ نماز میں اسے انجام دیا جاتا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی نماز میں اور عبادتیں انجام دی جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ نماز افضل العمل اور افضل العبادات ہونے کے ساتھ جامع العبادات بھی ہے، اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ اسلام میں جتنی بھی عبادات ہیں تمام کے کچھ کچھ نمونے نماز میں موجود ہیں، مثلاً دیکھئے! شریعت مطہرہ میں نیت کا خاص مقام ہے، حدیث میں ہے: ''إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ''. (مشکوٰۃ/ص:۱۱) ''تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ جب تک آدمی کی نیت نیک نہ ہو تب تک اسے اس عمل صالح کا اجر نہیں مل سکتا، بعض اعمال تو نیت کے بغیر درست ہی نہیں، اور وہ اعمالِ مقصودہ ہیں، جن کا کرنا شریعت میں مطلوب و مقصود ہے، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ، تو جس طرح دیگر اعمال وعبادات میں حصولِ اجر و ثواب یا لائق قبول ہونے کے لیے نیت ضروری ہے، اسی طرح نماز میں بھی نیت ضروری ہے۔

روزہ کی شان یہ ہے کہ روزہ دار کے لیے صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانا،

پینا اور بیوی سے استمتاع (جماع) جائز نہیں، تو نماز میں نمازی کے لیے بھی ان تمام چیزوں کی اجازت نہیں، اس اعتبار سے نماز میں روزہ داخل ہے، پھر زکوٰۃ میں روپیہ، پیسہ خرچ ہوتا ہے، تو نماز میں نمازی کے روپیہ، پیسہ سے زیادہ قیمتی وقت اور پیسہ دونوں خرچ ہوتا ہے؛ کیوں کہ نماز کے لیے مسجد کی تعمیر اور لباس وغیرہ میں مال خرچ ہوتا ہی ہے، اس لحاظ سے نماز میں زکوٰۃ داخل ہے، رہی بات حج کی، تو اس میں اللہ تعالیٰ کو پکارا جاتا ہے اور اسی سے مانگا جاتا ہے، یہی بات نماز میں پائی جاتی ہے، بار بار اس میں رب العالمین کی تعظیم بیان کی جاتی ہے، اسی کو پکارا جاتا ہے، اسی سے مانگا جاتا ہے، کبھی ہدایت مانگی جاتی ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ تو کبھی مغفرت طلب کی جاتی ہے: ”اَللّٰهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِيْ... الخ“ (مشکوٰۃ/ص:۸۷) پھر اسی کے ساتھ حج ایک عاشقانہ عبادت ہے، جس میں حاجی کی حالت عاشق کی طرح ہوتی ہے کہ بدن پر صرف دو چادریں، زبان پر لبیک کی صدائیں اور دیوانہ وار رب کے گھر (کعبہ) کا چکر لگاتا ہے، کبھی صفا، مروہ کے درمیان دوڑ لگاتا ہے تو کبھی منی، عرفات اور مزدلفہ میں اپنے خالق و مالک کو منانے اور راضی کرنے کے مختلف انداز اختیار کرتا ہے، یہ عاشقانہ حالت اور عجیب وغریب کیفیت حاجی کی حج میں ہوتی ہے، تو ایک نمازی کی نماز میں بھی ایسی ہی کچھ حالت اور کیفیت ہوتی ہے، نمازی بھی نماز میں اپنے خالق و مالک کو منانے اور راضی کرنے کے لیے ایسے ہی انداز اختیار کرتا ہے، کبھی بالکل مسکینی کی تصویر بن کر قیام کرتا ہے، جس میں زبان اس کی حمد وثنا سے تر، ہاتھ نیاز مندانہ بندھے ہوئے اور آنکھیں ایک غلام کی طرح جھکی ہوئی ہوتی ہیں، پھر جب رکوع میں جاتا ہے تو اس کی عاجزی اور بڑھ جاتی ہے اور اس حالت میں بھی زبان اس کی تسبیح سے رطب اللسان ہوتی ہے، اب (تسمیع کے بعد) سجدہ کی منزل ہے، جو مسکینی، عاجزی، انکساری اور بے نفسی کا نقطۂ عروج ہے، سر، پیشانی اور ناک انسان کی عزت وعظمت کے بڑے مظہر ہیں، لیکن نماز میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کے خاطر نمازی ان سب کو خاک پر رگڑتا ہے، تو جو کیفیت حاجی کی حج کے دوران ہوتی ہے، وہی حالت تقریباً نمازی کی نماز کے دوران ہوتی ہے، اس کے جسم کے

ایک ایک عضو سے خود سپردگی اور غلامی و بندگی ظاہر ہوتی ہے، قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا زمزمہ اور اس کی عظمت و کبریائی کا نعرہ اس کی زبان پر ہوتا ہے، بار بار الحاح والتجاء، تضرع، دعا اور اپنی عاجزی و گناہ گاری کا اقرار و اعتراف ہوتا ہے، صاحبو! نماز کی اصلی اور واقعی شان یہی ہے، اور جس نماز میں یہ کیفیت نہ ہو تو وہ در حقیقت نماز نہیں، حجاب ہے، علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

شوق ترا اگر نہ ہو، میری نماز کا امام ☆ میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

الغرض حج والی عاشقانہ ادائیں نماز میں پائی جاتی ہیں، اس زاویہ سے نماز میں گویا حج بھی موجود ہے، اس لیے نماز کو جامع العبادات کہا جاتا ہے۔

نماز ساری عبادتوں کا مجموعہ اور گلدستہ ہے

اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت تو کائنات کی تمام مخلوق کرتی ہے، حتیٰ کہ حیوانات، جمادات اور حشرات الارض (کیڑے مکوڑے) بھی کرتے ہیں، چناں چہ فرمایا:

﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ (بنی إسرائيل: ٤٤)

''ہر مخلوق ہمیں یاد کرتی ہے، ہماری تسبیح و تحمید بیان کرتی ہے، مگر تمھیں اس کا شعور اور احساس نہیں ہے۔'' بس جب تمھیں اس کا شعور نہیں تو پھر ان کی تسبیحات کی تاویلات کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں کہ ان کی تسبیح حالی ہے یا مقالی، اختیاری ہے یا جبری، وغیرہ۔ خیر ساری مخلوق اس کی تسبیح کرتی ہے، چناں چہ سورۂ صٓ میں حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَهُ أَوَّابٌ﴾ (ص: ١٧-١٨)

''ہم نے پہاڑوں کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ صبح وشام تسبیح کیا کریں اور پرندوں کو بھی جو کہ جمع ہو جاتے تھے، تمام اللہ تعالیٰ کے حضور متوجہ رہتے تھے۔'' اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ اور پرندے تسبیح کرتے تھے، ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ﴾ (النور: ٤١)

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے جو پر پھیلائے ہوئے ہیں، سب کو اپنی اپنی دعا اور تسبیح کا طریقہ معلوم ہے، اور حق تعالیٰ کو لوگوں کے تمام افعال کا اچھی طرح علم ہے۔'' معلوم ہوا کہ ہر چیز تسبیح وتحمید بیان کرتی ہے، اسی سے ہمارے بعض علماء نے فرمایا کہ درختوں کی تسبیح اور عبادت قیام ہے، حیوانات اور چوپایوں کی تسبیح وعبادت رکوع ہے، حشرات الارض (زمین پر پیٹ کے بل چلنے والے جانوروں) کی تسبیح وعبادت سجدہ ہے اور پہاڑوں کی تسبیح وعبادت قعدہ ہے۔

پھر فرشتوں کے متعلق منقول ہے کہ ان میں کا ایک گروہ صبح وشام تکبیر وتہلیل میں مشغول ہے، دوسرا گروہ قیام میں، تیسرا گروہ رکوع میں، چوتھا گروہ سجدہ میں، پانچواں گروہ قعدہ میں، وغیرہ۔ بہرکیف کائنات میں موجود مخلوق کی عبادات کے جتنے طریقے ہیں وہ سب کے سب حق تعالیٰ نے نماز میں جمع فرمادیے، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سارے کمالات جمع فرمادیے۔

حسن یوسف، دمِ عیسیٰ، ید بیضا داری
آں چہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو جو نماز دی اس میں ساری (مخلوق کی جانب سے کی جانے والی) عبادات کو جمع فرمادیا۔ (احسن المواعظ/ص: ۱۱۷)

یہ مالک کا کرم ہے کہ اس نے اس امت کو نماز کی شکل میں ایک ایسا عجیب وغریب گلدستہ دیا جس میں تمام مخلوقات کی عبادات اور تمام عبادات کی خوشبو کو جمع فرما دیا، اس وجہ سے بھی نماز کو جامع العبادات کہا گیا کہ نماز ساری مخلوق کی جانب سے کی جانے والی عبادتوں کا مجموعہ وگلدستہ اور امت محمدیہ کا خاصہ ہے۔

نماز کا حکم تمام آسمانی مذاہب میں رہا ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ اس جامعیت اور کیفیت کے ساتھ امت محمدیہ کے علاوہ کسی اور امت کو نماز نہیں ملی، ورنہ قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہے کہ نماز تمام ہی الٰہی وآسمانی مذاہب میں فرض تھی، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''نماز اور زکوٰۃ ایسی عبادتیں ہیں کہ از آدم علیہ السلام تا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نبی اور رسول کی شریعت میں فرض رہی ہیں، البتہ مختلف شریعتوں میں ان کی تفصیلات اور جزئیات مختلف رہی ہیں۔'' (معارف القرآن: ۶/ ۲۸/سورۂ مریم)

بعض علماء نے آیت کریمہ: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (النساء: ۱۰۳) کے تحت فرمایا کہ لفظ ''كَانَتْ'' اور اس کے مشتقات قرآن میں دوام کے معنی میں مستعمل ہوئے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پچھلی امت کے مومنین پر نماز فرض تھی، تو جہاں تک نفس نماز کا تعلق ہے، تو اس کا حکم ہر آسمانی وحی کو ماننے والی امت وملت میں ضرور رہا ہے، اور بعضوں کا تذکرہ تو صراحت کے ساتھ قرآن وحدیث میں ملتا ہے، مثلاً جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل وعیال کو جب مکہ مکرمہ کی (اس وقت) بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑا تو اس کا مقصد یہ بیان کیا:

﴿رَبَّنَا إِنِّيْ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (إبراهيم: ۳۷)

''الٰہ العالمین! اس وادیٔ غیر ذی زرع میں تیرے محترم گھر کے پاس میں نے اپنی

ذریت کو اس لیے چھوڑا ہے تا کہ وہ نماز قائم کریں۔'' اس کے علاوہ آپ نے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے نماز قائم کرنے کی دعا بھی فرمائی:

﴿ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ﴾ (إبراهيم: ٤٠)

''الٰہ العالمین! مجھے بھی نماز کا پابند بنا اور میری آل میں بھی اس سلسلہ کو قائم و دائم فرما۔'' اب آگے سیدنا خلیل اللہ علیہ السلام کے مطیع اور فرماں بردار بیٹے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کا حال سنئے، فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيْلَ إِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَبِيًّا ۝ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ص وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝﴾ (مريم: ٥٤- ٥٥)

''محبوبم! قرآن کے آئینہ میں پیارے اسماعیل کو بھی دیکھ لیجئے! ان کی صفاتِ حسنہ کو بیان کر دیجئے، وہ وعدے کے بڑے سچے تھے، رسول اور نبی تھے اور اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کیا کرتے تھے، اور وہ اپنے رب کے پسندیدہ تھے''۔

معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی شریعت میں بھی نماز کی خاص اہمیت تھی، حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں مروی ہے کہ ان کی نماز پوری قوم میں بہت ہی مشہور تھی، اسی لیے جب آپ نے قوم کو دعوتِ توحید دی تو قوم کے نادانوں نے بجائے ان کی دعوت قبول کرنے کے الٹا ان کو طعنہ دیا اور ان کی تبلیغ کو بطورِ مذاق نماز کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا:

﴿ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَايَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِيْ أَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ط إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝﴾ (هود:٨٧)

''اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ دیں، یا ہم اپنے مالوں میں جو چاہیں کریں، یقیناً آپ بڑے بردبار اور نیک چلن ہیں۔'' معلوم ہوا کہ سیدنا شعیب علیہ السلام کی شریعت میں بھی نماز تھی، اور آپ اس کا بہت

زیادہ اہتمام فرماتے تھے، اسی لیے بدبخت قوم نے نماز کو طعن وتشنیع کا ہدف اور نشانہ بنایا، اسی طرح قرآنِ کریم میں سیدنا موسیٰ وہارون علیہما السلام کے متعلق مذکور ہے، حق تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا:

﴿أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (یونس: ۸۷)

''تم قائم کرو نماز اور بشارت سنادو ایمان والوں کو۔ غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہاں اقامت صلوٰۃ کے بعد مومنین کو بشارت سنانے کا امر فرمایا گیا؛ کیوں کہ اس کے بغیر بشارت کا استحقاق نہیں، یہی وجہ ہے کہ اذان میں بھی ''حَيَّ عَلیٰ الصَّلوٰةِ'' نماز کی دعوت پہلے ہے، کامیابی کی بشارت ''حَيَّ عَلیٰ الفَلاَحِ'' بعد میں ہے، غرض سیدنا موسیٰ وہارون علیہما السلام کی شریعت میں بھی نماز تھی، نیز قرآنِ کریم سے حضرت زکریا علیہ السلام کا بھی نماز میں بکثرت مشغول رہنا ثابت ہے، حتیٰ کہ آپ نے بڑھاپے میں حصولِ اولاد کی جو دعا مانگی وہ بھی نماز ہی میں مانگی، اور عین نماز ہی میں فی الفوران کو رب العالمین کی طرف سے اس دعا کی قبولیت کا مژدہ بھی سنایا گیا:

﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ج قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ج إِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ فَنَادَتْهُ الْمَلٰئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

(اٰل عمران: ۳۸-۳۹)

''اس موقع پر (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی: ''اے میرے رب! مجھے خاص اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرمادے، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے، چناں چہ جب زکریا (علیہ السلام) عبادت گاہ میں نماز پڑھ رہے تھے، فرشتوں نے انہیں آواز دی کہ اللہ آپ کو یحییٰ کی (پیدائش کی) بشارت دیتا ہے، جو اس شان سے پیدا ہوں گے کہ اللہ کے ایک کلمے کی تصدیق کریں گے اور لوگوں کے پیشوا ہوں گے اور اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے مکمل طور پر روکے ہوئے ہوں گے اور نبی ہوں گے صالحین میں

سے۔“

علماء نے فرمایا حضرت زکریا علیہ السلام کی اس دعا میں بڑی تاثیر ہے، اس کا اہتمام حصول اولاد کے لیے نہایت مؤثر نسخہ ہے، خصوصاً نمازِ تہجد میں بعد درود کے دعاءِ ماثورہ کی جگہ یا اس کے بعد چالیس دن تک اس دعا کا ورد کرے تو قبولیت کی امید زیادہ ہے، (اگر عورت یہ وظیفہ پڑھے تو ایامِ عذرِ معین میں تہجد کی نماز میں پڑھنے کے بجائے نماز کے علاوہ میں پڑھے)(کتاب الصلوٰۃ/ص:۸۰ مؤلفہ: مولانا عبدالشکور فاروقیؒ)

بہر حال اس سے سیدنا زکریا علیہ السلام کے یہاں نماز کی اہمیت کا پتا چلتا ہے، علاوہ ازیں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تو قرآن نے کہا کہ آپ نے گہوارے ہی میں فرمادیا تھا:

﴿وَأَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا﴾ (مریم: ۳۱)

”حق تعالیٰ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک میں دنیا میں زندہ رہوں۔“ یہاں وصیت کا جو لفظ ہے اس سے بھی نماز کی اہمیت واضح ہوتی ہے، اس لیے کہ کسی چیز کا حکم جب زیادہ تاکید کے ساتھ کیا جائے تو اسے وصیت کہتے ہیں، اور نماز کا بار بار تاکید سے حکم فرمانا تو بالکل ہی واضح ہے۔ پھر یہاں علماء نے ایک اور نکتہ بھی بیان فرمایا کہ نماز ایک اہم عبادت ہے، اور عبادت دلیل عبدیت ہے، اور عبدیت والوہیت کا جمع ہونا عقلاً بھی محال ہے، لہٰذا نصاریٰ کا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدۂ الوہیت باطل ہے۔ فافہم۔

بہر کیف ان حقائق سے ثابت ہو گیا کہ نماز ایسی عظیم الشان عبادت ہے جس سے کسی نبی اور رسول کی شریعت خالی نہیں رہی، البتہ امت محمدیہ کو نمازِ پنجوقتہ اور اس کا جو مخصوص اور جامع طریقہ ملا وہ کسی اور کو نہیں ملا۔

نماز کی انفرادیت وخصوصیت:

پھر دیگر اعمال وعبادات میں نماز کی انفرادیت وخصوصیت یہ بھی ہے کہ اور عبادات

کی فرضیت تو فرشِ زمین پر ہوئی، لیکن نماز کی فرضیت عرشِ بریں پر ہوئی، نیز نماز سال کے بارہ مہینے اور مہینہ کے ہر دن رات میں ایک ہی نہیں، پانچ بار ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، تندرست ہو یا مریض، مسافر ہو یا مقیم، حالت جنگ میں ہو یا امن میں، (البتہ عورت کے لیے حالت حیض ونفاس میں نہیں ہے، لیکن البحر الرائق میں ہے کہ ہمارے ائمہ کے نزدیک حائضہ ونفسا عورت کے لیے مستحب یہ ہے کہ ہر نماز کے وقت وضو کرے اور اپنی جائے نماز پر بیٹھ کر بقدرِ اداءِ فرض تسبیح وتہلیل میں مشغول رہے، ''یُکْتَبُ لَهَا ثَوَابُ أَحْسَنِ صَلوٰةٍ كَانَتْ تُصَلِّیْ''. تو اس کے لیے سب سے اچھی اور عمدہ نماز جو وہ پڑھتی تھی اس کا ثواب لکھا جائے گا)(البحر الرائق/ص:۳۳۶)

غرض ہر ایک پر ہر حالت میں نماز فرض ہے، نماز کے علاوہ روزہ سال بھر میں صرف ایک مہینہ فرض ہے، اس میں بھی مریض اور مسافر کے لیے رعایت ہے، زکوٰۃ سال بھر میں مالداروں پر ہے، غریبوں پر نہیں، حج صاحب استطاعت پر زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہے، بار بار نہیں، اور ہر ایک پر نہیں، لیکن نماز کی انفرادیت وخصوصیت یہ ہے کہ ایک مسلمان پر جب تک ہوش وحواس باقی ہیں نماز فرض ہے، کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، اس کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھے، رکوع سجدہ کرنے کی قدرت نہیں تو اشاروں سے پڑھے، مرد مسجد میں نہیں آسکتا تو گھر پر ادا کرے، وضو نہیں کر سکتا تو تیمّم کرے، حتیٰ کہ ستر ڈھانپنے کے لیے ضروری کپڑا میسر نہیں ہے تو بے لباس ہی (شریعت کے حکم کے مطابق) بیٹھ کر اشارہ سے رکوع سجدہ کر کے پڑھ لے (نور الایضاح/ص:۶۷) قبلہ کی جہت معلوم نہیں تو جس طرف زیادہ دھیان جائے اسی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ لے، اس سے ایک طرف تو نماز کی دیگر عبادات میں انفرادیت، خصوصیت وعظمت کا پتہ چلتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نماز نہ پڑھنے والوں کا کوئی بہانہ حق تعالیٰ کے یہاں کام نہ آئے گا۔

نماز سے غفلت کرنے والوں کا کوئی عذر قیامت میں قبول نہ کیا جائے گا:

روح البیان میں ہے کہ جو شخص دنیا میں حکومت، سلطنت اور ریاست کی وجہ سے نماز سے غافل رہا ہوگا اور وہ اس کو بہانہ بنانا چاہے گا تو حق تعالیٰ کا حکم ہوگا کہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو حاضر کرو، جب یہ دونوں حضرات حاضر ہوں گے تب اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھ یہ دونوں بادشاہ تھے، اگر کسی کی حکومت، سلطنت اور بادشاہت نماز سے روک سکتی تھی تو انہیں کیوں نہیں روکا؟ تو اپنی بادشاہت اور ریاست کی وجہ سے نہیں، غفلت کی وجہ سے نماز سے رکا رہا، لہٰذا اے فرشتو! جاؤ اسے جہنم میں جھونک دو، اگر کوئی اپنی بیماری کا عذر پیش کرے گا تو ارشادِ عالی ہوگا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو بلاؤ، جب وہ حاضر ہوں گے، تو حق تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا: اے بیماری کا عذر پیش کرنے والے بے نمازی! تو زیادہ بیمار تھا یا یہ ہمارا نبی ایوب؟ دیکھ برسوں تک ہمارا پیغمبر بیمار رہا، مگر کبھی ہماری یاد اور نماز سے غافل نہ رہا، اگر کسی کو اس کی بیماری نماز سے روک سکتی تھی تو ہمارے پیغمبر ایوب کو کیوں نہ روکا؟ معلوم ہوا کہ تو خود غافل تھا اور بیماری کو بہانہ بناتا رہا، فرشتو! لے جاؤ اسے اور دوزخ میں پھینک دو، اگر کوئی کثیر العیال اپنی کثرتِ اولاد اور ان کی فکر معاش کا عذر پیش کرے گا تو فرمانِ شاہی ہوگا کہ حضرت یعقوب کو لاؤ، جب حضرت یعقوب علیہ السلام تشریف لائیں گے تو اس سے کہا جائے گا: تیری اولاد زیادہ تھی یا حضرت یعقوب علیہ السلام کی؟ اگر کسی کی کثرتِ اولاد اور فکر معاش اس کو نماز سے روک سکتی تھی تو ہمارے نبی یعقوب کو کیوں نہیں روکا؟ تو خود ہی نماز پڑھنا نہیں چاہتا تھا اور کثرتِ اولاد کا عذر پیش کرتا رہا، فرشتو! جاؤ اسے بھی جہنم میں ڈال دو، اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے ظلم وستم یا مرد اپنے آقا کے جور و جفا کا عذر کریں گے کہ الٰہی! مجھے اپنے خاوند یا حاکم و مالک کی وجہ سے نماز کی مہلت نہ ملی، تو دربارِ عالی میں فرعون کی بیوی سیدہ آسیہ رضی اللہ عنہا کو حاضر کیا جائے گا، پھر ارشادِ رب العباد ہوگا کہ تیرا خاوند یا حاکم زیادہ ظالم تھا یا فرعون؟ اگر کسی کو اپنے خاوند یا حاکم کا ظلم و جور ہماری عبادت سے روکتا تو بی بی آسیہ

کو ضرور روکتا، لہٰذا اے بے نمازی! خاوند یا حاکم کا عذر بھی غلط ہے، تو خود ہی اپنے پروردگار کی یاد اور نماز سے غافل رہا اور خواہ مخواہ بہانہ بناتا رہا، فرشتو! اسے بھی جہنم رسید کردو۔ العیاذ باللہ العظیم۔

پھر جب بے نمازی دوزخ میں داخل کردیے جائیں گے تب ان سے پوچھا جائے گا: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ﴾ ''تم دوزخ میں کس جرم کے سبب بھیجے گئے؟'' ﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ﴾ (المدثر: ۴۱-۴۲) ''وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔''
(از: احسن المواعظ/ ص: ۱۳۴)

ایک حیرت انگیز واقعہ:

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور صلحاءِ عظام رحمہم اللہ کسی بھی حالت میں نماز سے قطعاً غافل نہیں رہے، ہر حال میں انہوں نے نماز کا اہتمام فرمایا۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، ان کے پوتے حضرت عامر بن عبداللہ رحمہ اللہ (المتوفیٰ: ۱۲۱ھ) کا واقعہ منقول ہے کہ آخری وقت میں جب وہ سخت بیمار ہوگئے اور چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے، اس ضعف و نقاہت کے عالم میں اذان کی آواز ان کے کانوں میں پہنچی تو بے چین ہو گئے اور فرمانے لگے: ''مجھے اٹھاؤ اور مسجد تک پہنچاؤ'' لوگوں نے منع کیا، تو فرمایا کہ ''یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اذان کی آواز سنوں اور مولیٰ کے دربار میں حاضری نہ دوں'' ان کی خواہش کے مطابق لوگوں نے انہیں مسجد میں پہنچا دیا، آپ مغرب کی نماز میں شریک ہوئے، صرف ایک ہی رکعت ادا کر پائے اور روح پرواز کر گئی۔ (التحفۃ اللطیفۃ للسخاوی: ۲/ ۳۵، از: نماز میں خشوع خضوع پیدا کرنے کے طریقے/ ص: ۱۴۶)

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نعیم رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی ہیں، ایک دن وعظ و نصیحت کی غرض سے وہ حجاج بن یوسف کے پاس گئے، حجاج کے ظلم سے کون ناواقف ہوگا؟ نصیحت فرمائی اور ظلم کے انجام کی طرف توجہ دلائی، تو حجاج نے اس کا نقد صلہ دیتے ہوئے حکم دیا کہ ''اسے تنگ

وتاریک کوٹھری میں بند کردو" اس حالت میں پندرہ دن گذر گئے، جہاں نہ کھانا نہ پینا، نہ روشنی اور زندگی کا کوئی سامان، حجاج نے کہا "اب اس کی لاش نکال کر دفن کردو۔" چناں چہ ان کی لاش نکالنے کے لیے حجاج کے کارندوں نے جب دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہ کھڑے ہوکر نماز میں مشغول ہیں"۔

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں پابند ☆ بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ

(تہذیب التہذیب: ٦/ ٢٨٦، از کتابوں کی درسگاہ میں/ ص: ۴۱)

بلا شبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچ ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا﴾ (الحج : ٣٨)

"یقیناً اللہ سچے مومنوں کے دشمنوں کو خود دفع کرتا ہے۔"

انہیں جان دینا گوارا تھا نماز چھوڑنا گوارا نہ تھا، یہی ایک سچے مسلمان کی پہچان ہے جیسا کہ عربی کے کسی شاعر نے کہا:

اَلْمُسْلِمُ حَقًّا يُصَلِّيْ فَرْضَهٗ ☆ يَأْخُذُ الْفَأْسَ وَيَسْقِيْ أَرْضَهٗ

سچے مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ وہ باوجودے کہ کدال سے اپنا کھیت سینچتا ہے، مگر نماز سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔

نمازِ پنجوقتہ کی حکمتیں:

اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی یاد (اور دارین کی ترقیات) کا سب سے بہترین ذریعہ نماز ہے، فرمایا: ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰہٰ: ١٤) "میری یاد کے لیے نماز قائم کیجئے۔" تمہاری ترقی اسی میں ہے، بسا اوقات دنیوی مشاغل اور اس کی زیب وزینت سے متاثر ہوکر انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے، تو حق تعالیٰ نے اس غفلت کا علاج اس طرح کیا کہ روزانہ پانچ نمازیں قدرے وقفے کے ساتھ تھوڑی

تھوڑی دیر کے بعد فرض فرمادیں، ارشاد ہوا:

﴿إِنَّ الصَّلوٰةَ كَانَتُ عَلَى الْمُؤُمِنِيُنَ كِتٰبًا مَوُقُوُتًا﴾ (النسآء : ۱۰۳)

''بلا شبہ نماز ایمان والوں پر فرض ہے، جن کے اوقات بھی مقرر ہیں۔'' آیت کریمہ میں بتلایا کہ نماز کے اوقات اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے اور پھر باقاعدہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم عطا فرمایا گیا، جیسا کہ حدیث معراج اور متعدد احادیث میں اس کا تذکرہ ہے، اور عہد نبوت سے آج تک ہر دور میں مسلمانوں کا تواتر کے درجہ میں اس پر عمل رہا ہے۔

علماء نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے نماز کے پانچ مخصوص اوقات اسی لیے مقرر فرمائے تاکہ بندہ میں احساسِ عبدیت بیدار ہوکر غفلت کا علاج ہوجائے اور وہ دارین کی ترقیات سے مالا مال ہوجائے، بعض علماء نے نمازِ پنجوقتہ کی حکمتیں اس کے علاوہ بھی بیان فرمائی ہیں: مثلاً یہ کہ اولاً نمازیں پچاس فرض ہوئیں، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے پچاس کی پانچ رہ گئیں، حق تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ امت پڑھے گی پانچ، اور ثواب پائے گی پچاس نمازوں کا:

﴿مَنُ جَآءَ بِالُحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشُرُ أَمُثَالِهَا﴾ (الأنعام : ۱۶۰)

''جو شخص ایک نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب ہوگا۔''

پھر پچاس اور پانچ میں صرف نقطہ کا فرق ہے، اور ہمارے یہاں نقطہ کو ''نکتہ'' بھی کہتے ہیں، اور رب کی نکتہ نوازی تو بہت ہی مشہور ہے، ایک نقطہ ہٹا لیا تو ہزاروں بندے نمازی ہوکر جنتی بن گئے، اگر نقطہ نہ اٹھایا جاتا تو ہزاروں میں ایک نمازی ہوتا، اور جو بندہ تعمیل حکم میں نمازی نہ ہوتا وہ دوزخی بن جاتا، سبحان اللہ اس کی نکتہ نوازی دیکھئے! پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ جب یہ نماز والا عمل اس کے عالی دربار میں پہنچا تو پھر اس نقطہ کو ملا کر پانچ نماز کے ثواب کو پچاس کے برابر کردیا، اور انسان کو ترقی کے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔

پنجوقتہ نماز پر ایک اور نکتہ بھی علماء نے بڑا عجیب بیان فرمایا ہے کہ شرعاً پانچ طرح کے غسل فرض ہیں: (۱) جنابت کا غسل۔ (۲) حیض کا غسل۔ (۳) نفاس کا غسل۔ (یہ تینوں غسل تو فرض ہیں) (۴) اسلام لانے کا غسل۔ (عیدین و جمعہ کا غسل سنت ہے، اور اسلام لانے کا غسل اس وقت فرض ہے جب کہ کافر جنابت کی حالت میں مسلمان ہوا ہو، ورنہ مسلمان ہوتے وقت غسل مستحب ہے) (۵) میت کا غسل۔ (یہ فرضِ کفایہ ہے، جب کہ میت باغی، شہید یا مخنث نہ ہو) اس طرح شرعاً پانچ قسم کے غسل ہیں جو انسان کو ناپاکی سے پاک کرنے کے لیے مقرر ہوئے، لیکن سب سے بڑی ناپاکی تو گناہوں کی ہے، ظاہر کی ناپاکی سے انسان کا ظاہر اور بدن ناپاک ہوتا ہے، مگر گناہ سے انسان کا باطن اور دل ناپاک ہوتا ہے، ظاہر کی ناپاکی سے کپڑا ناپاک ہوتا ہے اور گناہ کی ناپاکی سے کردار ناپاک ہوتا ہے، ظاہر کی ناپاکی کو دور کرنے کے لیے پانچ طرح کے غسل ہیں تو باطن کی ناپاکی کو دور کرنے کے لیے پانچ وقت کی نماز ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَ رَأَیْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهْرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ، یَغْتَسِلُ فِیْهِ كُلَّ یَوْمٍ خَمْسًا، هَلْ یَبْقٰی مِنْ دَرَنِهٖ شَيْءٌ؟" قَالُوْا: "لَا یَبْقٰی مِنْ دَرَنِهٖ شَيْءٌ،" قَالَ: "فَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوٰتِ الْخَمْسِ، یَمْحُوْ اللّٰهُ بِهِنَّ الْخَطَایَا." (الصحیحین، مشکوٰۃ/ص:۵۷/ کتاب الصلوٰۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر نہر جاری ہو، جس میں وہ روزانہ پانچ دفعہ غسل کرتا ہو، تو کیا اس کے جسم پر کچھ میل کچیل باقی رہے گا؟" صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: "بالکل نہیں،" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بالکل یہی مثال ہے پانچ نمازوں کی، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ خطاؤں کو دھوتا اور مٹاتا ہے۔" محدثین فرماتے ہیں کہ نماز کی برکت سے صغائر معاف ہوتے ہیں، کیوں کہ کبائر کی نجاست اتنی غلیظ ہوتی ہے اور اس کے ناپاک اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ اس کا ازالہ سچی پکی توبہ ہی سے ہوسکتا ہے، ہاں، اللہ رب العالمین

کسی کے کبائر کو بھی نماز کی برکت سے معاف کردے تو اس کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔

ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں مسند احمد کا ایک واقعہ ہے کہ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اپنی دکان میں تھے کہ ایک عورت ایک درہم کی کھجوریں خریدنے آئی، تو انہوں نے موقع پا کر اس کا بوسہ لے لیا، کرنے کو تو یہ کام کر گئے، مگر بعد میں خوفِ الٰہی سے بے چین ہو گئے، یہی خاصہ ہے ایمان کا، کہ نیکی سے خوشی اور بدی سے بے چینی ہو، دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر سارا قصہ سنا دیا، آپ ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ''وہ ایک مجاہد کی بیوی تھی، جس کی غیر حاضری میں تم نے یہ خیانت کی،'' حضور ﷺ کی ناراضگی سے انہیں اپنی ہلاکت کا گمان ہونے لگا، اسی وقت وحی کا نزول ہوا:

﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِؕ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾

(هود: ١١٤)

جس میں فرمایا کہ ''رات دن پابندی کے ساتھ نماز قائم کرو، اس کی برکت سے برائیاں معاف کردی جاتی ہیں۔'' سن کر انہوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا یہ حکم صرف میرے لیے ہے؟'' فرمایا: ''نہیں، ساری امت اس میں شامل ہے۔''

(متفق علیہ، گلدستۂ تفاسیر: ۳/۴۱۱، مشکوٰۃ/ص:۵۸، رواہ ابن مسعود)

غرض جس طرح ظاہر کی صفائی کے لیے پانچ غسل ہیں اسی طرح باطن کی پاکی کے لیے پانچ نمازیں ہیں، یہ نمازیں نمازی کے گناہوں کو مٹاتی ہیں اور بندہ کو جنتی بناتی ہیں:

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهٗ، ثُمَّ يَقُوْمُ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلاً عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ وَوَجْهِهٖ، إِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ''. (رواه مسلم، مشكوٰة/ص:٣٩/ كتاب الطهارة)

حدیث شریف میں ہے کہ ''جو مسلمان اچھی طرح وضو کرے، پھر اللہ تعالیٰ کے

حضور کھڑے ہو کر پوری قلبی توجہ اور یکسوئی کے ساتھ دو رکعات (تحیۃ الوضو یا تحیۃ المسجد کی) نماز پڑھے (تو اللہ رب العزت کے نزدیک اس نفل عمل کی بھی اتنی عظمت و قیمت ہے کہ اس کا عامل لازمی طور پر) جنت میں جائے گا۔'' اور جب نفل نماز ادا کرنے کی اتنی فضیلت ہے تو فرض کی کتنی ہوگی۔

نماز میں خشوع اور خضوع پیدا کرنے کے طریقے:

لیکن ظاہر ہے کہ نماز کے یہ سارے فضائل وخصائص اس وقت ہیں جب کہ نماز میں حقیقت اور جان ہو، ورنہ بے دھیانی کی نماز سے خاص کوئی فائدہ نہیں، بقولِ شخصے:

زبان درذکر و دل درفکرِ خانہ ☆ چہ حاصل زیں نمازِ پنج گانہ

اور نماز میں حقیقت اور جان پیدا ہوگی اخلاصِ نیت، اتباعِ سنت اور خشوع وخضوع سے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ'' نماز میں دو لفظ آتے ہیں، خشوع اور خضوع، خشوع ظاہری سکون اور خضوع باطنی سکون کو کہتے ہیں۔ (مجالس مفتی اعظم)

حقیقت یہ ہے کہ نماز کو سکون سے پڑھا جائے تو اس سے دل کو بڑا سکون ملتا ہے، اس لیے قرآن کہتا ہے کہ جو مومن بندے خشوع اور خضوع سے نماز پڑھتے ہیں دارین کی کامیابی ان ہی کے لیے ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ○﴾ (المؤمنون: ١-٢)

''ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے جن کی نماز خشوع اور خضوع والی ہے۔''

اب نماز میں خشوع اور خضوع کیسے پیدا ہوگا؟ تو اس کے مختلف طریقے علماء نے کتاب وسنت کی روشنی میں بیان فرمائے ہیں، منجملہ ان کے کچھ یہ ہیں:

(۱) نماز کے مسائل معلوم کرنے کے بعد نماز کا وقت ہوتے ہی اس کی تیاری شروع کردے اور اذان ہوتے ہی مسجد میں پہنچ جائے، حضرت سعید بن المسیبؒ تابعی

کے بارے میں منقول ہے کہ بیس برس کے طویل عرصہ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اذان کے وقت آپ مسجد میں موجود نہ ہوں۔ (احیاء)

یادرکھو! جو نماز بلا انتظار کے پڑھی جاتی ہے عام طور پر وہ پھس پھسی ہوتی ہے۔

(۲) اس کے بعد حضورِ قلب کے ساتھ اچھی طرح سنت کے مطابق وضو کر کے اس تصور کے ساتھ نماز پڑھے کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں، اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو پھر اس یقین کے ساتھ نماز پڑھے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، حدیث میں ہے:

"أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ، فَإِنَّهٗ يَرَاكَ" (مشکوٰۃ ص:۱۱)

مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے امکان کی حد تک اس کی پوری کوشش کریں اور ہماری نماز ایسی ہو جیسی کہ اس وقت ہوتی جب اللہ رب العزت اپنے پورے جلال و جمال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے اور ہمیں نماز ادا کرنے کا حکم دیتے اور ہم ان کے سامنے کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے، یہ بات اگرچہ اتنی آسان بھی نہیں، لیکن ہم اپنی بساط کی حد تک اس کی کوشش کریں تو اس سے نماز کے خشوع وخضوع میں بہت فرق آئے گا، یا کم از کم یہ سوچ لیا کریں کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں، میں اگرچہ انہیں نہیں دیکھ سکتا، لیکن وہ مجھے دیکھ رہے ہیں اور وہ میری ہر ہر نقل و حرکت سے خوب اچھی طرح واقف ہیں، پھر پوری نماز اسی دھیان وخیال کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کریں کہ میں اپنے رب کے حضور حاضر ہوں اور نماز کے ذریعہ اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرر ہا ہوں، حدیث میں ہے: "إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلّٰى يُنَاجِيْ رَبَّهٗ." (بخاری) "نمازی نماز میں اپنے رب سے ہم کلامی اور راز و نیاز کرتا ہے۔"

حضرت بکر بن عبد اللہؒ فرماتے تھے کہ "اگر تو اپنے مالک سے بلا واسطہ بات کرنا چاہے تو جب چاہے تب کر سکتا ہے"، کسی نے پوچھا: "اس کی کیا صورت؟" فرمایا: "اچھی طرح وضو کر کے نماز پڑھو۔" اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ "اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے بات کرنا چاہے تو نماز پڑھے، لیکن اگر یہ چاہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس سے بات کریں تو قرآن پڑھے۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک کا کانٹیکٹ نمبر ۲،۴،۴،۳،۴ ہے، ان فرض نمازوں کے ذریعہ اس سے بآسانی رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

ایں نمازت تاجِ شاہی می دہد ☆ بل ترا از خود رہائی می دہد
نقد ہستی محو کن تو در نماز ☆ تا بگوئی پیش حق راز و نیاز

یہی نماز شاہی تاج تیرے سر پر رکھتی ہے، بلکہ تجھ کو تجھ سے آزاد کر دیتی ہے، نماز میں اپنی ہستی کی نقدی کو مٹا دے، تا کہ تو اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کی باتیں کرنے لگے۔ لیکن یہ مقام اس وقت میسر ہوسکتا ہے جب کہ نماز عین سنت کے مطابق ادا کی جائے۔

(۳) نماز میں خشوع اور خضوع پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ کر امت کو اس کی تعلیم دی (یعنی حضور ﷺ کی نماز کا جو طریقہ ہمارے فقہاءِ مجتہدین کے ذریعہ کتاب وسنت کی روشنی میں ہم تک پہنچا) بالکل اسی کے مطابق نماز پڑھی جائے۔ حدیث میں ہے:

عَنْ مَالِكِ بْنِ الْحُوَيْرِثِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ، وَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ، ثُمَّ لِيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ". (متفق عليه، مشكوٰة/ص:٦٦)

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں سے فرمایا: "تم نماز ایسی پڑھو جیسی تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا، اور جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے کوئی شخص اذان دے اور جو شخص تم میں سے علم وعمل میں بڑا ہو وہ امام بنے۔"

حضورِ پاک ﷺ کی نماز:

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس طرح منقول ہے:

”يَسْتَفْتِحُ الصَّلٰوةَ بِالتَّكْبِيرِ وَالْقِرَاءَةَ بِالْحَمْدِ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“

آپ ﷺ تکبیر تحریمہ سے نماز شروع فرماتے اور قراءت کا آغاز سورۂ فاتحہ سے فرماتے تھے۔ (جیسا کہ امام اور اکیلے نماز پڑھنے والے کے لیے ہمارے یہاں کتاب وسنت کی روشنی میں یہی حکم ہے)

”وَكَانَ إِذَا رَكَعَ لَمْ يُشْخِصْ رَأْسَهٗ وَلَمْ يُصَوِّبْهُ، وَلٰكِنْ بَيْنَ ذَالِكَ“.

”جب آپ ﷺ رکوع میں جاتے تو سر مبارک کو نہ اوپر کی جانب اٹھاتے اور نہ نیچے کی جانب جھکاتے، بلکہ درمیانی حالت میں رکھتے تھے۔“ (یعنی بالکل کمر کے متوازی)

”وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوعِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ قَائِمًا“.

”اور جب رکوع سے سر مبارک اٹھاتے تو سجدہ میں اس وقت تک نہ جاتے جب تک بالکل سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے۔“

”وَكَانَ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السَّجْدَةِ لَمْ يَسْجُدْ حَتّٰى يَسْتَوِيَ جَالِسًا“.

”اور جب سجدے سے سر مبارک اٹھاتے تو جب تک بالکل سیدھے نہ بیٹھ جاتے دوسرا سجدہ نہ فرماتے۔“

”وَكَانَ يَقُولُ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَحِيَّةَ، وَكَانَ يَفْرِشُ رِجْلَهُ الْيُسْرٰى وَيَنْصِبُ رِجْلَهُ اليُمْنٰى“.

”اور ہر دو رکعات پر التحیات پڑھتے تھے، اور اس وقت اپنے بائیں پاؤں کو نیچے بچھا لیتے اور داہنے پاؤں کو کھڑا کر لیتے تھے۔“ اس حدیث پاک کے اخیر میں ہے:

”وَكَانَ يَخْتِمُ الصَّلٰوةَ بِالتَّسْلِيمِ“. (مسلم، مشکوٰۃ/ص:۷۵/ باب صفة الصلوٰة)

آپ ﷺ ”السلامُ علیکم ورحمة اللّٰه“ کہہ کر نماز ختم فرماتے تھے۔“ اس طرح سکون کے ساتھ سنت کے مطابق نماز پڑھنے سے نماز میں خشوع اور خضوع پیدا ہوتا ہے، اور جو نماز سکون اور سنت کے مطابق ادا نہ کی جائے اس میں نہ خشوع اور خضوع پیدا ہوتا

ہے، نہ وہ قابل اعتبار ہے۔

(۴) علاوہ ازیں نماز میں خشوع اور خضوع پیدا کرنے کا چوتھا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس تصور کے ساتھ نماز پڑھے کہ گویا یہ زندگی کی آخری نماز ہے، یہ تدبیر بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی ہوئی ہے، ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے نصیحت فرمائی تھی کہ "إِذَا قُمْتَ فِيْ صَلوٰتِكَ فَصَلِّ صَلوٰةَ مُوَدِّعٍ". (مشکوٰۃ ص:٤٤٥) مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو رخصت ہونے والے کی طرح نماز پڑھو۔ یعنی جو شخص دنیا کو اور اس کی زندگی کو الوداع کہنے والا ہو اور ہمیشہ کے لیے سب سے رخصت ہونے والا ہو، اس کی نماز جیسی ہونی چاہیے ایسی نماز تم پڑھا کرو، جس کی عملی صورت یہی ہے کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو یہ خیال کریں کہ شاید یہی ہماری آخری نماز ہو اور اس کے بعد کوئی اور نماز ادا کرنے کا موقع نہ ملے، یہ تصور اور خیال کرنا کوئی مشکل کام نہیں، آسان ہے، اس تدبیر سے ان شاء اللہ بے حد نفع ہوگا، نماز میں جان آئے گی اور وہ نماز اللہ تعالیٰ کی مدد کھینچ لائے گی۔

ایک عبرتناک واقعہ:

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور صلحاءِ عظامؒ کی نماز ایسی ہی ہوا کرتی تھی، اس سلسلہ میں حضرت ابو معلق نامی انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کا عبرتناک واقعہ منقول ہے کہ آپ تجارت کی غرض سے اکثر سفر پر رہتے تھے، ایک بار مالِ تجارت لے کر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک ڈاکو نے آ کر پکڑ لیا اور کہا: "تمہارا مال اور جان دونوں لینا چاہتا ہوں" فرمانے لگے: "میری جان لے کر کیا کرو گے؟ مال حاضر ہے، لہٰذا مجھے چھوڑ دو" لیکن وہ نہ مانا، تب آپ نے فرمایا: "ٹھیک ہے، لیکن مجھے نماز کی مہلت دے دو،" ڈاکو نے مہلت دی، تو آپ نے آخری نماز سمجھ کر چار رکعات نماز ادا کی اور آخری سجدہ میں یہ دعا مانگی:

"يَا وَدُوْدُ، يَا وَدُوْدُ، يَا ذَا الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ، يَا فَعَّالاً لِمَا يُرِيْدُ، أَسْأَلُكَ بِعِزِّكَ

الَّذِیْ لَا یُرَامُ، وَبِمُلْكِكَ الَّذِیْ لَا یُضَامُ، وَبِنُوْرِكَ الَّذِیْ مَلَأَ أَرْكَانَ عَرْشِكَ، أَنْ تَكْفِيَنِیْ شَرَّ هٰذَا اللِّصِّ، يَا مُغِيْثُ أَغِثْنِیْ! يَا مُغِيْثُ أَغِثْنِیْ! يَا مُغِيْثُ أَغِثْنِیْ!".

''اے بہت محبت کرنے والے! اے بہت محبت کرنے والے! اے بزرگ عرش والے! اے اپنے ارادے کے مطابق عمل کرنے والے! میں تجھ سے تیری اس عزت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جس کا ارادہ نہیں کیا جا سکتا، اور اس ملک کا وسیلہ دے کر سوال کرتا ہوں جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اور تیرے اس نور کے ذریعہ سوال کرتا ہوں جس نے تیرے عرش کے ارکان کو روشن کیا ہے، کہ مجھے اس ڈاکو کی برائی سے بچالے، اے مدد کرنے والے! میری مدد فرما، اے مدد کرنے والے! میری مدد فرما، اے مدد کرنے والے! میری مدد فرما۔''

ابھی تو صحابی رضی اللہ عنہ کی نماز ختم نہ ہوئی تھی کہ ہاتھ میں نیزہ لیے ایک شہسوار نمودار ہوا اور اس نے ڈاکو کا کام تمام کر دیا۔

(الجواب الکافی لمن سأل عن الدواء الشافی/ص:۱۲، از کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۸۳)

(۵) نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کا ایک اور طریقہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ نماز میں جن چیزوں کو پڑھا جاتا ہے، مثلاً ثناء، سورۂ فاتحہ (اور چند مشہور سورتیں جو عموماً لوگ پڑھتے ہیں) رکوع سجدہ کی تسبیحات اور تشہد، درود کے علاوہ دعاءِ مسنونہ وغیرہ۔ ان سب کا معنی اور مطلب یاد کر کے پھر نماز کے تمام شرائط، سنتوں اور آداب کی حتی الوسع رعایت کرتے ہوئے قراءت، دعا واذکار اور تسبیحات وغیرہ کو اپنی یاد سے نہیں، بلکہ معنی کا دھیان کر کے پڑھے، اور یہ بھی کچھ مشکل نہیں، فکر کی جائے تو چند ہی دنوں میں ان چیزوں کے معانی یاد ہو سکتے ہیں، اس طرح نماز پڑھنے سے نماز میں خشوع اور خضوع پیدا ہوگا اور ثواب میں بھی اضافہ ہوگا۔

غرض نماز میں خشوع اور خضوع پیدا کرنے کے یہ مختلف طریقے ہیں، ان میں مبالغہ کرنے کی تو ضرورت نہیں ہے، البتہ جو طریقہ آسان اور پسندیدہ ہو اپنی بساط کی حد تک

بلا کسی مبالغہ کے اسے اختیار کر کے نماز کو جاندار بنایا جا سکتا ہے۔

ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ ''اگر ہم نے خشوع وخضوع پیدا کرنے کی کوشش کی تو اگرچہ خشوع وخضوع پیدا نہ ہو، مگر کوشش کا ثواب ضرور ملے گا، اس کے بغیر جو نماز ہوگی اس کو اداءِ صلوٰۃ کہیں گے، لیکن جو نماز اپنے وقت میں اہتمام و پابندی کے ساتھ تمام آداب وشرائط کی رعایت کرتے ہوئے خشوع اور خضوع کے ساتھ پڑھی جائے اسے اقامتِ صلوٰۃ کہیں گے، شریعت کا منشا بھی یہی ہے، اسی لیے قرآنِ کریم میں نماز کا حکم لفظِ اقامت کے ساتھ ہی آیا ہے، لہٰذا نماز ادا کرنے سے زیادہ قائم کرنے کی فکر کی جائے، اور زیادہ سے زیادہ رعایت آداب کی فکر کی جائے؛ کیوں کہ جس کی نماز اچھی اس کی زندگی اچھی، جس کی زندگی اچھی اس کی موت اچھی، جس کی موت اچھی اس کی قبر اچھی، جس کی قبر اچھی اس کی آخرت اچھی اور جس کی آخرت اچھی اس کی جنت پکی۔

اللہ تعالیٰ ہماری نماز کو صحیح معنی میں نماز بنا کر اسے ہمارے لیے دارین کی ترقی و نجات کا ذریعہ بنا دے۔ آمین۔

۲۷/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۳ھ

مطابق: ۱۸/ جولائی/ ۲۰۱۲ء

بروز بدھ (بزم صدیقی، بڑودا)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''.

☆......☆......☆

(۶)

حسن عمل کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَـنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ : "إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنۡظُرُ إِلٰی صُـوَرِکُـمۡ وَأَمۡوَالِکُمۡ، وَلٰکِنۡ يَنۡظُرُ إِلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَأَعۡمَالِکُمۡ". (مسلم/کتاب البر والصلة/ص:۲ ۱۷، مشکوٰة:٤٥٤/ باب الرياء والسمعة)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "بلاشبہ حق تعالیٰ (نظر رحمت وعنایت سے) تمہاری صورتوں اور مالوں کونہیں دیکھتے، لیکن اللہ جل شانہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔"

حسن عمل کی حقیقت:

حق تعالیٰ نے اس دنیا کو دارالعمل اور آخرت کو دارالجزاء بنایا، اور انسان بالارادہ جو کام کرتا ہے اسے عمل کہتے ہیں، اب اگر وہ کام شریعت کے دائرے میں ہو، یعنی اخلاصِ نیت، اتباعِ سنت اور استقامت کے ساتھ ہو، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ غفلت کے بجائے سب سے ہٹ کٹ کر اللہ تعالیٰ کی محبت میں ڈوب کر ایک خاص (احسانی) کیفیت کے مطابق ہو، تو خواہ وہ کام چھوٹا ہو یا بڑا، دینی سمجھا جاتا ہو یا دنیوی اور کرنے والا مرد ہو یا عورت اسے "عمل صالح" یا "عمل حسن" یا "مقبول عمل" کہتے ہیں، حق تعالیٰ نے انسانوں

کے لیے اس دنیا میں عارضی زندگی کا سلسلہ ''حسنِ عمل'' ہی کے لیے قائم فرمایا ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك: ٢)

''جس نے موت اور زندگی اس لے پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ بہتر ہے۔'' رب العالمین نے موت وحیات کا مسئلہ تمہاری اس آزمائش کے لیے رکھا ہے، کہ کون عمل میں زیادہ اچھا ہے، اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ نے جس طرح آنکھ دیکھنے کے لیے، کان سننے کے لیے، زبان بولنے اور چکھنے کے لیے، نیز ہاتھ پکڑنے کے لیے، پیر چلنے کے لیے اور دل ودماغ سوچنے سمجھنے کے لیے دیا ہے اسی طرح زندگی حسن عمل کے لیے دی ہے:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾

اگر زندگی نہ ہو تو عمل کیسے اور کس وقت کرے؟ کیوں کہ موت کے بعد کسی کے لیے عمل کا کوئی موقع نہیں رہتا، اسی لیے حق تعالیٰ نے اگر کسی کو زندگی دی تو اس کی قدردانی یہی ہے کہ حسن عمل کا خوب اہتمام والتزام کرے۔

پانچ کو پانچ سے قبل غنیمت جانو:

حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر نصیحت طلب کرنے لگا، تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا:

عَنْ عَمْرِو بْنِ مَیْمُوْنِ الْاَوْدِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِرَجُلٍ وَهُوَ يَعِظُهٗ: ''اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ: شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ، وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقْمِكَ، وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ، وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ، وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ''. (رواه الترمذی مرسلا، مشکوٰۃ/ص:٤٤١/ کتاب الرقاق)

علامہ حالیؒ نے اسے یوں منظوم فرمایا ہے:

غنیمت ہے صحت علالت سے پہلے — فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
جوانی بڑھاپے کی زحمت سے پہلے — اقامت مسافر کی رحلت سے پہلے
فقیری سے پہلے غنیمت ہے دولت — جو کرنا ہو کرلو، تھوڑی ہے مہلت

پانچ کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو!

(۱) جوانی کو بڑھاپے سے پہلے۔ کیوں کہ جوانی جلد ہی ختم ہونے والی ہے، اس کے بعد یا تو بڑھاپا ہے یا موت، اور جو کام جس حسن وخوبی کے ساتھ جوانی میں انجام دیا جاسکتا ہے وہ عموماً دوسری عمر میں نہیں ہوسکتا، اس لیے جوانی میں حسن عمل کا زیادہ اہتمام کرو۔

(۲) تندرستی کو بیماری سے پہلے۔ بیماری کا کوئی وقت متعین نہیں، جیسے کسی بھی عمر میں آدمی مر سکتا ہے، اسی طرح کسی بھی وقت مرض میں مبتلا ہوسکتا ہے، اور جو کام جس حسن وخوبی کے ساتھ تندرستی میں انجام دیا جاسکتا ہے وہ عموماً بیماری میں نہیں ہوسکتا، اس لیے تندرستی میں حسن عمل کا خوب اہتمام کرو۔

(۳) مالداری کو فقیری اور محتاجی سے پہلے۔ مالداری کا بھی کچھ پتہ نہیں کہ کب تک رہے گی، مقولہ مشہور ہے: ”لِأَنَّ الْمَالَ غَادٍ وَرَائِحٌ“ ”مال تو آنے جانے والی چیز ہے۔“

ایک واقعہ:

کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنی اہلیہ کے ساتھ بیٹھ کر عمدہ کھانا کھا رہا تھا کہ کسی فقیر نے خیرات کی صدا لگائی، فقیر کی یہ آواز اسے بہت بری لگی، اسے جھڑک کر دروازے سے دھتکارا، بے چارہ سائل فقیرانہ آیا تھا، صدا دے کر چلا گیا، گردشِ دوراں دیکھئے کہ یہ شخص خود فقیر ہوگیا، مال ودولت جاتا رہا، بیوی کو طلاق دے دی، اس نے کسی اور سے نکاح کرلیا، یہ دونوں میاں بیوی ایک دن عمدہ کھانا کھا رہے تھے کہ ایک فقیر نے صدا لگائی، شوہر نے کہا: ”فقیر کو کھانا

دے آؤ۔" وہ کھانا دے کر واپس ہوئی تو رونے لگی، میاں نے وجہ پوچھی، تو کہا: "فقیر میرا سابقہ شوہر تھا، اس حالت میں اسے دیکھ کر رونا آیا۔" اور سائل کو جھڑکنے کا سابقہ قصہ اسے سنایا، اس کا شوہر بولا: "واللہ! وہ فقیر میں ہی تھا۔" (المستطرف/ص:۱۳۳، از کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۶۴)

لٰہذا مال کا مآل (انجام) معلوم نہیں، آج جب ہے تو اسے کام میں لاؤ اور اس مال سے حسن اعمال کا اہتمام کرو۔

(۴) فراغت (فری وقت) کو مشغولیت سے پہلے۔ فرصت بھی اللہ جل شانہ کی نعمت ہے، بشرطیکہ اس کی قدر کی جائے، لیکن اگر ناقدری کی تو پھر یہی فرصت معصیت کا دروازہ ہے، اور فرصت کو کام میں لانے کا طریقہ یہی ہے کہ اس میں حسن عمل کا اہتمام کیا جائے۔

(۵) زندگی کو موت سے پہلے۔ کیوں کہ اس دنیوی زندگی کا بھروسہ ہی کیا ہے؟ بقولِ شخصے:

کون سا جھونکا بجھا دے گا کسے معلوم؟
زندگی کی شمع روشن ہے، ہوا کے سامنے

صاحبو! اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی گذارنے کے لیے ہمیں نہیں دی، سنوارنے کے لیے دی ہے، دنیا کی یہ عارضی زندگی بہت بڑا سرمایہ ہے جب کہ اسے سنوار لیا جائے، اور زندگی سنورتی ہے حسن عمل سے، لیکن عمل میں حسن آئے گا اخلاصِ نیت اور اتباعِ سنت سے، اس لیے اس کا اہتمام والتزام نہایت ضروری ہے، کہ یہی ہمارا مقصد زندگی ہے۔

بلکہ اگر یہ کہہ دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ "حسن عمل ہی کا نام زندگی ہے۔" اور جو زندگی حسن عمل سے خالی ہو وہ زندگی مردگی (موت) ہے۔

اگر چہ مال وزر ہو مگر ایمان سے محرومی ☆ مجھے وہ زندگی بھی مردگی معلوم ہوتی ہے

حسن عمل ہی سے زندگی بنتی ہے:

آیت کریمہ سے دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں عمل میں تکثیر نہیں، تحسین مطلوب ہے، اس لیے شریعت نے جو اعمال مقرر کیے ہیں ان میں حسن وخوبی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اپنی طرف سے زیادتی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے؛ کیوں کہ انسان کی دارین کی زندگی کا بننا سنورنا حسن عمل پر موقوف ہے، حسن عمل کے بغیر انسان نہ اِس جہاں میں حقیقی کامیابی وترقی حاصل کرسکتا ہے، نہ اُس جہاں میں، کہتے ہیں کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے، نہ ناری ہے

عاجز کا خیالِ ناقص ہے کہ ''عمل صالح'' یا ''حسن عمل'' کے جہاں اور بہت سے دینی، دنیوی اور اخروی فوائد وفضائل قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں، وہاں ایک عظیم الشان انعام یہ ملتا ہے کہ اس کی برکت سے زندگی پاکیزہ بن جاتی ہے، دنیا ہی میں اچھی اور خوشگوار زندگی نصیب ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کی ساری دوڑ دھوپ کا بنیادی مقصد اور ہدف یہی ہے کہ اچھی زندگی ملے، لائف اسٹائل اونچی ہو جائے، یہ پرائمری سے لے کر یونیورسٹیوں تک پڑھنا پڑھانا، اس کے بعد اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنا اور مختلف اعتبار سے دنیوی لائن میں پڑ کر خوب جدوجہد کرنا، ان سب کا مشترکہ مقصد کیا ہے؟ یہی نا کہ اچھی زندگی حاصل ہو، اب اچھی زندگی کے لیے کسی نے یہ سمجھا کہ اچھی تعلیم ہو، یا اچھی ڈگری ہو، یا اچھی تنخواہ ہو، یا اچھی صحت ہو یا ہر طرح کے اسبابِ راحت میسر ہوں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان سارے اسباب کے باوجود آج کی دنیا اچھی اور پرلطف زندگی سے محروم ہے، اس کی لاکھوں مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ اچھی تعلیم، اچھی ڈگری، اچھی تنخواہ، اچھی صحت اور ہر طرح کے اسبابِ راحت تو فراوانی کے ساتھ موجود ہیں مگر آدمی حقیقی لطف وسرور اور اچھی زندگی سے محروم ہے، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھی زندگی کیسے نصیب ہوسکتی ہے؟ حق تعالیٰ کلام پاک میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کے لیے ایمان اور حسن عمل کی ضرورت ہے، فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ (النحل:۹۷)

''جس شخص نے بھی مومن ہونے کی حالت میں نیک عمل کیا ہوگا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔'' اس میں حق تعالیٰ نے ایمان اور حسن عمل پر صرف اچھی زندگی کی بشارت ہی نہیں دی، بلکہ ضمانت بھی لی ہے، اور اس کی ہزاروں نہیں، لاکھوں مثالیں ہیں کہ جنہوں نے واقعی ایمان اور حسن عمل والی زندگی اختیار کی، انہیں اچھی زندگی ملی اور ان کی دنیوی زندگی بھی پر لطف بن گئی۔

حسن عمل کی برکت سے حقیر انسان بھی عزیز بن جاتا ہے:

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا بظاہر معمولی اور حقیر انسان بھی ایمان اور حسن عمل کی وجہ سے دونوں جہاں میں عزیز بن جاتا ہے اور کامیابی اس کے قدم چومنے لگتی ہے، چناں چہ سید المؤذنین ابوعبداللہ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ جو اگر چہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تھے، مگر حبشی نژاد (نسل کے) غلام ہونے کی وجہ سے عجمی لوگوں میں شمار ہوتے تھے، آپ کا رنگ تو کالا تھا، مگر دل نہایت اجلا اور پاک وصاف تھا، آپ بظاہر ذاتی ومالی اعتبار سے بہت معمولی تھے، جاہلی سماج میں اس قسم کے لوگ ہی اکثر ظلم وستم کا شکار ہوتے ہیں، سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں قبولِ اسلام کے بعد عرب کے جاہلی سماج میں یہی معاملہ ہوا، آپ پہلے عبداللہ ابن جدعان کی ملکیت میں بکریاں چرانے پر مامور تھے، اس نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ ''بلال کے ساتھ تمہارا جس طرح دل چاہے سلوک کرو۔'' اس کے بعد آپ کو طرح طرح کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں، مگر شدید ابتلاء کا دور اس وقت شروع ہوا جب ابن جدعان کے بعد آپ امیہ بن خلف کی غلامی میں آئے، وہ ظالم سزا دینے کے نت نئے طریقے سوچتا اور سزا دیتا، کبھی کبھی ان کی گردن میں رسی ڈال کر لڑکوں کے ہاتھ میں دے دیتا تھا، تو وہ آپ کو مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے جس سے گلے پر رسی کے نشان ہو جاتے اور دم گھٹنے لگتا، مگر آپ کی زبان پر اس وقت بھی نغمۂ توحید مچلتا رہتا تھا: ''أَحَدٌ أَحَدٌ''

ایک روز اس حالت میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ کو دیکھا تو دل بھر آیا اور ایک گراں قدر قیمت امیہ کو دے کر ان کو آزاد کر دیا، اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے لگے، آپ کی آواز نہایت بلند اور دلکش تھی، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذنِ خاص بن گئے، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور حسن عمل کی برکت سے انہیں اس قدر عزت اور عظمت ملی کہ فتح مکہ کے دن آپ رحمت عالم ﷺ کے ہم رکاب تھے اور آپ ﷺ کے حکم سے اس دن کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر توحید کی صدا بلند فرمائی، اذان دی۔ (سیرۃ الصحابۃ: ۲/۲۱۰)

یہ کوئی معمولی عزت اور شرف کی بات ہے؟ سچ ہے:

حسن عمل کی چنگاری جس دل میں فروزاں ہوتی ہے
اس لب کا تبسم ہیرا ہے، اس آنکھ کا آنسو موتی ہے

امیر المؤمنین خلیفۃ المسلمین سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ آپ کے متعلق فرماتے تھے کہ ”أَبُوْ بَكْرٍ سَيِّدُنَا أَعْتَقَ سَيِّدَنَا.“ کہ ابوبکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) کو آزاد فرمایا۔ (سیرۃ الصحابہ: ۲/۲۱۳)

معلوم ہوا کہ ایمان اور حسن عمل نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو غلامی اور پستی سے اٹھا کر سرداری و کامیابی کی منزلِ مقصود جنت تک پہنچا دیا، جب کہ ان کے آقا امیہ بن خلف کو بے ایمانی اور بدعملی نے جہنم رسید کر دیا، صحیح کہا ہے کہنے والے نے:

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے ☆ کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے

حضرت زاہر بن حرام رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

اسی طرح روایت میں حضرت زاہر بن حرام رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے کہ آپ شکل وصورت کے اعتبار سے قبولِ صورت نہیں تھے، مگر حضور ﷺ سے بڑی

محبت رکھتے تھے، جب بھی تشریف لاتے اپنے گاؤں کی کوئی نہ کوئی چیز ہدیے میں حضور ﷺ کے لیے لاتے تھے اور حضور ﷺ اسے بخوشی قبول فرما کر انہیں بھی واپسی پر کوئی نہ کوئی چیز ہدیہ میں پیش فرماتے، آپ ﷺ ارشاد فرماتے کہ ''إِنَّ زَاهِـرًا بَادِيَتُنَا، وَنَحْنُ حَاضِرُوهُ''. ''زاہر ہمارے دیہاتی ہیں، مراد یہ کہ ہمارے لیے دیہات کی چیزیں لاتے ہیں، اور ہم ان کے شہری ہیں، تو ہم انہیں شہری چیزیں پیش کرتے ہیں۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ حضرت زاہر بن حرام مدینہ کے بازار میں اپنا سامان بیچ رہے تھے، تبھی حضور ﷺ نے انہیں پیچھے سے آکر دبالیا، انہوں نے پوچھا: ''کون ہے؟ مجھے چھوڑ دو''، مگر جب کنکھیوں سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ ہیں، تو موقع غنیمت جان کر اپنی پشت حضور ﷺ کے سینے سے لگا دی، آپ ﷺ نے مزاحاً فرمایا: ''اس غلام کو کون خریدتا ہے؟'' اس پر انہوں نے عرض کیا: ''وَاللّٰهِ تَجِدُنِي كَاسِدًا'' حضور! اللہ کی قسم، مجھ (دیہاتی بدصورت) کو آپ کھوٹا پائیں گے، تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''لٰكِنْ عِنْدَ اللّٰهِ لَسْتَ بِكَاسِدٍ''. (مشکوٰۃ / ص: ٤١٦ / باب المزاح) ''لیکن اللہ کے نزدیک تم کھوٹے نہیں، بلکہ تمہارا بڑا مقام ہے۔''

تو بگڑی ہوئی زندگی حسن عمل سے سنور جاتی ہے، جیسا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور صلحاء کی سنور گئی، ہماری بھی سنور سکتی ہے، بہرحال اچھی زندگی اچھے عمل سے ملتی ہے، اور حسن عمل کے بغیر اچھی خاصی عزت والی زندگی بھی برباد ہو جاتی ہے، جیسا کہ کافر بادشاہوں اور مشرکوں کا انجام ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان ہی سے خوش ہوتے ہیں جو حسن عمل کا اہتمام کرتے ہیں:

قرآن وحدیث کے مطابق عزت کا اصل معیار ایمان اور حسن عمل ہے، لہٰذا فرمایا:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۳)

''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت، عظمت اور کرامت اسے حاصل ہے جس کی زندگی میں تقویٰ اور حسن عمل ہے۔'' حدیث مذکور میں فرمایا:

”إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ“.

”حق تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں، بلکہ دلوں کے احوال اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔“ مطلب یہ ہے کہ جس کے احوال واعمال اچھے ہیں حق تعالیٰ اس سے محبت کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں؛ کیوں کہ اس کے یہاں مقبولیت کا معیار شکل وصورت اور مال ودولت نہیں، بلکہ حسن نیت اور حسن عمل پر مدار ہے، دنیا میں حسن وجمال کا چلن ہے تو دنیا بنانے والے کے یہاں حسن نیت واعمال کا وزن ہے، اور اس کی محبت ورضا کا ضابطہ یہ ہے کہ وہ رب العالمین ہے، صرف رب المؤمنین، رب المسلمین اور رب الاولیاء والمتقین ہی نہیں، ساری کائنات کی مخلوق کا رب اور پالنہار ہے، اور اپنی پالی ہوئی چیز سے ہر ایک محبت کرتا ہے، حق تعالیٰ تو ساری کائنات کا خالق بھی ہے اور پالنہار بھی، اس لیے وہ اپنی ساری ہی مخلوق سے محبت کرتا ہے، لیکن خوش ان ہی لوگوں سے ہوتا ہے جو حسن عمل کا اہتمام کرتے ہیں، حضرت اکبر الٰہ آبادیؒ نے کیا خوب کہا ہے:

قرآن ہے شاہد، خدا حسن سے خوش ہوتا ہے
کس حسن سے؟ یہ بھی تو سنو حسن عمل سے

حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا قَالَ: ”يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ؟“ قَالَ: ”مَنْ طَالَ عُمُرُهٗ وَحَسُنَ عَمَلُهٗ“، قَالَ: ”فَأَيُّ النَّاسِ شَرٌّ؟“ قَالَ: ”مَنْ طَالَ عُمُرُهٗ وَسَاءَ عَمَلُهٗ“. (رواه أحمد والدارمی، مشکوٰة/ص: ٤٥٠/ باب استحباب المال والعمر للطاعة)

ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ فرمایا: ”جسے طولِ عمر کے ساتھ حسن عمل کی توفیق مل جائے“، یعنی جس کی عمر بھی زیادہ ہو اور عمل بھی بڑھیا ہو، اور برا وہ ہے جسے طولِ عمر یعنی لمبی زندگی تو ملی، مگر حسن عمل کا اس

نے اہتمام نہ کیا، بلکہ بدعملی میں زندگی گذاردی۔العیاذ باللہ العظیم۔
تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔

حسن عمل کی جزا خالق جنت کی زیارت:

اس کے برخلاف حق تعالیٰ نے حسن عمل والوں سے خوش ہو کر مزید (انعاماتِ اخروی) کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ (یونس: ۲۶)

"جن لوگوں نے بہتر کام کیے ہیں بہترین حالت انہیں کے لیے ہے اور اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی۔" یعنی جنہوں نے (دنیا کی زندگی میں) حسن عمل کا اہتمام کیا ان کے لیے (آخرت اور جنت میں) بھلائی وزیادتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حسن عمل کی جزا نری جنت ہی نہیں، بلکہ خالق جنت کی زیارت بھی ہے؛ کیوں کہ اس آیت کی تفسیر جو خود مفسر اعظم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی وہ یہ ہے کہ اس جگہ "اَلْحُسْنٰى" یعنی اچھے بدلہ سے مراد تو جنت ہے اور "زِيَادَةٌ" سے مراد حق تعالیٰ سبحانہ کی زیارت ہے جو اہل جنت کو حاصل ہوگی، جنت کی اتنی حقیقت سے تو ہر مسلمان واقف ہے کہ وہ ایسی راحتوں، لذتوں اور نعمتوں کا مرکز ہے جس کا اس فانی دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن جنت کی سب سے بڑی نعمت خالق جنت کی زیارت ہے، چناں چہ صحیح مسلم کی روایت ہے:

عَنْ صُهَيْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ، يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: "تُرِيْدُوْنَ شَيْئًا أَزِيْدُكُمْ،" فَيَقُوْلُوْنَ:" أَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوْهَنَا، أَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ، وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ،" قَالَ:" فَيُرْفَعُ الْحِجَابُ، فَيَنْظُرُوْنَ إِلٰى وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى، فَمَا أُعْطُوْا شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلٰى رَبِّهِمْ،" ثُمَّ تَلا: ﴿لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ (مشکوٰۃ/ص: ۵۰۰/ باب رؤية اللّٰه تعالىٰ/ الفصل الأول/حديث قدسى: ۱)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ "جب

اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو حق تعالیٰ ان سے خطاب فرمائیں گے: ’’کیا تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو بتلاؤ ہم اس کو بھی پورا کر دیں گے‘‘ اہل جنت جواب دیں گے: ’’الٰہی! آپ نے ہمارے چہرے روشن کیے، ہمیں جنت میں داخل فرمایا، جہنم سے نجات دی، اس سے زیادہ اور کیا چیز طلب کریں؟‘‘ اس وقت درمیان سے حجاب (پردہ) اٹھا دیا جائے گا اور سب اہل جنت حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے، تب معلوم ہوگا کہ جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت تھی، جس کی طرف ان کا دھیان بھی نہیں گیا تھا، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لِلَّذِينَ أَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰى وَزِيَادَةٌ﴾

صاحبو! حسن عمل کی اس خالق جنت کی زیارت کے علاوہ اور کوئی جزا نہ ہو تب بھی یہ کافی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ حسن عمل کی برکت سے فانی دنیا کی اس عارضی زندگی کو بھی جنت کا نمونہ بنا دیتا ہے، بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم کتاب وسنت میں موجود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سچے وعدوں پر یقین رکھیں اور ایمان وحسن عمل والی زندگی اختیار کریں۔

حق تعالیٰ ایمان اور حسن عمل سے ہماری زندگی آراستہ فرما کر ہمیں فلاحِ دارین نصیب فرمائیں۔ آمین۔

یومِ عاشوراء/۱۴۳۳ھ
مطابق: ۶/ دسمبر/ ۲۰۱۱ء
بروز منگل (بزم صدیقی)

’’اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اَنۡزِلۡهُ الۡمَقۡعَدَ الۡمُقَرَّبَ عَنۡدَكَ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ‘‘.

☆......☆......☆

(۷)

استقامت کی اہمیت اور فضیلت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ سُفۡيَانَ بۡنِ عَبۡدِ اللّٰهِ الثَّقَفِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: "قُلۡتُ: "يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ! قُلۡ لِيۡ فِي الۡإِسۡلَامِ قَوۡلًا لَا أَسۡأَلُ عَنۡهُ أَحَدًا بَعۡدَكَ" (وَفِيۡ رِوَايَةٍ: "غَيۡرَكَ") قَالَ: "قُلۡ اٰمَنۡتُ بِاللّٰهِ، ثُمَّ اسۡتَقِمۡ". (رواه مسلم، مشكوة/ص:۱۲/ كتاب الإيمان)

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: حضور! ''مجھے تکمیل اسلام کے بارے میں کوئی ایسی جامع اور کافی وشافی بات ارشاد فرما دیجئے کہ آپ کے بعد پھر میں کسی سے نہ پوچھوں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''زبان اور دل سے سچائی کے ساتھ کہو کہ میں اللہ جل جلالہ پر ایمان لایا، پھر اس پر اچھی طرح قائم رہو۔'' (اس اقرار پر استقامت اختیار کرو، یعنی ایمان باللہ کے بعد ایمانی مقتضیات اور شریعت پر استقامت کے ساتھ عمل کرو، تو یہ حصولِ سعادت وفلاحِ دارین کے لیے کافی ہے)

مسلمانوں کے تین طبقے:

اس وقت دنیا میں ایمان، اعمال اور ان پر پابندی واستقامت کے لحاظ سے مسلمانوں کے تین طبقے ہیں، ایک طبقہ تو وہ ہے جس کی زندگی دین وایمان اور اعمال و

استقامت والی ہے، یعنی شریعت کے احکام کی مکمل اطاعت، پابندی اور وفاداری والی ہے، اس طبقہ کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ان کو فکر و اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں، اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے ان سے پورے طور پر بچتے ہیں، لیکن کبھی نفس وشیطان کے بہکاوے میں آکر کوئی غلطی یا گناہ ہو جاتا ہے تو اس وقت سچی توبہ کر کے پھر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تابعداری اور وفاداری والی زندگی گذارنے لگتے ہیں، اس طبقہ کی تعداد اگرچہ بہت ہی کم ہے، تاہم ابھی یہ امت ایسے وفادار اور فرماں بردار لوگوں سے خالی نہیں، قریب قریب ہر خطہ وعلاقہ میں کچھ نہ کچھ ایسے مطیع و مستقیم بندے موجود ہیں، اور اصلی، حقیقی اور کام کے مسلمان دراصل یہی ہیں جو ارشادِ ربانی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ (حم السجدة : ۳۰)

اور مذکور حدیث نبوی "قُلْ: "اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ" ثُمَّ اسْتَقِمْ" کے مصداق ہیں۔

ان کے مقابلے میں ایک بہت بڑی تعداد مسلمان کہلانے والوں میں اب ان لوگوں کی ہے جو صرف پیدائشی، موروثی، خاندانی اور نسلی اعتبار سے تو مسلمان ہیں، لیکن اسلام سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں، صرف نام ہی کے مسلمان ہیں، ورنہ انہیں نہ یہ جاننے کی فکر ہے کہ اسلام کیا ہے؟ اور ہم سے اسلام کیا چاہتا ہے؟ اور نہ ان کی عملی زندگی میں احکام اسلامی کی کوئی پابندی ہے، ان لوگوں کے مسلمان ہونے کا مطلب بس اتنا ہی ہے کہ یہ اسلام کے منکر نہیں اور دین اسلام کو سچا دین سمجھتے ہیں، گویا زبانی طور پر اقرار کرتے ہیں، کہ "رَبُّنَا اللّٰهُ" لیکن اس کے آگے "ثُمَّ اسْتَقَامُوا" پر عمل نہیں، یعنی ایمانی تقاضوں کے مطابق اعمال ہیں نہ احکامِ شریعت پر استقامت و پابندی ہے، ان کی یہ حالت لائق صد افسوس ہے۔ انہوں نے اگر اپنی یہ غلط روِش نہ بدلی تو فتنۂ ارتداد کے اس دور میں ان کے ایمان سے محروم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

ان دو طبقوں کے علاوہ مسلمانوں میں ایک تیسرا اور درمیانی طبقہ وہ ہے جس کی

زندگی میں الحمدللہ ایمان اور اعمال دونوں ہیں، مگر احکامِ شریعت پر استقامت اور پابندی نہیں ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی پسند کے بعض اعمال واحکام پر عمل بھی کرتے ہیں، لیکن ایک سچے مسلمان کی طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ہر حکم پر چلنے کو اور زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کی پیروی کرنے کو انہوں نے اپنا اصولِ زندگی نہیں بنایا، اس لیے بہت سے کام وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے خلاف بھی کرتے ہیں، مثلاً نماز پڑھتے تو ہیں، مگر اہتمام اور استقامت سے پانچوں وقت کی نہیں پڑھتے، یا مثلاً نماز پڑھتے ہیں تو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، یا روزے بھی رکھتے ہیں اور رشوت سے بھی نہیں بچتے، یا عبادات کا اہتمام کرتے ہیں تو معاملات ٹھیک نہیں، الغرض شریعت پر استقامت نہیں، ظاہر ہے کہ عام مسلمانوں کی یہ حالت اور روِش اللہ جل شانہ کو ہرگز پسند نہیں، جس کی وجہ سے وہ مجموعی اور عمومی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نصرت سے اس دنیا میں محروم ہیں، انہیں آخرت کی محرومی سے ڈرنا چاہیے۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک بہت ہی نصیحت آموز واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سری سقطیؒ کہیں جا رہے تھے، دوپہر کا وقت تھا، لہٰذا قیلولہ کی نیت سے ایک درخت کے نیچے سو گئے، اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ کچھ دیر سونے کے بعد جب ان کی آنکھ کھلی تو انہیں اسی درخت سے ایک آواز سنائی دی، (حق تعالیٰ اپنی قدرت سے ہماری عبرت کے لیے کبھی کبھی ایسے واقعات رونما کر دے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے) درخت حضرت سے کہہ رہا تھا: ”يَا سَرِيُّ! كُنْ مِثْلِيْ“ اے سری! آپ میری طرح ہو جائیے، حضرت اس آواز سے بڑے حیران ہوئے، پوچھا: ”كَيْفَ أَكُوْنُ مِثْلَكَ؟“ میں تیری طرح کس طرح بن سکتا ہوں؟ تو درخت سے آواز آئی کہ مجھ میں ایک زبردست صفت ہے، اسے اختیار کر لیجئے، وہ صفت یہ ہے کہ ”إِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَنِيْ بِالْأَحْجَارِ أَرْمِيْهِمْ بِالْأَثْمَارِ“. جو میری طرف پتھر

چھینکتے ہیں میں انہیں پھل دیتا ہوں، لہٰذا آپ بھی میری طرح ہوکر بداخلاقی کا جواب خوش اخلاقی سے اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں، بلکہ پھول سے دیا کیجئے گا، آپؒ اس بات سے بہت متاثر ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ آپ کے دل میں ایک عجیب وغریب خیال آیا کہ درخت کی اس بہترین خوبی اور صفت کے باوجود آخر کیا بات ہے کہ حق تعالیٰ نے اسے آگ کی غذا بنادیا؟ آپ نے دریافت کیا: ”فَكَيْفَ مَصِيْرُكَ إِلَى النَّارِ“ ؟ یہ بتا! اللہ تعالیٰ نے تجھے آگ کی غذا کیوں بنادیا؟ درخت نے عرض کیا: ”حضرت! اس کی حکمت تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر اس خوبی کے ساتھ ایک خامی بھی ہے، وہ یہ کہ ”مِلْتُ بِالْهَوَاءِ هٰكَذَا وَهٰكَذَا“ جدھر کی ہوا چلتی ہے میں ادھر کو ڈول جاتا ہوں، یعنی میرے اندر استقامت نہیں ہے۔ (شاید اسی کے نتیجہ میں مجھے آگ کی غذا بنادیا گیا) (مستفاد از: بکھرے موتی: ۵/۱۷۴)

جن لوگوں کے ایمان واعمال میں استقامت نہیں انہیں اس واقعہ سے یہ نصیحت لینی چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حق تعالیٰ استقامت کا وصف نہ ہونے کے سبب قیامت کے دن نارِ دوزخ کی غذا بنادے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

استقامت پر جنت کی بشارت:

صاحبو! اللہ جل شانہ کو وہی لوگ پسند ہیں جو ایمان واستقامت والی زندگی بسر کرتے ہیں، اور جو اوقات کی حفاظت اور اعمال میں استقامت اختیار کرتے ہیں ان کے لیے قرآن وحدیث میں بڑی بشارتیں آئی ہیں، قرآن پاک میں فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ جن خوش نصیب لوگوں نے اللہ جل جلالہ کو اپنا مالک ومعبود مان کر اس کی فرماں برداری والی زندگی گذارنے کا اقرار کرلیا، یعنی ایمان لانے کے بعد اس کے تقاضوں پر چلنا طے کرلیا، ﴿ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ پھر اس اقرار اور فیصلہ کے مطابق زندگی گذاری، یعنی استقامت کے ساتھ شریعت پر چلتے رہے، تو چوں کہ استقامت والا عمل اللہ تعالیٰ کو بہت ہی

زیادہ پسند ہے، خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ حدیث میں ہے:

عَـن عَـائِشَةَ رَضِـيَ اللّٰهُ عَنهَا قَالَتُ قَالَ رَسُوُلُ اللّٰهِ ﷺ:" أَحَبُّ الْأَعُمَالِ إِلی اللّٰهِ أَدُوَمُهَا، وَإِنُ قَلَّ". (متفق علیه، مشکوٰة/ص: ۱۱۰/ باب القصد فی العمل)

''اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جو پابندی سے کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔'' آداب وشرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے استقامت کے ساتھ جو لوگ عمل کرتے ہیں ان کے لیے یہ خوشخبری ہے کہ:

﴿تتنزَّلُ عَلَيُهِمُ الُمَلٰئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوُا وَلَا تَحُزَنُوُا وَأَبُشِرُوُا بِالُجَنَّةِ الَّتِيُ كُنتُمُ تُوُعَدُوُنَ﴾ (حٰمٓ السجدة : ۳۰)

''فرشتے ان کے لیے یہ پیغام الٰہی لاتے ہیں کہ مطمئن ہو جاؤ، تمہارے لیے کوئی خوف اور غم کی بات نہیں؛ کیوں کہ تمہاری منزل جنت ہے۔'' جہاں اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کی رحمت اور خیر ہی خیر ہے۔ اب یہ بشارت فرشتے کس وقت سناتے ہیں؟ تو اس سلسلہ میں مفسرین کی دو رائے ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ جو بندے ایمان اور استقامت والی زندگی بسر کرتے ہیں انہیں موت کے وقت فرشتے یہ بشارت سناتے ہیں، یا قبر اور حشر میں سنائیں گے اسی کو ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿يَـٰٓأَيَّتُهَـا النَّفُسُ الُمُطُمَئِنَّةُ ٥ ارُجِعِيُ إِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرُضِيَّةً ٥ فَادُخُلِيُ فِيُ عِبَادِيُ٥ وَادُخُلِيُ جَنَّتِيُ٥﴾ (الفجر: ۲۷ تا ۳۰)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بشارت موت کے وقت سنائی جائے گی۔ لیکن مفسرین کی دوسری رائے یہ ہے کہ اس بشارتِ ربانی کو موت اور قبر وحشر کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ اس دنیوی زندگی میں بھی اصحابِ استقامت کے دلوں میں فرشتے من جانب اللہ یہ خیالات ڈالتے ہیں کہ تمہاری اصل منزل جنت ہے، جہاں اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت اور ہر طرح کی راحتیں ونعمتیں ہیں، جس سے انہیں اطمینان اور شرحِ صدر کی دولت نصیب ہوتی ہے، اور ان کے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، اور پھر ان کی

موت کے وقت اور قبر وحشر میں بھی خوشخبریوں کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، جیسا کہ آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿ نَحۡنُ أَوۡلِيَآؤُكُمۡ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِي الۡاٰخِرَةِ﴾ (حم السجدة : ۳۱)

یعنی فرشتے ایمان واستقامت پر جنت کی بشارت سنانے کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''ہم اس دنیا میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی ہماری تمہاری رفاقت میں رہیں گے۔'' اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل استقامت کو یہ بشارت فرشتے اس دنیوی زندگی میں بھی دیتے ہیں، بالخصوص موت کے وقت، یہ اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ایمانی سفر میں سخت سے سخت حالات بھی ان کے پائے استقلال میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتے۔

ایک واقعہ:

حیاۃ الصحابہ والصلحاء میں اس قسم کے بے شمار واقعات ملتے ہیں، مثلاً حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کے مناقب میں لکھا ہے کہ دورِ فاروقی میں ایک مرتبہ رومیوں سے جنگ کے دوران آپ چند مسلمانوں کے ساتھ گرفتار ہوگئے، شاہِ روم نے ان سے کہا کہ آپ نصرانی بن جائیں تو میں آپ کو اپنی حکومت میں شریک کرلوں گا، لیکن حضرت نے انکار کردیا، جس کی وجہ سے اس نے آپ کو تختۂ دار پر باندھ کر حکم دیا کہ ان پر تیر برسائے جائیں، لیکن جب دیکھا کہ ان پر کسی قسم کے خوف کے آثار نہیں ہیں، تو انہیں وہاں سے اتار کر کھولتے ہوئے گرم پانی کی دیگ میں ڈال دینے کا حکم دیا، جب انہیں دیگ کے قریب لے جایا گیا تو آپ رونے لگے، وجہ پوچھی گئی، تو فرمایا: ''میری تمنا ہے کہ میری سو جانیں ہوں اور ہر جان کو اس طرح اپنے رب کے حضور پیش کر کے حاضر ہوں'' یہ سن کر شاہِ روم کو حیرت بھی ہوئی اور عقیدت بھی، کہنے لگا: ''تم صرف میرے سر کو بوسہ دے دو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا'' فرمانے لگے: ''صرف مجھے نہیں، بلکہ میرے ساتھیوں کو بھی'' اس نے کہا: ''ٹھیک ہے'' تب آپ نے اس کے سر کو بوسہ دیا اور تمام مسلمانوں کو قید

سے آزاد کرادیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے سر کو بوسہ دیا۔ (الاصابہ:۲/ ۲۹۶،از: کتابوں کی درسگاہ میں ص:۶۱)

غرض یہ اسی بشارت کا اثر ہوتا ہے جو انہیں فرشتے دیتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں، موت تمہاری ساری مصیبتوں کو ختم کر دے گی، اس کے بعد آگے جنت میں تمہاری ہر خواہش و فرمائش پوری کی جائے گی:

﴿ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ﴾ (فصلت : ۳۱)

جنت میں تمہیں ایسی زندگی دی جائے گی جس کے بعد موت نہیں، ایسی جوانی دی جائے گی جس کے بعد بوڑھاپا نہیں، ایسی صحت وتندرستی دی جائے گی جس کے بعد بیماری نہیں، ایسی خوبصورتی دی جائے گی جو کبھی زائل نہ ہوگی، ایسی خوشی دی جائے گی جو کبھی ختم نہ ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی ایسی رضا نصیب ہوگی جس کے بعد کبھی ناراضگی نہیں، اور یہ سب کچھ تمہاری خدمت میں رب العالمین کی طرف سے اس طرح پیش کیا جائے گا جس طرح کسی کریم میزبان کی طرف سے عزیز مہمان کے لیے پیش کیا جاتا ہے:

﴿ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ﴾ (فصلت : ۳۲)

شریعت کا راستہ استقامت اور استغفار سے طے ہوگا:

اِن آیاتِ مبارکہ میں حق تعالیٰ نے استقامت پر جنت کی بشارت سنا کر اصل میں اس بات کی ترغیب دی کہ تم بھی اگر حقیقی کامیابی چاہتے ہو تو اپنی زندگی ایمان واستقامت والی بنالو، اسی کی ترغیب مذکور حدیث میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دی ہے کہ "قُلْ: "اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ" ثُمَّ اسْتَقِمْ" ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ حدیث مذکور اسی آیت کریمہ سے ماخوذ اور مقتبس ہے۔ (مرقاۃ شرحِ مشکوۃ/ص۸۴)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ توحید باری کا اقرار کرنے کے بعد زندگی کے ہر شعبہ میں طاعت الٰہی کا اہتمام کرو، اور پوری زندگی شریعت پر اپنی استطاعت اور طاقت کے مطابق

استقامت کے ساتھ چلو، اس کے باوجود اگر اس میں کوئی کمی اور کوتاہی ہو جائے تو فوراً ہی استغفار کرو، اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت طلب کرو، یہی حکم ربانی ہے:

﴿ فَاسْتَقِيْمُوْا إِلَيْهِ وَ اسْتَغْفِرُوْهُ ﴾ (فصلت : ٦)

صاحبو! شریعت کا یہ راستہ اسی طرح استقامت اور استغفار سے طے ہوتا ہے، اسی لیے حق تعالیٰ نے استقامت کے ساتھ ہی استغفار کا بھی حکم دیا کہ اس سے منزل آسان ہو جاتی ہے، اور جو لوگ راہِ شریعت وطریقت طے کر کے منزلِ مقصود تک پہنچے وہ اسی طرح پہنچے۔ بقولِ شاعر:

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے

استقامت کے درجات:

پھر علماءِ محققین فرماتے ہیں کہ استقامت کے مختلف درجات ہیں: (۱) اعلیٰ درجہ۔ (۲) ادنیٰ درجہ۔ استقامت کا اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ ایمان باللہ کے بعد اپنے ایمان، اعمال، اخلاص، اخلاق، عبادات، معاملات، معاشرت، تجارت غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی قائم کردہ حدود پر باقی رہنا، یعنی پورے دین اور شریعت پر استقامت اور پابندی سے عمل کرنا۔

یہ استقامت کا وہ درجہ ہے جس کے متعلق ہمارے اکابر صوفیہ نے فرمایا ہے کہ: ’’اَلِاسْتِقَامَةُ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ كَرَامَةٍ‘‘. (مرقاة المفاتيح/ص:٨٤) یعنی استقامت ہزاروں کرامتوں سے بہتر و بالاتر ہے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور صلحاء کو استقامت کا یہی اعلیٰ درجہ حاصل تھا، لیکن استقامت کا یہ اعلیٰ درجہ حاصل کرنا سب کے بس کی بات نہیں، اسی لیے کہتے ہیں کہ استقامت کے ساتھ شریعت پر چلنا پل صراط پر چلنے کے مترادف (ہم معنیٰ) ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث میں خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے استقامت کا حکم دیتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا:

" اِسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا". (رواه ابن ماجه والدارمی وأحمد، مشكوة / ص:۳۹ / كتاب الطهارة)

محدثین فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ استقامت کا حق ادا کرنا، اس کی انتہاء کو پہنچنا اور اس کا اعلیٰ درجہ پالینا بظاہر سب کے لیے آسان نہیں ہے۔

لہٰذا تم جس قدر استقامت اختیار کر سکتے ہو کرو، یہ مامور بہ ہے، ورنہ اس میں تعمق اور مبالغہ کرنا محمود تو ہے، مامور بہ نہیں، چناں چہ قرآنِ کریم نے تقویٰ کے باب میں حکم فرمایا:

﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آل عمران : ۱۰۲)

جیسے علماءِ مفسرین کے نزدیک یہاں ﴿حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ سے مراد تقویٰ کا وہ درجہ ہے جو استطاعت میں ہو، ایسے ہی یہاں بھی علماءِ محدثین کے نزدیک یہاں وہ استقامت مراد ہے جو اپنے اختیار اور استطاعت میں ہو، اور وہ ہے استقامت کا ادنیٰ درجہ، جس میں ایمان باللہ کے بعد اس پر باقی رہنا ضروری ہوتا ہے، یعنی دل سے توحید و رسالت کا اقرار کرنے کے بعد پھر موت تک اس پر قائم رہنا، یہ استقامت کا ادنیٰ درجہ ہے، جو بحمد اللہ ہم سب مسلمانوں کو حاصل ہے، کیوں کہ ہم نے کلمہ پڑھ کر اور اسلام کو اپنا دین بنا کر دل سے مانا اور زبان سے اس کا اقرار کیا کہ ﴿رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ اللہ وحدہ لاشریک لہٗ ہمارا خالق و مالک اور معبود ہے، ہم اس کے بندے ہیں اور بندگی ہمارا مقصد زندگی ہے، اس طرح گویا پہلا مرحلہ ہم نے طے کر لیا اور استقامت کا ادنیٰ درجہ حاصل کر لیا، اب دوسرا مرحلہ ﴿ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ کا ہے، یہ مرتے دم تک کا ہے، اگر ہم ہمت کر کے سچے دل سے ارادہ کر لیں کہ شریعت پر چلیں گے، اسی پر جئیں گے اور مریں گے، اگر اس میں کوئی کوتاہی ہوئی یا دشواری پیش آئی تو استغفار اور صبر سے کام لیں گے، تو ان شاء اللہ شریعت پر استقامت سے چلنا آسان ہو جائے گا، پھر اس کے اثرات و ثمرات اور برکات آخرت سے پہلے اس دنیا میں بھی ہم محسوس کریں گے۔

حق تعالیٰ استقامت کا اعلیٰ درجہ ہم سب کو عطا فرمائیں۔ آمین۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

(۸)

جہیز کا مروّجہ طریقہ اور اس کی تباہ کاریاں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِ اللّٰهِ بنِ مَسۡعُوۡدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ”یَا مَعۡشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسۡتَطَاعَ مِنۡكُمُ الۡبَاءَةَ فَلۡيَتَزَوَّجۡ، فَإِنَّهٗ أَغَضُّ لِلۡبَصَرِ، وَأَحۡصَنُ لِلۡفَرۡجِ، وَمَنۡ لَمۡ يَسۡتَطِعۡ فَعَلَيۡهِ بِالصَّوۡمِ فَإِنَّهٗ لَهٗ وِجَآءٌ“.

(متفق علیه، مشکوٰة/ص:۲٦۷ /کتاب النکاح)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اے نوجوانوں کی جماعت! جو شخص بھی تم میں سے جماع (نکاح اور اس کے موجبات ولوازمات مراد مہر اور نان ونفقہ وغیرہ) کی طاقت رکھتا ہو اس کو نکاح کرنا چاہیے؛ کیوں کہ یہ نکاح اجنبی عورت پر نظر پڑنے سے حفاظت کا ذریعہ ہے، اور شرمگاہ کو بھی محفوظ رکھتا ہے، اور جو شخص اس کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو روزہ رکھنا چاہیے، کہ یہ اس کے لیے جوشِ شہوت میں کمی کا ذریعہ ہے۔

تمہید:

اللہ رب العالمین نے انسان کو جس فطرت، طبیعت اور عادت کے مطابق پیدا فرمایا ہے دین اسلام میں اس کا پورا پاس و لحاظ رکھا گیا ہے، مثلاً ہر انسان کی فطرت میں جنسی خواہش اور شہوت موجود ہے، تو دین اسلام میں اس کی تکمیل کا جائز راستہ نکاح قرار دیا گیا ہے، پھر چوں کہ جنسی خواہش ہر ایک کی فطری ضرورت ہے، اس لیے اس کی تکمیل کا جو ذریعہ ہے یعنی نکاح دین اسلام نے اس میں ہر ایک کے لیے اتنی سہولت پیدا کر دی کہ شاید ہی اس سے زیادہ آسان اور کوئی معاملہ ہو، دین اسلام نے نکاح کو جتنا آسان رکھا کسی اور مذہب میں وہ بات نہیں کہ محض دو شرعی گواہوں کی موجودگی میں چند لفظوں (ایجاب وقبول) کے ساتھ نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

ایک واقعہ:

خیر القرون میں اتنی ہی آسانی سے نکاح کا عمل ہوتا تھا، چناں چہ اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ ابونعیم کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت ابوالدرداء اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما مواخاۃ کے قاعدہ سے بھائی بھائی تھے، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کسی جگہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا پیغام لے کر گئے اور حضرت سلمان کے فضائل بیان فرما کر انہیں بتایا کہ سلمان آپ کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں، تو لڑکی والوں نے کہا کہ سلمان سے شادی کروانے کو تو ہم تیار نہیں، البتہ آپ اگر چاہیں تو ہم آپ سے شادی کرنے کو تیار ہیں، چناں چہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ تیار ہو گئے، پھر اسی وقت نکاح فرما کر باہر آئے اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو صورتِ حال بتا کر ایک طرح کی شرمندگی کا اظہار فرمایا، یہ سن کر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ مجھ سے کیوں شرماتے ہیں؟ وہ تو مجھے آپ سے شرمانا چاہیے؛ کیوں کہ میں اس لڑکی کو پیغام دے رہا تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے مقدر میں

رکھی تھی۔'' (آج کا سبق ص:۴۷) یہ واقعہ ایک نمونہ ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کے یہاں نکاح کے سلسلے میں سادگی و آسانی کا۔

جہیز کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت:

لیکن افسوس صد افسوس! شریعت نے نکاح کے باب میں جتنی سہولت رکھی اور شادی کو جتنا سادہ بنایا ہم نے اسے بعض بیہودہ، جاہلانہ بلکہ کافرانہ رسومات اور خرافات کو خواہ مخواہ شامل کر کے اتنا ہی مشکل بلکہ مشکل ترین بنا دیا، بدقسمتی سے غیروں کی طرح ہمارے یہاں بھی اب نکاح جہالت وضلالت کی وجہ سے خرافات اور رسومات کا مجموعہ بن گیا، اس وقت ہمارے سماج میں نکاح کے موقع پر جو خرافات پائی جاتی ہیں ان میں سرفہرست ایک بہت ہی قبیح اور نہایت بری رسم جہیز ہے، حالاں کہ فی نفسہٖ جہیز کوئی بری چیز نہیں ہے، اس لیے کہ عربی لغت میں لفظِ "جَهَّزَ" کے معنی ہیں: مہیا کرنا اور تیار کرنا، عرفِ عام میں شادی کے موقع پر باپ بیٹی کو اپنی حیثیت کے مطابق اس کی ضرورت یا سہولت کا جو سامان دیتا ہے اسے "جَهَّزَ العَرُوْسَ" کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں اسی کو ''جہیز'' کہتے ہیں، شرعاً اس کا لین دین نہ تو حرام اور ناجائز ہے اور نہ ہی واجب اور ضروری۔ واقعہ یہ ہے کہ شادی کے موقع پر دولہن کو اس کا والد یا دیگر رشتہ دار دولہا اور اس کے اقرباء کے مطالبہ اور جبر کے بغیر اپنی مرضی اور خوشی سے بطورِ تحفہ یا صلہ رحمی اور حسن سلوک کی نیت سے جو کچھ دینا چاہیں تو یقیناً اس کی گنجائش ہے۔ (مگر اس کی مالکہ دولہن ہے، اور وراثت سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں ہے)

جہیز کا لالچ ذریعۂ ہلاکت ہے:

لیکن باقاعدہ جہیز کے لالچ میں شادی کی جائے یا اس کا مطالبہ کیا جائے اور خود باپ بھی زبردستی اور محض ریاکاری کے طور پر اپنی حیثیت سے زیادہ یعنی قرض لے کر سامانِ جہیز کا انتظام کرے، جیسا کہ آج کل جاہل سماج میں ہو رہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ طریقہ شرعاً وعقلاً

حرام اور ناجائز ہونے کے ساتھ دینی، دنیوی اور سماجی اعتبار سے بھی بہت سی خرابیوں اور تباہ کاریوں کا ذریعہ ہے، ایسی شادی عموماً خانہ آبادی کے بجائے خانہ خرابی کا ذریعہ ہوتی ہے، جس کا اشارہ حدیث پاک میں بھی ملتا ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: "مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لِعِزِّهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ إِلَّا ذُلًّا، وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ إِلَّا فَقْرًا، وَ مَنْ تَزَوَّجَهَا لِحَسَبِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ إِلَّا دَنَاءَةً، وَمَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لَمْ يُرِدْ بِهَا إِلَّا أَنْ يَغُضَّ بَصَرَهُ، أَوْ يُحَصِّنَ فَرْجَهُ، أَوْ يَصِلَ رَحِمَهُ، بَارَكَ اللّٰهُ فِيهَا، وَبَارَكَ لَهَا فِيهَا". (الترغيب والترهيب: ۳/ ۳۰، المعجم الأوسط للطبراني: ۳ /۱۷۸، والشامي: ۳/ ۸)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے محض اس کی دنیوی عزت وشہرت کی وجہ سے شادی کرے گا کہ اس کی بدولت مجھے بھی عزت اور شہرت مل جائے، تو عزت دینے والا مالک اس بری نیت کی وجہ سے اس کی ذلت میں اور اضافہ فرما دے گا، اور جو شخص کسی عورت سے محض اس کے مال و دولت اور جہیز کے لالچ میں شادی کرے گا، جیسا کہ بعض لوگ باقاعدہ مطالبہ اور سامانِ جہیز کی فہرست تو پیش نہیں کرتے، لیکن دولت مند گھرانے میں اسی لالچ میں رشتہ طے کرتے ہیں کہ بغیر مانگے بھی بہت کچھ مال وسامان مل ہی جائے گا، تو اس لالچ کے نتیجہ میں زمین وآسمان کے خزانوں کا خالق و مالک اس لالچی کو مال داری کے بجائے محتاجی کی سزا سے دوچار کرے گا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ اس کے رزق سے برکت اٹھالی جائے گی، اور جو شخص کسی اعلیٰ حسب نسب والی عورت سے محض خاندانی اور نسبی برتری حاصل کرنے کی نیت سے شادی کرے گا تو اللہ رب العزت اس پر پستی اور ذلت کا عذاب مسلط کر دے گا، جس کے نتیجہ میں وہ شخص اپنی بیوی کا غلام اور اس کے خاندان کے سامنے بے حیثیت بن کر رہ جائے گا، لیکن جو شخص کسی عورت سے اس کی نیکی اور دینداری کی بنیاد پر اس نیت سے نکاح کرے کہ (تکمیل شہوت کے بعد) نگاہیں نیچی رہیں، اور شرم گاہ بھی محفوظ رہے اور صلہ رحمی کرے، یعنی پاکدامنی اور صلہ رحمی کی نیت سے نکاح کیا،

تو پھر یہ نکاح زوجین کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ اور خانہ آبادی بلکہ دارین کی کامیابی کا سبب ہے۔

اس روایت سے جہاں یہ سبق ملا کہ نکاح نیک نیتی سے کرنا چاہیے وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ بدنیتی یعنی مال و دولت اور جہیز وغیرہ کے لالچ میں نکاح کرنے کا انجام تباہ کاری اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

جہیز کا مطالبہ رشوت اور ذریعۂ لعنت ہے:

اس کے باوجود جو لوگ جہیز کا صرف لالچ ہی نہیں رکھتے، بلکہ اس کا مطالبہ بھی کرتے ہیں ان پر یہ شعر خوب صادق آتا ہے:

عجب ماجرا ہے حضرات دیکھئے! داماد مانگتا ہے خیرات دیکھئے!

ایک ایسے ہی لالچی نے نکاح سے قبل اپنی بننے والی دولہن سے کہا کہ ''کیا تمہارے والد کی حیثیت ہے مجھے کار دینے کی؟'' اس نے بڑا بہترین جواب دیا کہ ''میرے باپ کی حیثیت تو پلین دینے کی ہے، کیا تیرے باپ کی حیثیت ہے ائیر پورٹ بنانے کی؟'' جواب سن کر وہ شخص شرمندہ ہوگیا۔

یاد رکھو کہ نکاح کے موقع پر لڑکی والوں سے گھوڑے، جوڑے اور سلامی کے نام پر رقم وصول کرنا یا ان سے سامانِ جہیز کا مطالبہ کرنا خواہ صراحۃً ہو یا اشارۃً، براہِ راست ہو یا بالواسطہ، بہر حال یہ شریعت اور شرافت کے خلاف ہونے کے ساتھ رشوت اور ذریعۂ لعنت بھی ہے؛ کیوں کہ اصلا (وشرعاً) عورت کو اللہ رب العزت نے محبوب و مطلوب اور مرد کو طالب بنایا ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت نے نکاح اور اس کے بعد کی تمام مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے، عورت پر نہیں، دیکھئے! مہر مرد پر ہے، عورت پر نہیں، اسی طرح دعوتِ ولیمہ دولہے کی طرف سے (مسنون) ہے، دولہن والوں کے لیے (دعوتِ طعام کی گنجائش تو ہے، مگر مسنون) نہیں، پھر عورت جب تک نکاح میں رہے ساری زندگی اس کی ضروریات کا انتظام

کرنا، شوہر کے ذمہ ہے، بیوی کے ذمہ نہیں، جس کی طرف قرآنِ کریم نے یوں اشارہ فرمایا:

﴿ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ﴾ (النساء : ٢٤)

''اور تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں وہ عورتیں جو ان (محرماتِ مذکورہ در آیت) کے علاوہ ہیں، کہ تم اپنے مالوں کے بدلہ طلب کرو''۔ معلوم ہوا کہ تم طالب ہو اور وہ مطلوب، لہٰذا تم صرف اسی کو طلب کرو، اس کے علاوہ کچھ اور جہیز اس سے یا اس کے والد وغیرہ سے طلب مت کرو، اس کی محبوبیت اور مطلوبیت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اس پر خرچ کیا جائے اور اس کی ضروریات کا انتظام کیا جائے، نہ کہ اس سے مطالبہ کیا جائے، چناں چہ شریعت نے نکاح کے بعد ہر طرح کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے، اور مذکورہ حدیث میں رحمت عالم ﷺ نے بھی بڑے لطیف انداز میں مردوں ہی سے خطاب فرمایا:

''يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهٗ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهٗ لَهٗ وِجَاءٌ''.

اے نوجوانو! تم میں سے جو شخص شادی کی مالی اور جسمانی ہر اعتبار سے طاقت اور طلب رکھتا ہو، مطلب یہ ہے کہ وہ بالغ اور اتنے مال کا مالک ہو جس سے وہ اپنی دولہن کا بذاتِ خود مہر اور نان و نفقہ وغیرہ برداشت کر سکے، تو اسے نکاح کرنا چاہیے۔ صاحبو! غور کرنے سے جو بات قرآن و حدیث سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ شریعت اسلامی میں نکاح کا تصور اسی وقت قائم ہوگا جب لڑکا کھانے کے ساتھ کھلانے کے لائق ہو جائے، اور ذمہ داریوں کے نبھانے کے قابل ہو جائے، اس کے برعکس اسلامی تعلیمات میں یہ تصور کسی بھی مقام پر ابھر کر سامنے نہیں آتا کہ لڑکی یا اس کے والدین قیمتی جہیز اور بھاری بھاری ساز و سامان کے مالک نہ ہو جائیں تب تک وہ نکاح نہیں کر سکتے۔

جہیز کے سلسلہ میں ایک عرب بزرگ کا تاثر:

اس سلسلہ میں عرب کے ایک بزرگ کا عبرتناک تاثر حضرت شیخ الاسلام علامہ محمد تقی

عثمانی مدظلہ نے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ ”چند سال پہلے شام کے ایک بزرگ شیخ عبدالفتاح یہاں تشریف لائے ہوئے تھے، اتفاق سے ایک مقامی دوست بھی اسی وقت آ گئے، اور جب انہوں نے ان بزرگ کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو ان سے دعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ میری دو بیٹیاں شادی کے لائق ہیں، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی شادی کے اسباب پیدا فرما دے، شیخ نے ان سے پوچھا کہ ”کیا ان کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا ہے؟“ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ ”رشتہ تو دونوں کا ہو چکا ہے، لیکن میرے پاس اتنے مالی وسائل نہیں ہیں کہ ان کی شادی کرسکوں“ شیخ نے یہ سن کر انتہائی تعجب سے پوچھا: ”آپ کی لڑکیاں ہیں یا لڑکے؟“ کہنے لگے کہ ”لڑکیاں ہیں“ تب شیخ نے سراپا تعجب بن کر کہا کہ ”لڑکی کی شادی میں مالی وسائل کی کیا ضرورت ہے؟“ انہوں نے کہا کہ ”میرے پاس انہیں جہیز میں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے“ شیخ نے پوچھا کہ ”یہ جہیز کیا ہوتا ہے؟“ اس پر حاضرین مجلس نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں رواج ہے کہ باپ شادی کے وقت اپنی بیٹی کو زیورات، کپڑے، گھر کا اثاثہ اور بہت سا ساز و سامان دیتا ہے، اسے جہیز کہتے ہیں، اور جہیز دینا باپ کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، اس کے بغیر لڑکی کی شادی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اور لڑکی کے سسرال والے اس کا مطالبہ کرتے ہیں“ شیخ نے یہ تفصیل سنی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ ”کیا بیٹی کی شادی کرنا کوئی جرم ہے؟ جس کی یہ سزا باپ کو دی جائے۔“ (ذکر وفکر)

جہیز کے خطرناک نتائج:

واقعی جہیز کا یہ مروّجہ طریقہ غیر شرعی ہونے کے ساتھ بہت ہی تشویش ناک اور شرمناک ہے؛ کیوں کہ اس کے نتائج بڑے ہی خطرناک ثابت ہو رہے ہیں، یہی وہ غیر شرعی رواج ہے جو آج نہ جانے کتنی غریب اور نادار لڑکیوں کے نکاح کی راہ میں سنگ گراں کی طرح حائل ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مال کے علاوہ حسن و جمال اور نیک اوصاف وخصائص اور مختلف کمالات سے آراستہ و پیراستہ بھی کیا ہے، اس کے باوجود وہ ازدواجی زندگی سے اس لیے محروم ہیں کہ ان کے یا ان کے والدین کے پاس لڑکے والوں کے ناجائز

مطالبات پورے کرنے کے لیے مال و دولت میسر نہیں، جس کے نتیجہ میں بے شمار لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی رہتی ہیں اور بیواؤں کی طرح نا اُمیدی کی زندگی گزار کر عمر کی اس منزل تک پہنچ جاتی ہیں جس میں نہ کوئی عموماً ان کا پرسانِ حال ہوتا ہے، نہ کوئی مناسب رشتہ ملتا ہے، نتیجۃً بعض اوقات ان کا قدم یا تو زنا کاری کی طرف یا پھر خودکشی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

اسی پس منظر میں ایک شخص نے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کو ایک خط لکھا کہ ''حضرت! میری چار لڑکیاں ہیں، جن کی شادی کی عمر ہو چکی ہے، اور ماشاءاللہ وہ ہر طرح سے لائق بھی ہیں، لیکن میرے پاس فرمائشی جہیز کا انتظام نہیں، جس کی وجہ سے میری بیٹیاں میری مجبوریاں بن گئی ہیں، آپ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر ہیں، بتلایئے میں کیا کروں؟ ایک آدھ لڑکی ہوتی تو ممکن تھا کہ میں جہیز کے ناجائز مطالبات پورے کر دیتا، مگر یہاں چار چار بیٹیاں ہیں، اور سبھی کے مطالبات پورے کرنا میری ہمت اور طاقت سے باہر ہے، لہٰذا آپ اجازت دیں تو میں اپنی چاروں بیٹیوں کے ساتھ خودکشی کرنا چاہتا ہوں، خط پڑھ کر حضرت لرز گئے اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ (مستفاد از: خطباتِ اسلم: ۳/۷۱)

جہیز سے نجات کیسے پائیں؟

ان حقائق سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موجودہ جہیز کے ناجائز رسم و رواج سے سماج میں کتنی خطرناک تباہ کاریاں پیدا ہوتی ہیں، ایسی صورت میں ضرورت ہے کہ سماج کو اس سے نجات دلانے کے لیے اس کے سدِ باب کی سنجیدگی کے ساتھ کوششیں کی جائیں اور اس سلسلہ میں تین طبقوں کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ ہیں: (۱) علماء۔ (۲) امراء۔ (۳) نوجوان۔

علماء کی ذمہ دراری ہے کہ وہ اپنی تقریر و تحریر اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ نیز سماجی اصلاحی تنظیمیں اپنے پلیٹ فارم سے نکاح کی سادگی اور جہیز وغیرہ کی برائی کو قرآن و حدیث کی روشنی میں موقع بموقع بیان کریں اور ایک ذہنی فضا تیار کریں اور عوام کو بتلائیں کہ یہ جہیز کا موجودہ نمائشی طریقہ خالص ہندووانہ رسم ہے، اور دولت کی نمائش صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن کے پاس دولت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور بے ایمانوں کے یہاں وراثت کا تصور نہیں

ہے، لٰہذا وہ بیٹی کو شادی کے موقع پر جہیز کی شکل میں مال واسباب دے دیتے ہیں، افسوس کہ آج ہمارے اکثر مسلمان بھائیوں نے بھی لڑکیوں کو وراثت دینا چھوڑ دیا، عاجز کے خیالِ ناقص میں تو اس کی ایک نقد سزا یہ ملی کہ جہیز کی لعنت ہم پر مسلط کر دی گئی، اس لیے وراثت کو رواج دے کر جہیز کو ختم کرنے کی ضرورت ہے، اور جن تقریبات میں جہیز کا لین دین ہو ان میں شرکت کرنے سے مکمل گریز کریں، تاکہ انہیں اس کی قباحت کا کچھ نہ کچھ احساس ہو جائے۔

اسی کے ساتھ امراء اور صاحب ثروت لوگ بھی اپنی شادیوں کو سادگی سے انجام دینے کا اہتمام کریں تو اس سے سماج کے دوسرے متوسط اور غریب طبقہ پر بھی اچھے اثرات پڑ سکتے ہیں؛ کیوں کہ اگر غریب آدمی شادی کرتا ہے تو دنیا کو یہ کہنے کا موقع ہے کہ ''اپنی غربت پر سادگی کا پردہ ڈال رہا ہے، دینے کو کچھ ہے نہیں تو بے چارہ سادگی کی آڑ لے رہا ہے۔'' لیکن اگر مالدار سادگی کے ساتھ شادی کرتا ہے تو وہ ایک شاندار مثال قرار پاتی ہے۔

پھر اس کا اکثر تعلق چوں کہ نوجوانوں سے ہے، اس لیے ہمارے نوجوان سماج کو اس نحوست سے پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا کے خاطر ہمت کر کے آگے بڑھیں اور اپنی دولہن ہی کو سب سے بڑا جہیز سمجھ کر یہ عزم کر لیں کہ

یہ سنگ گراں جو حائل ہے ☆ رستہ سے ہٹا کر دم لیں گے

اس طرح اگر سماج کے یہ تینوں طبقے اپنی اپنی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ بیدار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی سے امید ہی نہیں، بلکہ یقین ہے کہ سماج کی بہت سی خرابیاں اور تباہ کاریاں ختم ہو سکتی ہیں۔

حق تعالیٰ ہمارے سماج کو ہر طرح کی خرافات اور رسومات سے نجات عطا فرمائیں۔ آمین۔

۱۶/ ربیع الاول/ ۱۴۳۴ھ

مطابق: ۲۹/ جنوری ۲۰۱۳ء

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

(۹)

بیوی کے حقوق اور شوہر کے فرائض

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ حَكِيۡمِ بۡنِ مُعَاوِيَةَ الۡقُشَيۡرِيُّ عَنۡ أَبِيۡهِ قَالَ: "قُلۡتُ:" يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ! مَا حَقُّ زَوۡجَةِ أَحَدِنَا عَلَيۡهِ ؟" قَالَ: "أَنۡ تُطۡعِمَهَا إِذَا طَعِمۡتَ، وَتَكۡسُوَهَا إِذَا اكۡتَسَيۡتَ، وَلَا تَضۡرِبِ الۡوَجۡهَ، وَلَا تُقَبِّحۡ، وَلَا تَهۡجُرۡ إِلَّا فِيۡ الۡبَيۡتِ". (رواه أحمد وأبوداود وابن ماجه، مشكوٰة/ص: ۲۸۱/ باب عشرة النسآء وما لكل واحدة من الحقوق/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت حکیم بن معاویہ قشیریؒ اپنے والد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ''یارسول اللہ! بیوی کا حق ہم (شوہروں) پر کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، تم کپڑا پہنو تو اس کو بھی پہناؤ، اور اس کے منھ پر مت مارو، اس کو گالیاں نہ دو، اور نہ چھوڑو اس کو مگر گھر میں (یعنی یہ نہیں کہ ذرا سی ناراضگی پر مارنا دھاڑنا شروع کر دیا اور اس کے میکے بھیج دیا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے رہائش کا انتظام کرو۔)

میاں بیوی کے تعلقات کی اہمیت اور ان کے حقوق:

اللہ رب العزت نے انسانوں کے درمیان آپس میں جتنے تعلقات بنائے ہیں ان تمام میں میاں بیوی کے تعلق کو شریعت میں ایک خاص اہمیت اور خصوصیت حاصل ہے؛ کیوں

کہ نکاح کے ذریعہ ایک مرتبہ برضا ورغبت یہ تعلق قائم ہو جانے کے بعد عموماً تاحیات اور پوری زندگی باقی رہتا ہے، اور میاں بیوی کے درمیان بسا اوقات ایسا گہرا تعلق ہو جاتا ہے جیسا کہ خون اور گوشت یا روح اور جسم کا ہوتا ہے، گویا دونوں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جڑ جاتے ہیں، پھر ان ہی دوستونوں پر ایک نئے خاندان کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور نئے نئے خاندان وجود میں آتے ہیں اور ایک نیا معاشرہ تیار ہوتا ہے، اور یوں میاں بیوی کے تعلقات کا اچھا برا اثر ان کے علاوہ خاندان اور خاندان کا معاشرہ پر پڑتا ہے، لہٰذا معاشرتی وخاندانی زندگی کی خوشگواری کے لیے بھی میاں بیوی کے تعلقات میں درستی اور خوشگواری لانا امر لابدی اور ضروری ہے۔

شریعت مطہرہ نے میاں بیوی کے اس طویل تعلق کو بحسن وخوبی باقی اور قائم ودائم رکھنے کے لیے دونوں کے حقوق وفرائض بیان فرما کر انہیں بہتر طریقے پر ادا کرنے کی ہدایات دی ہیں، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرة : ۲۲۸)

قرآنی فصاحت وبلاغت کا اعجاز تو دیکھئے! کہ میاں بیوی کے حقوق کا اتنا اہم مضمون اتنے مختصر فقرہ میں بیان کر دیا، اس مختصر مگر جامع جملہ میں عورتوں اور مردوں کے حقوق وفرائض نہایت ہی منفرد انداز میں قرآن نے بیان فرمائے کہ ''شوہروں کے ذمہ عورتوں کے حقوق معروف اور اچھے طریقے پر ادا کرنا ایسے ہی فرض اور ضروری ہے جیسے کہ بیویوں پر شوہروں کے حقوق کا ادا کرنا فرض اور ضروری ہے۔'' یہاں زوجین میں سے ہر ایک کو ان کے ذمہ جو فرائض وحقوق ہیں حسن سلوک کے ساتھ ان کی ادائیگی کی طرف توجہ دلا کر گویا اس طرف اشارہ کر دیا کہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنی چاہیے، اگر ایسا ہوا تو پھر حقوق کے مطالبہ کا قصہ اور قضیہ ہی ختم ہو جائے گا؛ کیوں کہ مرد کے فرائض ہی عورت کے حقوق ہیں اور عورت کے فرائض مرد کے حقوق ہیں، جب فرائض ادا ہو گئے تو

حقوق خود بخود ادا ہو ہی جائیں گے۔

شوہر اپنے فرائض ادا کرے گا تو بیوی کے حقوق ادا ہوں گے، اور بیوی اپنے فرائض ادا کرے گی تو شوہر کے حقوق ادا ہوں گے۔ پھر دوسرا اشارہ آیت کریمہ کے اس حصہ میں اس طرف بھی ملتا ہے کہ شوہروں کو بیویوں کے حقوق ادا کرنے میں سبقت اور پہل کرنی چاہیے؛ کیوں کہ یہاں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور طاقت کی بنا پر عموماً عورت سے اپنے حقوق وصول کر ہی لیتا ہے، فکر عورتوں کے حقوق کی ہونی چاہیے کہ وہ عادۃً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کرسکتیں اور نہ انہیں کوئی زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بیوی کا مہر اور اس کی تفصیلات:

بہرکیف کتاب وسنت میں میاں بیوی کے حقوق کی جو تفصیلات ہیں ان میں بیوی کے جو حقوق شوہر کے ذمہ ہیں پہلے ان کا تذکرہ کرنا مناسب ہے، جو حسب ذیل ہیں: ایک مسلمان خاوند پر اس کی بیوی کا پہلا بنیادی حق مہر ہے، یہ عورت کی قیمت نہیں ہے، ایسا نہیں کہ مرد مہر ادا کرکے عورت کا مالک بن جاتا ہے، بلکہ یہ شوہر کی طرف سے ایک تحفۂ احترام ہونے کے ساتھ نکاح کی عظمت اور عورت کے شرف کا مظہر ہے، اس کی اہمیت کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ قرآنِ کریم میں تقریباً پانچ جگہوں پر اس کا ذکر آیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَآتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ﴾ (النسآء : ٤)

یعنی ’’اے مردو! تم اپنی بیویوں کے مہر خوشی خوشی ادا کرو۔‘‘ بعض علماء نے اداءِ مہر کو بھی مشابہ عبادت قرار دیا ہے۔ (بدایۃ المجتہد) اور احادیث طیبہ میں بھی بار بار اس کا تذکرہ آیا ہے، خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنی بیٹیوں کے نکاح کے موقعوں پر اہتمام سے مہر مقرر فرمایا، اسی لیے علماء نے فرمایا کہ شوہر کے ذمہ بیوی کا مہر ادا کرنا شرعاً واجب ہے، اس کی ادائیگی باعث نجات اور اس سے غفلت باعث ہلاکت ہے۔ حدیث میں ہے کہ ’’جس

شخص نے کسی عورت سے شادی کی، مہر کم تھا یا زیادہ، اس نے حق مہر ادا کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا، تو "لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَهُوَ زَانٍ". (رواه الطبراني في الأوسط الصغير، معارف الحديث: ۲٤/۷)

"قیامت کے دن وہ شخص بارگاہِ الٰہی میں زنا کار کی حیثیت سے پیش ہوگا۔"

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اداءِ مہر کے بارے میں شروع ہی سے بدنیت رہا، مہر کو زبانی جمع خرچ اور رسمی بات سمجھ کر طے کرلیا، دینے دلانے کا کوئی ارادہ سرے سے کیا ہی نہیں، تو اس شخص کے لیے یہ وعید ہے کہ قیامت میں وہ بدکار قرار دیا جائے گا، یہ وعید اس لیے ہے کہ مہر بیوی کا شرعی اور واجبی حق تھا، اس سے اسے محروم رکھا گیا، جس کی یہ سزا ہے۔ غور کیجیے گا! جب عورت کے ایک حق ادا نہ کرنے کی یہ وعید ہے تو سارے حقوق ادا نہ کرنے کی کیا وعید ہوگی؟ ہاں، اگر کسی نے مہر ادا کرنے کا پورا ارادہ کیا، کوشش بھی کی، مگر کسی مجبوری کی وجہ سے ادا نہ کرسکا، یا خود عورت نے بہوش وحواس بخوشی معاف کردیا، تو ایسا شخص اس وعید میں داخل نہ ہوگا۔ غرض یہ کہ مہر کی ادائیگی ضروری ہے، اس لیے اس میں آسانی رکھی گئی، پھر چوں کہ نکاح کرنے والوں کی مالی حالت اور ان کی استطاعت مختلف ہوسکتی ہے، اس لیے شریعت نے مہر کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں فرمائی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکیمانہ ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ "بہترین مہر وہ ہے جو حد اعتدال میں رہتے ہوئے شوہر کی مالی حیثیت کے مطابق اتنا ہو جسے وہ بآسانی ادا کر سکے۔" جس کی احناف کے یہاں کم از کم مقدار دس درہم (تین تولہ: ۶۱۸ ملی گرام چاندی) ہے۔ البتہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اکثر ازواجِ مطہرات وبناتِ طاہرات کا جو مہر طے کیا تھا جسے "مہر فاطمی" بھی کہتے ہیں وہ پانچ سو درہم تھا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تحقیق کے مطابق ہمارے ہندوستانی وزن کے اعتبار سے ۱۳۱/ تولہ تین ماشہ یعنی تقریباً پندرہ سوا یکتیس (۱۵۳۱) گرام چاندی کی قیمت ہوتی ہے۔ اتباعِ سنت کی نیت سے یہ مہر طے کرنا بہتر تو ہے، مگر ضروری نہیں، بس میاں بیوی کی رضامندی سے جو مہر طے ہو جائے نکاح کے

وقت ہی اس کی ادائیگی بہتر اور مستحسن ہے، اگر اس وقت ادا نہ کرے تو اس کے لیے عورت سے مہلت لینی چاہیے، پھر اس مہلت کے بعد فوراً ادا کرنا ضروری ہے، ورنہ عورت کو یہ حق ہوگا کہ وہ شوہر کو مباشرت سے روک دے، ایک شوہر عورت کے اس حق سے اسی وقت آزاد ہو سکتا ہے جب وہ ادا کر دے، یا عورت زندگی میں اپنی خوشی سے یا شوہر کے حق سے زیادہ سلوک کے عوض معاف کر دے، لیکن اگر زندگی میں ادا نہیں کیا اور نہ ہی عورت نے معاف کیا تو موت کے بعد مرحوم کے ترکہ سے مہر ادا کیا جائے گا، اور یہ ادائیگی وصیت اور تقسیم وراثت پر مقدم ہوگی۔

بیوی کے لیے گھر کا انتظام کرنا:

حق مہر کے بعد دوسرا حق ایک مسلمان خاوند پر اس کی بیوی کا ''حق سُکنٰی'' ہے، یعنی مکان اور مکان کے ضروری سامان کا انتظام کرنا، جیسا کہ مذکورہ حدیث میں اس کا اشارہ ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کی رہائش کے لیے اس کی اور اپنی حیثیت کے مطابق ایسے مکان کا انتظام کرنا جس میں کسی کی دخل اندازی کے بغیر مکمل حفاظت ممکن ہو، خواہ یہ رہائشی مکان مملوکہ ہو یا کرایہ کا۔ قرآنِ کریم میں بیوی کے اس حق کا تذکرہ تین چار مقامات پر ہوا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ سکونت بیوی کا واجبی اور شرعی حق ہے، یہ شوہر کا احسان نہیں ہے، حتیٰ کہ خدانخواستہ طلاق کی نوبت آگئی تو طلاق کے بعد بھی عدت ختم ہونے تک شوہر عورت کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتا، چناں چہ عورت کو گھر سے نکال دینا قبل اتمامِ عدت کے ظلم اور حرام ہے۔ (معارف القرآن)

قرآن پاک میں فرمایا:

﴿ أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ ﴾ (الطلاق : ٦)

یعنی ''اپنی کوشش کے مطابق بیوی کو وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو''۔ ایک مسلمان بیوی کے اس حق کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ رحمت عالم

ﷺ ہجرت فرما کر جب مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو وہاں آپ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ ہی اپنی ازواجِ مطہرات کے لیے مکانات بھی بنوانے کا اہتمام فرمایا۔ چناں چہ علامہ شبلی نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ ''مسجد نبوی جب تعمیر ہوچکی تو مسجد سے متصل ہی آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کے لیے مکان بنوائے،اس وقت حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما عقد نکاح میں آچکی تھیں،اس لیے دو ہی حجرے بنے، جب اور ازواجِ مطہرات آئیں تو اور مکانات بنتے گئے۔'' (سیرت النبی:۱/ ۱۶۸)

تو بیوی کا ایک حق سکونت بھی ہے، جو اس میں کوتاہی کرتے ہیں شریعت کی نظر میں وہ اپنی عورتوں کے مجرم ہیں۔

اب یہ کہ بیوی کے لیے گھر کیسا ہونا چاہیے؟ اس کی تفصیل کتاب وسنت کی روشنی میں اس طرح ہے کہ اگر شوہر معمولی حیثیت کا ہو تو بھی کم از کم بیوی کے لیے ایک علاحدہ گھر یا ایک علاحدہ کمرہ مخصوص کر دینا ضروری ہے، جہاں وہ اپنا سامان حفاظت سے رکھ بھی سکے اور جب چاہے میاں بیوی بے تکلف لیٹ بیٹھ بھی سکیں، خواہ کچن اور غسل خانہ و بیت الخلاء علاحدہ نہ ہو، جب کہ شوہر غریب ہو اور اس سے بہتر مکان لینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اتنا بھی کافی ہے، البتہ اگر شوہر مالدار ہو تو مستقل ایک گھر جس میں تمام ضروری سامان مہیا ہوں، یا جوائنٹ فیملی کی صورت میں ایسا کمرہ جس میں غسل خانہ اور کچن وغیرہ علاحدہ ہوں، اور کمرہ مستقل طور پر مقفل کیا جاسکتا ہو یہ ضروری ہے، پھر جب شوہر نے اپنی استطاعت وحیثیت کے مطابق مکان کا انتظام کر دیا اور جوائنٹ فیملی کی صورت میں عورت کو گھر کے دیگر افراد سے کوئی واقعی تکلیف بھی نہیں پہنچ رہی ہے تو اس صورت میں عورت کو علاحدہ مکان کے مطالبہ کا راجح قول کے مطابق حق نہ ہوگا۔ (مستفاد از: قاموس الفقہ: ۵/ ۲۰۸)

جوائنٹ فیملی کا حکم:

لیکن اگر جوائنٹ فیملی کی وجہ سے بیوی کو واقعی اذیت پہنچتی ہو، یا اس کے حقوق میں

کوتاہی ہوتی ہو، تو پھر بیوی کو علاحدہ مکان کے مطالبہ کا حق ہوگا، اس لیے کہ یہ اس کا واجبی حق ہے، اور واجب کا تارک گناہگار ہے، نیز گناہ کے کام میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، حتیٰ کہ والدین کی بھی نہیں: "لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ". (مشکوٰۃ/ص: ۳۲۱)

افسوس کہ آج کل اس سلسلہ میں کافی افراط وتفریط پائی جاتی ہے، بعض لوگ جوائنٹ فیملی میں رہنے کو ضروری سمجھتے ہیں، تو بعض لوگ علاحدہ رہنے کو، حالاں کہ جوائنٹ فیملی میں رہنا نہ مطلقاً محمود ہے نہ مذموم، اگر "تَعَاشَرُوْا كَالْأَقَارِبِ، وَتَعَامَلُوْا كَالْأَجَانِبِ". (روضة الأدب : ٥٣) کے اصول پر رہائش ہو، جس کا تقاضا یہ ہے کہ گھر کے سبھی افراد آپس میں شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ مل جل کر رہیں، لیکن معاملات اور لین دین میں کوئی اجمال یا ابہام نہ ہو، بلکہ مکمل صفائی ہو، اور ہر ایک کا سامان اور اس کی ملکیت اور ہر ایک کے کام کی نوعیت واضح ہو، تو یقیناً پھر جوائنٹ فیملی ایک محمود اور پسندیدہ چیز ہے۔ لیکن جہاں اس ترتیب پر عمل نہ ہو وہاں جوائنٹ فیملی کے سبب ہی عموماً آپسی اختلاف حتیٰ کہ الزام تراشی اور عیب جوئی وحق تلفی کی نوبت آتی ہے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جوائنٹ فیملی کی اجازت نہیں ہوسکتی، فقہاء کا اصول بھی یہی ہے کہ "جو چیز مفضی الی النزاع ہو اس کی اجازت نہیں۔" تاہم کسی وجہ سے جوائنٹ فیملی میں رہنا ضروری ہو تو اس وقت حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے بقول "چولہا تو ضرور ہی علاحدہ ہونا چاہیے، کہ زیادہ تر آگ اسی چولھے سے بھڑکتی ہے"۔

بیوی کا نفقہ، اس کی اہمیت اور فضیلت:

اس کے بعد بیوی کا ایک اہم حق شوہر کے ذمہ "نفقہ" ہے، جس کا اشارہ مذکورہ حدیث میں ہے، "نفقہ" کا مطلب یہ ہے کہ بیوی کی خوراک، پوشاک اور صحت وصفائی کے لیے زندگی کی جو بنیادی ضروریات ہیں ان کا انتظام کرنا بھی شوہر کے ذمہ فرض ہے، شوہر کے باپ یا بڑے بھائی کے ذمہ نہیں۔ لہٰذا شوہر کا بیوی کو نفقہ کے بارے میں اپنے باپ یا بھائی کا

محتاج رکھنا انتہائی جہالت ونادانی کی بات ہے، یہ ذمہ داری شوہر کی ہے، اور نفقہ بیوی کا ایسا شرعی اور واجبی حق ہے جو کسی حال میں شوہر سے ساقط اور معاف نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ بیوی خود اپنے اس حق سے دست بردار ہو جائے، یا نشوز (سرکشی وغیرہ) کی مرتکب ہو (تب ہی شوہر سے نفقہ ساقط ہوگا ورنہ نہیں) حتیٰ کہ علماء نے فرمایا ہے کہ ''جو شوہر اپنی بیوی کا نفقہ وخرچ برداشت نہیں کر سکتا وہ اپنا حق حاکمیت کھو دیتا ہے، اور اس کی بیوی کو اس بنا پر بھی فسخ نکاح کا حق حاصل ہو جاتا ہے''۔ (واللہ اعلم)

اس سے بھی نفقہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، علاوہ ازیں قرآن وحدیث میں اس کے مستقل احکام بیان ہوئے ہیں، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ﴾ (البقرۃ : ۲۳۶)

مطلب یہ ہے کہ شوہر اگر مالدار اور خوشحال ہو تو اس کی وسعت واستطاعت کے مطابق بیوی کا نفقہ وخرچ ہے، اور اگر مفلس وغریب ہو تو اس کی حیثیت کے مطابق نفقہ ہے۔ (اور خوشحالی وتنگ حالی کا معیار صدقۂ فطر وقربانی کا وجوب اور عدمِ وجوب ہے) گویا قرآن نے یہاں اپنے بلیغ انداز میں یہ بھی اشارہ کر دیا کہ نفقہ کا دار ومدار شوہر کی استطاعت پر ہے، عورت کی خواہشات پر نہیں، کہ اس کی تو کوئی حد ہی نہیں ہوتی نا! اس لیے مذکورہ حدیث میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کے ہم پر کیا حقوق ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''أَنْ تُطْعِمَهَا إِذَا طَعِمْتَ، وَتَكْسُوَهَا إِذَا اكْتَسَيْتَ''. یعنی اپنی استطاعت اور وسعت کے مطابق جو کچھ حق حلال کمائی سے تم کھاتے، پیتے اور پہنتے ہو وہی اپنی بیویوں کو بھی کھلاؤ پلاؤ اور پہناؤ۔ یعنی اپنی بیویوں کو ہم نوالہ وہم پیالہ بناؤ، اس کی مزید صراحت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا:

''وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ''. (رواہ مسلم، مشکوٰۃ ص: ۲۲۵)

کہ بیویوں کا شوہروں پر یہ خاص حق ہے کہ وہ ان کے کھانے اور کپڑے وغیرہ کی ضروریات اپنی حیثیت کے مطابق پوری کریں، "بِالْمَعْرُوْفِ" کا مطلب یہ ہے کہ اس میں فراخ دلی سے کام لیں، بخل سے کام نہ لیں، حتیٰ کہ اگر کوئی شوہر قدرت کے باوجود اپنی حیثیت سے اس قدر کم خرچ دیتا ہو جس میں بیوی بچوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، تو بیوی کو حق ہے کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اتنا لے سکتی ہے جو اس کی اور بچوں کی ضرورت کے لیے کافی ہو۔ چناں چہ آپ ﷺ نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا کو ایسی ہی ایک شکایت پر اس کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا تھا:

"خُذِیْ مَا یَکْفِیْكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوْفِ". (صحیحین، مشکوٰۃ: ۲۹۰)

لہٰذا شوہروں کو چاہیے کہ اپنے اس خوشگوار فریضہ کی ادائیگی کے لیے محنت سے حلال کمائیں، پھر رفیقۂ حیات اور گھر والوں کی جائز ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کمالِ محبت سے ان پر خرچ کریں، اس سے نہ صرف دنیا میں خوشگوار ازدواجی زندگی کی نعمت ملتی ہے، بلکہ مردِ مومن اسی عمل کی وجہ سے اخروی اعتبار سے بھی اجر وثواب کا حقدار ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ "ایک دینار تو وہ ہے جو تم نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جو تم نے کسی غلام (قیدی) کو آزاد کرنے میں صرف کیا، ایک دینار وہ ہے جو تم نے کسی فقیر کو صدقہ میں دیا، اور ایک دینار وہ ہے جو تم نے (اپنی بیوی کے نفقہ اور) گھر والوں پر (بہ نیت ثواب) خرچ کیا، ان تمام میں سب سے زیادہ اجر وثواب اس دینار کے خرچ کرنے کا ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا"۔ (مسلم، مشکوٰۃ: ۱۷۰)

اس لیے کہ یہ خرچ واجب ہے، اور واجب کا ثواب نفل سے زیادہ ہوتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے تھے کہ "حلال کمانا اور عیال پر لگانا ابدال والا عمل ہے۔"

حسن معاشرت:

الغرض! شوہر کے ذمہ بیوی کے یہ حقوق (مہر، سکنیٰ اور نفقہ) تو ایسے قانونی حقوق

ہیں جنہیں بہر حال ادا کرنا ضروری ہے، لیکن میاں بیوی کے نازک اور مقدس رشتہ کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے اداءِ حقوق کے علاوہ حسن سلوک کا بھی معاملہ کریں، اس لیے کہ نرے خشک قانون پر عمل کرنے ہی سے یہ لطیف اور پاکیزہ رشتہ نہیں نبھ سکتا، حسن سلوک اور حسن معاشرت کی بھی ضرورت ہے، اور قرآن وحدیث کی روشنی میں حسن معاشرت یہ ہے کہ میاں بیوی اپنی زندگی کے تمام گوشوں اور موقعوں میں ایک دوسرے کے جذبات و ضروریات اور مذاق ومزاج کی شرعی حدود میں رہتے ہوئے رعایت کے ساتھ دلجوئی و دلداری اور لطف وکرم کا معاملہ کریں، ان کی فطری وسماجی کوتاہیوں اور لغزشوں سے حتی الامکان چشم پوشی کا معاملہ کریں، یا اصلاح کی خلوصِ دل کے ساتھ فکر کریں، ایک دوسرے کے ساتھ اپنے قول وعمل میں بہتر سے بہتر رویہ اختیار کریں، تو اسی میں ازدواجی زندگی کی خوشگواری کا اصل راز پنہاں ہے، یہ حسن معاشرت اگرچہ جانبین سے مطلوب ہے، لیکن عورت اپنی فطری نزاکت وطبیعت اور جذباتیت کی وجہ سے اس کی زیادہ حقدار ہے، اسی وجہ سے خاص طور پر مردوں کو قرآنِ کریم میں تلقین فرمائی گئی کہ: ﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (النسآء : ۱۹) کہ ’’عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت سے رہو۔‘‘

حدیث پاک میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ’’اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا، فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ‘‘. (متفق علیه، مشکوٰة/ص: ۲۸۰) ’’میں تمہیں عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کی نصیحت کرتا ہوں، تم میری اس نصیحت کو قبول کرو؛ کیوں کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔‘‘ اس ارشاد کا مقصد عورت کی برائی نہیں، بلکہ اس کی رعایت اور اس کے ساتھ نرمی کی تلقین وہدایت ہے، تو عورت شرعاً وعقلاً ہر اعتبار سے حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے؛ کیوں کہ اس نے مرد کے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے، اپنے ماں باپ، گھر بار اور بہت کچھ چھوڑ کر اپنے شوہر کی ہوگئی، اس کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کریں، یہ ایمان واخلاق کے کمال کی علامت ہے، علاوہ ازیں اس پہلو پر بھی غور کریں کہ یہ ہمارے پاس دنیا میں اللہ

تعالیٰ کی امانت ہے، دنیا میں اس کی کوئی خاص ویلو یو ہو نہ ہو، لیکن جنت میں حوروں سے بڑھ کر اس کی شان ہوگی۔

صاحبو! اپنی خوش اخلاقی ونرم مزاجی کو جانچنے کا اصل میدان تو گھریلو زندگی ہی ہے؛ کیوں کہ ان ہی گھر والوں سے زیادہ واسطہ اور سابقہ پڑتا ہے، پھر گھر کی زندگی بے تکلف ہوتی ہے نا! اس لیے مزاج، اخلاق اور اعمال کا ہر رخ سامنے آتا ہے، لہٰذا جس کا معاملہ گھر والوں کے ساتھ اچھا ہوگا وہ اوروں کے لیے بھی یقیناً اچھا ہی ہوگا، اس لیے گھر والوں کے ساتھ حسن سلوک بھی کمالِ ایمان واخلاق کی علامت ہے۔ ان شاء اللہ اس کی برکت سے دارین کی زندگی خوشگوار ہوگی۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیق عمل عطا فرمائے۔ آمین۔

”اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْہُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ“.

☆......☆......☆
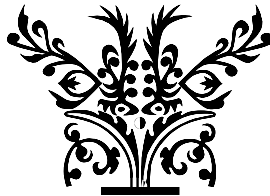
(۱۰)

شوہر کے حقوق اور بیوی کے فرائض

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهَا قَالَتۡ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَيُّمَا امۡرَأَةٍ مَاتَتۡ وَزَوۡجُهَا عَنۡهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الۡجَنَّةَ". (رواہ الترمذی، مشکوۃ/ص: ۲۸۱ باب عشرۃ النساء وما لکل واحد من الحقوق/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "جو عورت اس حالت میں مرے کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو، تو وہ جنت میں جائے گی"۔

ازدواجی تعلق کی اہمیت وحیثیت:

ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ کو وجود میں لانے کے لیے خاندانی نظام کو زیادہ سے زیادہ مستحکم، مضبوط اور کامیاب بنانا ضروری ہے، پھر ظاہر ہے کہ خاندانی نظام اور زندگی کا آغاز شوہر اور بیوی کے مقدس ازدواجی تعلق سے ہوتا ہے، اور عموماً یہ تعلق پوری زندگی ہی کے لیے ہوتا ہے، اس لیے پورا خاندانی نظام اسی تعلق اور رشتہ سے متعلق ہوتا ہے، اسی تعلق سے ایک خاندان کی تشکیل ہو کر خاندان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے، لہٰذا اس تعلق کی خوشگواری واستواری پر بڑی حد تک خاندانی نظام کی خوشگواری موقوف ہے، جس کے بعد ایک صالح اور پاکیزہ سماج اور معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

میاں بیوی کے ازدواجی تعلق کے سلسلہ میں شریعت مطہرہ کا عمومی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان کے درمیان مالک ومملوک اور آقا وباندی کی نسبت نہیں، بلکہ وہ ایک معاملہ (نکاح) کے دوفریق اور زندگی کے دوشریک ورفیق ہیں، البتہ قدرتی اور فطری طور پر ان کے کام کی نوعیت اور صلاحیت ایک دوسرے سے مختلف ہے، بعض صلاحیتیں مردوں میں ہیں جو عورتوں میں نہیں، اور بعض عورتوں میں ہیں جن سے مرد محروم ہیں، اس اعتبار سے اسلام نے دونوں کے دائرۂ کار کو تقسیم کیا ہے کہ مرد بیرون خانہ کی سرگرمیاں انجام دے تو عورت اندرونِ خانہ کی سرگرمیاں۔ پھر ان کو بخوبی سرانجام دینے کے لیے ضروری تھا کہ ان میں کسی ایک کو سربراہ کا درجہ دیا جائے، تو ظاہر ہے کہ اپنی فطری برتری اور ذمہ داری کے لحاظ سے اس کے لیے شوہر ہی زیادہ مناسب اور موزوں ہوسکتا تھا، چناں چہ شریعت محمدی واسلامی میں اس رشتہ کا سربراہ مرد اور شوہر کو قرار دیا گیا، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ (النسآء : ٣٤)

ازدواجی زندگی کے سفر میں مرد عورتوں کے سربراہ اور ذمہ دار ہیں؛ کیوں کہ وہ شرعاً عورت کی مہر کے علاوہ خوراک، پوشاک اور زندگی کی جملہ ضروریات کا بظاہر کفیل اور ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس ذمہ داری کو رضائے الٰہی کے لیے نبھانے والے شوہر کا بڑا مقام ہے۔

شوہر کی اہمیت وعظمت:

ایک موقعہ پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”لَوْ كُنْتُ اٰمُرُ أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا“. (الترمذی عن أبی هريرة، مشكوٰة/ ص: ۲۸۱) ”اگر میں کسی کو کسی مخلوق کے لیے سجدہ کا حکم کرتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔“ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ سجدہ کسی کو روا نہیں، نہ امتی نبی کو سجدہ کر سکتا ہے، نہ مرید پیر کو، نہ شاگرد استاذ کو، نہ کوئی چھوٹا اپنے بڑے کو سجدہ کرسکتا ہے، اگر اس کی گنجائش ہوتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے

شوہر کو سجدہ کیا کرے۔ اس موقع پر ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ (مزاحیہ انداز میں) فرماتے ہیں کہ ''چودھویں صدی کے بابو کو اجازت ہوتی کہ وہ اپنی بیگم کو سجدہ کیا کرے!'' غور کیجئے گا! کسی پر دوسرے کی اہمیت وعظمت واضح کرنے کا اس سے زیادہ مؤثر اور بلیغ انداز وعنوان اور کیا ہوسکتا ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیوی پر شوہر کی اہمیت وعظمت واضح کرنے کے لیے اختیار فرمایا، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک عورت پر اللہ جل شانہٗ کے بعد سب سے بڑا حق اس کے شوہر کا ہے، جیسا کہ خود ایک حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے:

''أَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَى الْمَرْأَةِ زَوْجُهَا، وَ أَعْظَمُ النَّاسِ حَقًّا عَلَى الرَّجُلِ أُمُّهٗ''. (رواه الحاكم فی المستدرك عن عائشة، معارف الحديث:٦/٦٩)

یعنی عورت پر سب سے بڑا حق اس کے شوہر کا ہے، جب کہ مرد پر سب سے بڑا حق اس کی ماں کا ہے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ ''شوہر بیوی کے لیے بمنزلۂ پیر کے ہے، ایک ہے بیعت والا پیر اور ایک ہے بیت (گھر) والا پیر، عورت کے لیے بیعت والا پیر کافی نہیں؛ کیوں کہ وہ ہر وقت کیسے ساتھ رہ سکتا ہے؟ لہٰذا اس کے لیے بیت والا پیر چاہیے، جو ہر وقت اس کے ساتھ رہ سکتا ہے، اس کا نفع اور رتبہ بیعت والے پیر سے بھی زیادہ ہے۔'' (لہٰذا شوہر کو بھی چاہیے کہ وہ کسی مصلح سے اپنا اصلاحی تعلق قائم فرما کر اپنے اندر وہ شان پیدا کرے کہ اہل خانہ کی مناسب اصلاح کر سکے)

علاوہ ازیں شوہر کی اہمیت وعظمت کا اندازہ مذکور حدیث سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں فرمایا کہ: ''أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ''. ''جو عورت اس حالت میں دنیا سے جائے کہ اس کی اطاعت، خدمت اور حسن سلوک کی وجہ سے اس کا (نیک اور متقی) شوہر اس سے راضی رہا تو وہ مرنے کے بعد سیدھی جنت میں جائے گی۔''

یاد رکھو! جب ایک مسلمان بیوی اپنے شوہر کو راضی کر کے جنتی بن سکتی ہے تو ناراض

کرکے جہنمی بھی بن سکتی ہے، اس لیے کہ شوہر کی رضا وناراضگی پر اللہ تعالیٰ کی رضا وناراضگی موقوف ہے، اس لیے حدیث پاک میں شوہر کو راضی کرکے دنیا سے جانے والی خاتون کو جنت کی بشارت سنائی گئی۔ البتہ وہ کسی عقیدہ یا عمل کی ایسی گندگی میں ملوث ہو جس کا لازمی نتیجہ عذابِ دوزخ ہو تو پھر قانونِ الٰہی کے مطابق اس کا اثر بھی ظاہر ہو کے رہے گا، اسی طرح اگر کوئی شوہر بلا کسی خاص شرعی وجہ کے بیوی سے ناراض ہو تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیوی بے قصور ہوگی اور ناراضگی کی ذمہ داری خود شوہر پر ہوگی۔ (معارف الحدیث:٦/٧٦)

ان حقائق کی بنیاد پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ کسی بھی شادی شدہ مرد کے لیے اس کی بیوی سکونِ زندگی ہے، تو بیوی کے لیے اس کا شوہر نایاب گوہر ہے، غالباً اسی وجہ سے شریعت مطہرہ میں شوہر کی خاص اہمیت وعظمت ہے اور اسی پس منظر میں اس کے کچھ حقوق بھی متعین کیے گئے ہیں۔

شوہر کی اطاعت کی فضیلت:

اس سلسلہ میں عورت کے ذمہ شوہر کا بنیادی حق نیکی اور ہر اس جائز بات میں جس کا شوہر کو حق حاصل ہے شوہر کی اطاعت کرنا ہے، قرآنِ کریم میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ﴾ (النسآء: ٣٤) ''نیک عورتیں وہ ہیں جو فرماں بردار اور اطاعت گزار ہوتی ہیں۔'' حدیث پاک میں ایسی عورتوں کے لیے بڑی فضیلت آئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ''جو عورت اپنے شوہر کی تابعدار اور مطیع ہو تو اس کے لیے پرندے ہوا میں، مچھلیاں دریا میں، فرشتے آسمانوں میں اور درندے جنگلوں میں دعا و استغفار کرتے ہیں۔'' (معارف الحدیث:۲/۹۹)

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلْمَرْأَةُ إِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَأَحْصَنَتْ فَرْجَهَا وَ أَطَاعَتْ بَعْلَهَا، فَلْتَدْخُلْ مِنْ أَيِّ

أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَ تْ". (رواه أبو نعيم فى الحلية، مشكوٰة/ص: ۲۸۱)

''جو عورت پانچوں وقت کی نماز پڑھے، ماہِ رمضان کے روزے رکھے اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے، اسے حق ہوگا یا اختیار ہوگا کہ وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔'' جنت کے آٹھوں دروازوں پر اس کا استقبال اور ویل کم کیا جائے گا۔ یہاں زکوٰۃ اور حج کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ ہر ایک پر فرض نہیں، جب کہ نماز اور روزہ تو ہر عورت پر فرض ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ پھر اس جگہ نماز اور روزہ جو دین کے ارکان وفرائض ہیں، ان کے ساتھ عورت کے لیے اس کی عزت کی حفاظت اور شوہر کی اطاعت کو ذکر فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ شریعت مطہرہ کی نگاہ میں اس کی بھی تقریباً ایسی ہی اہمیت ہے جیسی کہ ان ارکان وفرائض کی، اسی لیے حضرت شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں کہ ''شوہر کی اطاعت اللہ کی نفلی عبادت پر مقدم ہے''۔ (اصلاحی خطبات: ۹۲/۲)

ایک واقعہ:

اس کی تائید حدیث پاک میں مذکور ایک واقعہ سے بھی ہوتی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کو شوہر کی اجازت کے بغیر نفلی عبادت سے منع فرمایا، منقول ہے کہ حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کی بیوی ایک مرتبہ خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اپنے شوہر کی شکایت کرنے لگی کہ ''حضور! میرے شوہر مجھے نماز پڑھنے پر مارتے ہیں، روزہ رکھتی ہوں تو افطار کرا دیتے ہیں اور خود نماز فجر دیر سے پڑھتے ہیں''۔ اتفاق سے حضرت صفوان رضی اللہ عنہ مجلس نبوی میں موجود تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حقیقت حال دریافت کی، تو انہوں نے کہا کہ ''حضور! بات دراصل یہ ہے کہ جب میری بیوی نماز شروع کرتی ہے تو بڑی بڑی سورتیں نماز میں دیر تک پڑھتی رہتی ہے، میرے منع کرنے کے باوجود'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی سے فرمایا کہ ''ایک چھوٹی سورت یا اس کے برابر کوئی

آیت پڑھنے سے بھی نماز ہو جاتی ہے،'' حضرت صفوان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''روزہ کا بھی یہ حال ہے کہ جب رکھتی ہے تو مسلسل رکھتی چلی جاتی ہے، رات میں نماز اور دن میں روزے، اب میں جوان آدمی قابو نہیں رکھ پاتا، اس لیے روزہ افطار کرا دیتا ہوں،'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''کوئی عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ نہ رکھے،'' پھر آپ نے نمازِ فجر کی تاخیر کا عذر یہ پیش کیا کہ ''ہم مزدوری رات دیر تک کرتے ہیں، اس لیے فجر میں ذرا تاخیر ہو جاتی ہے۔'' (ابوداود وابن ماجہ، مشکوٰۃ/ص:۲۸۲)

معلوم ہوا کہ ایک عورت کو جو ثواب نفلی عبادت پر مل سکتا ہے وہی ثواب شوہر کی (جائز امور میں) اطاعت پر ملے گا؛ کیوں کہ شوہر کی اطاعت واجب ہے، پھر عبادت کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، تو عورت کے لیے شوہر کو راضی کیے بغیر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مشکل ہے، لہٰذا جب شوہر کی اطاعت کر کے اس کو راضی کر لیا تو اس سے اللہ جل شانہ کی رضا خود بخود حاصل ہو جائے گی۔

شوہر کی مخالفت پر وعید کب ہے؟

اس کے برخلاف جو عورت اپنے شوہر کی اطاعت وفرماں برداری کے بجائے مخالفت ونافرمانی اور سرکشی کا رویہ اختیار کرے اس کے لیے حدیث پاک میں سخت وعید بھی آئی ہے، ایک حدیث میں ہے:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "ثَلَاثَةٌ لَاتُقْبَلُ لَهُمْ صَلَاةٌ وَلَا تُصْعَدُ لَهُمْ حَسَنَةٌ".

''تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ نہ ان کی نماز قبول ہوتی ہے نہ ان کی نیکی (آسمان پر) چڑھتی ہے:

(۱) "اَلْعَبْدُ الْاٰبِقُ حَتّٰى يَرْجِعَ إِلٰى مَوَالِيْهِ" اس غلام کی جو اپنے آقا سے فرار ہو جائے جب تک وہ لوٹ نہ آئے اس کی نماز اور نیکی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں۔

(۲) ”وَالْمَرْأَةُ السَّاخِطُ عَلَيْهَا زَوْجُهَا“ اور اس عورت کی نماز جو شوہر کی نافرمانی کر کے اسے ناراض کرے، جب تک فرماں برداری کر کے اسے راضی نہ کرے اس کی نماز اور نیکی قبول نہیں۔

(۳) ”وَالسَّكْرَانُ حَتّٰى يَصْحُوَ“ نشہ والا جب تک کہ وہ نشے کے استعمال سے سچی توبہ نہ کرلے۔ (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة /ص: ۲۸۳)

ایک روایت میں ہے:

عَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:” إِذَا دَعَا الرَّجُلُ زَوْجَتَهٗ لِحَاجَتِهٖ فَلْتَأْتِهٖ، وَ إِنْ كَانَتْ عَلٰى التَّنُّوْرِ“. (ترمذی/كتاب الرضاع/ مشكوٰة/ص:۲۸۱)

”جب کوئی مرد اپنی بیوی کو اپنی ضرورت کے لیے بلائے تو اس کو چاہیے کہ فوراً اس کے پاس چلی جائے، خواہ وہ چولہے پر ہی کیوں نہ بیٹھی ہو۔“ یہاں ضرورت سے بلانے کا مطلب ہر طرح کی ضرورت ہوسکتی ہے، مگر حضرات محدثین کے نزدیک اس جگہ خاص طور پر جنسی ضرورت مراد ہے، جو نکاح کا ایک بنیادی مقصد ہے؛ کیوں کہ اس معاملہ میں کوتاہی برائی بلکہ بربادی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

”إِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهٗ إِلٰى فِرَاشِهٖ، فَأَبَتْ، فَبَاتَ غَضْبَانَ، لَعَنَتْهَا الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى تُصْبِحَ“. (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ۲۸۰ عن أبي هريرة)

”جب کوئی مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے (یہ میاں بیوی کے مخصوص تعلقات کی طرف شریفانہ انداز میں ایک اشارہ ہے) اور وہ عورت بغیر کسی طبعی وشرعی عذر کے انکار کرے، یا کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرے جس سے شوہر کا وہ منشا پورا نہ ہو، اور اس کی وجہ سے شوہر ناراض ہو جائے، تو ایسی عورت پر ساری رات فرشتے صبح تک لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔“

کیوں کہ یہاں شوہر کی اطاعت واجب تھی، اسی لیے مخالفت پر یہ وعید آئی ہے۔علماءِ محققین نے فرمایا کہ ''جن باتوں کا شریعت نے حکم دیا ہے جیسے نماز وغیرہ، یا جو باتیں عورت پر شوہر کے حق کا درجہ رکھتی ہیں جیسے شوہر کے تقاضۂ طبعی کی تکمیل، بشرطیکہ کوئی عذر مانع نہ ہو، تو ان امور میں شوہر کی اطاعت واجب ہے۔اور جو باتیں شریعت کے خلاف تو نہیں، لیکن شوہر کو ان کے مطالبہ کا حق بھی نہیں، ان باتوں میں بقولِ فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہٗ شوہر کی اطاعت کی جاسکتی ہے، مگر واجب نہیں، جیسے عورت کی املاک اور جائداد میں خود اسی عورت کو اس کے جائز تصرف کا پورا پورا حق ہے، اب اگر شوہر اس سلسلہ میں کوئی مشورہ یا مطالبہ کرے تو بیوی پر اس کا قبول کرنا واجب نہیں، اس کے علاوہ شوہر خلافِ شرع باتوں کا حکم کرے تو اس وقت اطاعت نہ کرنا واجب ہے۔

عصمت اور مال کی حفاظت:

غرض شوہر کا بنیادی حق عورت کے ذمہ جائز امور میں شوہر کی اطاعت ہے، جس کی تفصیل گذر چکی ہے، اس کے بعد ایک بڑا حق یہ ہے کہ عورت کی اپنی ذات خود اس کے شوہر کی ایک امانت ہے، علماء نے فرمایا کہ ''عورت کا حسن و جمال اور اس کی ظاہری کشش بھی شوہر کا ضروری حق ہے، جسے وہ قصداً ضائع نہیں کرسکتی، اس کا جمال بھی شوہر کی امانت ہے، اسی طرح شوہر کا مال جو اس کی حفاظت میں ہے وہ بھی ایک امانت ہے، لہٰذا شوہر حاضر ہو یا غائب، زندہ ہو یا مرحوم، خوبصورت ہو یا نہ ہو، امیر ہو یا غریب، بہر حال عورت پر اپنی عصمت وآبرو اور عفت وعزت نیز شوہر کے مال کی حفاظت کرنا فرض ہے۔قرآنِ کریم نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ (النسآء: ۳٤)

یعنی نیک عورتوں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ شوہروں کی غیر موجودگی میں بھی اپنی عزت وآبرو اور ہر امانت کی حفاظت کا پورا لحاظ کرتی ہیں، بلکہ جو چیزیں دامن عفت

وعزت کو کسی بھی درجہ میں داغدار بنا سکتی ہیں ان سے بھی دور رہتی ہیں، اسی طرح شوہر کے مال کی حفاظت کا اتنا خیال رکھتی ہیں کہ اس کی اجازت کے بغیر کبھی خرچ نہیں کرتیں، یا فضول خرچ نہیں کرتیں، اور جب خرچ کرتی ہیں تو شوہر کی عزت اور اپنی زینت بنانے نیز گھر کی رونق بڑھانے اور بچوں کا مستقبل سنوارنے ہی میں اور وہ بھی حکمت وکفایت کے ساتھ شوہر کی حیثیت اور آمدنی کا خیال کر کے۔

صاحبو! یقیناً ایسی عورتیں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت اور دنیا کی عظیم ترین دولت ہیں حدیث پاک میں ارشاد فرمایا کہ "أَرْبَعٌ مَنْ أُعْطِيَهُنَّ فَقَدْ أُعْطِيَ خَيْرَ الدُّنْيَا و الْآخِرَةِ". "جس خوش نصیب بندے کو چار چیزیں مل گئیں تو سمجھ لو کہ اسے دارین کی نعمتیں اور دولتیں مل گئیں:

(١) "قَلْبٌ شَاكِرٌ" شکر کرنے والا دل۔

(٢) "وَلِسَانٌ ذَاكِرٌ" ذکر کرنے والی زبان۔

(٣) "وَبَدَنٌ عَلَى الْبَلَاءِ صَابِرٌ" صبر کرنے والا جسم۔

(٤) "وَزَوْجَةٌ لَا تَبْغِيهِ خَوْنًا فِيْ نَفْسِهَا وَلَا فِيْ مَالِهٖ". (رواہ البیھقی فی شعب الإیمان عن ابن عباسؓ، مشکوٰۃ/ ص: ٢٨٣)

ایسی عورت جو اپنی عزت آبرو اور شوہر کے مال میں خیانت نہ کرے، یہی ایک عورت کی بہت بڑی خوبی ہے، یقیناً ایسی عورت ہر شوہر کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ اس کی راحت، زینت، عزت اور ایمان کی حفاظت کا بہت ہی اہم سرمایہ ہوتی ہے۔ اقبال نے ایسی عورت ہی کے لیے کہا تھا:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

ایسی عورت اپنی ہر خوشی وغمی ہی نہیں بلکہ پوری زندگی شوہر کے ساتھ وابستہ کر دیتی

ہے، اوراس کی سنسان زندگی پر بہار وخوشگوار بنا دیتی ہے۔اس کے برخلاف جوعورتیں اپنی عصمت اورشوہر کے مال کی حفاظت نہیں کرتیں وہ حق تعالیٰ کے شدید غیظ وغضب کی شکار ہو جاتی ہیں، پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جوعورت اپنی عفت وآبرو کی حفاظت نہیں کرسکتی وہ شوہر کے مال اور گھر کی بھی حفاظت نہیں کرسکتی،اس لیے کہتے ہیں نا! کہ

جس سے آنچل بھی نہیں سر کا سنبھالا جاتا
اس سے کیا خاک تیرے گھر کی حفاظت ہوگی

شوہر کا ایک اہم حق حبس (روکنا) بھی ہے:

عورت کی عصمت وعزت کی حفاظت ہی کے خاطر انہیں یہ حکم دیا گیا کہ ﴿وَ قَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ﴾ (الأحزاب:۳۳) اس آیت کریمہ کے پیش نظر شوہر کا ایک اہم حق ''حبس'' بھی ہے،یعنی شوہر کی اجازت اور مرضی کے بغیر عام حالات میں عورتیں اپنے گھر سے باہر نہ نکلیں، نہ ایسی جگہوں اور گھروں میں جائیں جہاں جانا شوہر کو پسند نہ ہو،البتہ خاص اور مجبوری کی صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں،مثلاً عورت بیمار ہو جائے اور گھر سے باہر نکلے بغیر علاج ممکن نہ ہو، یا کوئی شرعی مسئلہ درپیش ہواور شوہر دریافت کرکے حکم سے مطلع نہ کرے تو مسئلہ کی تحقیق کے لیے کسی معتبر عالم یا مفتی کے پاس جانا،اسی طرح والدین شدید بیمار ہوں اور کوئی تیمار داری کرنے والا نہ ہوتو شوہر کی ممانعت کے باوجود عورت کے لیے والدین کی تیمار داری کے لیے جانا جائز ہے،اسی طرح ہفتہ میں ایک بار والدین اور سال میں ایک بار دیگر محرم رشتہ داروں کی ملاقات کے لیے جانے کی اجازت ہے،لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ عورت کو یہ حق اس وقت حاصل ہوگا جب اس کے والدین خود آکر ملاقات کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔اس پس منظر میں ہمارے فقہاء کا خیال یہ ہے کہ شوہر کو چاہیے کہ وہ وقتاً فوقتاً بیوی کو اس کے والدین اور اقرباء سے ملاقات کے لیے لے جائے یا اجازت دے۔(مستفاد از: قاموس الفقہ:۴/۱۱۰)

آج اس سلسلہ میں جانبین سے افراط وتفریط ہوتی ہے، جو لائق افسوس ہے۔

بہر کیف! عورتوں پر شوہر کا ایک اہم حق ''حبس'' بھی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کی اجازت ومرضی کے بغیر عام حالات میں اپنے گھر سے نہ نکلیں، اور نہ ایسے لوگوں کو اپنے گھر میں آنے دیں جن کا آنا شوہر کو ناگوار اور ناپسند ہو، خواہ وہ عورتیں اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ چناں چہ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا اس میں جہاں اور بہت سی اہم اور پر اثر ہدایات سے پوری امت کو نوازا وہیں مرد وزن کے باہمی حقوق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَلَّا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُونَهُ''. (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص: ۲۲۵)

مطلب یہی ہے کہ شوہروں کا بیویوں پر یہ حق ہے کہ جن مردوں یا عورتوں کا گھروں میں آنا اور بیویوں سے بات چیت وغیرہ کرنا شوہروں کو پسند نہ ہو، بیویاں ان کو اپنے گھروں میں آنے کی اجازت ہرگز نہ دیں، ان احکامات وہدایات پر عمل کرنا جوہرِ عفت کی حفاظت کے لیے بہت ہی ضروری ہے؛ کیوں کہ ان احکامات کی خلاف ورزی کے بعد اگر ذرا بھی عصمت پر دھبہ لگ گیا، بلکہ ایک حساس اور غیور شوہر کے دل میں اس طرح کا کوئی شبہ بھی پیدا ہو گیا تو پھر بیوی کی اچھی سے اچھی خدمت واطاعت اور کوئی بھلائی بھی شوہر کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکے گی، اس لیے کہ اس معاملہ میں معمولی کوتاہی سے بھی شیطان شوہر کے دل میں شبہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور بالآخر نتائج بڑے ناخوشگوار اور خطرناک نکلتے ہیں، لہٰذا انسانی کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شریعت نے ان احکامات پر عمل کی تاکید فرمائی۔

شوہر کے اخلاقی حقوق:

یہ تو عورتوں کے ذمہ ان کے شوہروں کے شرعی وقانونی حقوق اور واجبات تھے، مگر اس کے علاوہ بیویوں کے ذمہ شوہر کے کچھ اخلاقی حقوق اور واجبات بھی ہیں، منجملہ ان میں

سے ایک ''امورِ خانہ داری کو انجام دینا'' اس کی اصل وہ حدیث ہے جس میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی اور داماد کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ ''میرے علی! گھر کے باہر کے کام کاج کو تم انجام دیا کرو، اور خانگی امور کو بیٹی فاطمہ انجام دیا کرے۔'' چناں چہ عہد نبوی اور خیر القرون سے یہی معمول رہا کہ خواتین گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانا پکانا وغیرہ کام انجام دیا کرتی تھیں، اس لیے یہ بھی شوہر کے اخلاقی حقوق میں داخل ہے، البتہ اگر شوہر مالی اعتبار سے مضبوط اور صاحب استطاعت ہو اور بچوں کے دودھ پلانے، نیز گھر کے کام وغیرہ کے لیے انتظام کر سکتا ہو تو اس صورت میں پھر عورت پر بچوں کو دودھ پلانا، کھانا پکانا اور اسی طرح خانگی کاموں کو انجام دینا شرعاً و قانوناً واجب نہیں ہے۔ (قاموس الفقہ/ص:۱۱۲)

اسی کے ساتھ شوہر کا ایک اخلاقی حق عورت پر یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑا محسن سمجھ کر احسان شناس بنے۔ (البتہ اگر شوہر بیوی کے حقوق کو ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہو تو اس وقت عورت کو بولنے کا حق ہے، پھر یہ بولنا احسان فراموشی اور ناشکری نہیں ہوگی)

(از اسلامی فقہ: ۲/ ۱۳۸، مؤلفہ علامہ مجیب اللہ ندویؒ)

شریف عورتوں کا یہ خاص وصف ہے جس سے وہ اپنے ربِ حقیقی یعنی حق تعالیٰ اور ربِ مجازی یعنی شوہر کو بڑی آسانی سے راضی کر لیتی ہیں، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ منقول ہے کہ عمران بن حطّان خارجی فرقے کا مشہور فصیح و بلیغ شاعر گذرا ہے، اس کی ذہانت وذکاوت کے واقعات بھی مشہور ہیں۔

علامہ زمخشریؒ نے نقل کیا ہے کہ وہ بے انتہاء سیاہ فام اور بدصورت تھا، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ جتنا وہ بدصورت تھا اس کی بیوی اتنی ہی خوبصورت تھی، وہ ایک دن بڑی دیر تک اپنے شوہر کے چہرے کو دیکھتی رہی، پھر اچانک اس نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ'' عمران نے بیوی سے پوچھا: ''کیا معاملہ ہے؟ تم نے کس بات پر اللہ جل شانہ کا شکر ادا کیا اور

"الحمدُ لِلّٰہِ" کہا؟" کہنے لگی: "میں نے اس بات پر اللہ جل شانہ کا شکرادا کیا کہ ہم دونوں جنتی ہیں" شوہر نے پوچھا: "وہ کیسے؟" تو کہا: "اس لیے کہ تمہیں مجھ جیسی حسین بیوی ملی، اس پر تم نے شکرادا کیا، اور مجھے تم جیسا شوہر ملا تو میں نے صبر کیا، لہٰذا اب تم تو شکر کے راستے سے جنت میں جاؤ گے اور میں صبر کے راستے سے؛ کیوں کہ حق تعالیٰ نے شاکر وصابر دونوں ہی کے لیے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔" (جب کہ وہ مومن ہوں) (از: تراشے/ص ۱۸)

شوہر کی تسخیر کا کامیاب نسخہ:

خلاصہ یہ ہے کہ عورتیں نہایت خوش دلی کے ساتھ اپنے شوہروں کی اطاعت کریں اور اطاعت گزار بنیں، نیز ان کے مزاج کو پہچان کر حسب موقع وضرورت خوشی خوشی ان کی خدمت کریں۔ پھر شرعی پردہ کے ذریعہ اپنی عفت کی حفاظت کریں اور وفادار بنیں، نیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد اپنے شوہروں کو خود کا سب سے بڑا محسن سمجھیں اور شکرگزار بنیں۔ یقیناً ان طریقوں پر عمل کر کے ہر عورت اپنے شوہر کا دل مٹھی میں لے سکتی ہے، اس لیے کہ یہ شوہر کی تسخیر کا یقینی اور کامیاب ترین نسخہ ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں اور ہم میں سے ہر ایک کو دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی کما حقہ توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

☆......☆......☆
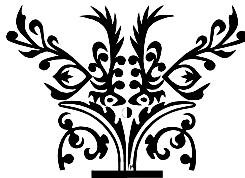
(۱۱)

طلاق کی حیثیت اس کے احکامات اور نقصانات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ''أَبۡغَضُ الۡحَلَالِ إِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ''. (رواہ أبو داود، مشکوٰۃ/ص: ۲۸۳/ باب الخلع والطلاق/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''حلال (اور جائز) چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے''۔

اسلامی معاشرے میں طلاق کی حیثیت:

کسی بھی انسان کے زندہ رہنے کے لیے تحت الاسباب غذا کی ضرورت ہوتی ہے، دوا کی نہیں، وہ ایک عارضی چیز ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی صحت مند شخص بلا وجہ غذا چھوڑ کر دوا ہی استعمال کرنے لگے تو اچھے خاصے تندرست وتوانا آدمی کا پورا جسمانی نظام درہم برہم ہو جائے گا، لیکن جب وہی انسان بیمار ہو جائے تو اب بطورِ علاج دوا بھی ضروری ہو جاتی ہے، بالکل یہی حیثیت ہے ازدواجی زندگی میں طلاق کی، اگر بلا کسی سخت مجبوری کے طلاق دی

جائے تو اس سے اچھا خاصا گھرانا متاثر ہو کر پورے پورے انسانی سماج کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اسی لیے اسلام میں اصلاً طلاق کی حرمت اور ممانعت ہی ہے، صرف ضرورت کے موقع پر ہی مجبوری کے آخری درجہ میں اس کی اجازت ہے، جب کہ خدانخواستہ ازدواجی زندگی میں ناخوشگواری اور ایسی دوری پیدا ہو جائے جیسے سمندر کے دو کنارے، تو ایسی صورت میں طلاق ایک ناخوشگوار ضرورت ہی نہیں، باعث راحت بھی ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ طلاق نہ تو کوئی گالی ہے نہ غصہ نکالنے کا ذریعہ، بلکہ مجبوری اور ضرورت کے وقت رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کا ایک حکیمانہ قانون ہے، یہ دوا کا وہ کڑوا گھونٹ ہے جس کو طبع انسانی ناپسند کرتی ہے، مگر عقل انسانی کہتی ہے کہ اسی تلخ کامی (اور کڑوے گھونٹ) میں بیمار ذہنیت کے لیے صحت وشفا کی حلاوت چھپی ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام طلاق کے باب میں نہ تو اتنی تنگی رکھتا ہے کہ کسی حال میں بھی اس کی تعلیمات میں کوئی گنجائش ہی نہ نکلے، اور نہ ہی اتنی آزادی کہ جب جس کا جی چاہے بغیر شرعی وسماجی ذمہ داری محسوس کیے جھٹ سے بندوق کی گولی کی طرح تین گولیاں چھوڑ دے؛ کیوں کہ طلاق ازدواجی زندگی کی ناخوشگواری کا ابتدائی نہیں بلکہ بالکل آخری مرحلہ ہے۔ یاد رکھو! اسلام دین فطرت ہے، اس کے دستور العمل میں فطرتِ بشری کی رعایت کرتے ہوئے ہر جگہ مناسب قیود اور حدود موجود ہیں، چناں چہ طلاق کے بھی کچھ اصول ہیں، اور اس کے بھی کچھ قیود واحکام ہیں، اگر لوگ ان ہدایات واحکامات کو اچھی طرح سمجھ کر عمل کریں تو نہ جانے کتنے گھریلو جھگڑے اور خاندانی مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔

اسلام میں طلاق کی حقیقت:

اسلام کے علاوہ دنیا کے دو بڑے مذاہب: ہندومت اور عیسائیت میں اصلاً طلاق کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، (ہندوؤں میں طلاق اور نکاحِ ثانی کا حق نہ ہونے کی وجہ سے ہی ''ستی'' کو رواج ہوا جو ظلم کی انتہا ہے) میاں بیوی جب ایک مرتبہ نکاح کے رشتہ میں بندھ جائیں تو

اب ان کے آپسی تعلقات کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، موت کے علاوہ کوئی چیز ایک کو دوسرے سے نجات نہیں دلا سکتی تھی، ظاہر ہے کہ یہ تفریط اور ایک غیر فطری تصور تھا، اس لیے بالآخر ہندو اور عیسائی اقوام نے اپنی گردن سے اس قانونی طوق کو اتار پھینکا، وہ اپنے قدیم مذہب اور موقف پر قائم نہ رہ سکیں، آج ہندوستان اور مغربی و عیسائی ممالک میں ہر جگہ طلاق کی گنجائش پیدا کی گئی ہے، بلکہ مغربی اقوام اور کلچر نے تو اس میں اس درجہ افراط سے (حد سے گذر کر) کام لیا اور ایسے معمولی معمولی اسباب پر طلاق لینی شروع کر دی کہ گویا ''نکاح کا پاکیزہ رشتہ بچوں کا گھروندا ہو، جسے صبح بنایا اور شام کو توڑ دیا''۔

اسلام چوں کہ دین فطرت ہے، اس لیے طلاق کے بارے میں اس نے جو موقف اختیار کیا درحقیقت وہ نہایت ہی معتدل اور تقاضائے فطرت کے عین مطابق ہے، نہ بے جا سختی، نہ مکمل آزادی؛ اس لیے کہ میاں بیوی کے درمیان بعض اوقات ایسے ناگوار اور نامناسب حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن میں ان کا ساتھ رہنا بجائے راحت و مسرت کے مصیبت بن جاتا ہے، اس وقت نکاح کے مقدس رشتے کو ان پر زبردستی تھوپے رکھنا دونوں کی زندگی کو عذاب بنا سکتا ہے، اس لیے ایسے ناخوشگوار اور نامناسب حالات میں فریقین ہنسی خوشی اور باضابطہ رشتۂ نکاح کو ختم کر کے ایک دوسرے سے مستقل علاحدگی اختیار کر لیں تو یہ عقل و نقل کے اعتبار سے کوئی جرم نہیں ہے، اسلام میں اسی کا اصطلاحی نام ''طلاق'' ہے، جو بوقت ضرورت ہے تو حلال، لیکن حق تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے، جیسا کہ حدیث بالا میں فرمایا گیا۔

طلاق سے پہلے تدبیر:

اسی لیے اسلام طلاق سے پہلے تدبیر کا نہایت تاکید سے حکم دیتا ہے، تاکہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے؛ کیوں کہ تدبیر سے پہلے طلاق دینا مصیبت بھی ہے اور معصیت بھی۔

اس سلسلہ کی تدابیر کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر میاں بیوی کو ایک دوسرے کی کوئی بات پسند نہ ہو تو ان کو ایک دوسرے کی اچھی اور پسندیدہ باتوں پر بھی نظر اور غور کرنا چاہیے، قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا:

﴿فَإِنۡ كَرِهۡتُمُوهُنَّ فَعَسٰۤى أَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡئًا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا﴾
(النسآء: ۱۹)

’’اور اگر بمقتضائے طبیعت ان کی کوئی بات تم کو پسند نہ ہو تو یہ سوچو کہ شاید تم جس چیز کو برا سمجھ رہے ہو حق تعالیٰ نے اس میں تمہارے لیے کوئی بھلائی رکھی ہو‘‘۔

اس ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بھی بے عیب نہیں ہوتا، اب اگر کسی میں کوئی ایک خرابی ہے بھی تو اس میں دس اچھائیاں بھی ہوسکتی ہیں، لہٰذا ایک خرابی کو لے کر بیٹھے رہنا اور دس اچھائیوں سے آنکھیں بند کر لینا انصاف کے خلاف ہے، اس سے کوئی مسئلہ حل بھی نہیں ہوسکتا، حدیث شریف میں ہے:

عَنۡ أَبِيۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا يَفۡرَكُ مُؤۡمِنٌ مُؤۡمِنَةً، إِنۡ كَرِهَ مِنۡهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنۡهَا آخَرَ". (مسلم، مشکوٰۃ/ص: ۲۸۰)

’’کوئی مسلمان مرد کسی مسلمان عورت سے بغض نہ رکھے، اگر اس کو اس کی ایک عادت پسند نہ ہو تو دوسری پسند آجائے گی۔‘‘

اس لیے طبعی خامیوں کو نظر انداز کر کے فطری اور واقعی خوبیوں کو پیشِ نظر رکھیں، یہ ایک مومن شوہر کی صفت ایمان کا تقاضا اور مومنہ بیوی کے ایمان کا حق ہے۔

اور اگر میاں بیوی کے مابین کوئی اختلاف یا جھگڑا ہو تو اس وقت حکم یہ ہے کہ جس بات پر اختلاف اور جھگڑا ہوا اس کے اسباب میں غور کریں، پھر انہیں دور کرنے کی سنجیدگی کے ساتھ کوشش کریں، افہام وتفہیم اور عفو ودرگذر سے کام لیں، تاکہ بات آگے نہ بڑھے۔

جو مسائل در پیش ہوں گفتگو سے حل کرلو!
فیصلہ نہیں ہوتا، فاصلہ بڑھانے سے

لیکن اگر نرم وگرم ہر طریقہ آزمانے کے بعد بھی اختلاف اور جھگڑا باقی رہے، تب دونوں اپنے اپنے کسی خیر خواہ کو ثالث بنالیں (کسی کو اپنے بیچ میں ڈالیں) اب وہ دونوں نمائندے میاں بیوی کی باتیں سن کر سمجھ کر اختلافات اور جھگڑا ختم کرنے کی نیک نیتی کے ساتھ اصلاحی کوشش کریں، جس کی کوتاہی ہوا سے آگاہ کریں کہ میاں بیوی کا یہ نازک رشتہ ہے، یہ کوئی ہار جیت کا کھیل نہیں، انہیں بتلائیں کہ یہ اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کا معاملہ ہے، اس لیے اپنی کوتاہی تسلیم کریں اور ایک دوسرے کو برداشت کریں، قرآنِ کریم نے وعدہ کیا ہے:

﴿ إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ﴾ (النسآء: ۳۵)

''اگر یہ دونوں نمائندے نیک نیتی سے ان کے درمیان اصلاح کی کوشش کریں گے تو حق تعالیٰ ان کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔'' یقیناً اس قرآنی واسلامی نسخہ کو اختیار کرکے دوبارہ زوجین کا تعلق درست کیا جاسکتا ہے۔

صاحبو! یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے ہی ہیں، بالخصوص ازدواجی زندگی میں تو ایک دوسرے سے گلے شکوے ہوتے ہی ہیں، جب کبھی ایک دوسرے سے امیدیں وابستہ ہونے کے بعد وہ ٹوٹتی ہیں تو مایوسی ہوتی ہے، توقعات پر کوئی پورا نہ اترے تو جھنجھلاہٹ ہوتی ہے، یہ باتیں کوئی نئی نہیں، شاید ہی کسی کی زندگی اس سے خالی ہو، عموماً ایسی باتیں آنی جانی ہوا کرتی ہیں، مل جل کر تدبیر کرنے سے وہ راحت میں بھی بدل سکتی ہیں، لہٰذا اس قسم کی باتوں پر علاحدگی اختیار کرلینا کوئی سمجھداری ودانائی نہیں، اس لیے نہ مرد طلاق کا قدم اٹھائے اور نہ عورت اس کا مطالبہ کرے۔

طلاق کا اسلامی طریقہ:

تاہم یہ تدبیر بھی۔ العیاذ باللہ العظیم۔ ناکام ہوجائے اور اندازہ ہوجائے کہ اب نہ تو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار زندگی گذار سکتے ہیں، نہ ایک دوسرے کے حقوق ادا کر

سکتے ہیں، تو اس انتہائی مجبوری کی صورت میں پھر طلاق کی اجازت میاں بیوی کے لیے ایک ضرورت بن جاتی ہے، کیوں کہ

وہ افسانہ جسے انجام تک پہنچانا نہ ہو ممکن
اسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا ہے

اسلام نے ازدواجی زندگی میں میاں بیوی کو اس کی خاص تلقین کی کہ جہاں تک ممکن ہو ایک دوسرے کے ساتھ بہترین سلوک کیا جائے، اور اگر بوقت مجبوری علاحدگی کا فیصلہ کریں تو اس میں بھی شرافت والا طریقہ اختیار کیا جائے، اور حسن سلوک کا دامن چھوڑا نہ جائے، قرآن مجید نے اسے یوں تعبیر کیا ہے:

﴿فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ (البقرة: ۲۲۹)

منشا یہ ہے کہ جس طرح تم نے سوچ سمجھ کر شرافت کے ساتھ نکاح کیا تھا، اب جب طلاق کے ذریعہ اس رشتہ کو بجبوری ختم کرنا ہو تو بھی اسی طرح سوچ سمجھ کر شرافت کے ساتھ ختم کیا جائے۔

ایک واقعہ:

چناں چہ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ ایک بزرگ نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کیا، تو مریدین نے وجہ دریافت کی، انہوں نے خاموشی اختیار کی، پھر کچھ عرصہ کے بعد طلاق دے دی، تب بھی مریدین نے وجہ دریافت کی، مگر حضرت اس وقت بھی خاموش رہے، بعض احباب نے عرض کیا کہ ''حضرت! آپ نے طلاق دینے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی، تو اب کم از کم وجہ بیان نہ کرنے کی وجہ ہی بیان کر دیجئے!'' اس پر انہوں نے بڑا عجیب جواب دیا کہ ''دیکھو! جب وہ میری بیوی تھی اس وقت اگر میں اس کی کوئی برائی بیان کرتا تو یہ میری غیرت کے خلاف تھا، اور جب میں اسے طلاق دے چکا تو اب وہ میرے لیے اجنبیہ ہوگئی، جس کی برائی کرنا جائز نہیں، لہٰذا نہ اس وقت وجہ بتانا پسند کیا نہ اب کرتا ہوں۔'' (از: فیض ابرار)

غرض! طلاق کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ طلاق دینے کے لیے اولاً مناسب وقت (طہر اور پاکی) کا انتظار کیا جائے، پھر جب مناسب وقت آجائے، یعنی عورت اپنے ماہانہ نسوانی دورے سے فارغ ہو چکی ہو، اور میاں بیوی کے درمیان وظیفۂ زوجیت ادا کرنے (صحبت) کی نوبت نہ آئی ہو، تو اسی وقت شوہر دو گواہوں کی موجودگی میں صرف ایک طلاق دے کر خاموش ہو جائے، یہ احسن طریقہ ہے، اس طرح ایک طلاقِ رجعی واقع ہو جائے گی، اس میں عدت گذرنے تک زوجین کو پھر سے سوچنے سمجھنے کا موقع ملتا ہے، اس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ کرے دونوں کے لیے حالات درست ہو جائیں تو شوہر عدت کے دوران (جو کہ تین حیض، یا تین ماہ یا حاملہ کے لیے وضع حمل کی مدت ہے اس میں) اپنی دی ہوئی طلاق سے رجوع کر سکتا ہے، جس کے لیے زبان سے اتنا کہنا بھی کافی ہے کہ ''میں نے طلاق سے رجوع کر لیا۔'' البتہ دو گواہوں کی موجودگی میں یہ رجوع کیا جائے۔

اس طرح نکاح کا رشتہ خود بخود تازہ ہو جائے گا، اور اگر عدت میں رجوع نہیں کیا تو عدت ختم ہوتے ہی طلاقِ بائن ہو جائے گی، جس میں شوہر کو رجوع کا حق نہیں رہتا، لیکن اگر بعد میں دونوں کو یہ احساس ہو جائے کہ اب انہوں نے سبق سیکھ لیا ہے اور آئندہ مناسب انداز میں دونوں پہلے سے اچھی زندگی گذار سکتے ہیں تو ان کے لیے یہ راستہ کھلا ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے دوبارہ از سرِ نو نکاح کر لیں۔ (جس کے لیے نیا ایجاب وقبول، گواہ اور مہر سب ضروری ہے) اگر مذکورہ سہولت اور اسلامی ہدایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میاں بیوی نے پھر سے نکاح کا رشتہ تازہ کر لیا ہو اور پھر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تنازع (جھگڑا) کھڑا ہو جائے تب بھی دوسری طلاق دینے میں جلدی نہ کرے، بلکہ ان ہی ہدایات پر عمل کرے جو اوپر ذکر کی گئیں، ان تمام ہدایات کے باوجود اگر پھر طلاق دینا ضروری ہو تو اس مرتبہ بھی اسی طرح ایک ہی طلاق دے، اب مجموعی طور پر دو طلاقیں ہو جائیں گی، لیکن معاملہ اس کے باوجود میاں بیوی کے ہاتھ میں رہے گا، یعنی عدت کے دوران شوہر پھر رجوع کر سکتا ہے، اور عدت گذرنے کے بعد دونوں باہمی رضامندی سے پھر تیسری بار نکاح کر سکتے ہیں،

یہ ہے طلاق دینے کا وہ اسلامی طریقہ جس میں نقصانات کم سے کم اور نکاح کے رشتہ کو برقرار رکھنے اور ٹوٹنے سے بچانے کے لیے درجہ بدرجہ مختلف راستے کھلے ہیں۔

ایک طلاق ابھی نہیں اور تین طلاق میں جلدی نہیں:

ہاں اگر کوئی شخص ان تمام درجوں کو پھلانگ جائے تو پھر نکاح وطلاق کوئی آنکھ مچولی کا کھیل تو نہیں جو غیر محدود زمانہ تک جاری رکھا جائے، لہٰذا جب تیسری طلاق بھی دے دی، یا-العیاذ باللہ العظیم-کوئی عقل کا اندھا اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہوکر دھڑ ادھڑ تین طلاق دے دے، جو گناہ، غلط اور غیر شرعی طریقہ ہے، تو بقولِ حضرت شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ اب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چاروں فقہی مکاتب فکر کے نزدیک اس گناہ کی ایک سزا یہ ہے کہ اس کے بعد رجوع یا نئے نکاح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، اور جو لوگ ان فقہی مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اکثر تین طلاقیں ایک ساتھ دینے کے بعد شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔(از: ذکر وفکر/ص:۳۲۴)

لہٰذا طلاق کے معاملے میں سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنے سے طلاق ہوتی ہی نہیں، بلکہ طلاق کا صحیح اور احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک ہی مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کیا جائے، اس سے زیادہ نہیں، اور وہ بھی فوری نہیں، عاجز کا خیالِ ناقص ہے کہ ''ایک طلاق ابھی نہیں اور تین طلاق میں جلدی نہیں۔'' ورنہ معاملہ نہایت دشوار ہو جائے گا، اور جس طرح ایک اور تین کے عدد میں فرق ہے اسی طرح ایک اور تین طلاق دینے کے حکم میں بھی فرق ہے، دونوں کا حکم ایک نہیں ہے۔

فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ ''اگر واقعی طلاق شریعت کے بتائے ہوئے اس طریقہ پر دی جائے اور طلاق سے پہلے ازدواجی زندگی کی مشکلات اور مسائل کے حل کے لیے یہ راستے اختیار کیے جائیں تو طلاق کا تناسب جو بہ مقابلہ دوسری اقوام کے مسلمانوں میں بحمد للہ اب بھی کم ہے اور بھی کم ہو جائے''۔(قاموس

الفقہ :۴/ ۳۶۶)

طلاق کا اختیار مردوں کو کیوں؟:

پھر یہ کمالِ حکمت ہے کہ اسلام نے طلاق کی باگ مردوں کے ہاتھ میں رکھی ہے، چوں کہ نکاح کی بنا پر عائد ہونے والی تمام مالی ذمہ داریاں مردوں کے سر ہیں، اس لیے عدل کا تقاضا ہے کہ معاہدہ کے جس فریق پر ذمہ داریوں کا بوجھ رکھا گیا ہے اسی کو اس معاہدہ کو ختم کرنے کا اختیار بھی حاصل ہو، یہ تو ایک قانونی پہلو ہے، لیکن غور کیا جائے تو اصل میں اسلام نے اس قانون کے ذریعہ عورتوں کو تحفظ فراہم کیا ہے، ظاہر ہے کہ قدرتی طور پر معاہدۂ نکاح کے دو فریق مرد و عورت میں خلقی (پیدائشی) اعتبار سے مرد کو غلبہ اور قوت حاصل ہے، اب اگر مرد کو طلاق دے کر نجات پانے کا موقع حاصل نہ ہو تو وہ ظلم کا غیر قانونی راستہ اختیار کرتا ہے اور عدالت کی تگ و دو کی بجائے چاہتا ہے کہ عورت ہی کو اپنی راہ سے ہٹا دے، اس طرح عورتوں کو قتل اور نذرِ آتش کرنے کے واقعات پیش آتے ہیں، جو ہندوستان میں روزمرہ کا معمول ہے، اور رہ گئی اس کے بعد شوہر کے خلاف عدالتی کاروائی، تو دنیا کے اکثر ملکوں میں منصوبہ بند قتل کے جرم کو ثابت کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ہمارے ہندوستان جیسے ممالک میں شوہر کو عدالت سے طلاق حاصل کرنے میں جتنی دشواری پیش آتی ہے شوہر اس سے کم میں قتل اور اقدامِ قتل کی سزا سے اپنے آپ کو بچالے جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم سماج میں باوجود ناخواندگی اور تعلیمی و معاشی پسماندگی کے دلہنوں کو جلانے کے واقعات بہ مقابلہ ہندو معاشرہ کے ''صفر'' کے درجہ میں ہیں۔ (قاموس الفقہ :۴/ ۳۵۵)

الغرض شریعت اسلامی کا کمال یہ ہے کہ اس نے طلاق کا اصل اختیار مرد کو دیا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتوں کی نجات کا کوئی راستہ ہی نہیں رکھا، بلکہ ان کے لیے بھی خلع یا بذریعۂ قاضیٔ شریعت (اسلامی عدالت کا جج) فسخ نکاح کی گنجائش رکھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت کو کسی طرح یہ یقین ہو جائے کہ وہ اپنے شوہر کے یا خود اس کا شوہر اس کے

حقوق ادا نہیں کرسکتا، یا دونوں میں موافقت ہو ہی نہیں سکتی، لیکن مرد طلاق دینے پر آمادہ بھی نہیں، تو ایسی صورت میں عورت اپنا مہر معاف کر کے یا مہر کی رقم لوٹا کر یا اپنے حقوق معاف کر کے یا پھر جو کچھ رضا مندی سے مناسب رقم طے ہو جائے اسے دے کر شوہر کو طلاق دینے پر آمادہ کرسکتی ہے، اسے خلع کہتے ہیں، لیکن اگر شوہر کسی طرح راضی نہ ہو اور نہ حقوق ادا کرتا ہے اور نہ آپس میں دونوں کے تعلقات کی درستی ممکن ہو تو اس وقت قاضئ شریعت معاملہ کی تحقیق کے بعد اپنے اختیارات کو استعمال کر کے شوہر کو خلع پر مجبور کرسکتا ہے، یا فسخ نکاح کے طور پر عورت کو طلاقِ بائن دے سکتا ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت ثابت بن قیس نامی ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا اسی طرح کا معاملہ پیش آیا تو آپ ﷺ نے ان کی بیوی کو حکم دیا کہ وہ مہر میں دیا گیا باغ واپس لوٹا دیں، اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ وہ طلاق دے دیں۔ (بخاری، مشکوٰۃ /ص: ۲۸۳/ باب الخلع و الطلاق/ الفصل الأول)

آج بھی بحمد اللہ ہمارے مفکرین ملت حضرات علماءِ امت نے ملک کے مختلف حصوں میں ''دار القضاء'' قائم کیے ہیں، جہاں اس قسم کے امور انجام پاتے ہیں، لہٰذا ان سے استفادہ بوقت ضرورت کیا جاسکتا ہے، بلکہ ضروری ہے۔

طلاق کی مذمت:

بہر کیف یہ طلاق کے قانونی اور شرعی احکامات تھے، جو اسلامی شریعت کی صداقت وحقانیت کی واضح دلیل بھی ہیں اور جن سے مشرق ومغرب کے ماہرین قانون نے خوشہ چینی کی ہے، لیکن اگر کوئی شخص ان تمام احکامات وہدایات سے قطع نظر کر کے بے سوچے سمجھے طلاق دے تو اس میں اسلام کا کیا قصور ہے! غلطی اور گناہ خود اسی کا ہے، نیز ایسے لوگوں کے لیے بڑی سخت مذمت اور وعید وارد ہوئی ہے، چناں چہ حدیث مذکور میں اسے ''أَبْغَضُ الْحَلاَلِ'' قرار دیا گیا، یعنی کوئی بھی حلال کام اس سے زیادہ برا نہیں ہوسکتا۔ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

تا توانی پا منہ اندر فراق ☆ أبغضُ الأشياءِ عندی الطلاق

"جب تک ہو سکے جدائی میں پاؤں مت رکھو، یہ چیز رحمٰن کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔" لیکن شیطان کو یہی چیز سب سے زیادہ پسند ہے، جیسا کہ روایت میں صراحت ہے کہ شیطان اپنا تخت سمندر پر بچھا کر اپنے کارندوں سے کارگزاری سنتا ہے، ان میں سے جب کوئی میاں بیوی کی جدائی کی بات سناتا ہے تو شیطان اسے خوش ہو کر شاباشی دیتا ہے۔
(مسلم، مشکوٰۃ/ص:۱۸)

ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَا مُعَاذُ! مَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الْعِتَاقِ، وَلَا خَلَقَ اللّٰهُ شَيْئًا عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ أَبْغَضَ مِنَ الطَّلَاقِ". (رواه الدار قطنی، مشکوٰة/ ص: ٢٨٤/ باب الخلع والطلاق/ الفصل الثالث)

"حق تعالیٰ کے نزدیک روئے زمین پر غلام (یعنی قیدی) آزاد کرنے سے زیادہ محبوب اور کوئی چیز نہیں، اور طلاق سے زیادہ مبغوض اور کوئی چیز نہیں۔

ایک حدیث میں ہے:

"تَزَوَّجُوْا وَلَا تُطَلِّقُوْا، فَإِنَّ الطَّلَاقَ يَهْتَزُّ مِنْهُ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ". (المقاصد الحسنة: ٣١، رواه علي بن أبی طالبؓ)

نکاح کرو اور (بلاوجہ) طلاق مت دو؛ کیوں کہ اس سے خدا کا عرش ہل جاتا ہے۔

ایک روایت میں ہے:

عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَيُّمَا امْرَأَةٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلَاقًا فِيْ غَيْرِمَا بَأْسٍ، فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَائِحَةُ الْجَنَّةِ". (رواه أحمد والترمذی، مشکوٰة/ ص: ٢٨٣)

''جو عورت اپنے شوہر سے (بغیر کسی سختی اور شدید مجبوری کے) طلاق کا مطالبہ کرے تو اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔''

طلاق کے نقصانات اور اسباب:

بے وجہ طلاق کی مذمت اس لیے ہے کہ اس کے نقصانات ونتائج بڑے سنگین ہیں، اس سے صرف رشتۂ نکاح ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ خاندانی زندگی کے بہت سے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں: مثلاً

(۱) میاں بیوی چوں کہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں؛ اس لیے ازدواجی زندگی کے گہرے تعلقات کے بعد کی جدائی سخت پریشانی اور قلبی وذہنی کوفت کا سبب ہوتی ہے۔

(۲) اگر میاں بیوی سے کوئی اولاد ہے تو طلاق کے بعد ان کی پرورش کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اور ماں باپ کی جدائی سے بچوں کی نفسیات پر بھی بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

(۳) مہر، نفقہ، عدت واملاک کی تقسیم میں بھی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۴) موجودہ حالات میں طلاق والے مرد وعورت کے لیے عقدِ ثانی سہل و آسان نہیں ہوتا، عام طور پر انہیں بے نکاحی زندگی گذارنی پڑتی ہے، جس سے اخلاقی نقصانات بھی ہوتے ہیں، پھر عموماً عورت کے لیے تو گذر بسر کا بھی مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے، خصوصاً ہمارے ہندوستان جیسے ممالک میں جہاں پہلے سے معاشی حالات اتنے اچھے نہیں ہیں، ایسے میں ایک مطلقہ اور بیوہ عورت کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ تمام پرعیاں ہے، اسی وجہ سے ایک زخم خوردہ خاتون نے طلاق ہونے پر اپنے سابقہ شوہر سے کہا تھا:

طلاق تو دے رہے ہو بڑے غیظ وغضب کے ساتھ
میرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ

غرض یہ کہ طلاق سے نہ صرف میاں بیوی اور ان کی اولاد بلکہ پورے خاندان اور سماج پر اس کے دور رس اثرات پڑتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاں بوقت ضرورت طلاق کی اجازت دی ہے وہاں اسے "أَبْغَضُ الْحَلاَلِ" بھی قرار دیا ہے، یعنی یہ وہ چیز ہے جو جائز کاموں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔ اس لیے طلاق اور اس کے اسباب سے بچنا چاہیے، آج کل جو بلا وجہ اور بلا مجبوری کے طلاقیں واقع ہوتی ہیں تو عموماً اس کے اسباب یہ ہیں: (۱) ناپسندیدگی کے باوجود شادی۔ (۲) آپس میں شکوک وشبہات اور بدگمانی۔ اس موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ جس دروازے سے شک اندر آتا ہے محبت اور اعتماد اسی دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں، لہٰذا خواہ مخواہ شک کرنے سے احتیاط کرنا چاہیے۔ (۳) عیش پرستی۔ (۴) ازدواجی زندگی کی اہمیت سے ناواقفی۔ (۵) اسلامی تعلیمات وہدایات سے دوری۔ ضرورت ہے کہ شادی کے موقع پر اپنی پسند کا لحاظ رکھے، یا پھر جس سے شادی ہوگئی اس سے اب خوش ہو جائے، یہ بھی ایک اعتبار سے مجاہدہ ہے، اس کے علاوہ بلا وجہ شکوک وبدگمانی سے احتیاط کرے، عیش پرستی کے بجائے ذمہ داری والی زندگی اختیار کرے، ازدواجی زندگی کی اہمیت کو سمجھے، اس کی خوشگواری پر زندگی کی خوشگواری ایک حد تک موقوف ہے، نیز طلاق کے نقصانات کو سوچے، اسی کے ساتھ علماءِ کرام اپنے خطبوں، وعظوں اور حلقوں میں اس قسم کی باتیں عوام کے سامنے واضح کریں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ بھی یہ احکامات وہدایات لوگوں تک پہنچائی جائیں، تاکہ اس سلسلہ میں ہونے والی بے اعتدالیاں اور غلط فہمیاں ختم ہو جائیں۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں اور طلاق وافتراق سے حفاظت فرما دے۔ آمین۔

یوم عاشوراء/۱۴۳۲ھ/ یومِ جمعہ (بزمِ صدیقی)

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

(۱۲)

تربیتِ اولاد کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ أَوْ يُنَصِّرَانِهٖ أَوْ يُمَجِّسَانِهٖ، كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِيْمَةُ بَهِيْمَةً جَمْعَاءَ، هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ؟ ثُمَّ يَقُوْلُ: ﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذَالِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ﴾ (الروم: ٣٠) (متفق عليه، مشكوة /ص: ٢١/ باب الإيمان بالقدر)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ "ہر بچہ فطرت یعنی اسلام پر یا ایمان قبول کرنے کی صلاحیت پر پیدا کیا جاتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی (و پارسی وغیرہ) بنا دیتے ہیں، جس طرح ایک جانور جب (کامل الخلقت) بچہ جنتا ہے تو پیدائش کے وقت وہ صحیح وسالم ہوتا ہے، کیا تمہیں اس میں کمی محسوس ہوتی ہے؟ پھر (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے) یہ آیت کریمہ پڑھی، جس کا مطلب یہ ہے کہ "اللہ کی دی ہوئی صلاحیت وقابلیت کا اتباع کرو، جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی پیدا کردہ شئ کو تبدیل نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے"۔

تربیت کا ابتدائی دور بچپن کا ہے:

اللہ جل شانہ وعم نوالہٗ کی جانب سے بلا کسی استحقاق وبلا کسی فرق وامتیاز کے جو زندگی کی بے بدل نعمت ملی اس کا ابتدائی، بنیادی اور بہترین زمانہ بچپن کا ہے، انسانی سیرت واخلاق کی تعمیر وترقی میں بچپن کا دور نہایت اہم سمجھا جاتا ہے، اگر اخروی زندگی کا بننا اور بگڑنا دنیوی زندگی کے بننے اور بگڑنے پر موقوف ہے تو دنیوی زندگی کا بننا اور بگڑنا، سنورنا اور اجڑنا بڑی حد تک بچپن کے دور پر موقوف ہے، عموماً بچپن کا اچھا برا اثر پچپن (اخیری عمر) تک رہتا ہے، جس کا بچپنہ سنور گیا اس کی عموماً جوانی نورانی اور پوری زندگی بھلائی وکامیابی کے ساتھ گذرتی ہے، اس کے برخلاف جس کا بچپنہ بگڑ گیا عموماً اس کی جوانی دیوانی وطوفانی اور پوری زندگی برائی وناکامی کے ساتھ گذرتی ہے، اس لیے بچوں کی تعلیم وتربیت کی فکر بچپن ہی سے ضروری ہے، اس میں غفلت ہلاکت کا ذریعہ ہے۔

ایک ماہر اطفال بزرگ سے کسی نے اپنے بچہ سے متعلق یہ سوال کیا کہ ''بچہ کی تربیت کس عمر سے کرنی چاہیے؟'' انھوں نے پوچھا: ''یہ بتلاؤ کہ تمہارے بچے کی پیدائش میں ابھی کتنا وقت باقی ہے؟'' اس نے کہا کہ ''وہ تو چھ سال کا ہو چکا'' تو فرمایا: ''انا للہ...... افسوس ہے کہ تم نے اپنے بچہ کی تربیت کے چھ سال ضائع کردیے، جاؤ اور فوراً تربیت شروع کردو؛ کیوں کہ بچہ نرم ونازک اور نوخیز پودے کے مانند ہے، اس کو جس طرح چاہیں موڑا جا سکتا ہے، ایک پودا جب تک پودا ہوتا ہے تب تک اس کی ڈالیوں کو موڑنا آسان ہے، مگر جب وہ درخت بن جائے تو پھر اسے موڑنا دشوار ہوتا ہے، یہی حال بچپن کا ہے، بچے کو نیک وبد جس ماحول میں ڈھالا جائے وہ ڈھل جاتا ہے، اگر بچپن میں جسمانی نشو ونما کے ساتھ والدین اور سرپرست حضرات بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دیں، دینی، اصلاحی واخلاقی اعتبار سے ان کی پوری نگرانی رکھیں، انہیں صالح وسازگار ماحول دیں، تو آج کے یہ بچے مستقبل (فیوچر) میں بڑے بنیں گے، یہ نرم ونازک پودے شجرۂ طیبہ بنیں گے اور ساری انسانیت ان

کے سایہ تلے راحت پائے گی اور ان کے اعمالِ صالحہ واخلاقِ حسنہ کے ثمرۂ شیریں سے مستفیض ہوگی، وبالعکس! اگر بچوں کے بچپن میں ان کے والدین اور سرپرستوں نے صحیح تعلیم وتربیت سے غفلت برتی، دینی، اصلاحی واخلاقی اعتبار سے ان کی نگرانی نہ رکھی، بےحیائی اور برائی والے ماحولِ قابلِ لاحول سے انہیں نہ بچایا تو یہ بچے پھر برے بنیں گے، پھر ان کا مستقبل بھی نہایت تاریک ہوگا، ایسے بچے معاشرے کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوں گے اور حدیث کے مطابق اس کے ذمہ دار بڑی حد تک ان کے والدین اور سرپرست ہی ہوں گے؛ کیوں کہ یہ دراصل ان ہی کے اچھے برے ہونے کا اثر ہے جو بچوں نے قبول کیا ہے۔

اچھے یا برے لوگ پیدا نہیں ہوتے، بنائے جاتے ہیں:

حدیث مذکور میں اس حقیقت کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں سمجھایا گیا ہے کہ ''حق تعالیٰ اپنے سبھی بندوں اور بندیوں پر بہت ہی مہربان اور رحیم وکریم ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے ہر بچہ کو فطرتِ اسلامی پر پیدا فرمایا، خواہ وہ کسی گھرانے، علاقے اور ملک میں پیدا ہوا ہو، وہ ایسی صلاحیتوں پر پیدا کیا جاتا ہے کہ اگر اسے غلط اور گناہوں والا گندا ماحول نہ ملے تو ایک بہترین انسان اور مسلمان بن کر معاشرہ کا مفید ترین فرد بن سکتا ہے، لیکن اگر معاملہ اس کے خلاف ہوا تو والدین اور سرپرستوں کی غلط تربیت اور ماحول کے برے اثرات سے اس کے افکار واعمال بھی بگڑ جاتے ہیں، جیسے ہم عملی طور پر دیکھتے ہیں کہ آج کل مسلمان گھرانوں میں پیدا ہونے والے بچوں کو جب عیسائیوں کے مشنری اسکولوں یا دیگر غیر مسلموں کے مذہبی تعلیمی اداروں میں داخل کردیا جاتا ہے تو اکثر وہ ان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں، اور اسلام کے فطری وعقلی نظریات، عقائد واعمال سے بیگانہ ہوجاتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی اس روحانی، ایمانی واخلاقی تباہی میں والدین برابر کے شریک ہیں، اس لیے کہ حدیث بالا کے مطابق ان کے والدین نے انہیں جس سانچہ میں ڈھالا وہ اس میں ڈھلے، یہ حقیقت ہے کہ

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج ☆ تا ثریا می رود دیوار کج

جن بچوں کی خشت اول (پہلی اینٹ) ٹیڑھی ہوگی تو ان کی زندگی کی ساری عمارت ٹیڑھی ہی ہوگی۔

اس حدیث فطرت سے ایک ٹھوس حقیقت یہ ثابت ہوئی کہ اچھے یا برے لوگ پیدا نہیں ہوتے، بلکہ بنائے جاتے ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں پیدائشی طور پر قبولِ حق ونیکی کی فطری صلاحیت رکھی ہے، اس میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی، غلط ماحول سے انسان غلط راستہ پر جاسکتا ہے، لیکن اس سے اس کی نیکی و بھلائی والی فطرت کلی طور پر ختم نہیں ہوجاتی، محبت، اچھی تربیت اور نیک ماحول سے پھر اسے صحیح راستہ پر لایا جاسکتا ہے، اس لیے کہ تربیت سے تو جنگل کے جانوروں کو بھی مطیع و مانوس کیا جاسکتا ہے، دیکھئے نا! سرکس (Circus) میں ایک معمولی انسان شیر، ہاتھی اور بندر وغیرہ کو اپنا مطیع بنالیتا ہے، اور گھروں میں کتا اور طوطا وغیرہ کو مطیع اور مانوس بنالیا جاتا ہے، تو کیا اشرف المخلوقات اپنی اولاد کو جس کی رگوں میں خود اسی کا خون دوڑتا ہے، مطیع نہیں بناسکتا؟ یقیناً بچوں کو اچھی تعلیم وتربیت سے مطیع ومثالی انسان بنایا جاسکتا ہے، لیکن اگر اس سے غفلت برتی جائے تو یقین مانئے ایسے بچے اپنے والدین کے ہوتے ہوئے بھی یتیم کی طرح ان کی شفقت اور تعلیم وتربیت سے محروم اور لاوارث رہیں گے۔

یہ بچے آئندہ چل کر اپنے گھر والوں کے لیے بلکہ پورے خاندان اور معاشرے کے لیے مفید ہونے کے بجائے مضر بن جاتے ہیں، اور بسا اوقات ان سے سماج کا ایک طبقہ نقصان اٹھاتا ہے، اس اعتبار سے ایک بچہ کی صحیح تعلیم وتربیت ایک فرد ہی کی نہیں، بلکہ پورے ایک خاندان اور معاشرے کی تعلیم وتربیت کے مترادف ہے، اور اس میں غفلت اور کوتاہی کا مطلب ہے کہ ایک خاندان اور معاشرے کو برباد کیا جارہا ہے، یہی وجہ ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے جن کاموں کو صدقۂ جاریہ قرار دیا ان میں سے ایک نیک اولاد بھی

ہے؛ کیوں کہ ان کی نیکی سے سارے گھرانے، خاندان اور سوسائٹی کو نفع ہوگا، اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا، اور اگر یہ اولاد تربیت سے محروم رہی تو خود بھی بری بنے گی اور اس کی برائی کا دائرہ نہ جانے کہاں تک پھیلے گا۔

تربیتِ اولاد میں خلل ناقابل برداشت امر ہے:

اسی لیے اربابِ علم ودانش کے نزدیک تربیت اولاد میں خلل ناقابل برداشت امر ہے، چناں چہ حضرت ابوالقاسم امام راغب اصفہانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ”خلیفہ منصور نے بنو امیہ کے اربابِ علم ودانش (طبقۂ علماء) کو قید سے رہا کرتے وقت دریافت کیا کہ تمہارے لیے جیل میں سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت چیز کیا تھی؟“ سب نے بالاتفاق جواب میں یہ بات کہی کہ ”خلیفہ نے ہم کو یکا یک قید کردیا اور اتنی مہلت بھی نہ دی کہ ہم اپنے بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کے لیے کسی لائق استاذ کا انتخاب اور انتظام کرسکیں، اتنے عرصے میں ہمارے بچے تعلیم وتربیت سے محروم رہے، یہی تکلیف ہمارے لیے ناقابل برداشت تھی، رہی وہ تکلیفیں جو ہم نے قید خانے میں جھیلیں وہ ہمارے لیے کچھ زیادہ قابل التفات نہیں، اس لیے کہ ہم تو قید خانے سے باہر ہوتے ہوئے بھی اس سے زیادہ جفاکشی کے عادی ہیں۔“ (تربیت اولاد: ۱۵۹)

واقعہ یہ ہے کہ جو بچے صحیح تعلیم وتربیت سے محروم رہ جاتے ہیں وہ زندگی میں عموماً بہت سی خیر وخوبیوں سے محروم رہتے ہوئے خود بھی خسارہ میں رہتے ہیں، نیز والدین اور سرپرستوں کے لیے بھی خسارہ کا سبب بنتے ہیں، جس کی طرف ایک حدیث شریف میں بھی اشارہ ملتا ہے: ”إِنَّمَا إِثْمُهٗ عَلٰى أَبِيْهِ“. (مشکوٰۃ: ۲۷۱)

حضرت مفکر ملت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ نے دینی تعلیمی کونسل کے ایک اجلاس میں بڑی اہم بات ارشاد فرمائی تھی کہ ”بچوں کا چھوٹی عمر میں مرجانا اس سے بہتر ہے کہ بچے صحیح تعلیم وتربیت سے محروم رہ کر بڑے ہوں، اور خود بھی دوزخ کا ایندھن بنیں اور

والدین کے لیے بھی دوزخ میں جانے کا ذریعہ بنیں۔‘‘

تربیتِ اولاد کی ایسی فکر کریں جیسی انبیاء علیہم السلام امت کی کرتے تھے:

تربیت اولاد کی اسی اہمیت کے پیش نظر حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اہل ایمان کو خصوصی طور پر متوجہ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (التحریم: ٦)

’’اے ایمان والو! نارِ دوزخ سے خود اپنے آپ کو بھی بچاؤ، اور اپنے اہل وعیال کو بھی۔‘‘ روایت میں ہے کہ اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دربارِ رسالت میں عرض کیا: ’’اللہ کے رسول! اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آگئی، (کہ ہم گناہوں سے بچیں اور احکامِ الٰہیہ کی پابندی کریں) مگر اہل وعیال کو کس طرح نارِ دوزخ سے بچائیں؟‘‘ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ان کاموں سے اپنے اہل وعیال کو بھی منع کرو، اور جن کاموں کے کرنے کا حکم تم کو دیا ان کا اپنے اہل وعیال کو بھی حکم کرو، تو یہ عمل ان کو نارِ دوزخ سے بچا سکے گا‘‘۔ (روح المعانی، معارف القران: ۵۰۲/۸)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح نارِ دوزخ سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے اسی طرح اہل وعیال کو بھی، لہٰذا اس کے لیے اپنے ساتھ ان کی بھی اصلاح اور تربیت کی فکر کرو، اور ان کو وہ اچھا ماحول اور تعلیم دو جو انہیں نارِ دوزخ سے بچا سکے، اس عاجز کا خیالِ ناقص ہے کہ والدین اور سرپرست اولاد کی تعلیم وتربیت کے اس فریضہ کو اس وقت تک کما حقہ ادا نہیں کر سکتے جب تک وہ اس سلسلہ میں ایسے فکر مند نہ ہو جائیں جیسے حضراتِ انبیاء علیہم السلام اپنی امت کی اصلاح وتربیت کے لیے فکر مند رہتے تھے، ضروری ہے کہ ہم تربیت اولاد کی ایسی فکر کریں جیسی حضراتِ انبیاء علیہم السلام امت کی کیا کرتے تھے، اس سلسلہ کا پہلا عمل نیک ماحول کے بعد ان کے حق میں دعا کا اہتمام ہے، اس دعا کا بھی اہتمام کریں:

" رَبَّنَا هَبُ لَنَا مِنُ أَزُوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعُيُنٍ وَاجُعَلُنَا لِلُمُتَّقِينَ إِمَامًا" (الفرقان : ٧٤)

اے ہمارے رب! ہمیں اپنے بیوی اور بچوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما، اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔"

اس سلسلہ کا دوسرا عمل اولاد کی بہتر سے بہتر دینی ودنیوی تعلیم وتربیت کا خود اہتمام کرنا، یا کم از کم اس کا بہتر سے بہتر نظم کرنا ہے۔ یاد رکھو! اولاد سے حقیقی اور سچی محبت یہی ہے کہ ان کی جسمانی نشو ونما کے ساتھ ان کی اصلاحی، اخلاقی، عملی اور دینی تربیت کا بھی اہتمام وانتظام کیا جائے، ورنہ یہ کوئی عقلمندی نہیں کہ محض ان کی جسمانی ودنیوی ضروریات اور جائز وناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے رات دن ایک کر کے حلال وحرام کی پرواہ کیے بغیر انتظام کیا جائے، انہیں سخت سردی اور تیز دھوپ وگرمی سے تو بچانے کے لیے پوری توانائی خرچ کی جائے، مگر آخرت کے دائمی نقصان اور نارِ دوزخ سے بچانے کی کوئی فکر نہ کی جائے، آج کل اکثر لوگ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد بچوں کا کیا ہوگا؟ اس کی فکر بہت کم لوگوں کو ہے کہ بچوں کے مرنے کے بعد خود ان کا کیا ہوگا؟ جب کہ عقلمندوں اور اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی یہی فکر ہوتی ہے، قرآن کہتا ہے کہ" سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے آخری وقت میں اسی سوچ اور فکر کے نتیجہ میں اپنی اولاد سے فرمایا تھا: ﴿مَا تَعُبُدُونَ مِنۢ بَعُدِیُ﴾ (البقرۃ:۱۳۳) یہ نہیں فرمایا کہ " مَا تَأْكُلُونَ مِنُ بَعُدِیُ؟" میرے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ تم کیا کھاؤ گے؟ بلکہ فرمایا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت واطاعت کرو گے؟ تا کہ تمہاری دنیا وعقبیٰ کامیاب ہو جائے، اس پر ان کی اولاد نے ان کو اطمینان دلایا، معلوم ہوا کہ یہی اصل اور نبیوں والی فکر ہے، اور دور اندیش وعقلمند لوگ اپنی اولاد کے سلسلہ میں دنیا سے کہیں زیادہ آخرت کے بارے میں سوچتے اور فکرمند رہ کر پہلے ہی سے تربیت کرتے ہیں۔

تربیتِ اولاد کا فریضہ کس طرح انجام دیں؟

ہمیں بھی چاہیے کہ ہم ان کے طرزِ عمل سے سبق سیکھ کر ان ہی کے مطابق دعا اور

حسنِ تدبیر سے تربیتِ اولاد کا فریضہ انجام دیں، اس کے لیے بنیادی طور پر نیک مائی اور حلال کمائی کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے، پھر جہاں تک تربیت کی بات ہے تو اس میں نرمی وسختی دونوں ضروری ہیں، نہ انتہائی نرمی کافی ہے، نہ انتہائی سختی، بلکہ اعتدال اور میانہ روی سے کام لیتے ہوئے حسب موقع ترغیب وترہیب سے تربیت کریں، صاحبِ طرز ادیب علامہ عبدالماجد دریا آبادیؒ فرماتے ہیں: ''کیا اچھی تربیت انتہائی سختی کے مرادف ہے؟ کیا یہ مقصد یوں پورا ہوسکتا ہے کہ بچوں کے دلوں پر حد سے زیادہ رعب اور خوف طاری کر دیا جائے اور انہیں گویا بالکل بے دست و پا بنا دیا جائے؟ پھر کیا ضرورت سے زیادہ دلار اور پیار مفید ہوگا؟ کیا اچھی تربیت کی غرض یوں حاصل ہوسکتی ہے کہ اپنے تئیں بالکل بچوں کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے اور ان کی ہر ضد کو بلا روک ٹوک پورا کرنا ضروری سمجھ لیا جائے، تجربہ اس نتیجہ تک پہنچانے کے لیے بالکل کافی ہے کہ یہ دونوں طریقے افراط اور تفریط کو شامل اور راہِ حقیقت سے دور ہیں، بچوں کی تربیت سے متعلق سب سے پہلا اور سب سے پچھلا جو فرض ایک مسلمان مربی پر عائد ہوتا ہے وہ یہ کہ انہیں وہ بہترین مسلم بننے کی راہ پر لگائے، کہ بڑے ہوکر ان کا شمار امتِ اسلامیہ کے قابلِ فخر فرزندوں میں ہو، اور وہ اللہ کے بہترین بندے ثابت ہوں، ان کے عقائد درست ہوں، ان کے اعمال صالح ہوں، تا کہ ہر قسم کی دینی و دنیوی فلاح و برکت ان کے حصے میں آسکے۔'' (سچی باتیں: ۳۱)

منقول ہے کہ شیخ سعدیؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''تربیت اولاد کا فریضہ کیسے انجام دیا جائے؟'' تو فرمایا: (شروع سے ہی اچھے ماحول اور اچھی تعلیم وتربیت کے اہتمام کے بعد) ''جب بچے کی عمر دس سال ہو جائے تو اسے اجنبی لوگوں میں نہ بیٹھنے دیں، اچھے اخلاق کی تعلیم دیں، غیر ضروری پیار وشفقت نہ کریں، بڑوں کا ادب سکھائیں، اس کی تمام (جائز) ضروریات پوری کریں، تا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے دوسری طرف متوجہ نہ ہو، پڑھائی کے شروع زمانہ میں اس کا حوصلہ بڑھائیں، لیکن بوقتِ ضرورت مناسب انداز میں تنبیہ بھی کریں، اسی کے ساتھ لازمی طور پر اسے کوئی ہنر بھی سکھائیں، تا کہ بوقت ضرورت

اسے کام میں لا سکے۔“

ایک واقعہ عمدہ تربیت کا اعلیٰ نمونہ:

اس سلسلہ میں عمدہ تربیت کا ایک اعلیٰ نمونہ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ ہیں، جن کا مقام صوفیۂ کرام میں بہت بلند ہے، بلکہ آپ کو مقتدائے صوفیہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، عہد طفولیت ہی میں آپ کے حصہ میں صحیح ماحول اور تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں بہت کثرت سے سعادت آئی تھی، حتیٰ کہ آپ کا یہ قول ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے عالمِ ارواح میں فرمایا تھا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ تو مجھے اپنا ﴿بَلیٰ﴾ کہنا برابر یاد ہے۔ ان کا واقعہ ہے، جس کو وہ خود بیان فرماتے ہیں کہ ”میری عمر جس وقت تین برس کی تھی ایک دن میں نے اپنے ماموں اور مربی حضرت محمد بن سوارؒ کی رات والی عبادت دیکھی، ان کی نظر جب مجھ پر پڑی تو پوچھا: ”بیٹے! تم اپنے خالق کی عبادت نہیں کرتے؟“ میں نے کہا: ”کس طرح کروں؟“ آپ نے فرمایا: ”اس طرح کہ زبان کو حرکت دیے بغیر صرف تین مرتبہ تہہِ دل سے کہو: "اَللّٰـهُ مَعِيَ" اَللّٰهُ نَاظِرِیْ إِلَيَّ، اَللّٰهُ شَاهِدِیْ“ تو میں نے بھی اپنے ماموں جان کے ساتھ چند راتوں تک اس طرح عمل کیا اور ان کو اس کی اطلاع دی، آپ نے کچھ دنوں کے بعد فرمایا: ”اب وہ وِرد ہر رات میں گیارہ مرتبہ کیا کرو“ میں نے چند راتوں تک اس پر عمل کیا، پھر اپنے حال سے ماموں جان کو واقف کیا، البتہ اس مرتبہ دل میں ایک قسم کی حلاوت اور مٹھاس سی محسوس کی، ایک سال کا عرصہ گذرنے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ ”بیٹے! جو وظیفہ میں نے بتلایا اسے موت تک پابندی سے جاری رکھو“ الحمد للہ! اس پر عمل کرنے کی برکت سے بچپن ہی سے میں میرے دل کی پنہائیوں میں اس کی شیرینی محسوس کرنے لگا، پھر حضرت نے ایک طویل عرصہ گذرنے کے بعد مجھ سے فرمایا: ”اے سہل! جس شخص کا یہ یقین ہو کہ اللہ جل شانہ (اپنے علم کے ذریعہ) میرے ساتھ ہے، اور وہ مجھے دیکھ رہا ہے، تو اس شخص سے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس کی نافرمانی کرے“ لہٰذا ہر گناہ سے بچو۔ (اس موقع پر یہ عرض کرتا چلوں کہ الحمد للہ! اس عاجز کی

اہلیہ محترمہ کی الحمدللہ! یہ عادت رہی ہے کہ وہ ہمارے بچوں کو ان کی کسی شرارت پر متوجہ و متنبہ کرنے کے لیے کہا کرتی ہیں کہ ''دیکھو! اللہ میاں دیکھتے ہیں'' کاش! ہماری خواتین بھی اپنے بچوں کو کتے اور بھوت سے ڈرانے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے ڈراتیں تو اس تربیت کے نتیجہ میں بچپن ہی سے ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و خشیت پیدا ہو جائے)۔

حضرت سہلؒ فرماتے ہیں کہ ''اس کے بعد میں مکتب جانے لگا تو الحمدللہ! سات سال کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کرلیا، اور اکثر روزہ رکھنے لگا، اور رات کو اکثر حصہ نماز و ذکر واذکار میں گذارنے لگا۔'' (تذکرۃ الاولیاء:۱۵۳)

اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کا بیج ان کے بچپن ہی میں بو دیا گیا تھا، جس کا اثر پوری زندگی باقی رہا۔

اولاد کو اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کرنا:

اس لیے والدین کا فریضہ ہے کہ اولاد کو صحیح ماحول دیں اور تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت بھی کریں، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے تو تربیتِ اولاد سے آگے کا مرحلہ اپنی اولاد کو اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کرنے کا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل میں یہ دستور اور رواج تھا کہ بعض صاحب توفیق بندے اپنے بچوں کو اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کرتے تھے، ان کو مُحَرَّر کہا جاتا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے آزاد کیا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس بچہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کر دیا تو اب یہ کوئی دنیوی کاروبار نہیں کرے گا، حتیٰ کہ شادی بیاہ بھی نہیں کرے گا، یہ ان تمام ذمہ داریوں سے آزاد رہے گا، بس اللہ تعالیٰ کی عبادت میں زندگی صرف کرے گا۔

حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ (حَنَّہ) امرأۃ عمران نے جس وقت وہ حمل سے تھیں یہ منت مانی تھی:

﴿رَبِّ إِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (آل عمران : ۳۵)

’’اے اللہ! میں اس پیدا ہونے والے بچہ کو تیرے نام پر وقف کرتی ہوں، لہٰذا تو میری اس نذر کو قبول فرما، بے شک تو سننے والا ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔‘‘

بات یہ تھی کہ حضرت عمران جو بیت المقدس کے امام تھے اور انہیں کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے ان کی بیوی نے نذر مانی تھی کہ اگر ان کے کوئی اولاد ہوئی تو وہ اسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کردیں گی۔ ’’مُــحَـرَّر‘‘ کے معنیٰ ہیں وہ اولاد جو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دی گئی ہو۔

حضرت امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے اپنی تفسیر ’’احکام القرآن‘‘ میں اس آیت کے تحت فرمایا کہ ’’اولاد کو اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کرنے کا یہ طریقہ امت محمدیہ میں بھی ہے، لیکن اس کی شکل اور ترتیب بدل دی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے نومولود بچہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کرنے کی نیت اور جذبہ رکھتے ہیں انہیں چاہیے کہ اس بچہ کی پیدائش کے بعد جب وہ تعلیم کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے لیے تعلیم وتربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کریں، پھر جب وہ فارغ ہوجائے تو اسے دین کی خدمت کے لیے فارغ کرکے اس کو اسی میں مشغول رکھا جائے، ہماری شریعت میں ایسے لوگوں کے لیے نکاح کرنا اور معاشی مشغلہ اختیار کرنا بھی جائز ہے۔‘‘ (بلکہ ضروری ہے) لیکن اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت ہو، اسی پر جینا اور مرنا ہو۔ تو صاحبو! عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس امت کے ’’مُحَرَّر‘‘ یہی لوگ ہیں اور یہی حزب اللہ (اللہ تعالیٰ کی جماعت) ہیں۔ اللّٰہم اجعلنا منہم.

حق تعالیٰ ہمیں اپنی اور اپنے اہل وعیال کی تربیت واصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

٢٢/ ذی القعدہ/١٤٣٢ھ قبل الجمعہ (بزمِ صدیقی)

’’اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ‘‘.

(۱۴)

حلال روزی کی تلاش اس کی اہمیت اور فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِ اللّٰہِ بۡنِ مَسۡعُوۡدٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ”طَلَبُ کَسۡبِ الۡحَلَالِ فَرِیۡضَةٌ بَعۡدَ الۡفَرِیۡضَةِ“. (رواہ البیھقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ /ص:۲٤۲/کتاب البیوع/ باب الکسب وطلب الحلال/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”حلال روزی تلاش کرنا فرض کے بعد ایک فریضہ ہے“۔

کر تو بھی ترقی دنیا میں، اسبابِ تجارت پیدا کر
قارون کی دولت ٹھکرا دے، عثمان کی دولت پیدا کر

فکرِ معاد کے ساتھ کسبِ معاش بھی ضروری ہے:

اسلام کا دنیائے انسانیت پر ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے دین اور دنیا کی خود ساختہ (اپنی طرف سے متعین کی ہوئی) حد بندیوں کو ختم کیا اور ایسا پاکیزہ وفطری نظام پیش کیا

جس پر عمل کر کے ہم اپنی دنیا کو بھی دین بنا سکتے ہیں، اس کی ایک بہترین مثال کسبِ معاش ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے اعتدال کے ساتھ رزقِ حلال کی طلب وتلاش اور اس کے لیے محنت کی جائے، کیوں کہ یہ بھی عبادت اور امر شریعت کی بجا آوری ہے۔ اسلام جہاں ہمیں فکر معاد (یعنی آخرت کی فکر اور تیاری) کا حکم دیتا ہے، وہیں کسب معاش کی بھی ترغیب بلکہ تاکید کرتا ہے۔

﴿وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ﴾ (الحجر: ۲۰)

''اور ہم نے تمہارے لیے زمین میں معاش (یعنی روزی کے اسباب) پیدا کیے اور ان کے لیے بھی جن کو تم رزق نہیں پہنچاتے۔'' اس لیے اب انتظار کرنے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کے بجائے ﴿وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (الجمعة: ۱۰) ان اسباب کو اختیار کرو اور رزقِ حلال تلاش کرو۔ کیوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا، نماز قائم کرنا، روزہ رکھنا اور زکوٰۃ وحج وغیرہ ادا کرنا اسلام کے اولین ارکان اور بنیادی احکام وفرائض ہیں، اسی طرح درجہ اور مرتبہ میں ان کے بعد حلال روزی کی طلب اور اس کے لیے محنت کرنا بھی ایک اہم اسلامی حکم اور دینی فریضہ ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا: ''طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ'' کہ ''حلال روزی کی تلاش میں لگنا' دیگر فرائض مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کے بعد ایک فرض ہے۔'' لہٰذا جس طرح فکرِ معاد کے لیے ان فرائض کا اہتمام ضروری ہے اسی طرح کسب معاش کے لیے رزقِ حلال کا انتظام بھی ضروری ہے، اور حلال روزی تلاش کرنا بھی ایک انسان پر دیگر اسلامی فرائض کی طرح ایک فرض ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ حبِ دنیا تو منع ہے، لیکن کسبِ دنیا منع نہیں۔

اعتدال کے ساتھ رزقِ حلال کی تلاش عبادت ہے:

اور جب حلال روزی کی تلاش فرض ہے تو ظاہر ہے کہ کسی بھی فریضہ کی ادائیگی اور

اس میں مشغولیت عین دین وعبادت اور حصولِ فضلِ الٰہی کا ذریعہ ہے، اسی لیے قرآنِ کریم نے اس کی ترغیب دیتے ہوئے اسے اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیا:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (الجمعة : ۱۰)

''پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین پر چلو پھرو، اور اللہ کا فضل (یعنی حلال روزی تلاش) کرو۔'' معلوم ہوا کہ کسب معاش محض دنیوی اور معاشی ضرورت ہی نہیں، بلکہ شرعی فریضہ اور دینی عبادت بھی ہے، لہٰذا اعتدال کے ساتھ رزقِ حلال کی تلاش اور اس کی جستجو میں لگنا اہم ضرورت اور عبادت ہے۔ کہتے ہیں کہ مانگنا ذلت ہے تو دینا عزت ہے، اور حلال کمانا بہترین عبادت ہے۔ کسی شاعر نے تو حلال روزی کی تلاش کو سب سے افضل عبادت کہہ دیا:

افشاء دلِ مومن پہ ہے یہ رازِ معاش ☆ خلوت میں کرے غور ہر انسان اے کاش
حصے تو عبادت کے ہیں گو سات مگر ☆ سب سے افضل حلال روزی کی تلاش
مقبول عبادت نہیں بے اکلِ حلال ☆ ہے حکمِ خدا کہ کھاؤ رزقِ حلال

قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

﴿وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ (المائدة : ۸۸)

''اور اللہ نے تمہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے حلال پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔''

صاحبو! حلال اور پاکیزہ مال کے سوا دنیا کے کسی مال میں کوئی خیر نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب بطن میں پاک مال جاتا ہے تو وہ باطن کو بھی پاک کرتا ہے، ورنہ خراب کر دیتا ہے۔

''الترغیب'' کی ایک روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میرے لیے مستجاب الدعوات بننے کی دعا فرما دیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''حلال کھاؤ اور حرام سے بچو، تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، بندہ کے پیٹ میں جب کوئی حرام کا لقمہ جاتا

ہے تو چالیس دِن تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔“

اس لیے دین برباد کر کے ڈگریاں حاصل کی جائیں اور حرام رزق کمایا جائے، اس سے بہتر ہے کہ معمولی نوکری یا مزدوی کر کے حلال روزی حاصل کی جائے؛ کیوں کہ قرآن وحدیث میں مطلق کمائی کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ کسب حلال یعنی حلال روزی کی تلاش کا حکم دیا گیا ہے، جس کا منشا اور خاص مقصد حرام کمانے سے بچانا اور حلال وطیب روزگار کی طلب وتلاش کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ جب بندہ حرام سے بچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے حلال روزی کے دروازے غیب سے کھولنے کا وعدہ کرتے ہیں، چناں چہ فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ (الطلاق: ۲-۳)

حلال رزق وہ ہے جس کی شریعت میں ممانعت نہ آئی ہو، اور طیب وہ ہے جس کے ساتھ دوسرے کا حق متعلق نہ ہو۔

حلال روزی تلاش کرنے کے فضائل:

احادیث مبارکہ میں حلال روزی کمانے والے ہر تاجر، ہر مزدور، ہر کاشتکار، ہر دستکار اور محنت سے اپنا روزگار حاصل کرنے والے کے لیے بڑی بشارتیں اور فضیلتیں وارد ہوئی ہیں، ایک حدیث میں ہے: ”طَلَبُ الْحَلَالِ جِهَادٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ“. (کنز العمال: ۲/ ۱۹۳) کہ حلال روزی کی طلب اور تلاش جہاد فی سبیل اللہ کے مانند عبادت اور اجر وثواب کا ذریعہ ہے۔

امام غزالیؒ نے اس سلسلہ میں ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اس دوران صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک صحت مند نوجوان کو دیکھا کہ روزی کی تلاش میں بھاگ دوڑ کر رہا ہے، کسی نے کہا کاش! اس کی صحت اور جوانی راہِ الٰہی میں خرچ ہوتی! یہ سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر

یہ (حلال روزی کی تلاش اور طلب میں) اس لیے محنت کرتا ہے تا کہ اپنے آپ کو ذلت سوال سے بچائے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہے، اسی طرح اگر اس کی دوڑ دھوپ کمزور والدین اور اپنے چھوٹے بچوں (مراد اہل وعیال) کے لیے ہے تا کہ ان کی معاشی (اور دنیوی) ضروریات پوری کرے، تب بھی یہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہے، ہاں، اگر اس کی یہ جد وجہد اس لیے ہے تا کہ مال کما کر دوسروں پر فخر کرے، تب اس کی یہ دوڑ دھوپ اور فکر وکوشش شیطان کے راستہ میں ہے۔'' ایک اور روایت ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلالًا اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ، وَسَعْیًا عَلٰی أَهْلِهٖ، وَتَعَطُّفًا عَلٰی جَارِهٖ، لَقِيَ اللّٰهَ تَعَالٰی یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَوَجْهُهٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ، وَمَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا مُکَاثِرًا مُفَاخِرًا مُرَائِیًا لَقِيَ اللّٰهَ تَعَالٰی وَهُوَ عَلَیْهِ غَضْبَانُ''. (رواه البیهقی فی شعب الإیمان، مشکوٰة/ص: ٤٤٤)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے حلال روزی اس لیے تلاش اور طلب کی تا کہ بھیک مانگنے سے بچے اور اپنے گھر والوں پر خرچ کرے، نیز اپنے پڑوسی پر مہربانی کرے، تو یہ شخص قیامت کے دن حق تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا، اور جو شخص حلال طریقہ سے دنیا کمائے، لیکن زیادتی، بڑائی اور ریا کاری کے لیے تو وہ قیامت کے دِن اللہ پاک سے اس حال میں ملے گا کہ حق تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوں گے۔'' (العیاذ باللہ العظیم)

غور کیجیے گا کہ جب بد نیتی سے حلال کمانے پر یہ وعید ہے تو حرام کمانے پر کیا وعید ہوگی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ فرماتے تھے: ''جنت کو

ان لوگوں کی طلب ہے جن کو حلال روزی کی طلب ہے۔" سبحان اللہ! ان حقائق کی بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ تاجروں، کاشتکاروں اور کاریگروں وغیرہ کو مطلقاً دنیا دار کہنا اور سمجھنا صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر ان کی تجارت، ملازمت زراعت اور صنعت کا مقصد اور منشا محض دنیا کی طلب نہیں، بلکہ حسن نیت کے ساتھ حلال روزی کی طلب اور تلاش ہے، اور اس کے ساتھ وہ دیگر فرائض وحقوق سے غافل وکاہل بھی نہیں، تو یہ لوگ پکے دیندار ہیں اور ان کی یہ تجارت، زراعت، ملازمت، محنت اور کسب معاش کے لیے کسی بھی طرح کی جائز کوشش عبادت ہے۔

ذاتی محنت کی کمائی کے فوائد وفضائل:

جب یہ حقیقت ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی اور اہل وعیال کی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے کسی اور پر بوجھ بننے کے بجائے اپنی حیثیت وصلاحیت کے مطابق مناسب اور حلال روزگار کا انتظام کریں، اس کے لیے اگر ملازمت، ذاتی محنت اور مزدوری بھی کرنی پڑے تو یہ نہ شرافت کے خلاف ہے، نہ شرم کی بات ہے؛ کیوں کہ بیکاری کے مقابلہ میں محنت ومزدوری کرنا بہت بہتر عمل ہے۔ احادیث مبارکہ میں ان لوگوں کے لیے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں جو حلال روزی کے لیے ذاتی محنت، صنعت، کاریگری، دستکاری ومزدوری کرتے ہیں اور ہاتھ کی کمائی سے کھاتے ہیں، ایک حدیث میں ہے:

عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "قِيلَ: "يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ؟" قَالَ: "عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ، وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُورٍ". (رواه أحمد، مشكوٰة/ص/ ٢٤٢)

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! سب سے پاکیزہ اور اچھی کمائی کونسی ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "آدمی کا اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا (مراد اپنے ہاتھ، دماغ اور ذاتی محنت کی کمائی) اور ہر نیکی والی تجارت۔" جو شریعت کی ہدایت کے مطابق امانت اور صداقت کے ساتھ کی جائے۔ یہاں ہاتھ کی کمائی اور ذاتی محنت

کو نیکی والی تجارت پر مقدم کیا، جس سے اس کی اہمیت وفضیلت اور اولیت ثابت ہوتی ہے، پھر وہ ہر کسی کے لیے آسان بھی ہے، اور اس کا نفع بھی یقینی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے:

عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ، وَإِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ". (بخاری، مشکوٰۃ/ص: ۲۴۱)

''کسی نے کوئی کھانا اس سے بہتر نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ (اور ذات) کی محنت سے کما کے کھایا ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ حصولِ معاش کی صورتوں میں سب سے اچھی اور آسان صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ اور ذات سے کوئی ایسا (حلال اور جائز) کام و ہنر اختیار کرے جس سے وہ اپنے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی تکمیل کر سکے، اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ وہ معاشی اعتبار سے کسی کا محتاج نہ ہوگا، کہتے ہیں نا کہ ''ذات محنت زندہ باد'' اس سے تنگ دستی دور ہوگی۔

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا کہ ''بیٹے! حلال کمائی کے ذریعہ اپنی تنگ دستی دور کرنا، کیوں کہ جو تنگ دست ہوتا ہے عموماً اس میں تین باتیں پیدا ہو جاتی ہیں: (۱) دینی کمزوری۔ (۲) علمی کمزوری۔ (۳) بے مروتی۔ (خودداری کا ختم ہو جانا) اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ لوگ اسے حقیر سمجھتے ہیں۔ بقولِ شخصے:

سبھی ہنس کر ملا کرتے ہیں جب تک چار پیسے ہیں
غریبی میں نہیں پوچھے گا کوئی ''آپ کیسے ہیں؟''

دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محنت ومزدوری کا کام کرنے سے کسرِ نفسی وعاجزی بھی پیدا ہوتی ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔

حضرت داود علیہ السلام کا واقعہ:

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ سلطنت بھی عطا فرمائی تھی، مگر اس کے باوجود آپ کا حال یہ تھا کہ اپنے عہد حکومت میں غیر متعارف لوگوں سے اپنے حالات معلوم کرتے تھے، مقصد اپنے حالات کی اصلاح ہوتا، ایک مرتبہ حق تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو انسانی شکل میں بھیجا، حضرت نے انجانے میں اس کو انسان سمجھ کر دریافت کیا کہ ''داؤد کیسا آدمی ہے؟'' اس نے کہا کہ ''حضرت داؤد یوں تو ہر طرح بہت اچھے ہیں، البتہ ایک بات ضرور ہے کہ وہ بیت المال سے وظیفہ لیتے ہیں۔'' فوراً حضرت کو تنبہ ہوا، دل پر ایک چوٹ سی لگی، اسی وقت بارگاہِ الٰہی میں سر بسجود ہو کر دعا مانگی کہ ''الٰہی! مجھے بیت المال کی روزی سے مستغنی کر دے اور کوئی ہنر سکھا دے، تاکہ اپنی ذاتی محنت سے کھایا کروں۔'' حق تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرما کر آپ کو زرہ بنانے کا ہنر سکھا دیا، ساتھ ہی یہ معجزہ بھی عطا کر دیا کہ سخت لوہا آپ کے ہاتھ میں آتے ہی نرم ہو جاتا، جس سے آپ بآسانی زرہ بنا لیتے، پھر اس زرہ کو چار ہزار درہم میں بیچ کر اپنا گذر بسر کرتے، اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ زرہ چھ ہزار میں بیچتے، جن میں سے دو ہزار درہم اپنے اور اہل وعیال کی ضرورتوں میں خرچ کرتے اور باقی چار ہزار درہم بنی اسرائیل کے فقراء و مساکین پر صدقہ فرماتے۔ (مرقاۃ:۶/۴)

اس سیمعلوم ہوا کہ ذاتی محنت کی حلال کمائی سب سے بہتر اور افضل عمل ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام کا عمل بھی یہی تھا، اور خود ہمارے آقا ﷺ نے بکریاں چرائی ہیں، نیز حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے وہ لوگ جن کے پاس کوئی خاص ذریعۂ معاش نہ تھا وہ رزقِ حلال اور کسب معاش کے لیے دن میں جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتے اور انہیں فروخت کر کے اپنا گذر بسر کرتے، بھیک نہیں مانگتے تھے، بقولِ شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیم ؒ ''نذر اللہ، نیازِ حسین'' اور

دما دم، نہ دھوکہ، نہ غم
کمائیں گے احمق، کھائیں گے ہم

آج جب کہ حصولِ رزقِ حلال کے بے شمار ذرائع موجود ہیں ایسی صورت میں رزقِ حلال کی تلاش کوئی مشکل کام نہیں۔

حلال روزی کے سلسلہ میں اکابر کا طریقۂ کار:

اس سلسلہ میں ہم تاریخ کے اوراق میں حضرات علماء، فقہاء اور صلحاء کی زندگی کا مطالعہ کریں تو کئی روشن مثالیں ملتی ہیں کہ ہمارے اسلاف ایک طرف مسندِ درس پر بیٹھ کر ہزاروں طلباء و تلامذہ کو تفسیر و حدیث اور فقہ کا درس دیتے اور دوسری طرف مختلف پیشوں اور ہنروں کے ذریعہ رزقِ حلال بھی کماتے، ان میں سے کسی نے روغن سازی کی تو کسی نے عطر فروشی، کوئی لوہار تھا تو کوئی لکڑ ہارا، کوئی کاتب تھا تو کوئی کاشتکار، کوئی برتن بناتا تو کوئی کپڑا بنتا اور بیچتا تھا، مثلاً حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ نعمانؒ کپڑے کے تاجر تھے، علامہ ابوحمزہؒ اور ابوالحسنؒ کپڑا بنتے تھے، ابوعلیؒ "دَھَّـــان" یعنی تیل فروش تھے، حافظ الحدیث ابن رومیہؒ دوائیاں بیچتے تھے، ابوالفضل دمشقیؒ نجار تھے، ابوسعید نحویؒ اور ابن طاہرؒ کتابت کرتے تھے، فقہ کی مشہور کتاب مختصر القدوری کے مصنفؒ کا نام ہی اس لیے "قدوری" مشہور ہو گیا کہ وہ ہنڈیاں بناتے تھے، (عربی میں "قِـــدْرٌ" ہنڈیا کو کہتے ہیں) شیخ فریدالدین عطارؒ عطر فروش تھے، اس عاجز کے دادا حضرت حافظ نور محمد صاحبؒ نے پوری زندگی امامت و تدریس کے ساتھ جلد سازی کا کام کیا، اور ان کے اتباع میں اس عاجز کے والد ماجد حضرت مولانا محمد صدیق صاحب جامعیؔ، چچا حضرت حافظ ابراہیم صاحب اور خود اس عاجز نے بھی ایک زمانہ تک جلد سازی کا کام کیا، اگر ہم بھی حلال روزی کے سلسلہ میں اپنے اسلاف و اکابر کے طریقۂ کار کو اپنائیں، اس طرح کہ پہلے مناسب تدابیر کریں، پھر اللہ تعالیٰ پر توکل رکھیں تو تجربہ شاہد ہے کہ حلال روزی کے لیے جب کوئی مناسب پیشہ اختیار کیا جائے تو ضرور برکت ہوتی ہے، البتہ اس میں از حد مشغول ہو جانا اور زندگی کو اسی کی نذر کر دینا یہ عقلاً و شرعاً درست نہیں، جیسا کہ آج کل بہت سے دنیا داروں کا یہی حال ہے۔ بقولِ شاعر:

خدا کو بھول گئے لوگ فکر روزی میں
خیالِ رزق ہے، رزّاق کا خیال نہیں

غور کیجیے کہ آدمی کماتا کیوں ہے؟ آرام سے کھانے اور ضروریات پوری کرنے کے لیے، اب اگر کوئی شخص دن رات کا سارا آرام کام کاج اور کاروبار ہی کی نذر کردے تو یہ امر عقلاً وشرعاً کیوں کر درست ہوسکتا ہے، اس لیے تعجب ہے اس شخص پر جو دولت کمانے کے لیے صحت کھودیتا ہے، پھر صحت حاصل کرنے کے لیے دولت خرچ کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان کو جتنا لگاؤ رزق کمانے سے ہے اگر اتنا لگاؤ رزّاق سے ہو جائے تو وہ کامیاب ہو جائے۔

حق تعالیٰ ہمارے لیے نسلوں تک حلال روزی کے آسان اسباب مہیا فرما کر اس میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔

۱۴/ ذی الحجہ/۱۴۳۲ھ
مطابق: ۱۱/۱۱/ ۲۰۱۱ء
بروز: جمعہ (بزمِ صدیقی)

" اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

☆......☆......☆
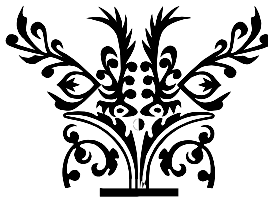
(۱۴)

حفاظت نظر کے انعامات اور بدنظری کے نقصانات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ جَرِيۡرِ بۡنِ عَبۡدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: ”سَأَلۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ عَنۡ نَظَرِ الۡفُجَاءَةِ، فَأَمَرَنِيۡ أَنۡ أَصۡرِفَ بَصَرِيۡ“. (رواه مسلم، مشكوٰة/ص: ۲٦۸/ باب النظر إلى المخطوبة وبيان العورات/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”رحمت عالم ﷺ سے میں نے (غیر محرم پر پڑنے والی) اچانک کی نظر کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ ”میں اپنی (اس اچانک کی) نظر (کو بھی فوراً) پھیر لوں۔“

جیسی نظر ویسا دل پہ اثر:

اللہ رب العزت کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک مہتم بالشان نعمت آنکھ اور اس کی بینائی وروشنی بھی ہے، اس کے بغیر انسان کی زندگی بے رونق اور بے کیف ہو جاتی ہے، آنکھوں کی بینائی سے محروم انسان کے لیے دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود بے کار رہے، اس

لیے آنکھ کو اعضائے جسمانی میں خاص فوقیت واہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ دل کے سلطان الاعضاء ہونے کے باوجود خود دل پر اچھے برے اثرات آنکھ کی وجہ سے پڑتے ہیں، اور پھر دل ودماغ سے لے کر جسم کے تمام اعضاء وجوارح تک اسی آنکھ کی وجہ سے وہ اثرات پھیلتے ہیں، یوں سمجھئے کہ آنکھ کیمرہ کے مانند ہے، اس کے ذریعہ اچھی بری تصویریں اور مناظر دل ودماغ میں جاکر وہاں کے حفاظت خانہ اور میموری (Memory) میں محفوظ ہوجاتے ہیں، اس کے بعد دل میں اسی قسم کے جذبات واثرات پیدا ہوتے ہیں، مثلاً کعبۃ اللہ اور کلام اللہ کو دیکھ کر عموماً مردِ مومن کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت، اسی طرح روضۂ رسول اللہ ﷺ اور احادیث رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر آپ ﷺ کی عظمت واطاعت، اولیاء اللہ اور نیک لوگوں کو دیکھ کر ان کی عقیدت ومحبت، اہل وعیال اور والدین کو دیکھ کر ان کی محبت والفت، مریضوں اور معذوروں کو دیکھ کر ان کی خدمت کا جذبہ اور رقت، تو بدمعاشوں اور ظالموں کو دیکھ کر ان سے نفرت وعداوت کے جذبات، اسی طرح غیر محرموں کو دیکھ کر ہوس وشہوت اور برے جذبات واثرات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جیسی نظر ویسا دل پہ اثر، آنکھ کا اچھا استعمال اور اچھی نظر اس نعمت کا شکر اور عبادت ہے تو بری نظر ناشکری، معصیت اور باعث ہلاکت ہے۔ اگر آنکھ کا استعمال درست ہوگا تو دل درست رہے گا، لیکن اگر آنکھ کا استعمال غلط ہوگا تو بدنظری کے بعد دل کی حفاظت مشکل ہوگی۔

نظر کے بگڑنے سے دل بگڑتا ہے:

اور بدنظری کا مطلب یہ ہے کہ کسی غیر محرم یعنی پرائی عورت یا حسین اور خوبصورت بے ریش لڑکے یا ان کی تصویر کی طرف شرعی ضرورت کے بغیر محض شہوت یا حصولِ لذت کی غرض سے دیکھنا اور لطف اندوز ہونا، مزا لینا، یہ بدنظری کہلاتا ہے، جو زنا کا پہلا زینہ اور مقدمہ ہے، اس لیے شریعت مطہرہ میں بدنظری ناجائز اور حرام ہے۔ بقولِ شاعر:

اِسے دیکھا اُسے دیکھا، اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا
نہ دیکھا یار کو، اغیار کو دیکھا تو کیا دیکھا

افسوس کہ آج بے پردگی کی وجہ سے یہ گناہ اتنا آسان اور عام ہوگیا کہ گھر سے نکلنے کے بعد آنکھوں کو پناہ ملنی مشکل ہوگئی، اچھے اچھے لوگ بھی اس گناہ کے عادی ہوگئے، یاد رکھو! جب آنکھیں اس ذلیل حرکت کی عادی بن جاتی ہیں تو پھر شیطان کو زیادہ محنت اور جد وجہد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ بدنظری خود بخود شیطان کی آرزؤں اور کوششوں کی خاطر خواہ تکمیل کر دیتی ہے؛ کیوں کہ جب بار بار بدنظری کرنے والوں کی ہوسناک نظریں دو چار اور محوتماشہ ہوتی ہیں تو رفتہ رفتہ ان میں ہمت اور جرأت بڑھتی ہے، پھر زبان کو گفتگو کا حوصلہ ملتا ہے، اور ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا ہے، پھر اسی دوران دست ہوس آگے بڑھتے ہیں اور بالآخر نفس کی لگام ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے تو شرم وحیا کے سارے حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور اس طرح نظر کے بگڑنے سے دل بگڑ جاتا ہے۔اسی کو کہتے ہیں:

دیکھنے سے شوق پیدا اور شوق سے پیدا طلب
دل کی دشمن آنکھ تھی اور دل دشمن جاں ہو گیا

بدنظری کے تین بڑے نقصانات:

بدنظری سے بعض اوقات باعزت لوگوں اور گھرانوں کا وقار خاک میں مل جاتا ہے، ان کی شرافت داغدار ہوجاتی ہے، شیطان بدنظری کے اس ہتھیار سے بآسانی لوگوں کا شکار کر لیتا ہے، اس لیے حدیث قدسی میں بدنظری کے نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

”اَلنَّظَرُ سَهْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِهَامِ إِبْلِيْسَ، مَنْ تَرَكَهَا مِنْ مَخَافَتِيْ، أَبْدَلْتُهٗ إِيْمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهٗ فِيْ قَلْبِهٖ“. (الترغيب والترهيب:۳/۲۳، عن عبدالله بن مسعود، المعجم للطبراني:۱۰/۱۷۳، مجمع الزوائد:۸/۶۳، حديث قدسی نمبر:۲)

بدنظری کا پہلا نقصان یہ ہے کہ نظر (بد) شیطان کے تیروں میں سے

ایک زہریلا تیر ہے، کسی زمانہ میں زہر میں ڈبوکر تیر چلایا جاتا تھا جو عموماً جان لیوا ثابت ہوتا تھا، تو بدنظری کو شیطان کا زہریلا تیر اس اعتبار سے فرمایا گیا کہ زہریلا تیر اگر جان لیوا ثابت ہوتا ہے تو بدنظری ایمان لیوا ثابت ہوتی ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ زہریلا تیر دوسروں کو ہلاک کرتا ہے، لیکن بدنظری کا تیر پہلے خود صاحب نظر کو ہلاک کرتا ہے اور دل کو زخمی کرتا ہے۔

ایک واقعہ:

چناں چہ ایک عبرت ناک واقعہ منقول ہے کہ مصر میں ایک شخص تھا جو برابر مسجد میں رہتا اور پابندی سے اذان دیتا اور اپنا وقت عموماً طاعت وعبادت میں گذارتا، ایک مرتبہ جب وہ اذان دینے کی غرض سے مسجد کے مینارے پر چڑھا تو اچانک پڑوس کی ایک عیسائی لڑکی پر نظر پڑی تو اس کو دیکھتا ہی رہ گیا، اور شیطان کا یہ زہریلا تیر اپنے نشانہ پر لگ گیا، وہ شخص عیسائی لڑکی پر دل وجان سے فریفتہ ہوگیا، پھر جب ''آنکھیں ہوئیں چار تو دل میں آیا پیار'' دونوں نے ایک ہونے کا ارادہ کرلیا، لڑکی کہنے لگی: ''میں تیار ہوں، لیکن میرا باپ آپ کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اس رشتہ کو ہرگز منظور نہیں کرے گا'' اس پر وہ مریض عشق بولا: ''کوئی حرج نہیں، میں اسلام چھوڑ کر عیسائی مذہب قبول کرتا ہوں'' اور پھر ایسا ہی کیا، لیکن ابھی مقصود حاصل بھی نہ ہوا تھا کہ یہ شخص اس گھر میں رہتے ہوئے کسی کام سے چھت پر چڑھا اور کسی طرح گر پڑا، جس کے نتیجہ میں موقع پر ہی اس کی موت واقع ہوگئی۔ (التذکرۃ:۴۳، از: اللہ سے شرم کیجئے/ص:۲۳۵)

اس لیے قرآنِ پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ لَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ وَ لَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ﴾ (البقرة : ۲۲۱)

''اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، یقیناً ایک مومن باندی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، اگرچہ مشرکہ تمہیں پسند

آ جائے۔‘‘

دین اسلام میں مشرک عورتوں سے نکاح اس لیے بھی جائز نہیں کہ اس سے ایمان خطرہ میں آ جاتا ہے، جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں ہوا۔

اور یوں بدنظری کا زہریلا تیر بعض اوقات ایمان لیوا ثابت ہوتا ہے، یا کم از کم اس سے چہرہ کا ایمانی نورتو سلب ہو ہی جاتا ہے۔ اس لیے کہ حدیث شریف میں ہے:

’’لَتَغُضُّنَّ أَبْصَارَكُمْ وَلَتَحْفَظُنَّ فُرُوجَكُمْ، أَوْ لَيَكْسِفَنَّ اللّٰهُ وُجُوهَكُمْ‘‘.

(الترغيب و الترهيب:۳/ ۲۵، عن أبی أمامة)

’’اپنی نظریں نیچی رکھواور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو بے نور بنا دے گا۔‘‘ شاید اسی لیے وہ مثل مشہور ہے نا کہ ’’بری نظر والے! تیرا منھ کالا‘‘ حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ فرماتے ہیں کہ ’’بدنظری کرنے والا خواہ کتنا ہی حسین ہو، لیکن اس کے چہرے پر رونق اور نورانیت نہیں ہوتی‘‘۔

بدنظری کا دوسرا بڑا نقصان: یہ ہے کہ بدنظری کے سبب لعنت الٰہی برستی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

’’لَعَنَ اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ إِلَيْهِ‘‘. (رواه البيهقی فی شعب الإيمان، مشکوٰة: ۲۷۰/ الفصل الثالث/ عن الحسن مرسلاً)

یعنی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اس شخص پر جو بلا کسی عذر اجنبی عورت یا کسی کے ستر کو دیکھے، نیز وہ بھی ملعون ہے جس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو بے ستر یا بے پردہ کر کے لوگوں کو دیکھنے کا موقع دیا، جیسا کہ شادی وغیرہ میں عموماً ہوتا ہے کہ بعض باپردہ عورتیں بھی بن سنور کر اس طرح بے احتیاطی سے آتی ہیں کہ مردوں کی نظریں پڑ جاتی ہیں۔

نیز اس لعنت کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ عموماً بدنظری کا مرتکب اپنی اصلاح اور توفیق عمل سے محروم ہو جاتا ہے، اسی لیے حضراتِ صوفیہ کا قول ہے کہ ’’بدنظری کے ساتھ دل کی

اصلاح نہیں ہوتی جب تک اس کا علاج کر کے اس سے اجتناب نہ کیا جائے۔'' حتیٰ کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذاکرین کے دلوں میں ذکر کی وجہ سے نور تو پیدا ہوتا ہے، لیکن بد نظری میں مبتلا ہونے کے سبب وہ ذکر کی حلاوت اور نسبت ونورانیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ (العیاذ باللہ العظیم)

آج کل ہمیں نماز، ذکر واذکار، تسبیحات ومعمولات اور مناجات وغیرہ میں جو لذت اور حلاوت حاصل ہونی چاہیے وہ نہیں ہوتی، تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بدنظری ہے۔

بدنظری کا تیسرا نقصان: اخروی اعتبار سے یہ ہوتا ہے کہ بدنظری کرنے والا اس کے سبب سخت عذابِ الٰہی میں مبتلا ہوگا، حدیث شریف میں ہے:

''مَنْ نَظَرَ إِلٰى مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ أَجْنَبِيَّةٍ عَنْ نَظَرِ شَهْوَةٍ، صُبَّ فِى عَيْنَيْهِ الْآنُكُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''. (تكملة فتح القدير، نصب الراية، زيلعى، الحديث الرابع/ فصل فى الوطى والنظر والمس/ حديث :٥)

یعنی جس شخص نے کسی اجنبی عورت کے حسن کو شہوت کی نظر سے دیکھا ہو (پھر بغیر توبہ کے مر گیا) تو قیامت کے روز اس کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ آج ایک گھاس کا چھوٹا سا تنکا یا دھول کا چھوٹا سا ذرّہ ہماری آنکھ میں گر جاتا ہے تو ہم بے چین ہو جاتے ہیں، جب بدنظری کی سزا میں گرم پگھلا ہوا سیسہ بدنظری کرنے والوں کی آنکھوں میں ڈالا جائے گا تب کیا ہوگا؟ العیاذ باللہ العظیم۔

حفاظت نظر کی اہمیت:

بدنظری کے ان ہی نقصانات سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں بڑے اہتمام سے مرد وزن کو الگ الگ نظر کی حفاظت کا حکم فرمایا، چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ﴾

اور بعد والی دوسری آیت میں مومن عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ قُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ﴾ (النور: ۳۰-۳۱)

حالاں کہ اللہ پاک کی سنت اور عادت یہ ہے کہ جب وہ اپنے بندوں اور بندیوں کو کوئی حکم دیتے ہیں تو اس میں سب ہی کو ایک ساتھ پکارا جاتا ہے، جیسے: ''يَآأَيُّهَا النَّاسُ'' اے لوگو! اسے خطابِ عام کہا جاتا ہے، یا کبھی صرف ایمان والے مردوں اور عورتوں کو پکارا جاتا ہے: ''يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' سے، یعنی اے ایمان والو! اسے خطابِ خاص کہا جاتا ہے۔ لیکن خطابِ الٰہی عمومی ہو یا خصوصی، بہرحال تمام ہی مرد و زن عموماً اس میں داخل ہوتے ہیں، مردوں اور عورتوں کو الگ الگ خطاب نہیں کیا جاتا، لیکن حفاظت نظر کا حکم ایسا اہم ہے جس میں امت کے مردوں اور عورتوں دونوں کو الگ الگ اہتمام سے خطاب کیا گیا۔ پھر یہ حکم بقولِ حکیم العصر حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ حق تعالیٰ نے براہِ راست نہیں دیا، بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ ''قُلْ''، محبوبم! آپ اپنی امت کے مومن مردوں اور عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ حفاظت نظر کا اہتمام کریں اور اپنی نظریں نیچی رکھا کریں۔ ایسا کیوں؟ حق تعالیٰ نے براہِ راست حکم دینے کے بجائے اپنے نبی کو واسطہ کیوں بنایا؟ تو اس میں راز یہ ہے کہ جیسے ایک شریف باپ یا بڑا اپنی اولاد اور ماتحتوں کو اس قسم کی باتیں خود کہنا پسند نہیں کرتا، بلکہ دوستوں سے کہلاتا ہے کہ ذرا تم انہیں سمجھاؤ کہ وہ اس قسم کے بے حیائی والے کام نہ کریں، بالکل اسی طرح بدنظری والے معاملہ کو سمجھ لو کہ بدنظری بھی بڑی بے حیائی والی گندی حرکت ہے، اس لیے رب العالمین نے اپنے نبی رحمۃ للعالمین ﷺ کے ذریعہ کہلایا کہ آپ ہی ایمان والے بندوں اور بندیوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اس بے شرمی والے کام یعنی بدنظری سے احتیاط کیا کریں۔ (مستفاد از: مواہب ربانیہ/ص:۱۸)

ایک واقعہ:

خیرالقرون میں اس حکم پر کس قدر عمل تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا

ہے کہ سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو آپ کو بھی وہاں آنے کی دعوت دی گئی، آپ وہاں پہنچے اور اسلامی لشکر کے ساتھ فاتحانہ شان سے بیت المقدس میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا، جب عیسائیوں اور یہودیوں کو پتہ چلا تو انہوں نے ایک سازش کے تحت اپنی جوان اور حسین لڑکیوں کو مکانوں کے بالا خانوں پر کھڑا کر دیا، تاکہ مسلمانوں کا وہ لشکر جو جنگ میں مشغول ہونے کے سبب ایک عرصہ سے بیویوں سے دور تھا ان کے جذبات میں ہیجان پیدا ہو اور فتنہ میں مبتلا ہو جائیں، فراستِ فاروقی نے اس سازش کو سمجھ لیا، فوراً لشکر کو جمع کیا اور قرآنِ کریم کا یہ پیغام سنایا: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ﴾ حفاظتِ نظر کا حکم سنتے ہی لشکرِ اسلام کے جذبات سنبھل گئے اور اٹھی ہوئی نظریں جھک گئیں۔ (الفاروق: علامہ شبلی نعمانی)

حفاظت نظر کے تین بڑے انعامات:

اب جن خوش نصیب لوگوں نے حفاظت نظر کی اہمیت ونزاکت کو سمجھ کر اس پر عمل کیا تو ان کے لیے بڑے بڑے انعامات کے وعدے بھی کیے، مثلاً جو حدیث قدسی بیان کی اس میں حفاظت نظر کا پہلا انعام یہ بیان فرمایا کہ

”مَنْ تَرَكَهَا مَخَافَتِيْ أَبْدَلْتُهُ إِيْمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِيْ قَلْبِهِ“.

یعنی جو شخص بدنظری کا گناہ کسی مجبوری سے نہیں، بلکہ محض میری خشیت اور خوف یا میری محبت ورضا جوئی کے خاطر ترک کر دے، تو میں اس کے عوض اسے ایسا ایمان (اور اس کی وہ کیفیت) عطا کروں گا جس کی مٹھاس اور شیرینی وہ اپنے دل کے اندر محسوس کرے گا۔ چوں کہ حفاظت نظر میں نفس کو مجاہدہ کرنا پڑا، ایک قسم کی تلخی اور کڑواہٹ برداشت کرنی پڑی، لہٰذا اس کا نقد انعام ایمان اور عبادت میں حلاوت کی شکل میں دیا گیا، کڑوی دوا کھا کر فوراً میٹھی چیز کھانے کی رغبت ہوتی ہے نا۔ اسی طرح حفاظت نظر کے وقت کی تلخی برداشت کرنے کے بعد جب حلاوت ولذت کی رغبت ہوئی تو اس کا صلہ ایمان وعبادت کی حلاوت ولذت کی

شکل میں ہی ملنا چاہیے تھا، سو وہ عطا کر دیا گیا، اسی کو ایک دوسری حدیث میں اس طرح بیان فرمایا:

عَنْ أَبِیْ أُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "مَامِنْ مُسْلِمٍ يَنْظُرُ إِلٰى مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ أَوَّلَ مَرَّةٍ، ثُمَّ يَغُضُّ بَصَرَهٗ، إِلَّا أَحْدَثَ اللّٰهُ لَهٗ عِبَادَةً يَجِدُ حَلَاوَتَهَا".

(رواه أحمد، مشكوٰة/ص: ۲۷۰/ الفصل الثالث)

یعنی جو مسلمان کسی اجنبی عورت کے محاسن پر نظر پڑتے ہی اپنی نظر جھکا لے اور ہٹا لے، تو حق تعالیٰ اس کو عبادت میں حلاوت عطا فرمائیں گے۔ اس موقع پر یہ یاد رہے کہ عبادت واطاعت سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی ہے، حلاوت ولذت محمود تو ہے، مقصود نہیں، اور یہ نعمت غض بصر اور حفاظت نظر میں موجود ہے۔

اس کے ساتھ حفاظت نظر کا دوسرا بڑا انعام یہ ملتا ہے کہ عبادت میں حلاوت کے بعد بندہ اس میں ترقی کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اسے نورِ بصیرت وفراست سے نوازا جاتا ہے، اس طرح حفظِ بصارت کے عوض نورِ بصیرت کی نعمت سے نوازا جاتا ہے، جس کے بعد حلال وحرام اور صحیح وغلط میں فرق اور تمیز آسان ہو جاتی ہے، جب کہ بدنظری سے فراست ایمانی کمزور ہو جاتی ہے، صاحبو! فساق وفجار کو نظر بازی اور بدنظری سے جس قدر مسرت اور لذت حاصل ہوتی ہے اہل نظر اور صاحبِ بصیرت وفراست کو اس سے کہیں زیادہ مسرت ولذت نظر بچا کر نصیب ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ حفاظت نظر کا تیسرا بڑا اخروی انعام یہ ہے کہ حق تعالیٰ آخرت میں جہنم سے حفاظت فرما کر جنت میں داخل فرمائیں گے، اور وہاں اپنی رضا کے ساتھ ان شاء اللہ نظر کی حفاظت پر اپنا دیدار نصیب فرمائیں گے۔ حدیث میں ہے:

"ثَلَاثَةٌ لَا تَرٰى أَعْيُنُهُمُ النَّارَ، عَيْنٌ حَرَسَتْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَعَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، وَعَيْنٌ كُفَّتْ عَنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ". (الترغيب والترهيب: ٤/ ١١٤)

تین آنکھیں ایسی ہیں جو قیامت کے دن جہنم نہیں دیکھیں گی، (یعنی) اللہ تعالیٰ ان کی جہنم سے حفاظت فرمائیں گے اور ان پر دوزخ کو حرام فرمائیں گے:

(۱) وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد فی سبیل اللہ میں مجاہدین کی حفاظت کے لیے جاگی ہو۔

(۲) وہ آنکھ جو خوفِ الٰہی (یا شوق الٰہی) سے روئی ہو۔

(۳) وہ آنکھ جو ربِ کریم کی حرام کردہ چیزوں کو دیکھنے سے بند رہے یا بچی رہے۔

بہرکیف حفاظت نظر پر تین عظیم الشان انعامات کے وعدے ہیں: اول ایمان و اعمال میں حلاوت۔ دوم: نورِ بصیرت وفراست۔ سوم: دوزخ سے حفاظت اور جنت میں اللہ تعالیٰ کی زیارت۔ ضرورت ہے کہ ہم نظر کی حفاظت کا اہتمام کریں اور بدنظری سے اجتناب کریں۔ رزقنا اللّٰہ تعالیٰ بمنه و کرمه وفضلهٖ، آمین.

بدنظری کا علاج:

اور نظر کی حفاظت کا طریقہ اور بدنظری کا ایک علاج تو وہی ہے جسے قرآن نے بیان فرمایا﴿ قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ﴾ لہٰذا بدنظری کا پہلا علاج یہ ہے کہ ہمیشہ نیچی نظر رکھی جائے، اس سے شیطان سے بچنا نہایت آسان ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ شیطان انسان کے ایمان واعمال پر حملہ کرنے کے لیے چاروں سمتوں سے حملہ آور ہوتا ہے:

﴿ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ﴾ (الأعراف: ۱۷)

''پھر میں ان کو ورغلاؤں گا آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے۔''

البتہ دو سمتیں محفوظ ہیں: (۱) اوپر کی۔ (۲) نیچے کی۔ اب اگر کوئی شخص شیطان سے حفاظت کے لیے اوپر دیکھ کر چلے تو ٹھوکر کھا کر گر جانے اور جان تک کے جانے کا خطرہ ہے،

لہٰذا جان وایمان سے محفوظ رہنے کا ایک ہی راستہ بچا، اور وہ ہے نیچے والا راستہ، لہٰذا ہر وقت نظر نیچی رکھ کر چلیں گے تو ان شاءاللہ شیطان کے حملوں سے اور جان وایمان کے خطروں سے محفوظ رہیں گے۔ پھر بھی اگر کسی اجنبی عورت پر نظر پڑ جائے خواہ شہوت کی نہ ہو، بلکہ اچانک کی ہو، تب بھی فوراً ہٹالیں، ویسے نظر فجاءۃ اگر چہ فوراً ہٹا لینے کی وجہ سے معاف ہے، لیکن اس میں بھی نقصان کا امکان تو رہتا ہی ہے؛ کیوں کہ اس نظر فجاءۃ کی وجہ سے اگر دل میں کوئی فاسد خیال گھر کر گیا تو اس کے نقصان کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ حدیث میں اسی کا حکم فرمایا۔

صاحبو! یہ شیطان بڑا چالاک ہے، وہ پہلے حسینوں کا فرسٹ فلور دکھاتا ہے، یعنی ناف کے اوپر والا حصہ، پھر اس فرسٹ فلور سے گراؤنڈ فلور یعنی ناف کے نیچے والے حصہ میں لاکر رسوا کرتا ہے، وہ ایک دم سے گراؤنڈ فلور اس لیے نہیں دکھاتا کہ کہیں (Drainage) ڈرینیج گٹر لائن دیکھ کر رغبت کے بجائے نفرت نہ ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں سرے سے حسینوں کے فرسٹ فلور دیکھنے سے ہی منع فرما دیا، تاکہ بندے رسوا نہ ہو جائیں۔

بعض اولیاء اللہ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ صرف عورتوں ہی سے نیچی نظر نہ رکھتے تھے، بلکہ مردوں سے بھی نیچی نظر کر کے بات کیا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے غض بصر اور حفاظت نظر کی عادت ڈالی، ہم بھی ہمت اور قوت سے کام لیتے ہوئے اس کی عادت ڈالیں تو بڑا نفع ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے، آمین۔

دوسرا علاج بدنظری سے حفاظت کا یہ ہے کہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے کہ جتنا ہم کسی کو دیکھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ رب العالمین ہمیں دیکھتا ہے، وہ ہمیں خلوت میں، جلوت میں، روشنی میں، تاریکی میں، دن میں، رات میں، سفر میں، حضر میں، ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں دیکھتا ہے، وہ ہمارے سارے احوال سے باخبر ہے۔

قرآن کہتا ہے:

﴿أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللّٰهَ يَرٰى﴾ (اقرأ: ١٤)

''کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے؟'' اگر اس تصور کو مستحضر اور تازہ کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہیں، ہماری ہر نقل وحرکت اس کے علم میں ہے، تو اس تصور کے دل ودماغ میں راسخ ہونے اور جم جانے کے بعد ان شاء اللہ بدنظری اور برائی سے بچنا آسان ہوگا۔ اسی طرح ایک اور آیت ہے: ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ (الفجر: ١٤) کہ ''تیرا رب گھات میں ہے۔'' ہم سے غفلت میں نہیں، بلکہ ہماری طرف پورے طور پر متوجہ ہے، ان دونوں آیتوں کے مضمون کو ذہن نشین کرکے باقاعدہ روزانہ تھوڑی دیر ان کا مراقبہ کرلیا جائے تو یہ چند منٹ کا مراقبہ چوبیس گھنٹے کی زندگی میں کام دے گا، جیسے چابی والی پرانے زمانہ کی گھڑی میں چند منٹ چابی دینے سے چوبیس گھنٹے کام دیتی تھی، وہی حال ان شاء اللہ ان آیاتِ مبارکہ کے مراقبہ سے ہوگا۔

بدنظری کا تیسرا علاج یہ ہے کہ جب اس کا تقاضا دل میں پیدا ہو تو اس پر عمل نہ کریں، بلکہ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث میں جتنی بدنظری کی وعیدیں ہیں ان کو سوچیں، یہ بھی اس مہلک مرض کا مؤثر ترین علاج ہے، کیوں کہ خوفِ الٰہی کے بعد بدنظری وبدکاری سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔ بقولِ شاعر:

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی ☆ اور نفس نے چاہا رشک پری
شیطان نے ترغیب بھی دی ☆ کہ ہاں، لذت تو ملے گی زانی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا ☆ اور نفس کی خواہش بھی ہے روا
شیطان کا ساتھ البتہ برا ☆ اور خوفِ خدا ہے اس کی دوا

بہرحال! آنکھ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، اگر اہتمام کے ساتھ اس کی حفاظت کی جائے، محارم پر بلا وجہ نظر ڈالنے سے بچا جائے، بالخصوص اس وقت جب کہ شہوت کو

بڑھانے اور ابھارنے کے اسباب بھی موجود ہوں تو یہی اس آنکھ کی نعمت کا حق اور اداءِ شکر ہے، ایسی آنکھ انسان کے لیے سراسر سعادت وکامیابی کا ذریعہ ہے، جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے جب اپنی نظر کو محفوظ رکھا تو بلا سے بچے اور کامیاب ہوئے، لیکن اگر اس کی حفاظت کا اہتمام نہ کیا گیا، بدنظری سے اجتناب نہ کیا گیا، محارم سے محفوظ نہ رکھا گیا، اس کا ناجائز اور غلط استعمال کیا گیا تو یہی اس آنکھ کی نعمت کی ناقدری وناشکری اور خیانت ہے، ایسی نظر انسان کے لیے نقصان وناکامی کا باعث بنتی ہے، جیسا کہ زلیخا نے جب نظر کی حفاظت نہ کی تو بلا میں مبتلا ہوگئی تھی۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

نظر کی جولانیاں نہ پوچھو ☆ نظر حقیقت میں وہ نظر ہے
اٹھے تو بجلی پناہ مانگے ☆ جھکے تو خانہ آباد کرے

بدنظری سے حفاظت کی دعا:

اس کے ساتھ بدنظری سے حفاظت کے لیے بزرگوں کی تلقین کردہ ایک دعا بھی بہت مفید ہے، اور وہ دعا یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّىْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ خَائِنَةِ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ".

اس عاجز کو یہ دعا شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ نے مؤرخہ: ۷/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۱ھ بروزِ منگل بعد نمازِ ظہر حرمِ مکہ میں تلقین فرمائی تھی، اس کا اہتمام والتزام بھی نہایت مفید اور مؤثر ہے۔

حق تعالیٰ اپنے فضل سے بدنظری اور اپنی ناراضگی سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

(۱۵)

زبان کی حفاظت اور اس کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ سَعِيۡدِنِ الۡخُدۡرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ رَفَعَهٗ، قَالَ: ''إِذَا أَصۡبَحَ ابۡنُ اٰدَمَ فَإِنَّ الۡأَعۡضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ، فَتَقُوۡلُ: اِتَّقِ اللّٰهَ فِيۡنَا، فَإِنَّا نَحۡنُ بِكَ، فَإِنِ اسۡتَقَمۡتَ اسۡتَقَمۡنَا، وَإِنِ اعۡوَجَجۡتَ اعۡوَجَجۡنَا''. (رواه الترمذی:۲/۶۳، مشکوٰۃ/ص: ۴۱۳/ باب حفظ اللسان والغيبة والشتم/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب آدمی صبح کرتا ہے تو سارے اعضاء زبان کی خوشامد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو ہمارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتی رہنا؛ کیوں کہ ہم سب کا تعلق تجھ ہی سے ہے، اگر تو سیدھی رہے گی تو ہم سب سیدھے رہیں گے، اور اگر تو ٹیڑھی ہو جائے گی تو ہم سب بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔''

زبان جسم کا بہترین یا بدترین عضو ہے:

ربِ کریم کی تخلیق وقدرت کا ایک عجیب وغریب نمونہ زبان اور اس کی گویائی بھی ہے کہ یوں تو یہ گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے، لیکن یہ دنیا بھر کی مختلف زبانیں بولتا اور ذائقے چکھتا ہے، جہاں یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت اور ایک انعام ہے وہاں اس میں ہمارے لیے

امتحان بھی ہے؛ کیوں کہ بظاہر تو یہ منھ کے بتیس دانتوں کے درمیان میں ایک چھوٹا سا گوشت کا ٹکڑا ہے، لیکن اعضاءِ جسمانی میں اس عضو اور اس کی گویائی کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ دیگر تمام اعضاء کی صلاح وفساد ایک حد تک اس پر موقوف ہے، زبان کا ایک کلمہ کافر کو مومن بنا سکتا ہے اور مومن کو کافر بھی، زبان ہی کا ایک جملہ انسان کو نکاح کے پاکیزہ بندھن میں باندھ بھی سکتا ہے اور جدا بھی کرا سکتا ہے، زبان کا ایک ہی بول لوگوں کے مابین آگ بھڑکا بھی سکتا ہے اور بجھا بھی سکتا ہے، اسی زبان سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا ومحبت کا مستحق بھی بن سکتا ہے اور ناراضگی ولعنت کا بھی۔ حدیث میں ہے کہ:

عَنْ بِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''إِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الْخَيْرِ مَا يَعْلَمُ مَبْلَغَهَا، يَكْتُبُ اللّٰهُ لَهٗ بِهَا رِضْوَانَهٗ إِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ، وَ إِنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنَ الشَّرِّ مَا يَعْلَمُ مَبْلَغَهَا، يَكْتُبُ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْهِ سَخَطَهٗ إِلٰى يَوْمِ يَلْقَاهُ''. (رواه الترمذی و ابن ماجه، مشكوٰة/ص: ٤١٢)

''بلا شبہ بعض اوقات ایک شخص اپنی زبان سے کوئی ایسی خیر کی بات نکالتا ہے جس کا درجہ (صلہ) خود نہیں جانتا، مگر حق تعالیٰ اس کلمۂ خیر کی وجہ سے قیامت تک کے لیے اس شخص کے بارے میں اپنی رضا کو لکھ دیتا ہے، اس کے برخلاف کبھی کوئی ایسا کلمۂ شر زبان سے نکالتا ہے جس کی قباحت کو خود جانتا نہیں، حالاں کہ اس کی وجہ سے قیامت تک کے لیے حق تعالیٰ اپنی ناراضگی اس پر لکھ دیتا ہے۔''

نیز قرآنِ کریم میں فرمایا گیا کہ بعض اوقات انسان کسی برائی اور بدگوئی کو معمولی سمجھتا ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی ہوتی ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿وَ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّناً وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ﴾ (النور: ١٥)

''اور تم اس بات کو معمولی سمجھ رہے تھے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بڑی سنگین بات تھی۔''

تو زبان یہ ایسا عجیب وغریب عضو ہے کہ اس میں خوبی خرابی اور نفع نقصان دونوں کا امکان ہے، ظاہر ہے کہ اس کے خیر وشر کا انحصار و دار و مدار اس کے استعمال پر ہے، اگر زبان کا استعمال درست ہے تو اس سے خیر وجود میں آئے گی؛ اس لیے یہ جسم کا ایک بہترین عضو ہے، لیکن اگر اس کا استعمال غلط ہے تو اس سے شر وجود میں آئے گا، بایں صورت یہ جسمانی اعضاء میں بدترین عضو شمار ہوگا۔

حضرت لقمان علیہ السلام کا واقعہ:

اس سلسلہ میں حضرت لقمان علیہ السلام کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ان کو ان کے آقا نے حکم دیا کہ ایک بکری ذبح کر کے اس کے دو بہترین حصے میرے پاس لاؤ، انہوں نے بکری ذبح کی اور اس کا دل و زبان لا کر پیش کیا، آقا نے دوبارہ حکم دیا کہ ایک اور بکری ذبح کرو اور اس کے دو بدترین اعضاء میرے سامنے لاؤ، انہوں نے پھر ایک بکری ذبح کی اور اب کی بار بھی وہی دو اعضاء یعنی دل اور زبان ہی کو پیش کیا، ان کے آقا نے تعجب سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ میں نے دو بہترین حصے طلب کیے تب بھی تم یہی زبان اور دل لائے، اور بدترین اعضاء طلب کیے تب بھی تم یہی لائے، ایسا کیوں؟ حضرت لقمان حکیم علیہ السلام نے فرمایا: ''بات دراصل یہ ہے کہ دل اور زبان اچھے رہیں تو ان سے بہتر جسم کا کوئی عضو نہیں ہو سکتا، اور اگر یہ بگڑ جائیں تو ان سے بدتر عضو بھی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔'' یہ دونوں بہتر رہیں تو بہترین ہیں، لیکن بدتر ہو جائیں تو بدترین ہیں۔ (تفسیر قرطبی: ۴/۶۱، از: کتابوں کی درسگاہ میں: ۶۵)

زبان دل کی ترجمان ہے:

یوں تو جسمانی اعضاء کا ظاہری و باطنی اعتبار سے دار و مدار دل پر ہے، لیکن انسان کی زبان چوں کہ دل کی ترجمان ہے، اس لیے دونوں کی نوعیت بھی ایک ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ دل جو کچھ اچھا برا سوچتا ہے، زبان اس کو بیان کرتی ہے، اور دیگر اعضاء اس پر عمل کرتے

ہیں، اس لیے اس کی تاثیر دل پر زیادہ نمایاں ہوتی ہے، تو جس طرح دل کے صالح وفاسد ہونے کا اثر سارے اعضاءِ جسم پر پڑتا ہے اسی طرح زبان کے اچھے اور برے استعمال کا اثر بھی تمام اعضاءِ بدن پر پڑتا ہے، زبان کی اسی خاص نوعیت کی وجہ سے ہر روز انسان کے سارے اعضاء بزبانِ حال یا بزبانِ قال پوری عاجزی اور لجاجت کے ساتھ زبان سے ایک درخواست کرتے ہیں جس کا تذکرہ مذکورہ حدیث میں ہے کہ ''ہماری صلاح وفلاح اور انجام کی اچھائی و برائی اور نفع ونقصان بظاہر تجھ سے وابستہ ہے، اس لیے اے زبان! ہم پر رحم کرنا اور خوفِ الٰہی سے بے خوف ہوکر بیبا کانہ نہ چلنا، ورنہ تیرے ساتھ ہماری بھی خیر نہیں، ہم بھی تکلیف اور مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے، اور اگر تو احتیاط سے رہی تو اس میں تیرے ساتھ ہمارا بھی فائدہ ہے، فرمایا: ''اِتَّقِ اللّٰهَ فِيْنَا، فَإِنَّا نَحْنُ بِكَ'' اگر اس موقع پر یہ سوال پیدا ہو کہ زبان کو اعضاءِ جسم کس طرح مخاطب کرتے ہیں؟ تو اس سلسلہ میں حضرت شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث حقیقت بھی ہوسکتی ہے کہ ہر صبح اعضاءِ جسم زبان سے اس طرح گفتگو کرتے ہوں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمثیل اور مثال کے طور پر فرمایا ہو، مقصد یہ ہے کہ سارے اعضاءِ جسم چوں کہ زبان کے تابع ہیں؛ لہٰذا اس کو صحیح رکھنے کی کوشش کرو۔''

(اصلاحی خطبات: ۴/۱۴۳)

زبان کی حفاظت کے فوائد:

زبان کی حفاظت کے اتنے فوائد ہیں کہ اس سے جسم وجان کے ساتھ اعمال وایمان کی حفاظت بھی ہوتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایمان وارکانِ اسلام کے بعد ابوابِ خیر واعمالِ صالحہ کے حسن وقبول کا مدار بڑی حد تک زبان کی حفاظت پر ہی موقوف ہے، اس بارے میں ایک حدیث درج کی جاتی ہے جس سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک دن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ''حضور!

مجھے ایسا عمل بتا دیجیے جس کی وجہ سے میں جنت میں پہنچ جاؤں اور دوزخ سے بچ جاؤں'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ أَمْرٍ عَظِيمٍ، وَإِنَّهٗ لَيَسِيرٌ عَلٰى مَنْ يَّسَّرَهُ اللّٰهُ تعالٰى عَلَيْهِ''.

''بات تو تم نے بہت بڑی پوچھی ہے، لیکن بڑی اور بھاری ہونے کے باوجود یہ اس بندے اور بندی کے لیے آسان ہے جس کے لیے حق تعالیٰ اپنی توفیق سے آسان فرما دیں۔'' اب جب یہ اہم سوال پوچھا ہی ہے تو لو اب اس کا جواب بھی سنو! اس سلسلہ میں سب سے مقدم بات تو یہ ہے:

''تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا، وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ، وَتُؤْتِي الزَّكٰوةَ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ''.

دین کے اہم اور بنیادی مطالبوں کو اہتمام سے ادا کرنے کی فکر کرو، (یعنی) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، اور اچھے طریقے یعنی دل کی توجہ کے ساتھ نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ شریف کا حج کرنا۔ یہ تو اسلام کے بنیادی ارکان و فرائض تھے، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر تم چاہو تو میں تمھیں ابوابِ خیر کے بارے میں بھی خبر دوں؟ (غالباً اس سے آپ ﷺ کی مراد نفل عبادات تھیں) چناں چہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی طلب دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا:

''الصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلٰوةُ الرَّجُلِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ''.

دیکھو! ''روزہ گناہوں اور دوزخ کی آگ سے حفاظت کے لیے ڈھال ہے، اور صدقہ گناہ سے سلگنے والی (جہنم کی) آگ کو اس طرح بجھاتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے، اور رات کے درمیانی حصے کی نماز (تہجد) کا بھی یہی حال ہے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے تہجد اور صدقہ کی فضیلت کے سلسلہ میں سورۂ سجدہ کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ز وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○ (السجدة : ١٦)

جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ایمان والے بندوں کا حال یہ ہے کہ راتوں میں اپنے بستروں کو چھوڑ کر خوف وامید کی کیفیت کے ساتھ ہماری عبادت ودعا میں مشغول رہتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے وہ اس میں سے ہماری رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں، ان اعمالِ خیر کے صلہ میں ان کے لیے جو کچھ نعمتیں اور آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کا سامان پردۂ غیب میں ہم نے رکھا ہے اس کو کوئی بھی نہیں جانتا، بس اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور اسی کو اس کا کما حقہ علم ہے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں دین اسلام کا سر، اس کا ستون اور اس کی بلندی بتادوں؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''میں نے عرض کیا: ''ضرور یا رسول اللہ!'' تو ارشاد ہوا:

''رَأْسُ الْأَمْرِ الإِسْلَامُ، وَعُمُوْدُهُ الصَّلٰوةُ، وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ''.

دین کا سر یا سرا اسلام ہے، (یعنی اسلام قبول کرنا اور اس کو اپنا دین بنانا، اس کے بغیر کوئی عمل نہ قبول ہوگا، نہ آخرت میں اس کا کوئی اجر ملے گا) دین کا ستون نماز ہے، (جس طرح مکان ستون کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اسی طرح بغیر نماز کے دین بھی قائم نہیں رہ سکتا) اور دین کی بلندی جہاد ہے، (دین اور دینداری کی سربلندی جہاد پر موقوف ہے) اس واقعہ اور حدیث کا آخری جز جس کی وجہ سے یہاں اس کو درج کیا گیا ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے معاذ! کیا میں تمہیں وہ چیز بھی بتادوں جس پر ان سب چیزوں کا دارومدار ہے اور جس کے بغیر یہ سب اعمالِ خیر ہیچ اور بے وزن ہیں؟'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں: ''حضور! وہ چیز بھی ضرور بتادیجئے گا'' تب آپ ﷺ نے اپنی زبان پکڑی اور ارشاد فرمایا:

"کُفَّ عَلَیْكَ هٰذَا" اس زبان کو روکو، اس کو قابو اور حفاظت میں رکھو۔'' اس کے بڑے فوائد ہیں، اگر اس کی حفاظت کی تو یہ عظیم القدر درجات اور بہت سے فضائل کے حصول کا ذریعہ ووسیلہ بنتی ہے، بلکہ ایک حد تک ایمان کی حفاظت زبان کی حفاظت پر موقوف ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ:

پاک رکھ اپنی زبان تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

زبان کی حفاظت نہ کرنے کے نقصانات:

لیکن اگر زبان کی حفاظت نہ کی تو پھر اس کی بیباکیاں و بے احتیاطیاں ایک طرف خود انسان کے وقار کو مجروح کر دیتی ہیں تو دوسری طرف انسان کے اعمالِ صالحہ وحسنہ کو بھی بے وزن و بے نور کر دیتی ہے، اور انسان کے لیے حد درجہ محرومی وشقاوت کا سبب بن جاتی ہے، حدیث شریف کا یہ مضمون سن کر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو بڑا تعجب ہوا، انہوں نے دریافت کیا: ''حضرت! کیا زبان کی باتوں اور لغزشوں پر بھی ہماری اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ ہوگی؟'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

"یَا مَعَاذُ! وَهَلْ یَکُبُّ النَّاسَ فِی النَّارِ عَلیٰ وُجُوْهِهِمْ أَوْ عَلیٰ مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ". (رواه أحمد والترمذی وابن ماجه، مشکوٰة/ص: ۱۴/ کتاب الإیمان/ الفصل الثانی)

''اے معاذ! تم بھی عجیب آدمی ہو، ارے لوگوں کو جہنم میں ان کے منھ یا ناک کے بل زیادہ تر ان کی زبانوں کی بے احتیاطی اور زبان کی حفاظت نہ کرنے کی وجہ سے ہی تو ڈالا جائے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن دوزخ میں جانے والے اکثر وبیشتر وہی ہوں گے جنہوں نے دنیا میں اپنی زبانوں کی حفاظت نہ کی ہوگی۔ صاحبو! ان حقائق سے واضح

ہو گیا کہ زبان کی لغزش قدم کی لغزش سے خطرناک ہے؛ کیوں کہ زبان کی لغزش کے نتیجہ میں بسا اوقات بہت سے گناہ صادر ہو جاتے ہیں۔

چناں چہ محققین فرماتے ہیں کہ انسان کے بدن میں سات اعضاء ایسے ہیں جن سے عموماً گناہ اور معاصی سرزد ہوتے ہیں: (۱) پیر۔(۲) شرمگاہ۔(۳) پیٹ۔(۴) ہاتھ۔ (۵) آنکھ۔(۶) کان۔(۷) زبان۔ پھر ان میں بھی بہت سے بڑے بڑے گناہ ایسے ہیں کہ ان کا تعلق زیادہ تر زبان سے ہے اور زبان ہی کے ذریعہ ان کا صدور ہوتا ہے، مثلاً (۱) جھوٹ۔ (۲) جھوٹی قسم۔ (۳) جھوٹی گواہی۔ (۴) جھوٹا وعدہ۔ (۵) جھگڑا۔ (۶) گالی گلوچ۔(۷) لعن طعن۔(۸) گانا اور گندی و فحش باتیں۔(۹) غیبت۔(۱۰) چغلی (۱۱) دوغلی باتیں۔(۱۲) افشاءِ راز۔(۱۳) ناجائز مذاق واستہزاء۔(۱۴) بے موقع و بے جا تعریف، بالخصوص فاسق و بدعتی وغیرہ کی تعریف۔ نیز (۱۵) غلط مسئلہ وفتویٰ بیان کرنا وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کے گناہ ایسے ہیں جن میں انسان زبان کے ذریعہ ہی مبتلا ہو کر بالآخر جہنم کا مستحق بن جاتا ہے، اس اعتبار سے کہنے والے نے صحیح کہا کہ

ہرچہ بر آدمی ز زیاں برسد
ہمہ از آفتِ زباں برسد

اسی بنا پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید کے ساتھ زبان کی حفاظت کی ترغیب دی، ایک موقع پر فرمایا: ”مَنْ صَمَتَ نَجَا“. (رواه أحمد والترمذی، مشکوٰۃ /ص: ۴۱۳) مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے زبان کی حفاظت کی اس طرح کہ فضول، بری، اور بے فائدہ باتوں سے زبان کو روکا تو وہ ہلاکت کے غار میں گرنے سے بچ گیا اور نجات پا گیا۔ عربی کا مقولہ ہے کہ

”مَنْ حَفِظَ لِسَانَهُ قَلَّتْ نَدَامَتُهُ“. (روضة الأدب/ص: ۴۹)

”زبان کی حفاظت کرنے والا ندامت سے بچے گا۔“

زبان کی حفاظت کے طریقے:

اور زبان کی حفاظت کے لیے جو نسخے اور طریقے ہیں ان میں پہلا طریقہ نہایت ہی آسان ہے، اور وہ عام حالات میں خاموش رہنا ہے، مطلب یہ ہے کہ بے فائدہ اور ناپسندیدہ باتوں سے بچے، اب جس شخص کا یہ عمل ہوگا وہ قدرتی طور پر کم بولنے اور زیادہ خاموش رہنے والا ہوگا، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا، بقولِ محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں سب سے زیادہ بولنے کی ضرورت تھی، کہ قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لیے آپ ﷺ کو ہدایات دینی تھیں، اور آپ ﷺ اس ضرورت سے بولنے میں کوئی کمی نہ کرتے تھے، بتانے کی ہر چھوٹی بڑی بات بتلاتے تھے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے دیکھنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کا حال یہ بیان فرمایا کہ ''كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَوِيْلَ الصَّمْتِ''. (رواه البغوی فی شرح السنة عن جابر بن سمرة، مشكوٰة/ص: ٥٢٠ / باب فی أخلاقه وشمائله) ''آپ ﷺ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے۔'' ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''وَلَا يَتَكَلَّمُ إِلَّا فِيْمَا يَرْجُوْ ثَوَابَهٗ''. (جمع الفوائد) آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف وہی بات کرتے تھے جس پر آپ ﷺ کو ثواب کی امید ہوتی۔ (از معارف الحدیث: ۲/ ۲۴۸)

ایک حدیث میں خاموش رہنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ''مَقَامُ الرَّجُلِ لِلصَّمْتِ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً''. (بيهقی فی شعب الإيمان، عن عمران بن حصين، مشكوٰة/ص: ٤١٤)

''کسی شخص کو خاموشی اختیار کرنے کی وجہ سے جو مرتبہ ملتا ہے وہ ساٹھ سال کی (نفلی) عبادت سے بڑھ کر ہے۔'' شاید اسی وجہ سے کہا گیا کہ ''اگر بولنا چاندی ہے تو خاموش

رہنا سونا ہے۔‘‘ اور یہی حفاظت زبان کا پہلا اور آسان طریقہ ہے۔

اور اگر بولنا ضروری ہو تو اب زبان کی حفاظت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خیر کی بات خوبی کے ساتھ بولے۔ حکم ربانی بھی یہی ہے، فرمایا:

﴿وَ قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ (بنی إسرائیل : ٥٣)

’’محبوبم! میرے بندوں کو کہہ دو کہ وہ اچھی بات کیا کریں۔‘‘ اسی لیے ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ“. (بخاری: ٩٥٩/٢، مشکوٰۃ/ص: ٣٦٨)

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ خیر کی بات (خلوص سے) کرے یا خاموش رہے۔ بقولِ شاعر:

لبِ خاموش کا دونوں جہاں میں بول بالا ہے
وہی محفوظ رہتا ہے جس کے لب پہ تالا ہے

لیکن عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس طریقہ پر عمل کرنا اس وقت آسان ہو سکتا ہے جب آدمی سوچ سمجھ کر شریعت کے مطابق بولنے کی عادت ڈالے، زبان کو اس احتیاط سے چلائے جس احتیاط سے ڈرائیور گاڑی کو چلاتا ہے۔ گویا اس شعر کا مصداق بن جائے کہ

جب کبھی بولنا، وقت پر بولنا
مدتوں سوچنا، مختصر بولنا

چوں کہ قلت عقل کا اندازہ کثرتِ کلام سے ہوتا ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ گفتگو کے شرعی آداب کو ہر وقت پیش نظر رکھا جائے۔

گفتگو کے آداب:

کتاب وسنت کی روشنی میں علماءِ کرام نے گفتگو کے چند آداب بیان فرمائے ہیں،

جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) بوقتِ ضرورت بقدرِ ضرورت جب بات کرنی ہو تو خیر کی بات خوبی کے ساتھ اور سچی بات سلیقہ کے ساتھ کریں۔

(۲) درمیانی آواز میں مسکراتے ہوئے میٹھے لہجے میں ٹھہر کر بلا تکلف بات کریں۔

(۳) عورتوں کو اگر مردوں سے یا مردوں کو عورتوں سے بولنے کا اتفاق ہو تو صاف سیدھے اور کھرے لہجے میں بات کریں، کسی طرح کی نزاکت اور نرمی پیدا نہ کریں، تاکہ کوئی برا خیال دل میں نہ آئے۔

(۴) کبھی کوئی دین کی بات کرنی ہو تو مخاطب کے ذہن وصلاحیت کو سامنے رکھ کر مناسب انداز میں سوچ کر سوز کے ساتھ بات کی وضاحت کیجئے، ضرورت ہو تو اپنی بات کو دہرا لیجئے گا، تاکہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

(۵) جس سے بھی بات کرنی ہو اس کی عمر، مرتبے اور اس سے اپنے تعلق کا لحاظ رکھتے ہوئے بات کریں، ماں باپ، استاذ اور بڑوں سے دوستوں کی طرح گفتگو نہ کریں، اسی طرح اپنے بچوں، شاگردوں اور چھوٹوں سے گفتگو کے وقت اپنے مرتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے شفقت سے بات کریں۔

(۶) جب مجلس میں بات کرنی ہو تو اجازت لیں، کسی کی بات کاٹ کر نہ بولیں، پھر مجلس کے ختم پر یہ دعا پڑھ لیں: ”سُبُحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمُدِكَ وَأَشُهَدُ أَنُ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنُتَ أَسُتَغُفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيُكَ“. (مشکوٰۃ/ص: ٦١٤) تاکہ دورانِ مجلس کوئی فضول بات کہی سنی ہو تو اس کا کفارہ ہو جائے۔

(۷) نیز سنیں زیادہ، بولیں کم۔ بقولِ شاعر:

کہے ایک، جب سن لے انسان دو
اللہ نے زبان دی ہے ایک، اور کان دو

یہ عقلمندوں کی علامت ہے کہ بلا وجہ گفتگو کو طول نہ دیا جائے، ان آداب کی رعایت رکھتے ہوئے جب بات کی جائے گی تو بات میں وزن اور اثر پیدا ہوگا، اور زبان کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ آج اگر ہماری باتیں بے وزن اور بے اثر ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم گفتگو کے ان آداب کو کما حقہ ملحوظ نہیں رکھتے۔

منقول ہے کہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا: ''حضرت! کیا وجہ ہے کہ ہمارے کلام میں تاثیر نہیں رہی؟ حالاں کہ ہمارے اسلاف کا کلام بہت مؤثر ہوتا تھا'' تو فرمایا: ''بھئی! بات یہ ہے کہ وہ زبان کی حفاظت کرتے تھے، اور جب بھی کوئی بات کرتے تو اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی، اسلام کی سربلندی اور نجاتِ اخروی ہوتا، جب کہ آج ہم جو بات کرتے ہیں تو عموماً اس سے ہمارا مقصد لوگوں کی خوشی، اپنی بڑائی اور طلب دنیا ہوتا ہے، ایسی صورت میں ہماری گفتگو اور بات چیت کیوں کر مفید اور مؤثر ہوسکتی ہے؟''

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

زبان کی حفاظت کے لیے گفتگو کے ان آداب کی رعایت ضروری ہے۔

علاوہ ازیں زبان کی حفاظت کا تیسرا طریقہ آیت کریمہ: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق: ۱۸) کا مراقبہ ہے، جس میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ جو کچھ زبان سے نکلتا ہے وہ فضا میں تحلیل ہوکر فنا نہیں ہوجاتا، بلکہ سب کا سب من وعن فرشتوں کے ذریعہ محفوظ ہوجاتا ہے، گویا (کراماً کاتبین) فرشتوں کے پاس خود کار مشین ہے، جوں ہی ہم سے کوئی قول وفعل صادر ہوتا ہے فوراً اس میں ریکارڈ ہوجاتا ہے، پھر اسی کے مطابق قیامت کے دن ہم سے باز پرس ہوگی، فرمایا: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ یعنی انسان کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا مگر اس کے پاس ایک نگراں فرشتہ مستعد اور تیار ہوتا ہے۔

جب بلا ناغہ صبح وشام اس آیت کریمہ کا مراقبہ کیا جائے گا تو آہستہ آہستہ سوچ کر بولنے کی عادت پڑے گی، پھر ان شاء اللہ گفتگو کے ان آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے بولنا بھی آسان ہو جائے گا، اور اس طرح زبان کی حفاظت سے بہت سے فوائد حاصل ہوں گے، خیر وجود میں آئے گی اور فضولیات ومعصیات سے حفاظت نصیب ہوگی، یاد رکھو! جیسے مال کی حفاظت ضروری ہے اس سے زیادہ زبان کی حفاظت ضروری ہے۔

حق تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں اپنی زبانوں کی حفاظت کرنے اور اپنی مرضیات کے مطابق کام وکلام کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

☆......☆......☆

(۱۶)

سچ کی فضیلت اور جھوٹ کی مذمت

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "عَلَیْکُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ یَھْدِیْ إِلَی الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ یَھْدِیْ إِلَی الْجَنَّةِ، وَمَا یَزَالُ الرَّجُلُ یَصْدُقُ وَیَتَحَرَّی الصِّدْقَ، حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَ اللّٰہِ صِدِّیْقًا، وَإِیَّاکُمْ وَالْکِذْبَ، فَإِنَّ الْکِذْبَ یَھْدِیْ إِلَی الْفُجُوْرِ، وَإِنَّ الْفُجُوْرَ یَھْدِیْ إِلَی النَّارِ، وَمَا یَزَالُ الرَّجُلُ یَکْذِبُ وَیَتَحَرَّی الْکِذْبَ، حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَ اللّٰہِ کَذَّابًا". (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص: ٤١١/ باب حفظ اللسان والغیبة والشتم/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم سچ کو لازم پکڑو؛ کیوں کہ سچ نیکی کی راہ دکھاتا ہے، اور بلاشبہ نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے، اور انسان برابر سچ بولتا رہتا ہے اور سچ ہی پر عمل کرنے کی فکر کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں "صدیق" لکھ دیا جاتا ہے، اور تم جھوٹ سے بچو؛ کیوں کہ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے، اور گناہ دوزخ کی طرف لے جاتا ہے، اور

انسان جھوٹ کو اختیار کرتا ہے پھر جھوٹ ہی کے لیے فکرمند رہتا ہے، حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ''کذاب'' لکھ دیا جاتا ہے''۔

سچ کی اہمیت:

انسان کی ایمانی و اخلاقی اعلیٰ خوبیوں اور خصلتوں میں سرفہرست ہونے کی حیثیت جس خوبی و خصلت کو حاصل ہے وہ ہے ''صدق''، جس کا صحیح اور مکمل مطلب دل، زبان اور عمل کی سچائی ہے، یہ ان نیک خصلتوں میں سے ہے جنہیں تمام آسمانی بلکہ غیر آسمانی ادیان و مذاہب نے بھی سراہا ہے، اور دنیا کے تمام سنجیدہ لوگ اپنے مزاج اور مذاہب و مسالک کے اختلاف کے باوجود اس کی پسندیدگی پر متفق ہیں، اس کی اہمیت کے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ حق تعالیٰ نے اس صفت سے خود اپنے آپ کو متصف فرمایا، یعنی سچ اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ صفت ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (النسآء: ۱۲۲)

''اور کون ہے جو اپنی بات میں اللہ سے زیادہ سچا ہو؟''

اسی کے ساتھ سچ ہمارے آقا اور مولیٰ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان اور نام مبارک کا گویا ایک حصہ ہے، آپ ''الصادق الامین'' سے مشہور ہوئے، جس کے معنی سچا اور امانتدار ہیں۔ منقول ہے کہ ۷ھ محرم الحرام میں جب سرکار دو عالم ﷺ کا والا نامہ لے کر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ قیصر روم کے دربار میں پہنچے تو اس نے خط پڑھ کر تحقیق کی غرض سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ابوسفیان سے کچھ سوالات کیے، جو اس وقت مسلمان نہ ہوئے تھے، اور تجارت کی غرض سے وہاں آئے تھے، مختلف سوالات کرتے ہوئے ہرقل نے پوچھا کہ ''جو شخص مدعی نبوت ہے کیا اس نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ بولا ہے؟'' جواب میں ابوسفیان نے حضور اکرم ﷺ سے دشمنی کے باوجود آپ ﷺ کی سچائی کا اقرار کیا کہ ''اس مدعیٔ نبوت نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔'' (مشکوٰۃ: ۵۲۵)

روایتوں میں ہے کہ فتح مکہ کے بعد ابوسفیان جب مسلمان ہو گئے تو ایک موقع پر کسی نے ان سے کہا کہ قیصر روم کے دربار میں آپ کو حضور اکرم ﷺ کے خلاف ہرقل کو بھڑکانے کا موقع ملا تھا، اس کے باوجود آپ نے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں جھوٹا ہونے کی بات کیوں نہ کہہ دی؟ اس پر ابوسفیان نے کہا کہ یہ بات میرے دل میں بھی آئی تھی، لیکن محمد عربی ﷺ کی صداقت عرب وعجم میں ایسی مشہور اور ضرب المثل تھی کہ اگر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) جھوٹا کہہ بھی دیتا تو میں خود ہی پورے عرب میں جھوٹا مشہور ہو جاتا۔ معلوم ہوا کہ ''صدق'' حق تعالیٰ کی پاکیزہ صفت اور شان ہے اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی مرکزی خصلت اور پہچان ہے۔

سچ کی تاکید اور ایک واقعہ:

اس لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ہر موقع پر سچائی کی تاکید فرمائی، رب العالمین نے فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا﴾ (الأحزاب : ۷۰)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی سچی بات کرو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمیشہ لوگوں کو سچ بولنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے، چناں چہ حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا:

''عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ''.

لوگو! ہمیشہ سچ بولو! سچائی کو لازم پکڑ لو، اپنی پہچان بنالو؛ کیوں کہ صدق سیدھے راستہ پر لے جاتا ہے، سچائی نیکی کی راہ پر ڈالتی ہے، یعنی اس سے نیکی اور امورِ خیر کی توفیق ملتی ہے اور راہِ جنت کھلتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب واقعہ (اللباب فی علوم الکتاب: ۲/ ۲۳۵ میں ابو حفص عمر بن علی الدمشقیؒ نے اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ''تفسیر عزیزی میں سورۂ قلم کی

آیت: ﴿مَـا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ (القلم:۲) کے تحت، نیز علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ''سیرۃ النبی ص:۶/ ۱۷۱) میں نقل فرمایا کہ ایک شخص دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کرتا ہے: ''حضور! مجھ میں چار برائیاں ہیں: (۱) زنا کاری۔ (۲) چوری۔ (۳) شراب نوشی۔ (۴) دروغ گوئی۔ یعنی جھوٹ۔ سنا ہے آپ ان سب کو حرام بتاتے ہیں، حالاں کہ میں فوری طور پر ان ساری برائیوں کو نہیں چھوڑ سکتا، البتہ اگر آپ ان میں سے کسی ایک کے ترک کا حکم دیں تو میں ایمان لے آؤں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھی بات ہے، تم ایمان لے آؤ اور صدق کا اہتمام کرو۔'' وہ شخص ایمان لے آیا اور ہمیشہ سچ بولنے کا وعدہ کر کے چلا گیا، جب رات ہوئی تو حسب معمول اس کے سامنے شراب پیش کی گئی، سوچنے لگا کہ اگر شراب پی لی، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح پوچھا تو انکار نہیں کرسکوں گا کہ وہ جھوٹ ہوگا، اور میں نے کبھی جھوٹ نہ بولنے کا وعدہ کیا ہے، اور اگر اقرار کروں گا تو شراب کی سزا (اسّی کوڑے) دی جائے گی، اس لیے شراب سے باز رہا، اور جب زنا کا ارادہ ہوا تو یہی سوچ کر بچا رہا، اور اسی فکر سے چوری کے فعل سے بھی رکا رہا۔ (اسلامی سزاؤں کا یہی تو بنیادی فائدہ ہے کہ انسانی معاشرہ جرائم سے پاک ہوجاتا ہے) صبح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا:

''مَا أَحْسَنَ مَا قُلْتَ، لَمَّا مَنَعْتَنِيْ مِنَ الْكِذْبِ، اِنْسَدَّتْ أَبْوَابُ الْمَعَاصِيْ عَلَيَّ''.

یارسول اللہ! آپ نے ہمیشہ سچ بولنے اور جھوٹ کو چھوڑ دینے کی ایسی عمدہ نصیحت فرمائی کہ اس ایک صفت صدق کی وجہ سے تمام گناہوں کا دروازہ مجھ پر بند ہوگیا، اور مجھے نیکی وتوبہ کی توفیق نصیب ہوگئی۔ سچ ہے: ''اَلصِّدْقُ يُنْجِيْ وَالْكِذْبُ يُهْلِكُ''. (روضة الأدب:۴۸) ''سچ نجات دلاتا ہے اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے۔''

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچ آتے ہیں اے واعظ!
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے، منوائی نہیں جاتی

(جگر مرادآبادیؒ)

اور ایک شعر ہے:

صداقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ سے
حقیقت کھل ہی جاتی ہے طرزِ تکلم سے

سچ کی برکت:

حقیقت یہ ہے کہ صدق ایک ایسی صفت ہے کہ اگر اس پر مداومت اختیار کی جائے تو اس کی برکت سے ایک معمولی انسان بھی با کمال بن سکتا ہے، کہتے ہیں نا کہ

"أَكْلُ الْحَلَالِ، وَصِدْقُ الْمَقَالِ، كِلَاهُمَا عَلَامَتَانِ لِصَاحِبِ الْكَمَالِ".

(روضة الأدب: ٥٢)

"صاحب کمال کی دو علامتیں ہیں: (۱) اکل حلال۔ (۲) صدق مقال۔"

ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبد المجید ندیمؒ فرماتے تھے: "رزقِ حلال کے بغیر صدقِ مقال نہیں ہوسکتا، اور صدقِ مقال نہ ہو تو روحانی زندگی بے نور ہو جاتی ہے۔" اور یہی در حقیقت تصوف کی روح ہے، جس میں یہ دونوں باتیں پیدا ہو جائیں گویا اس کو دو پر لگ گئے، جن سے وہ اڑ کر راہِ سلوک کی منزلیں بآسانی طے کر کے قربِ الٰہی حاصل کر لے گا۔

حدیث شریف میں فرمایا:

"وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ، حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا".

جب آدمی مستقل سچ بولتا رہتا ہے اور دل، زبان اور عمل کا سچا بن جاتا ہے، تو یہی در اصل ایک سچے مومن کی پہچان ہے؛ اس لیے کہ بظاہر ایمان حاصل ہو، مگر دل میں سچائی نہ ہو تو یہ منافقت ہے، اور زبان میں سچائی نہ ہو تو یہ کذب ہے، اور عمل میں سچائی نہ ہو تو یہ ریا ہے۔ یاد رکھو کہ قبولِ دینِ حق سب سے بڑا صدق ہے، لہٰذا سچ کی ضرورت ایمان، اعمال اور اقوال سب میں پڑتی ہے، حدیث پاک میں "يَتَحَرَّى" کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی مکمل سچ پر عمل کرنے کی فکر اور کوشش کرتا ہے تو اس صفت صدق کی برکت سے وہ صدیق بن جاتا ہے، وہ

اس وصف صدق کی برکت سے مقامِ صدیقیت حاصل کرلیتا ہے جو نبوت کے بعد ولایت کا سب سے اونچا درجہ ہے، وہ صدق کی برکت سے اس درجہ کے اجر وثواب اور حسن خاتمہ کا حقدار بن جاتا ہے۔

سچ نجات کا ذریعہ ہے:

اور بالآخر یہی صدق اس کی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے؛ اسی لیے تو قرآنِ کریم نے سچائی کو مدارِ نجات قرار دیا:

﴿قَالَ اللّٰهُ هٰـذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًاط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُo﴾

(المائدة: ۱۱۹)

''یہ (قیامت کا) وہ دن ہے کہ راست بازوں اور سچوں کو ان کا صدق نفع دے گا، ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، اور یہی تو بڑی کامیابی ہے۔''

بہر حال کہ صدق کلیدِ نجاتِ دارین ہے، اور صدق کے حصول کے لیے صادقین وصدیقین وصالحین کی صحبت امر لابدی اور ضروری ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبة: ۱۱۹)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو۔'' سچے لوگوں کے دوست بن جاؤ، آیت شریفہ میں عامۃ المسلمین کو دو ہدایتیں دی گئی ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت اختیار کرنا۔ (۲) صالحین اور صادقین کی صحبت اختیار کرنا۔ صادق اسے کہتے ہیں جس کا ظاہر وباطن یکساں ہو، اور وہ قول وعمل کا سچا اور قول وقرار کا پکا ہو، اور جو صادق ہے وہی صالح بھی ہے، جو صادق اور سچا نہ ہو وہ صالح اور نیک ہو ہی نہیں سکتا، سچائی ایک مخلص

مومن کا شعار اور پہچان ہے، جب کہ جھوٹ منافق کی علامت اور پہچان ہے، سچائی ایک شریف ترین صفت اور اعلیٰ درجہ کی ایمانی، اخلاقی اور انسانی خصلت ہے جو سچے کو اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے ہاں معزز اور قابل اعتماد بنا دیتی ہے۔

حضرت یوسف ابن اسباطؒ فرماتے ہیں کہ ”سچ بولنے والے کو تین خصلتیں عطا کی جاتی ہیں: (۱) ”اَلْحَلَاوَةُ“ زبان کی مٹھاس۔ (۲) ”وَالْمَلَاحَةُ“ چہرے کی کشش۔ (۳) ”وَالْمَهَابَةُ“ قدرتی رعب اور ہیبت۔ (البیھقی فی شعب الإیمان: ٤/ ٢٢٣، از: رسالہ مظاہر العلوم/ ص: ۹/ بابت: مئی/ ۲۰۰۸ء)

سچائی اختیار کرنے والے کو چھوٹے، بڑے، اپنے، پرائے، نیک اور بد کے مابین ایک خاص مقام نصیب ہوتا ہے، اس لیے قرآن وحدیث میں ہمیشہ صدق کو اختیار کرنے اور جھوٹ سے مکمل اجتناب کرنے کا حکم فرمایا گیا۔

جھوٹ کے نقصانات:

ارشادِ نبوی ہے:

”وَإِيَّاكُمْ وَالْكِذْبَ، فَإِنَّ الْكِذْبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ، وَإِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكِذْبَ، حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا“.

لوگو! ہمیشہ کذب بیانی، دروغ گوئی اور جھوٹ سے مکمل پرہیز کرو؛ کیوں کہ وہ ہلاکت و بربادی کا راستہ ہے، اس میں نظر آنے والا نفع دراصل انسانی عقل ونظر کا دھوکہ ہے، کہ وہ وقتی اور عارضی نفع کو حقیقی اور اصلی نفع سمجھ بیٹھا، ورنہ سچ سچ ہے اور جھوٹ جھوٹ ہے، جھوٹ سے نیکی کی توفیق سلب کر لی جاتی ہے اور بدی کا دروازہ کھلتا ہے، جھوٹ گناہ کی جڑ ہے جس کے نتیجہ میں بسا اوقات ایک جھوٹ کئی گناہوں کا سبب بن جاتا ہے، اور اس کے بعد جب ایک مرتبہ کوئی شخص کذب بیانی کی وجہ سے لوگوں میں جھوٹا مشہور ہو جاتا ہے تو ایک

طرف اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق ہو کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نظر رحمت سے گر جاتا ہے، اور دوسری طرف وہ لوگوں کی نگاہ سے بھی گر جاتا ہے، اس کا اعتماد لوگوں میں مجروح ہو جاتا ہے، لوگ نہ اس کے بولنے کا اعتبار کرتے ہیں نہ رونے کا؛ کیوں کہ جھوٹ وہ زہر ہے جو انسان کی شخصیت کو مجروح کر دیتا ہے۔ دانائے رومؒ فرماتے ہیں:

گفتہ است: "الکِذْبُ رَیْبٌ فِیْ القُلُوْبِ"

نیز الصدق طمانین وطروب

فرمایا کہ جھوٹ دلوں میں شک پیدا کرنے والا ہے، جب کہ سچ اطمینان اور خوشی پیدا کرتا ہے۔ جس طرح ایامِ حیض کے درمیان کا طہر بھی حیض سمجھا جاتا ہے اسی طرح جھوٹے آدمی کا سچ بھی جھوٹ سمجھا جاتا ہے۔

یاد رکھئے! جھوٹ اسلام کی نظر میں وہ غیر معمولی بدترین اور سنگین ترین جرم ہے جو کم از کم ایک سچے مسلمان کا کام نہیں۔

جھوٹ مومن کامل کے شایانِ شان نہیں:

اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ رحمت عالم ﷺ سے ایک موقع پر یہ عجیب وغریب سوال کیا گیا کہ "أَیَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا؟" کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟ قَالَ: "نَعَمْ" فرمایا: ہونا تو نہیں چاہیے، مگر فطری کمزوری کے باعث یہ خصلت بد اس میں ہوسکتی ہے، دوسرا سوال کیا گیا: "أَیَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ بَخِیْلًا ؟" کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: جی ہاں، یہ بری بات بھی ایک مومن میں مال کی حرص کی وجہ سے ہوسکتی ہے، اس کے بعد عرض کیا گیا: "أَیَکُوْنُ الْمُؤْمِنُ کَذَّابًا ؟" کیا ایک مومن کذّاب یعنی بہت زیادہ جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایا: نہیں۔

(رواه مالك والبيهقى فى شعب الإيمان مرسلًا، مشكوٰة/ ص: ٤١٤)

ایمان جھوٹ کو برداشت نہیں کرسکتا، مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ بیباکانہ جھوٹ کی عادت جمع ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا ایک سچے مومن کے شایانِ شان بالکل نہیں کہ وہ

جھوٹا ہو، ایک زمانہ وہ تھا جس میں سچ ہی مسلمان کی پہچان تھی، اور جب کبھی کوئی مسلمان جھوٹ بول دیتا تو غیر مسلم کہتے: ''توبہ توبہ، تو مسلمان ہوکر جھوٹ بولتا ہے۔'' ظاہر ہے کہ جس کا اللہ تعالیٰ پر کامل یقین ہو وہ کیوں کر جھوٹ بول سکتا ہے۔

اس لیے کہ عموماً جھوٹ دو وجہوں سے بولا جاتا ہے: (۱) جلب منفعت یعنی حصولِ نفع کے خاطر۔ (۲) دفع مضرت یعنی نقصان سے بچنے کے لیے۔ اور یہ بات طے ہے کہ مقدر میں لکھے ہوئے نقصان سے کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا اور نفع کو کوئی روک نہیں سکتا، اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی اگر کوئی جھوٹ بولتا ہے تو یہ بلا وجہ ہوا، جو عقلاً وشرعاً غلط ہے، اسی لیے امام زہریؒ نے ایک موقع پر یہ عجیب بات ارشاد فرمائی کہ

''وَاللّٰهِ! لَوْ نَادٰى مُنَادٍ مِنَ السَّمَآءِ: '' أَنَّ اللّٰهَ أَحَلَّ الْكِذْبَ، مَا كَذَبْتُ''.

(فتح الباری: ۳۳۷/۷، از: کتابوں کی درسگاہ میں ص: ۸۲)

اللہ کی قسم! اگر کوئی پکارنے والا آسمان سے پکارے کہ ''حق تعالیٰ نے (نعوذ باللہ من ذالک) جھوٹ حلال کردیا، تب بھی میں جھوٹ بولنا پسند نہیں کرسکتا۔'' واقعہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جھوٹ کی جو مذمت آئی ہے وہ اتنی سخت ہے کہ ان کے علم میں آنے کے بعد ایک سچے مسلمان کا جھوٹ بولنا ناممکن سی بات ہو جاتی ہے، اور ایک سچے پکے مسلمان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ بے دریغ جھوٹ بولے۔

ایک حیرت انگیز واقعہ:

داعیٔ اسلام حضرت مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: ''اگر ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو بحیثیت معجزہ پڑھنے، سننے اور سمجھنے کے بجائے بحیثیت اسوہ پڑھیں اور سمجھیں تو یہ سچائی اور صدق جو آپ ﷺ کی قطعی ویقینی پہچان تھی وہ ہماری بھی پہچان بن جائے، اور کسی سچے متبع سنت کے لیے جھوٹ بولنا تو درکنار اس کا تصور بھی ناممکن تھا کہ مسلمان جھوٹ بول سکتا ہے، بہت زمانہ نہیں گذرا، ماضی قریب کا ایک حیرت انگیز واقعہ

ہے کہ پھلت والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت قاضی یوسف ناصحیؒ جو بادشاہ سکندر لودھی کے استاذ اور شیخ تھے، ایک مرتبہ کچھ مسلمان اکٹھا ہوکر قاضی صاحب کے پاس پہنچے اور خود کو مظلوم ظاہر کرکے غیر مسلموں کے مظالم کو خوب بڑھا چڑھا کران کی شکایت کی، یہ بھی بتایا کہ کاشت کی جن زمینوں پر ہمارا گذر بسر تھا وہ زمینیں بھی ظالم ہم سے گٹھریوں میں باندھ کر لے گئے! قاضی صاحب ان کی گفتگو سن کر بہت متاثر ہوئے، فوراً ایک خط لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا، جس میں قاضی صاحب نے سارے حالات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا کہ ''افسوس! ظالم ان کی کھیتی کی زمینیں بھی گٹھریوں میں باندھ کر لے گئے، جس سے ان کے بچوں تک پر فاقوں کی نوبت آگئی، آپ بادشاہ ہیں، آپ کی ذمہ داری ہے کہ علاقہ کے ذمہ دار کو حکم دے کر معاملہ کی تحقیق کرکے مظلوموں کو ان کا حق دلوایا جائے۔'' بادشاہ کے پاس خط پہنچا تو اس نے ادب سے اپنے شیخ کے نامہ کو آنکھوں سے لگایا، جب کھول کر پڑھا تو اسے ہنسی آگئی، جواباً عرض کیا کہ حضرت! تعمیل حکم میں فوراً علاقہ کے ذمہ دار کو معاملہ کی تحقیق اور مظلوم کو اس کا حق دلوانے کا حکم جاری کردیا، مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ عالم اور فقیہ ہوکر بھی یہ بات کیوں نہ سمجھ سکے کہ زمین بھی کوئی باندھ کر لے جانے کی چیز ہے؟ آخر یہ بات کس طرح سچ ہوسکتی ہے؟

سکندر کا جواب جب حضرت تک پہنچا تو وہ آب دیدہ ہوگئے، پھر فرمایا کہ ''یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ کھیت اور زمین باندھ کر نہیں لے جائی جاسکتی، مگر بات یہ ہے کہ میرے لیے یہ یقین کرلینا تو آسان ہے کہ زمین بھی باندھ کر لے جائی جاسکتی ہے، اس کے مقابلہ میں کہ مسلمان جھوٹ بھی بول سکتا ہے، کہنے والے مسلمان تھے، لہٰذا میں کیوں کر یہ مان لوں کہ مسلمان بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔؟ (از: رسالہ ارمغان/ص:٦/ بابت مئی ۲۰۱۰ء)

ہزار خوف ہو، مگر زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندر کا طریق

ضرورت کے وقت توریہ کی اجازت ہے:

افسوس کہ نبیٔ کریم ﷺ سے دعوائے محبت کے باوجود سچائی تو ہماری کیا پہچان بنتی، اس کے برعکس جھوٹ ہماری پہچان بنتی جاری ہے، آج جھوٹ کی برائی خود مسلمانوں کے ذہنوں سے بھی نکلتی جارہی ہے، اگرچہ بعض مواقع میں ضرورتاً جھوٹ کی بشکل توریہ گنجائش ہے؛ کیوں کہ جھوٹ کی حرمت اس لیے ہے کہ عموماً اس سے کسی نہ کسی کا نقصان ہوتا ہے، گویا امام غزالیؒ کی زبان میں جھوٹ کی حرمت وممانعت لعینہٖ نہیں بلکہ لغیرہٖ ہے، یہی وجہ ہے کہ جہاں جھوٹ سے کوئی نیک اور صحیح مقصد متعلق ہو تو وہاں اس کی اجازت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''(۱) اصلاح بین الناس کی غرض سے، (۲) زوجین (میاں بیوی) کا ایک دوسرے کو خوش کرنے کی غرض سے (مثلاً یہ کہ بیوی بن سنور کر شوہر سے اپنے متعلق پوچھے کہ میں کیسی لگ رہی ہوں؟ یا کھانا بنانے کے بعد پوچھے کہ کیسا بنا ہے؟ تو واقعہ کے خلاف شوہر نے پسندیدگی کا اظہار کیا، اور مقصد یہ تھا کہ اس سے آپس میں محبت بڑھے گی، تو یہ جائز ہے) جب کہ اس سے کسی کی حق تلفی نہ ہوتی ہو، (۳) جہاد بالکفار کے موقع پر، بشرطیکہ اس سے عہد شکنی نہ ہوتی ہو۔ (مشکوٰۃ ص: ۴۲۸/فصل ثانی)

تو شرعاً ان مواقع پر جھوٹ کی گنجائش ہے، مگر ان مواقع میں بھی توریہ کرنا اولیٰ ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ خلافِ واقعہ امر کا اظہار مصلحت کا تقاضا ہو تب بھی صریح جھوٹ بولنے کے بجائے کنایہ سے کام لینا اولیٰ وافضل ہے، جسے توریہ کہتے ہیں، ضرورت کے مواقع پر توریہ کرنے کی اجازت ہے۔

آج سماج میں جھوٹ کا گناہ عام ہوگیا:

مگر اب لوگ ضرورتاً نہیں، عادتاً جھوٹ بولتے ہیں، اور جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا سمجھا جانے لگا، کیوں کہ بدقسمتی سے اس وقت سماج میں یہ گناہ اتنا عام ہوگیا ہے کہ شاذ

ونادرہی عام آدمی کا دامن اس سے پاک اور محفوظ ہو، فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں: ''صحافت' جس کا کام واقعات کو کسی کمی بیشی کے بغیر عام لوگوں تک پہنچانا ہے، اور جسے بہر حال ناطرفدار اور حق کا ترجمان ہونا چاہیے وہ بھی غیر معمولی خبریں شائع کرنے بلکہ خبریں وضع کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کرتے، اربابِ سیاست کا تو کہنا ہی کیا؟ جھوٹ بولنا ان کے نزدیک عیب نہیں، ہنر ہے، اور ہتھیلیوں میں جنت دکھانا سیاست کا گویا اوجِ کمال ہے، جھوٹے وعدوں اور دعووں کا اگر کوئی مقابلہ ہو تو شاید ہی کوئی طبقہ اہل سیاست پر بازی لے جاسکے، یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کا احساس اور عنداللہ حساب و کتاب کا یقین کمزور پڑ گیا ہے، اور انسان نے اس دنیا سے آگے دیکھنا اور سوچنا ہی چھوڑ دیا، ظاہر ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے خوف اور جواب دہی کے احساس سے عاری ہوں تو کوئی چیز ان کو جرم سے نہیں روک سکتی، اور جو لوگ اپنے اللہ کے حضور پیشی اور جواب دہی کا احساس رکھتے ہوں ان کے لیے معمولی تنبیہ بھی تازیانۂ عبرت بن سکتی ہے۔'' (از شمع فروزاں/ص:۱۰۱)

جھوٹ کی بدبو اور ''اپریل فول'' کی مذمت:

بہر کیف جھوٹ سے بچنا نہایت ضروری ہے، ورنہ بچنا نہایت نادانی ہے؛ کیوں کہ جھوٹ سے غیر معمولی نقصان ہوتا ہے، مثلاً اس سے اکتسابِ حسنات اور اجتنابِ سیئات کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، نیز جھوٹ بولنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت نازل ہوتی ہے، اور لوگوں کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

"إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَكُ مِيلاً مِنْ نَتْنِ مَا جَآءَ بِهٖ". (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ٤١٣)

''جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو اس جھوٹ کی بدبو سے (محافظ) فرشتہ ایک میل دور بھاگتا ہے۔''

شراحِ حدیث فرماتے ہیں کہ ہر گناہ کی ایک بدبو ہوتی ہے، جس کو اللہ تعالیٰ کی معصوم، پاکیزہ، لطیف اور غیر مرئی مخلوق یعنی فرشتے جن کو حق تعالیٰ نے ہماری حفاظت اور راحت رسانی کے لیے مقرر فرمایا ہے وہ محسوس کرتے ہیں، اور گناہوں کی بدبو سے انہیں نہایت اذیت اور تکلیف ہوتی ہے، خصوصاً جھوٹ کی بدبو تو بہت ہی اذیت ناک ہوتی ہے، اسی لیے بطورِ خاص اس کا ذکر کیا۔ یہ حق تعالیٰ کی ستاری ہے کہ گناہوں کی بدبو کا ادراک اور احساس عام انسانوں کو دنیا میں نہیں ہونے دیا، ورنہ تو ہر انسان خود اپنی ہی بدبو سے پریشان بھی ہوتا اور رسوا بھی ہو جاتا، اللہ تعالیٰ کی اس صفت ستاری و رحمت الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم جھوٹ اور ہر قسم کے گناہوں سے بچیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھیں کہ جھوٹ صرف وہی نہیں ہے جو جان بوجھ کر غلط اور خلافِ حقیقت بولا جائے، بلکہ جھوٹ وہ بھی ہے کہ آدمی بلا تکلف ہر سنی سنائی بات کا چرچا کرنے لگے، خواہ اس کے صحیح یا غلط ہونے کا اسے کوئی علم نہ ہو، حدیث میں اس کو یوں فرمایا کہ "کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا أَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص:۲۸/ عن أبی هریرۃ)

اسی طرح مذاق میں جھوٹ بولنا، جیسا کہ یکم اپریل میں کیا جاتا ہے، یہ بھی حرام ہے، اور کئی بدترین گناہوں کا مجموعہ ہے، مثلاً: (۱) "اپریل فول" منانا گمراہ اور بے دین لوگوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا ہے۔ (۲) دھوکہ دینا۔ (۳) اذیت دینا۔ (۴) جان بوجھ کر بلا وجہ صریح جھوٹ بولنا۔ (۵) اس جھوٹ پر خوش ہونا۔ (۶) اس گناہ کو حلال اور جائز سمجھنا وغیرہ کئی گناہ اس میں جمع ہو جاتے ہیں، لہٰذا ایک سچے مسلمان سے یہ ممکن ہی نہیں کہ مغرب کی اندھی تقلید میں تہذیب جدید کے عنوان پر اس رسم بد کو اختیار کرے، اس لیے کہ یہ ملعون و مغضوب لوگوں کا طریقہ ہے۔

حق تعالیٰ ہم سب کی جھوٹ سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

"اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ".

(۱۷)

غیبت کی حقیقت

اس کے احکامات اور نقصانات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "أَتَدۡرُوۡنَ مَا الۡغِيۡبَةُ ؟" قَالُوۡا: "اَللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ أَعۡلَمُ"، قَالَ: "ذِكۡرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكۡرَهُ"، قِيۡلَ: "أَ فَرَأَيۡتَ إِنۡ كَانَ فِيۡ أَخِيۡ مَا أَقُوۡلُ؟" قَالَ: "إِنۡ كَانَ فِيۡهِ مَا تَقُوۡلُ فَقَدِ اغۡتَبۡتَهٗ، وَإِنۡ لَمۡ يَكُنۡ فِيۡهِ مَا تَقُوۡلُ فَقَدۡ بَهَتَّهٗ". (رواه مسلم:۲/۴۲۱، مشكوٰة/ص: ۴۱۲/ باب حفظ اللسان والغيبة)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے (اپنے صحابہ سے) فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟'' حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کے رسول ہی کو بخوبی علم ہے'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا اپنے بھائی کا تذکرہ ایسی صفت کے ساتھ کرنا جو اس کو ناگوار ہو'' (تو یہی غیبت ہے) کسی نے عرض کیا کہ ''حضرت! اگر میں اپنے بھائی کی کوئی ایسی برائی ذکر کروں جو واقعۃً اس میں ہو'' (پھر بھی وہ غیبت ہے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''غیبت تب ہی ہوگی جب کہ وہ برائی اس میں موجود ہو، اور اگر اس میں وہ برائی موجود ہی نہیں (جو تم نے اس کی طرف منسوب کی)

تب تو یہ بہتان ہوا۔"

غیبت کی حقیقت:

انسان اسلام کی نظر میں دنیا کی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ محترم و معظم ہے، نیز اسلام کی نظر میں اپنی حرمت و عزت کی حفاظت ہر انسان کا بنیادی حق ہے، اس لیے عمومی حالات میں اسلام کسی ایسے قول و فعل کی قطعاً اجازت نہیں دیتا جس سے کسی بھی انسان کی کمزوریوں اور پوشیدہ عیبوں کی تشہیر ہو کر اس کی رسوائی اور بے عزتی ہو، چوں کہ غیبت سے ایک شخص کی رسوائی اور آبروریزی ہوتی ہے اور اس سے اس کو ناگواری اور دلی تکلیف پہنچتی ہے، جس کے نتائج بعض اوقات بڑے خطرناک اور دور رس نکلتے ہیں، اس وجہ سے اسلام میں اسے ایک بدترین و سنگین ترین جرم قرار دیا گیا۔ غیبت کیا ہے؟ اس کو حدیث مذکور میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع اور نپے تلے انداز میں واضح کیا فرمایا: "ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ" اپنے کسی بھائی کا تذکرہ (جو اگرچہ واقعی اور سچا ہو، مگر بلا کسی صحیح مقصد کے) اس انداز میں کرنا جو اسے ناگوارِ خاطر گذرے، یہ غیبت ہے۔" پھر اس کے عموم میں ہر ایسی بات اور برائی شامل ہے جس سے مذکور شخص کی عزت و حرمت میں فرق آتا ہو، خواہ وہ برائی دنیوی ہو یا دینی، اور جسمانی ہو یا اخلاقی، نیز اس کی موجودگی میں کی جائے یا غیر موجودگی میں، اور وہ برائی اس کی ذات میں ہو یا اہل و عیال میں، الغرض! جس قول و فعل اور برائی سے کسی کی بے عزتی ہوتی ہو (بلا کسی صحیح وجہ کے) اس کا اظہار کرنا غیبت میں داخل ہے، حدیث پاک میں غیبت کی جو تعریف "ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ" بیان فرمائی اس کے عموم سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور اسی کو علامہ آلوسیؒ روح المعانی میں نقل فرماتے ہیں:

"لَا فَرْقَ فِي الْغِيْبَةِ بَيْنَ أَنْ تَكُوْنَ فِي غَيْبَةِ الْمُغْتَابِ أَوْ بِحَضْرَتِهِ، هُوَ الْمُعْتَمَدُ". (روح المعانی: ۲۶/۱۵۸)

یعنی غیبت خواہ مغتاب (جس کی غیبت کی جائے اس) کی غیر موجودگی میں کی

جائے یا موجودگی میں، دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں، یہی قابل اعتماد بات ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جو سمجھا گیا ہے کہ غیبت صرف وہی ہے جو پیٹھ پیچھے کی جائے اور سامنے کسی کی توہین کریں تو وہ غیبت نہیں، محققین کی تحقیق کے مطابق یہ خیال ہی غلط ہے۔

کونسا تذکرہ غیبت ہے؟

البتہ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ غیبت کی وعید میں اپنے بھائی کا وہی تذکرہ شامل ہے جو اس کی ناگواری کا باعث ہو، جیسا کہ لفظِ ''بِمَا یَکْرَہُ'' سے واضح ہوتا ہے، لیکن جس تذکرہ سے ناگواری نہ ہو وہ غیبت نہیں۔ چناں چہ حضرت شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں کہ ''غیبت کی اس تعریف میں بنیادی اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کسی کا تذکرہ اس طرح کیا جائے جو اس کے لیے ناگواری کا موجب ہو، اگر اس بات کا یقین ہے کہ اس تذکرہ سے اسے ناگواری نہیں ہوگی تو وہ غیبت نہیں ہے، خواہ وہ اس کی کسی برائی ہی کا بیان ہو، لٰہذا کچھ دوست اگر آپس میں بے تکلف ہیں اور ان کے درمیان ہنسی مذاق اس طرح چلتا رہتا ہے کہ اس میں کسی شخص کی واقعی برائی کا بیان اسے ناگوار نہیں گذرتا، اور ایسی صورت میں وہ اپنے کسی غیر حاضر دوست کا تذکرہ اسی بے تکلفی کے ماحول میں کرتے ہیں اور اس میں اس کی کوئی برائی بھی بیان کرتے ہیں جس کے بارے میں غالب گمان ہوتا ہے کہ وہ اس غائبانہ تذکرہ کو ناگوار نہیں سمجھے گا، تو یہ غیبت نہیں ہے، لیکن اگر وہی بات اس دوستانہ ماحول سے ہٹ کر کسی ایسی جگہ کہی جاتی ہے جہاں وہ اس دوست کی خفت وتذلیل یا تحقیر کا موجب ہو تو ظاہر ہے کہ یہ بات اسے ناگوار ہوگی اور غیبت میں داخل ہو جائے گی، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں دوستوں کا مقصد اپنے دوست کی بدخواہی، یا تحقیر وتذلیل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ بے تکلفی کا اظہار ہوتا ہے، جو محبت ہی کا ایک شعبہ ہے، اس لیے ایسا تذکرہ نہ اس کے لیے مضر ہے نہ اس سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے، اور نہ اسے ناگوار ہوتا ہے، ہاں بعض لوگ دوستی میں بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں، اور اس قسم

کے بے تکلف ماحول میں بھی برائی سے اپنا تذکرہ انہیں ناگوار ہوتا ہے، وہاں ایسا تذکرہ پھر غیبت میں داخل ہوجائے گا۔'' (از ذکروفکر/ص:۲۰۲ تا ۲۰۳)

غیبت کی مذمت قرآن میں:

قرآن وحدیث میں جن اخلاقی وسماجی برائیوں کی نہایت شدت سے مذمت بیان کی گئی شاید غیبت ان میں سرفہرست ہے، قرآنِ کریم نے غیبت سے بچنے کا حکم کرتے ہوئے غیبت کرنے والے کو اپنے مردار بھائی کا گوشت کھانے کے مثل ہلاکت خیز گناہ قرار دیا:

﴿ وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًاط أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ﴾ (الحجرات:۱۲)

مطلب یہ ہے کہ تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، ہرگز نہیں، لہٰذا جیسے مردہ کھانے سے تمہیں نفرت ہے اسی طرح غیبت سے بھی نفرت کرو۔

صاحبو! اگر مردار بھائی کا مال کھانے والا ظالم ہے تو مردار بھائی کا گوشت کھانے (غیبت کرنے) والے کے متعلق کیا خیال ہے؟ ایسا آدمی تو بدرجہ اولیٰ بدترین ظالم ہے، جس کی ہلاکت یقینی ہے، قرآن نے ایک مقام پر غیبت کرنے والوں کی ہلاکت کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (الھمزہ:۱)

لفظ ''هُمَزَة'' اور ''لُمَزَة'' اگرچہ چند معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں، لیکن اکثر مفسرین نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ''هُمَزَة'' کے معنیٰ غیبت یعنی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کے عیوب کا تذکرہ کرنا ہے، اور ''لُمَزَة'' کے معنیٰ روبرو کسی کو طعنہ دینے اور برا کہنے کے ہیں، یہ دونوں ہی چیزیں (غیبت اور) سخت گناہ ہیں۔ (معارف القرآن:۸/۸۱۵)

غیبت کی وعیدیں قرآن وحدیث میں زیادہ ہیں، جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس گناہ کے اشتغال میں کوئی رکاوٹ سامنے نہیں ہوتی، جو شخص اس میں ملوث ہوتا ہے وہ اس میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، بخلاف روبرو کہنے کے، کہ وہاں دوسرا بھی مدافعت کے لیے تیار ہوتا ہے، نیز یہ اس لیے بھی بڑا ظلم ہے کہ اس میں مظلوم کو اس بات کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ اس پر کیا الزام لگایا جارہا ہے، کہ وہ اپنی صفائی پیش کرسکے۔

غیبت کی مذمت حدیث میں:

اس کے علاوہ احادیث طیبہ میں بھی بڑی سختی کے ساتھ غیبت کی شناعت ومذمت کو بیان فرمایا ہے، حتیٰ کہ اسے زنا سے سخت گناہ بتلا کر اس پر دردناک عذاب کی وعید سنائی، ملاحظہ فرمائیں، حدیث میں ہے کہ "اَلْغِیْبَۃُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا" غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت اور سنگین گناہ ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے حیرت سے سوال کیا: "حضور! یہ کیسے؟" آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا:

"إِنَّ الرَّجُلَ لَيَزْنِيْ فَيَتُوْبُ، فَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، وَفِيْ رِوَايَةٍ: "فَيَتُوْبُ، فَيَغْفِرُ اللّٰهُ لَهٗ" وَ إِنَّ صَاحِبَ الْغِيْبَةِ لَا يُغْفَرُ لَهٗ حَتّٰى يَغْفِرَهَا لَهٗ صَاحِبُهٗ، وَفِيْ رِوَايَةِ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "صَاحِبُ الزِّنَا يَتُوْبُ، وَصَاحِبُ الْغِيْبَةِ لَيْسَ لَهٗ تَوْبَةٌ". (رواہ البیھقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ/ص: ۴۱۵/ باب حفظ اللسان والغیبۃ والشتم/ الفصل الثالث)

یعنی ایک آدمی جب کبھی شہوت سے مغلوب ہوکر زنا کرلیتا ہے تو اس کے بعد شرمندہ ہوکر صرف سچی پکی توبہ اور معافی مانگ لینے سے حق تعالیٰ اس کی مغفرت کردیتے ہیں، مگر غیبت کرنے والے کو جب تک خود وہ شخص معاف نہ کردے جس کی اس نے غیبت کی ہے وہاں تک اس کی معافی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوگی؛ کیوں کہ زنا کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، اور غیبت کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور حق تعالیٰ کے یہاں حقوق اللہ سے زیادہ اہمیت حقوق العباد کی ہے، اپنے حقوق میں تو وہ فضل سے کام چلا لیتے ہیں، جب کہ بندوں

کے حقوق میں عدل کا معاملہ فرماتے ہیں، اس لیے جب زانی نادم ہوکر سچے دل سے معافی مانگتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے گناہ پر معافی کا قلم پھیر دیتے ہیں، برخلاف غیبت کے، چوں کہ اس کا تعلق بندے سے ہے، اس لیے جب تک خود وہ بندہ جس کی غیبت کی گئی ہے معاف نہ کرے، معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس اعتبار سے گویا غیبت زنا سے بھی اشد ہے۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے فرمایا کہ "اَلْغِیْبَۃُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا" (غیبت کا گناہ زنا سے بھی بڑھ کر ہے، اس) میں غیبت کے شدید تر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ زنا گناہِ باہی (شہوت سے صادر ہونے والا) ہے، اور غیبت گناہِ جاہی (تکبر سے صادر ہونے والا) ہے، زنا کے صدور کے بعد نفس میں عاجزی پیدا ہوتی ہے، کہ (ہائے) میں نے یہ خبیث اور گھناؤنا کام کیا (اس کے بعد عموماً بندہ کے دل پر خوفِ الٰہی طاری ہوتا ہے، اس کو اپنے کیے پر ندامت ہوتی ہے، جس کے نتیجہ میں اسے توبہ کی توفیق مل جاتی ہے اور وہ معافی مانگ کر اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا مستحق بن جاتا ہے) جب کہ غیبت میں مبتلا ہونے کے بعد آدمی کو ندامت تک نہیں ہوتی، (کیوں کہ وہ اس گناہ کو معمولی سمجھتا ہے، بلکہ بعض اوقات گناہ بھی نہیں سمجھتا، جس کی وجہ سے نہ اسے توبہ کی طرف توجہ ہوتی ہے اور نہ توفیق، لہٰذا وہ توبہ سے محروم رہتا ہے) اس بنا پر غیبت کو زنا سے بھی بدتر فرمایا گیا ہے۔" واللہ اعلم۔

غیبت سے ہلاکت:

جب یہ واضح ہو گیا کہ غیبت کا گناہ آدم خوری والے گناہ کے مانند اور زناکاری سے بھی بدتر ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا ارتکاب ہلاکت و بربادی کی گھنٹی ہے، جیسا کہ مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا:

گوشتہائے بندگانِ حق خوری
غیبت ایشاں کنی، کیفر بری

’’تو اللہ تعالیٰ کے بندوں کا گوشت کھاتا ہے، یعنی ان کی غیبت کرتا ہے، اور انتقام کے نیچے آتا ہے، (پھر تیری ہلاکت میں کیا تردد؟) چناں چہ جو لوگ غیبت کے مرتکب توبہ کیے بغیر مر گئے ان کے لیے جہنم میں کیسا ہلاکت خیز عذاب ہے اس کو حضرت شفی بن ماتع الاصبحی رضی اللہ عنہ مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’چار قسم کے جہنمی اہل جہنم کے لیے اذیت پر اذیت کا باعث ہوں گے، جو ’’حَمِیم‘‘ یعنی کھولتے ہوئے جہنم کے پانی اور ’’جَحِیم‘‘ یعنی جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کے درمیان دوڑتے ہوں گے، اس ہلاکت سے موت کو بار بار پکارتے ہوں گے، تو انہیں دیکھ کر اہل جہنم آپس میں کہیں گے کہ ان پر کیا مصیبت آئی کہ یہ اپنے ساتھ ہمیں بھی مصیبت در مصیبت مبتلا کر رہے ہیں؟ پھر ان چاروں میں سے ایک تو وہ ہوگا جو بیڑیوں میں بندھا ہوگا اور اس پر انگاروں کا صندوق رکھا گیا ہوگا، دوسرا وہ شخص ہوگا جو خود اپنی آنتیں گھسیٹتا ہوگا، تیسرا وہ آدمی ہوگا جس کے منہ سے پیپ اور خون بہہ رہا ہوگا، اور چوتھا وہ بدنصیب ہوگا جو خود اپنا گوشت کھاتا ہوگا، پس صندوق والے سے پوچھا جائے گا کہ اَبْعَدُ (یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور) کا کیا ماجرا ہے؟ جس نے ہمیں مصیبت در مصیبت میں ڈال رکھا ہے، وہ جواب دے گا کہ ’’یہ بدنصیب اس حال میں مرا کہ اس کی گردن پر لوگوں کے مالی حقوق تھے۔‘‘ (جو اس نے دنیا میں ادا نہیں کیے تھے، آج یہ اسی کی سزا میں مبتلا ہے) پھر آنتیں کھینچنے والے سے اسی طرح کا سوال کیا جائے گا، وہ جواب دے گا کہ ’’یہ محروم القسمت اس کی بالکل پروا نہیں کرتا تھا کہ پیشاب اس کے بدن پر کہاں لگ رہا ہے۔‘‘ (یعنی پاکی ناپاکی کا کچھ خیال نہ کرتا تھا، اسی کے سبب یہ اس عذاب میں مبتلا ہوا) اس کے بعد منہ سے پیپ اور خون نکلنے والے سے اہل جہنم اسی طرح کا سوال کریں گے، تو وہ جواب میں کہے گا: ’’یہ ازلی بدبخت جب کسی غلط بات کو دیکھتا تو اس سے اس طرح لطف اندوز ہوتا تھا جیسے بدکاری سے لطف حاصل کیا جاتا ہے۔‘‘ یعنی بدی اور بدکاری سے روکنے کی کوئی فکر نہ کرتا، نہ اسے برا سمجھتا، لہٰذا یہ اسی وجہ سے سزا میں مبتلا ہوا) اور آخر میں خود اپنا گوشت کھانے والے سے صورتِ حال معلوم کی جائے گی، تو وہ کہے گا کہ ’’یہ بدبخت

"كَانَ يَأْكُلُ لُحُومَ النَّاسِ بِالْغِيبَةِ، وَيَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ". (رواه ابن أبي الدنيا والطبراني/الترغيب والترهيب:۳/۵۰۷، باب ماجاء في ذم الغيبة)

دنیا میں غیبت کر کے لوگوں کا گوشت کھایا کرتا تھا، اور چغلی (جو غیبت کا نہایت ہی اعلیٰ درجہ ہے) کھانے میں دلچسپی لیتا تھا۔" (اللہ سے شرم کیجئے/ص:۷۰)

اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سفر معراج کے دوران میرا گذر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ناخن (جہنم کی آگ کی وجہ سے) سرخ تانبے کے سے تھے، جن سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ نوچ کر زخمی کر رہے تھے، تو میں نے یہ عبرت ناک منظر دیکھ کر جبرئیل سے پوچھا: "یہ کون ہیں جو ایسے سخت عذاب میں مبتلا ہیں؟" فرمایا:

"هٰؤُلَاءِ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ لُحُومَ النَّاسِ وَيَقَعُونَ فِي أَعْرَاضِهِمْ". (رواه أبو داود:۲/۳۲۱، مشكوٰة/ص: ۴۲۹، باب ما يُنهىٰ عنه من التهاجُرِ والتقاطع واتباع العوراتِ)

"یہ وہ لوگ ہیں جو زندگی میں لوگوں کا گوشت کھایا کرتے تھے، یعنی (غیبتیں کیا کرتے تھے) اور ان کی آبروریزی کیا کرتے تھے۔" غیبت کرنے والوں کے لیے عالم برزخ اور دوزخ میں خاص طور سے یہ سزا اس لیے تجویز کی گئی کہ دنیوی زندگی میں ان مجرمین نے غیبت کر کے لوگوں کا گوشت کھایا اور ان کی عزت آبرو کو مجروح کیا، لہٰذا ان کی یہی سزا ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سینوں اور چہروں کو زخمی کریں اور اپنا گوشت کھائیں۔ (العیاذ باللہ العظیم)

وہ مواقع جو غیبت کی مذمت سے مستثنیٰ ہیں:

لیکن یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ غیبت کی مذمت وحرمت اسی وقت ہے جب کہ اس کا کوئی جائز مقصد نہ ہو، اور اگر غیبت کسی معقول وجہ اور مقصد سے کی جائے، مثلاً اصلاح یا لوگوں کو شر سے بچانے کے لیے کسی گروہ یا شخص کی واقعی برائی دوسروں کے سامنے

بیان کرنا ضروری ہو جائے، یا اس کے علاوہ ایسے ہی کسی شرعی، اخلاقی یا معاشرتی مقصد کا حصول اس پر موقوف ہو، تو اس وقت کسی شخص یا گروہ کی برائی بیان کرنا اس غیبت میں داخل نہیں جو شرعاً حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اور جس کی بڑی شدت سے مذمت اور وعید آئی ہے۔ چناں چہ علامہ شامیؒ نے ایسے گیارہ مواقع بیان فرمائے ہیں جن میں کسی کی برائی بیان کرنا غیبت کی مذمت کے دائرہ میں داخل نہیں ہے:

(۱) بطورِ حسرت وافسوس کسی کی برائی بیان کرنا۔ (۲) غیر معین طور پر عام اہلِ بستی کے عیب بیان کرنا۔ (۳) برسر عام بری حرکتیں کرنے والے کی حرکتیں بیان کرنا۔ (۴) لوگوں کو متنبہ کرنے کے لیے کسی بد عقیدہ شخص کی بدعقیدگی کا اظہار کرنا۔ (۵) حاکم کے سامنے ظلم کے مداوے کے لیے ظالم کا ظلم بیان کرنا۔ (۶) جو شخص برائی روکنے پر قدرت رکھتا ہو اس کے سامنے برائی کرنے والے کے عیوب ظاہر کرنا۔ (مثلاً باپ کے سامنے بیٹے یا آقا کے سامنے خادم یا استاذ کے سامنے شاگرد کی برائی کرنا) (۷) رشتہ داری (یا معاملہ) قائم کرنے کے متعلق مشورہ دیتے وقت متعلقہ شخص کے عیوب کا اظہار کر دینا۔ (۸) فتویٰ لیتے وقت صحیح صورتِ حال مفتی کو بتا دینا۔ (۹) غلام وغیرہ خریدنے والے سے غلام کا عیب بیان کرنا۔ (۱۰) اگر کوئی شخص کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جس میں اس کے کسی نقص وعیب کا اظہار ہو، لیکن وہی لقب اس کے لیے مشہور ہو، جیسے ''بہرا'' وغیرہ، تو محض تعارف کرانے کے لیے کسی کو ''بہرا، نابینا، یا لنگڑا'' وغیرہ کہنا۔ (۱۱) مجروح اور غیر معتبر رواۃِ حدیث اور مصنفین کے حالات کا بیان، یہ سب صورتیں غیبت میں داخل نہیں، بشرطیکہ ان میں نیت اصلاح کی ہو اور تحقیر مسلم کا عنصر ہر گز شامل نہ ہو۔ (شامی ص:۹/ ۵۸۶، فصل فی البیع/ باب الاستبراء وغیرہ/ کتاب الحظر والإباحۃ) (مستفاد از: اللہ سے شرم کیجیے/ ص:۶۶)

غیبت کے اسباب:

یاد رکھو! قرآن وحدیث میں جس غیبت کی مذمت آئی اور جسے گناہِ کبیرہ اور حرام

قرار دیا گیا ہے اس پر جب انصاف کے ساتھ غور کیا جائے تو اس کی تہہ میں کوئی نہ کوئی ایسا سبب ضرور ملے گا جو کسی نہ کسی نفسیاتی روگ اور بیماری کی نشاندہی کررہا ہوگا، بعض اوقات اس کا سبب ''کبر'' ہوتا ہے، بعض لوگ دوسرے کا عیب بیان کر کے اسے ناقص اور اپنے آپ کو بڑا باور کرنا چاہتے ہیں، اس شوق میں کسی کی برائی کی جاتی ہے، یا یہ خوف ہوتا ہے کہ شاید ہماری جیسی تعظیم کہیں اس کی نہ ہونے لگے، اس لیے عیب بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں، کبھی اس کا سبب ''حسد'' ہوتا ہے، جب کسی شخص کو آگے بڑھتا دیکھتے ہیں یا لوگوں میں اس کی تعریف سنتے ہیں، تو رگِ حسد جوش مارتی ہے اور دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ترقی اور تعریف ختم ہو جائے، تو اور کچھ تو بن نہیں سکتا، لہٰذا اس کے عیب بیان کرنا شروع کرتے ہیں اور اس طرح اپنے جذبۂ حسد کی تسکین کی جاتی ہے، کبھی اس کا سبب ''غصہ'' ہوتا ہے، کسی بات سے ناراض اور غصہ ہو کر دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے عیوب اور برائیاں بیان کی جاتی ہیں، کبھی اس کا سبب دوستوں کی مجلس ہوتی ہے، جس میں اوروں کی دیکھا دیکھی اور ہاں میں ہاں ملانے یا ہنسی مذاق اور دل لگی کے لیے کسی کی برائی بیان کی جاتی ہے۔ غرض غیبت کے اس قسم کے مختلف اسباب ہیں جو درحقیقت کسی نہ کسی باطنی خبث اور نفسیاتی بیماری کی نشاندہی کرتے ہیں۔

آج بدقسمتی سے غیبت کی وبا شعوری اور غیر شعوری طور پر ہمارے موجودہ معاشرہ میں اتنی عام ہوگئی کہ چوراہوں اور چائے کے ہوٹلوں سے لے کر اچھے اچھے لوگوں کی بڑی اہم مجلسوں تک پھیلی ہوئی ہے، بعض جگہوں پر تو مجلس کی گرمی غیبت ہی کے دم سے ہوتی ہے، اب یہ مرض اتنا عام ہوگیا کہ اس کی برائی اور گناہ ہونے کا احساس تک دل سے نکلتا جارہا ہے، یہ صورتِ حال افسوس ناک ہی نہیں، بلکہ اندیشناک بھی ہے، ضرورت ہے کہ اس کی طرف توجہ دی جائے اور اس کے خاتمہ کے لیے فکر کی جائے، اس سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

غیبت سے بچنے کی تدابیر:

چوں کہ غیبت اپنے اختیار سے ہوتی ہے، لہٰذا غیبت سے بچنا اختیار میں ضرور ہے، البتہ اس سے بچنے کے لیے ہمیت کر کے اس کی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جن میں سب سے پہلی تدبیر دعا ہے، اللہ تعالیٰ سے غیبت سے حفاظت کی دعا سچے دل سے کرے کہ یا اللہ! اپنی رحمت سے آپ ہمیں غیبت کرنے، سننے اور اس کے مواقع ومجالس سے بھی بچا لیں۔

اسی کے ساتھ دوسری تدبیر غیبت کی مذمت میں جو وعیدیں ہیں ان کا استحضار ہے، قرآن وحدیث میں غیبت کی جو سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان کو پڑھ، سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اس لیے جب آدمی غیبت کے نقصان اور اس کے خسران کو سوچے گا کہ اس کے نتیجہ میں دونوں جہاں میں ہلاکت آتی ہے، محنت کی کمائی اور نیکی مفت میں چلی جاتی ہیں، اچھے اعمال غیبت کرنے والوں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں، (جیسا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص اپنے نامۂ اعمال کو دیکھے گا تو اسے ایسی بہت سی نیکیاں نظر آئیں گی جو اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کی تھیں، وہ حیرت سے بارگاہِ الٰہی میں گویا ہوگا کہ ''یا اللہ! ان نیکیوں کو تو میں نے کبھی نہیں کیا تھا، (پھر یہ میرے نامۂ اعمال میں کیسے؟) ارشاد ہوگا: ''لوگوں نے تیری غیبت کی تھی، جس کے نتیجہ میں یہ نیکیاں درج کر دی گئیں، دوسرا شخص اپنے نامۂ اعمال میں بہت سی نیکیاں موجود نہ پا کر عرض کرے گا، تو ارشاد ہوگا: ''تو نے دنیا میں لوگوں کی غیبت کی تھی، آج اس کی سزا میں ان نیکیوں کو تیرے نامۂ اعمال سے صاف کر دیا گیا۔'' (شعب الایمان: ۵/ ۲۹۹)

ان باتوں کے استحضار کے بعد غیبت سے بچنا آسان ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

تیسری تدبیر یہ ہے کہ جب کبھی کسی کی غیبت کا داعیہ اور تقاضا دل میں پیدا ہو تو اس وقت اس کے مقتضا پر عمل نہ کرے، بلکہ اپنے عیوب پر نظر کرے، جس کو اپنے عیوب کی فکر ہو

وہ دوسروں کے عیوب کہاں تلاش کرے گا؟ جیسے جو شخص خود بیماری کی سخت تکلیف میں مبتلا ہو وہ دوسروں کی بیماری کی کہاں پروا کرتا ہے؟ اسی طرح جب انسان اپنی اصلاح کی فکر میں لگ جاتا ہے کہ مجھ میں فلاں فلاں خرابی و برائی ہے، پھر اسے عموماً دوسروں کی غیبت کی فرصت نہیں ہوتی۔

چوتھی تدبیر یہ ہے کہ کسی کا تذکرہ ہی نہ کرے، نہ اچھائی سے نہ برائی سے؛ کیوں کہ شیطان بڑا چالاک ہے، اچھائی سے تذکرہ شروع کرا کر برائی پر ختم کراتا ہے، اور یوں غیبت کے گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے، اس لیے اس سے بچنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ دوسرے کا ذکر ہی نہ کرے۔ ہمارے اسلاف کا یہی حال تھا۔

چناں چہ منقول ہے کہ حضرت سفیان بن حسینؒ ایک مرتبہ قاضی ایاس بن معاویہؒ کی مجلس میں بیٹھ کر کسی کا تذکرہ کرنے لگے، جو غیبت تک جا پہنچا، تو قاضی صاحب نے بڑی خوبی سے اس پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا آپ نے رومیوں کے ساتھ جہاد کیا؟'' کہنے لگے: ''نہیں'' دریافت کیا: ''سندھ اور ہند کے جہاد میں کبھی شرکت کی؟'' کہا: ''نہیں'' قاضی صاحب نے فرمایا: ''عجیب بات ہے کہ روم اور سندھ وغیرہ کے کفار تو آپ کی تلوار سے محفوظ رہے، لیکن ایک بے چارہ مسلمان بھائی آپ کی (زبان اور) غیبت سے نہ بچ سکا۔'' آپ نے زبان کی تلوار اس پر چلا دی، ''دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ'' والا معاملہ، حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں کہ ''قاضی صاحبؒ کے اس جملہ کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اس کے بعد زندگی بھر پھر میں نے کسی کی غیبت نہیں کی۔'' (البدایہ والنہایہ: ۹/ ۳۳۶، از: کتابوں کی درسگاہ میں /ص: ۳۹)

غیبت کی معافی کا طریقہ:

تاہم اگر ہم سے جانے انجانے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی کی غیبت ہو جائے، تو اب اس کا تدارک اس طرح کیا جائے کہ جس شخص کی غیبت کی ہو اپنے ساتھ اس

کے لیے بھی سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں، حدیث میں ہے:

"كَفَّارَةُ الْغِيْبَةِ أَنْ تَسْتَغْفِرَ لِمَنِ اغْتَبْتَهُ، تَقُوْلُ: " اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَهُ". (رواه البيهقى فى الدعوات الكبير، وقال:" هذا الإسناد ضعيف". مشكوٰة/ص: ٤١٥ باب الغيبة والشتم/ الفصل الثالث)

لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب اس غیبت کی خبر اس شخص تک نہ پہنچی ہو جس کی غیبت کی گئی، یا وہ مر گیا ہو، یا ایسی دور دراز جگہ پر ہو جہاں تک رسائی ممکن نہ ہو، تو اس صورت میں جس کی غیبت کی گئی اس کے لیے حق تعالیٰ سے مغفرت کی اس طرح دعا کریں کہ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَهُ" یا اللہ! میں نے غیبت کا گناہ کیا، لہٰذا مجھے اور جس کی میں نے غیبت کی ہے اسے معاف فرما دے۔ اسی کے ساتھ جن لوگوں کے سامنے کسی کی غیبت کی تھی ان ہی کے سامنے اس کی مدح وثنا اور تعریف بھی کردے، تاکہ پہلی بات (غیبت) کا غلط ہونا ثابت ہو جائے، لیکن جس کی غیبت کی تھی اسے ہماری اس حرکت کی خبر ہو جائے تو اس صورت میں اگر ممکن ہو تو اس کے پاس جا کر اجمالی طور پر معافی مانگ لیں کہ "بھئی ہمارا کہا سنا معاف کرو۔" یہی اس کا کفارہ اور غیبت کی معافی کا طریقہ ہے۔ حق تعالیٰ ہم سب کی اپنی رحمت سے غیبت اور ہر قسم کے گناہ سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

۲۹/ ذوالحجہ/ ۱۴۳۱ھ

مطابق: ٦/ ڈسمبر/ ۲۰۱۰ء

بروز: پیر، بعد العصر، (بزم صدیقی)

" اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

☆......☆......☆

(۱۸)

چغلی کی حقیقت

اس کے احکامات اور نقصانات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ حُذَیۡفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوۡلُ: "لَا یَدۡخُلُ الۡجَنَّةَ قَتَّاتٌ". وَفِيۡ رِوَایَةِ مُسۡلِمٍ: "نَمَّامٌ". (متفق علیه، مشکوٰة/ص:٤١١/ باب حفظ اللسان والغیبة والشتم/الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "چغلخور آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا"۔

چغلی کی حقیقت:

عام لوگوں کے درمیان آپسی تعلقات کی درستی، خوشگواری، اتفاقِ باہمی اور حسن معاشرت اسلامی تعلیمات کے اہم اور بنیادی مقاصد میں سے ہے، حتیٰ کہ بعض حیثیتوں سے اس کو دیگر نفلی عبادات سے اہم قرار دیا گیا ہے، اس لیے جو چیز اس راہ میں حائل ہوکر باہمی تعلقات کو خراب کر کے بغض وعداوت اور مخالفت ومنافرت پیدا کرے، ظاہر ہے کہ اسلام

میں وہ بدترین درجہ کی برائی اور معصیت ہوگی، منجملہ ان میں سے ایک چغلی بھی ہے، جو سنگین اخلاقی جرم ہے اور غیبت کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کا ذکر کافرانہ خصلت یا منافقانہ عادت کے طور پر کیا گیا:

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ﴾ (القلم: ۱۰-۱۱)

''مت مانو اس شخص کی بات جو (جھوٹ بولنے میں بے باک اور) بے تحاشا قسمیں کھانے کا عادی ہے اور چغل خوری جس کا مشغلہ ہے۔'' کتبِ قدیمہ کے بہت بڑے عالم حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''تورات میں چغل خوری کو سب سے بڑا گناہ بتایا گیا ہے''۔ (از معارف الحدیث: ۳/ ۲۷)

چغلی کی حقیقت یہ ہے کہ فتنہ وفساد کی غرض سے ایک کی بات اگرچہ وہ صحیح ہو دوسرے تک پہنچا کر ایک کو دوسرے سے بدگمان اور ناراض کر دینا، یعنی فتنہ کا بیج بو دینا، اس ذلیل حرکت اور رذیل عادت کا نام چغلی ہے، اسلام میں یہ حرام اور بدترین درجہ کا جرم ہے؛ کیوں کہ اس کے نتائج نہایت خطرناک اور سنگین ہوتے ہیں، بسا اوقات اس سے لوگوں میں تفرقہ اور فتنہ پیدا ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ چغلی باہمی عداوت ولڑائی کا ایندھن ہے۔

چغل خور بدترین شخص ہے:

اور جو لوگ فتنہ وفساد کی غرض سے اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی اِدھر کرتے ہیں (مفت میں پوسٹ مین بن کر لگائی بجھائی والا کام کرتے ہیں) حدیث میں ان چغل خوروں کو شر پسند اور بدترین بندے کہا گیا ہے، فرمایا:

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بنِ غَنَمٍ وَ أَسْمَآءَ بِنْتِ يَزِيْدَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: '' خِيَارُ عِبَادِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ إِذَا رُؤُوا ذُكِرَ اللّٰهُ''.

''اللہ تعالیٰ کے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آجائے۔'' یعنی جو عبدیت میں کامل اور شریعت کے حامل ہیں، جنہیں دیکھتے ہی گویا بے ساختہ دل پکار اٹھے کہ

یہی ہیں وہ اللہ والے جن کو دیکھتے ہی اللہ تعالیٰ یاد آجائے۔اس کے برعکس بدترین بندوں کی علامت یہ ہے:

"وَشِرَارُ عِبَادِ اللّٰهِ اَلْمَشَّاؤُوْنَ بِالنَّمِيْمَةِ، اَلْمُفَرِّقُوْنَ بَيْنَ الْأَحِبَّةِ، اَلْبَاغُوْنَ الْبُرَاءَ الْعَنَتَ". (رواه أحمد والبيهقى فى شعب الإيمان، مشكوٰة/ص: ٤١٥)

"اللہ تعالیٰ کے بدترین بندے وہ ہیں جو چغل خوری کرنے والے، دوستوں کے مابین جدائی پیدا کرنے والے اور پاک دامنوں (بے گناہوں) کو ملوث کرنے والے ہیں۔"

اس حدیث میں بدترین شخص اس کو قرار دیا جو عادۃً چغل خور ہے اور چغلی جس کا محبوب اور دلچسپ مشغلہ ہو، اور جو اللہ تعالیٰ کے بندوں اور بندیوں کو بدنام اور پریشان کرنے کے درپے ہو، عاجز کے خیالِ ناقص میں ایسا شخص واقعی بڑا خطرناک اور شیاطین الانس میں سے ہوتا ہے۔العیاذ باللہ العظیم۔

اسی لیے حضرت یحییٰ بن اکثمؒ فرماتے تھے کہ "چغل خور جادوگر سے بھی زیادہ موذی ہوتا ہے؛ کیوں کہ جو کام جادوگر ہفتہ بھر میں کر پاتا ہے چغل خور بعض اوقات وہ کام ایک منٹ میں کر دیتا ہے۔" عموماً اس سے دلوں میں نفرت اور کشیدگی پیدا ہوجاتی ہے، رشتہ داریاں ٹوٹ جاتی ہیں، خاندانوں میں نفرت کے شعلے بھڑک کر لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں، اور اس طرح چغل خوری کے نتیجہ میں اچھا خاصا بنا بنایا ماحول قابل لاحول ہو کر معاشرہ شر اور فساد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

چغل خوری کے مفاسد سے متعلق عبرتناک واقعہ:

امام غزالیؒ نے چغل خوری کے مفاسد بیان کرتے ہوئے ایک عبرت ناک واقعہ حماد بن سلمہؒ کی روایت سے بیان فرمایا ہے "کہ ایک شخص بازار میں غلام خریدنے گیا، ایک غلام اسے پسند آگیا، اسے بیچتے وقت بائع نے امانتداری کے ساتھ یہ واضح کر دیا کہ اس غلام میں اور تو کوئی عیب نہیں، البتہ چغل خوری کی عادت ضرور ہے، مشتری نے اسے معمولی سمجھا

اور غلام کو خرید کر گھر لے آیا، ابھی کچھ ہی دن گذرے تھے کہ غلام نے اپنی چغلی کی عادت کے مطابق یہ گل کھلایا کہ اپنے آقا کی بیوی سے تنہائی میں کہا: ''بیگم صاحبہ! ایسا لگتا ہے کہ تمہارا شوہر تمھیں پسند نہیں کرتا اور اب دوسری کا ارادہ کر رہا ہے، لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں، میرے پاس ایک تدبیر ایسی ہے کہ اس پر عملِ سحر کروا کر تم دونوں میں دوبارہ محبت کا انتظام کرا سکتا ہوں، اس کے لیے آپ کو صرف اتنا کرنا ہے کہ جب رات کو وہ تمہارے پاس سونے آئے تو استرے سے اس کے ڈاڑھی کے چند بال کاٹ کر مجھے دے دینا، یہ نہایت نافع اور کارگر نسخہ ہے'' بیوی فوراً تیار ہوگئی، اور استرے کا انتظام کرلیا، دوسری طرف یہ چغل خور اپنے آقا کے پاس پہنچا اور جا کر یوں بات بنائی کہ ''حضور! سنا ہے بیگم صاحبہ نے کسی غیر مرد سے آشنائی اور تعلق قائم کرلیا ہے اور اب تمھیں اپنے راستہ سے ہٹانے کے لیے قتل کا موقع تلاش کر رہی ہے، اس لیے ذرا ہوشیار رہنا'' اس کے بعد وہ آقا جب رات میں بیوی کے پاس جا کر مصنوعی نیند سویا تو تھوڑی دیر میں بیوی استرا لے کر اس کے ڈاڑھی کے چند بال کاٹنے کی غرض سے آگے بڑھی، پھر کیا تھا غلام کے بات کی تصدیق ہوگئی اور شک یقین سے بدل گیا، اس لیے قبل اس کے کہ بیوی کچھ کرتی اور کہتی، اس نے اسی استرے سے بیوی کا کام تمام کر دیا، جب بیوی کے خاندان والوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے آ کر شوہر کو قتل کر دیا، اتنے میں مرد کے اقرباء اور رشتہ دار بھی آ گئے، اور دونوں کے خاندان والے مارنے مرنے کے لیے برسر پیکار ہوگئے، اس طرح اچھے خاصے خاندان میں چغل خوری کی وجہ سے خونریزی کی نوبت آ گئی۔ (احیاء العلوم: ۳/ ۹۵، از تنبیہ الغافلین مترجم ص: ۱۸۹)

اسی طرح مغل بادشاہ نے اپنے دورِ حکومت میں جب کہ ایک ایرانی بادشاہ حملہ کرنا چاہتا تھا، صلح کرلی اور دونوں طرف معاہدہ ہوگیا، ایک چغل خور نے ایرانی بادشاہ سے عرض کیا: ''حضور! جاں بخشی ہو تو ایک بات بتلانا چاہتا ہوں کہ مغل بادشاہ نے صلح تو خود کی ہے، مگر پس پردہ وہ زبردست حملہ کی تیاری کر رہا ہے، یہ سن کر ایرانی سخت ناراض ہوا اور تحقیق کے بغیر اسی وقت جنگ کا فیصلہ کرلیا، پھر فوراً فوج کو حملہ کا حکم دیا، اس چغلی کے نتیجہ میں جو

جنگ ہوئی تو ایک ہی وقت میں تیس ہزار آدمی قتل ہوئے اور گلی کوچوں میں خون کی نالیاں بہہ گئیں۔ (از خطباتِ رحیمی: ۱۰/ ۱۱۵)

ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
کارِ بد خود کرے، لعنت کرے شیطان پر

چغل خوری کی مذمت:

حدیث میں ایسے چغل خور کے لیے سخت مذمت آئی ہے جو لوگوں اور خصوصاً شوہر اور بیوی، اسی طرح آقا اور غلام کے مابین منافرت کرادے، ان کے لیے فرمایا:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ خَبَّبَ امْرَأَةً عَلٰى زَوْجِهَا، أَوْ عَبْدًا عَلٰى سَيِّدِهٖ". (رواہ أبو داود، مشکوٰۃ/ص: ۲۸۲ / باب عشرۃ النسآء/ الفصل الثانی)

جو شخص کسی عورت کو اس کے شوہر کے خلاف بھڑکائے یا غلام کو اس کے آقا کے خلاف بھڑکائے (یا اس کے برعکس کرے) تو وہ شخص ہم میں سے نہیں، ہمارا اور اس کا کوئی تعلق نہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ عادتِ بد اور ذلیل حرکت ایک سچے مومن کی نہیں ہوسکتی، پھر عجیب بات یہ ہے کہ اس بدترین منافقانہ ومفسدانہ خصلت سے لوگوں کا سخت نقصان تو ہے ہی، لیکن چغل خور کو بھی کوئی نفع نہیں ہوتا، بلکہ اسے بھی حسرت وندامت اور ذلت ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور دونوں جہاں میں کفِ افسوس ہی ملنا پڑتا ہے۔

چناں چہ حضرت ابوعبداللہ القرشیؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص کسی بزرگ (فقیہ) کے پاس سات سو میل کا طویل سفر کر کے سات باتیں معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوا، کہنے لگا: حضرت!

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ آسمان سے زیادہ ثقیل چیز کیا ہے؟ جواب میں فرمایا: "کسی عفیف اور عفیفہ یعنی پاک دامن مرد وزن پر عیب اور تہمت لگانا۔"

(۲) زمین سے زیادہ وسیع چیز کیا ہے؟ فرمایا: ’’حقوق زمین سے زیادہ وسیع ہیں۔‘‘

(۳) پتھر سے زیادہ سخت چیز کیا ہے؟ فرمایا: ’’بے ایمان کا دل۔‘‘

(۴) آگ سے زیادہ جلانے والی چیز کیا ہے؟ فرمایا: ’’حرص وحسد کی برائی آگ سے زیادہ جلانے والی ہے۔‘‘

(۵) زمہریر سے زیادہ ٹھنڈی چیز کیا ہے؟ فرمایا: ’’کسی قریب کے سامنے اپنی حاجت کا سوال کرنا (جب کہ کامیابی نہ ہو) زمہریر سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔‘‘

(۶) سمندر سے زیادہ گہری چیز کیا ہے؟ فرمایا: ’’قناعت پسند دل سمندر سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔‘‘

(۷) یتیم سے زیادہ کمزور اور زہر سے زیادہ قاتل کیا چیز ہے؟ فرمایا: ’’چغلی کرنا زہر سے زیادہ خطرناک قاتل ہے، پھر چغلی ظاہر ہوتے وقت چغل خور (دنیا وآخرت میں) یتیم سے زیادہ ذلیل اور رسوا ہو جاتا ہے۔‘‘ (از: روضۃ الصالحین ص:۹۹)

پتھر کو میری جانب کیا سوچ کے پھینکا ہے؟
شیشہ کے مکان والو! اپنا انجام بھی سوچا ہے؟

چغل خوری کی مذمت پر ایک قطعہ ہے کہ لوگو!

چغلی ہے خصلت بد، بچو اس سے ہمیشہ
جو لوگ ہیں بے ایمان، انہیں کا ہے یہ پیشہ
یہ خصلت ہے ایسی جس سے کچھ ہاتھ نہیں آتا
یہ معصیت ہے بے لذت، انجام ہے اس کا ذلت اٹھانا

چغل خوری کے سبب عذابِ قبر:

صاحبو! چغل خور ذرا سا کوئی شگوفہ چھوڑ کر آپس میں عداوت ونفرت کی آگ تو

بھڑکا دیتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ لوگوں کے درمیان فتنہ وفساد کی جو آگ اس نے چغلی کے ذریعہ لگائی ہے اس کے انگارے خود اسی کو اس کی قبر وحشر میں جلائیں گے؛ کیوں کہ

جو جلاتا ہے کسی کو خود بھی جلتا ہے ضرور
شمع جلتی ہے خود پروانوں کے جلنے کے بعد

روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کے ایک باغ سے نکلے تو (بقیع سے) دو ایسے انسانوں کی آواز سنی جنہیں ان کی قبر میں عذاب دیا جارہا تھا، آپ ﷺ وہیں ٹھہر گئے اور فرمایا: ''ان دونوں قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے، (محدثین فرماتے ہیں کہ یہ قبریں نئی تھیں، اور ایک قول کے مطابق مشرکین کی تھیں، لیکن راجح قول یہ ہے کہ مسلمانوں کی تھیں، واللہ اعلم۔) اور یہ عذاب جس جرم کے نتیجہ میں دیا جارہا ہے اس کو ان لوگوں نے معمولی سمجھ رکھا تھا، پھر آپ ﷺ نے معذبین کے گناہوں کی نشاندہی فرمائی کہ ایک کو تو پیشاب کے چھینٹوں سے احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے، لیکن دوسرے کو چغل خوری کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے۔'' حالاں کہ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی چاہے تو ذرا سی توجہ سے بھی بچ سکتا ہے؛ کیوں کہ نہ پیشاب کے چھینٹوں سے بچنا مشکل ہے اور نہ چغلی کرنا ہی زندگی کا کوئی لازمی جز ہے، لیکن چوں کہ ان قبر والوں کی طبیعت کا لگاؤ ان چیزوں سے ہو گیا تھا اس لیے وہ نہ بچ سکے اور عذابِ قبر میں مبتلا ہو گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (تر کھجور کی) ایک ٹہنی منگائی اور اس کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ایک دونوں کی قبروں پر لگا کر ارشاد فرمایا:

''لَعَلَّهٗ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا''. (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ٤٢/ باب آداب الخلاء / الفصل الأول)

''توقع ہے کہ اس کی وجہ سے ان دونوں کے عذاب میں تخفیف ہو جائے جب تک یہ ٹہنیاں نہ سوکھیں۔'' یا بعض علماء نے ایک مطلب یہ بھی بیان کیا کہ مجھے توقع ہے کہ ان شاخوں کے خشک ہونے سے قبل ہی ان قبر والوں کے عذابِ قبر میں تخفیف ہو جائے گی۔

یہاں یہ واضح رہے کہ یہ عمل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا، پھر اس سے تخفیف عذاب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی خصوصیت تھی، لہٰذا اس حدیث شریف سے قبروں پر سبزہ لگانے اور پھول چڑھانے پر استدلال کرنا صحیح نہیں؛ کیوں کہ اگر یہ چیزیں میت کے حق میں تخفیف عذاب کا سبب ہوتیں تو احادیث صحیحہ میں اس کی صراحت کے ساتھ ترغیب وتاکید ہوتی، حالاں کہ ذخیرۂ احادیث میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ فافهم، واللّٰه أعلم وعلمه أحكم وأتم. (مستفاد از: مفتاح الأسرار/ ص: ۳۳۲)

بہر کیف حدیث پاک سے یہ ثابت ہوگیا کہ چغل خوری کے سبب قبر میں عذاب ہوتا ہے، حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ عذابِ قبر کے تین حصے ہیں:

(۱) ایک حصہ غیبت سے ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا حصہ چغلی سے۔ (۳) تیسرا حصہ پیشاب (کے چھینٹوں میں احتیاط نہ کرنے اور) نہ بچنے سے۔ العیاذ باللہ العظیم۔ (از: اللہ سے شرم کیجئے/ ص: ۷۵)

چغل خوری کے سبب عذابِ جہنم:

اور معاملہ صرف اسی پر ختم نہیں ہوگا، بلکہ چغل خوری کے سبب جہنم میں بھی سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا، حدیث بالا میں چغل خور کے انجامِ بد کو بیان فرمایا کہ ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ“ مطلب یہ ہے کہ چغل خوری کی عادت ان سنگین جرائم اور گناہوں میں سے ہے جو جنت کے داخلہ میں رکاوٹ بننے والے ہیں، اور کوئی شخص چغل خوری کی اس گندی حرکت اور منافقانہ شیطانی عادت کے ہوتے ہوئے جہنم کا عذاب بھگتے بغیر جنت میں داخل نہ ہوسکے گا۔ مسلم شریف کی روایت میں ”قَتَّاتٌ“ کے بجائے ”نَمَّامٌ“ کا ذکر ہے، دونوں کے مرادی معنیٰ چغل خور کے آتے ہیں، البتہ بعض علماء نے ”قَتَّاتٌ“ اور ”نَمَّامٌ“ میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ جو شخص کسی کے ساتھ بات کرتے وقت سامنے موجود ہو، پھر بعد میں وہاں سے اٹھ کر دوسرے کے پاس جاکر چغلی کھائے تو اسے ”نَمَّامٌ“ کہتے ہیں، اور جو شخص کسی کی

بات چپکے سے سن کر اس کی وہ بات فتنہ کی غرض سے دوسرے کو پہنچا دے تو وہ "قَتَّاتٌ" ہے، اور جنت میں داخل نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ چغل خور شخص جنت کے دخولِ اوّلی سے محروم رہے گا، پہلے اسے چغلی کی سزا جہنم میں جھیلنی پڑے گی، پھر وہ جنت میں داخل ہو سکے گا۔ یا پھر ایک مطلب یہ ہے کہ اس برائی کے ہوتے ہوئے جنت میں داخلہ نہ ہو سکے گا، جب تک اس سے پاک نہ ہو جائے، اب یہ پاکی جہنم میں سزا کے ذریعہ ہوگی یا اس کے بغیر فضل الٰہی کے ذریعہ ہوگی۔ واضح رہے کہ عام طور پر چغل خور ایسی حرکت دو آدمیوں میں غلط فہمیاں پیدا کرانے اور لڑانے ہی کے لیے کرتا ہے، اور یہ وعیدیں بھی اسی صورت میں ہیں، لیکن اگر کوئی شخص دو آدمیوں میں جوڑ پیدا کرنے اور تعلقات بحال کرانے کی غرض سے اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی اِدھر کرتا ہے تو ایسی جد وجہد کرنے والا نہ صرف یہ کہ ان وعیدوں میں سرے سے شامل ہی نہیں، بلکہ اس کا یہ کام کارِ خیر بھی ہے، جس میں بوقت ضرورت بہ شکل توریہ جھوٹ کا سہارا لینے کی بھی گنجائش ہے۔

چغل خوری کی مضرت سے کیسے بچیں؟

ضرورت ہے کہ چغل خوری کی مضرت سے محفوظ رہنے کے لیے کتاب وسنت میں بیان کردہ ان وعیدوں کو پیش نظر رکھیں، تاکہ اس کے خطرناک نتائج اور برے انجام سے بچا جائے، اگر کوئی شخص ہمارے سامنے کسی کی چغلی اور برائی بیان کرے تو اس وقت اس کی ہاں میں ہاں ملانے یا خاموش رہنے کے بجائے حتی الامکان اپنے دینی بھائی سے خوش گمان رہ کر اس کی طرف سے صفائی پیش کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

امام غزالیؒ نے (احیاء العلوم: ۳/۹۴ میں) لکھا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی غیبت، برائی یا چغلی سنے تو اسے چھ باتوں کا التزام کرنا چاہیے، ان شاء اللہ العزیز اس سے وہ شخص چغل خوری کی مضرت اور اس کے برے نتائج ونقصانات سے محفوظ رہے گا:

(۱) چغل خور کی بات پر یقین اور اعتماد نہ کرے؛ کیوں کہ وہ فاسق ہے جس کا

شرعاً اعتبار نہیں۔ چناں چہ منقول ہے کہ ایک شخص کسی دن اپنے ایک دوست پر سخت ناراض ہوگیا، دوست نے تعجب سے ناراضگی کی وجہ پوچھی، تو کہنے لگا: ''ایک ثقہ اور قابل بھروسہ آدمی نے مجھ سے تمہاری گفتگو میرے متعلق نقل کی، جس کے سبب مجھے تم سے ناراضگی ہے'' وہ کہنے لگا: ''دوست اگر وہ آدمی ثقہ ہوتا تو چغلی ہرگز نہ کرتا، جب اس نے چغلی کی تو اب وہ ثقہ اور لائق اعتبار نہیں بلکہ فاسق وبدکار ہے جس کا اعتبار نہیں۔''

(۲) چغل خور کو چغلی سے منع کرے، بلکہ مناسب انداز میں تنبیہ کرے۔ (اگر ممکن ہو) چناں چہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس ایک شخص نے کسی کی چغلی کی، تو آپ نے فرمایا: ''ہم تیری بات پر یقین نہیں کرسکتے جب تک کہ تحقیق نہ کرلیں، اس کے بعد اگر تو جھوٹا ثابت ہوا تو آیت قرآنیہ: ﴿إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْا﴾ (الحجرات:٦) کا مصداق ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم سے کوئی فاسق آکر کوئی بات کہے تو اس کی تصدیق نہ کرو۔ اور اگر تو اپنی شکایت میں سچا ثابت ہوگیا تب بھی تو آیت کریمہ: ﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ﴾ (القلم: ١١) کا مصداق ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ طعنہ زنی اور بہت زیادہ چغلی کرنے والے کی بات نہ مانو۔ لہٰذا کسی بھی شکل میں تیری بات کا اعتبار نہیں؛ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تو چغلی سے توبہ کرلے، ہم تجھے معاف کرتے ہیں، امید ہے کہ حق تعالیٰ بھی تجھے معاف کردیں، اس نے کہا: ''حضرت! معافی چاہتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔'' (از: تنبیہ الغافلین مترجم/ص:۱۹۱)

(۳) چغل خور کے کہنے سے کسی پر بدگمانی ہرگز نہ کرے؛ کیوں کہ قرآنِ کریم کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾ (الحجرات: ١٢) ''بعض گمان گناہ ہیں۔''

(۴) چغل خور جو بات کسی کے متعلق کہہ رہا ہے اس کی تحقیق اور جستجو بھی نہ کرے؛ کیوں کہ قرآنِ کریم کا اعلان ہے: ﴿لَا تَجَسَّسُوْا﴾ (الحجرات: ١٢) ''تجسس نہ کرو۔''

(۵) چغل خور کی بات ہی نہ سنے، بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ کے لیے ناراضگی وغصہ کا اظہار کرے۔

(۶) اور اگر اس کی بات سن لی ہو تو اس کی بات دوسرے سے نقل ہرگز نہ کرے، ورنہ خود چغل خوری کی برائی میں شامل ہو جائے گا۔ حضرت کعب احبارؒ کا بیان ہے کہ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام قحط کے زمانہ میں تین مرتبہ قوم کو لے کر دعا کے لیے نکلے، لیکن قبولیت دعا کے آثار نظر نہ آئے، تو آپ نے عرض کیا: ''یا اللہ! کیا راز ہے؟'' وحی آئی کہ ''اے موسیٰ! تمہاری جماعت میں ایک چغل خور ہے، جس کی نحوست سے دعا کی قبولیت کے آثار نظر نہیں آتے'' عرض کیا: ''اے اللہ! وہ کون ہے؟'' ارشاد ہوا: ''ہم چغلی سے منع کرتے ہیں اور خود ہی کریں، یہ مناسب نہیں، البتہ بہتر یہ ہے کہ سب مل کر توبہ کرو، چناں چہ جب سب نے مل کر توبہ کی تو دعا قبول ہوئی اور قحط سالی ختم ہوئی۔'' (آج کا سبق/ص:۱۵۷)

البتہ جن موقعوں پر شرعی ضرورت اور دینی مصلحت کا تقاضا ایسی باتیں کہنے یا سننے کا ہو تو ظاہر ہے کہ پھر وہ مواقع ان احکامات سے مستثنیٰ ہوں گے، کما قال العلماء۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں اور چغلی نیز ہر برائی سے بچالیں۔ آمین۔

" اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنۡزِلۡهُ الۡمَقۡعَدَ الۡمُقَرَّبَ عِنۡدَكَ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ".

☆......☆......☆
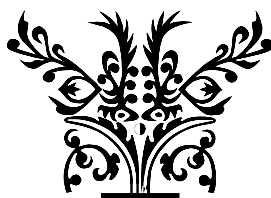
(۱۹)

تکبر کی حقیقت اس کے احکامات ونقصانات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ:" يَقُوۡلُ اللّٰهُ تعالىٰ: "اَلۡكِبۡرِيَاءُ رِدَائِیۡ، وَالۡعَظَمَةُ إِزَارِیۡ، فَمَنۡ نَازَعَنِیۡ وَاحِدًا مِنۡهُمَا أَدۡخَلۡتُهُ النَّارَ، وَفِیۡ رِوَايَةٍ:"قَذَفۡتُهٗ فِیۡ النَّارِ". (رواہ مسلم:۲/۳۱۹، مشکوٰۃ/ص: ۴۳۳/ باب الغضب والکبر / الفصل الأول، حدیث قدسی نمبر:۳)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ "کبریائی (بڑائی) میری (اوپر کی بڑی) چادر ہے، اور عظمت میری ازار (نیچے کی چھوٹی چادر) ہے، جس نے ان دونوں میں سے کوئی چیز مجھ سے لینے کی کوشش کی میں اسے جہنم میں داخل کروں گا۔"

تکبر اور بڑائی اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے:

انسان بندۂ رحمٰن ہے، بندگی اس کی پہچان ہے اور بندہ کا حسن وکمال یہی ہے کہ اس

کے ہر قول وعمل سے اللہ تعالیٰ کی بندگی، نیازمندی، عاجزی اور انکساری ظاہر ہو، جہاں تک بڑائی اور کبریائی کی بات ہے تو وہ صرف اور صرف اسی ذاتِ پاک کا حق اور اسی کے شایانِ شان ہے جو کائنات کا خالق اور زندگی وموت کا مالک ہے، اور جو سب سے بڑا ہے، اس سے بڑا کوئی نہیں اور وہ ''اللہ'' ہی ہے، وہ متکبر ہے، یعنی کامل فی الکبریاء ہے، ہر قسم کی بڑائی وکبریائی اسی کے ساتھ خاص ہے۔

﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (الجاثیة: ۳۷)

''اسی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست (اور) حکمت والا۔'' اس کی طاقت بھی زبردست اور اس کی حکمت (یعنی اس طاقت کا حسن استعمال) بھی زبردست، وہ اپنی زبردست طاقت کو زبردست حکمت کے ساتھ استعمال کرتا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا، لہٰذا بڑائی اسی کے لیے زیبا ہے، حدیث مذکور میں حق تعالیٰ نے اس مضمون کو گویا اس طرح بیان فرمایا کہ: ''اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعَظَمَةُ إِزَارِيْ'' یعنی بڑائی میری چادر اور عظمت میری ازار (لنگی) ہے، اس حدیث قدسی میں ''چادر'' اور ''لنگی'' جیسے الفاظ حق تعالیٰ نے بطورِ مثال استعمال فرمائے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر شخص کی چادر اور لنگی اس کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، تو اسی طرح یہ دونوں صفتیں یعنی کبریائی اور عظمت صرف اور صرف میری ذات ہی سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں کوئی میرا ساجھی اور شریک نہیں۔ چناں چہ حق تعالیٰ کی کچھ صفات تو وہ ہیں جن کا کچھ حصہ بندوں کو بھی دیا گیا ہے، اور بندے بہ طریق مجاز خود کو ان صفات کے ساتھ متصف کرسکتے ہیں، جیسے عفو ورحم اور جودوکرم وغیرہ، لیکن کچھ صفات ایسی ہیں جو حق تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، جن سے بندہ اپنے آپ کو بہ طریق مجاز بھی عقلاً وشرعاً متصف نہیں کرسکتا، عظمت اور بڑائی انہیں اوصاف میں سے ہیں۔

انسان کے لیے تکبر کرنا مناسب نہیں

انسان ضعیف البنیان ہے، ابتداء میں وہ نا قابل بیان تھا، پھر اپنی پیدائش سے لے کر موت تک پریشان رہتا ہے، مختلف قسم کی ضرورتوں کا محتاج ہوتا ہے، ذرا سی بیماری و پریشانی سے بے کار ہو کر بیٹھ جاتا ہے، بسا اوقات اسے دوسروں کا اختیار تو در کنار خود اپنی ذات اور نفس کا بھی پورا اختیار نہیں ہوتا، پھر انجام کار موت کا شکار ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں تکبر اس کے لیے کس طرح مناسب ہو سکتا ہے؟ اور وہ اس صفت الٰہی میں ساجھی اور شریک ہونے کی جرأت کس بنا پر کر سکتا ہے؟ یہ شانِ بندگی کے قطعاً خلاف ہے، اس لیے جب کوئی بندہ حقیقت کو بھول کر اللہ تعالیٰ کی اس مخصوص صفت میں شریک ہونا چاہتا ہے، یعنی تکبر کرتا ہے تو حق تعالیٰ کے دربار میں وہ بہت ہی بڑا مجرم بن جاتا ہے؛ کیوں کہ اس کا یہ جرم نہایت ہی سنگین ہے، اس لیے اس کی بڑی سخت وعیدیں آئی ہیں۔

متکبروں کے لیے وعیدیں:

قرآن پاک میں فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ﴾ (النحل:۲۳)

''اللہ رب العزت تکبر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتے۔'' اور اللہ تعالیٰ کی نظر محبت سے محروم رہنے والا عزت کیسے پا سکتا ہے؟ متکبروں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا محرومی ہو سکتی ہے کہ جب تک وہ تکبر سے توبہ نہیں کر لیتے خواہ کتنی ہی نیکیاں کر لیں، مگر وہ عباد الرحمٰن یعنی رب العالمین کے محبوب اور پسندیدہ بندوں میں شامل ہو ہی نہیں سکتے۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ کو وہ گنہگار تو پسند ہے جو توبہ کر کے تواضع اختیار کرے، مگر وہ عبادت گزار پسند نہیں جو تکبر کرے۔ سیدنا آدم علیہ السلام سے ایک چوک ہو گئی، جس کے بعد انہوں نے فوراً توبہ کی، تواضع و عاجزی اختیار کی، تو دربارِ الٰہی سے معافی بلکہ مقبولیت مل گئی،

اس کے برخلاف شیطان نے حکم الٰہی کے سامنے جھکنے کے بجائے تکبر کیا، تو اسے ذلت ولعنت ملی، اس کی ساری عبادتیں ضائع اور برباد ہوگئیں، عزت کی بلندیوں سے ذلت کی پستیوں میں ڈال دیا گیا، اسی لیے مبلغ اسلام علامہ سید عبدالمجید ندیم شاہ صاحبؒ فرماتے تھے: ''تکبر انسان کو ہضم ہی نہیں ہوتا، کہ یہ اللہ ہی کی شان ہے، انسان اسی وقت بلند ہوتا ہے جب وہ (اللہ تعالیٰ ہی کے لیے) تواضع اختیار کرتا ہے، لہٰذا جتنی عاجزی اختیار کروگے بلند ہوتے جاؤگے، اور جتنا تکبر اختیار کروگے پست ہوتے جاؤگے۔''

کہنے والے نے سچ ہی کہا ہے:

وہ ڈالی ٹوٹ ہی جاتی ہے ہوا کے ایک جھونکے سے
جسے اپنی بلندی پر ذرا بھی ناز ہوتا ہے

اور ملاحظہ ہو:

جھکتے وہی ہیں جن میں جان ہوتی ہے
اکڑ کے رہنا مُردوں کی پہچان ہوتی ہے

حدیث میں آتا ہے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ خطبہ میں فرمانے لگے: ''لوگو! تواضع وعاجزی اختیار کرو؛ کیوں کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کی، یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر اور اس کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے تواضع کی تو حق تعالیٰ اسے عزت وعظمت عطا فرماتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے خیال اور نگاہ میں تو چھوٹا ہوگا، لیکن عام بندگانِ خدا کی نظر میں بڑا ہوگا۔ ''وَمَنْ تَکَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ'' اس کے برخلاف جو شخص تکبر اور بڑائی کا رویہ اختیار کرے گا تو حق تعالیٰ اسے ذلیل اور خوار فرمائیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عام لوگوں کی نگاہوں میں کتوں اور خنزیروں سے بھی زیادہ ذلیل اور بے وقعت ہوجائے گا، اگرچہ خود اپنے خیال میں بڑا ہو۔ (مشکوٰۃ/ص: ٤٣٤/ باب الغضب والکبر/ الفصل الثالث، رواہ البیهقی فی شعب الإیمان)

پستی سے سربلند ہو اور سرکشی سے پست
اس راہ کے عجیب نشیب وفراز ہیں

معلوم ہوا کہ جیسے قناعت کا پھل راحت ہے اسی طرح تواضع کا پھل عزت اور تکبر کا نتیجہ ذلت ہے۔

متکبروں کا انجام:

یہ محض شاعری نہیں، بلکہ حقیقت اور سچائی ہے، جس پر دنیا کی تاریخ شاہد ہے، آپ دیکھئے نا! آج تک اس دنیا میں کیسی زبردست قوت کی حامل قومیں آئیں، قومِ نوح، قومِ ثمود اور قومِ عاد جنہیں اللہ تعالیٰ نے بڑی حکومت، طاقت اور دولت دی تھی، جس کے نشہ میں چور ہوکر وہ اپنی حقیقت، اصلیت اور اوقات بھول گئے، تکبر اور بڑائی کرنے لگے، ﴿مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (حمٓ السجدة: ۱۵) کا نعرہ لگانے لگے، نتیجہ کیا نکلا؟ اللہ رب العزت نے ان کو عبرت ناک انجام تک پہنچایا، کسی کو غرقِ آب کیا، کسی کو آگ سے ہلاک کیا، کسی کو زمین میں خاک کیا اور کسی کو ہوا سے برباد کیا۔ قرآنِ پاک نے قومِ ثمود کا حسرت ناک حال بیان کیا کہ اللہ رب العزت نے ان پر ایک تیز وتند ہوا بھیجی، ﴿رِيحًا صَرْصَرًا﴾ (حمٓ السجدة: ۱۶) جو آٹھ دن اور سات راتیں چلتی رہی، اتنی شدید تھی کہ ان کو پٹخ پٹخ کر زمین پر مار گرایا، قرآن کہتا ہے کہ ان کی لاشیں زمین پر ایسی بکھری پڑی تھیں، "كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ﴾ (الحاقة: ۸) جیسے کھجور بڑے بڑے کھوکھلے تنے زمین پر بکھرے ہوں، بہرحال جب قوموں نے تکبر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹا دیا، اور افراد نے تکبر کیا تو وہ مٹ گئے، اس لیے دوستو! تواضع کا سہارا لے کر چلا کرو، ورنہ تکبر کی ٹھوکر ہلاک کردے گی۔

بقولِ شخصے:

زبر نہیں، زیر ہو جا ☆ کیوں کہ آگے پیش ہونا ہے

ایک واقعہ:

حضرت عبدالرحمٰن صفویؒ نے اپنی کتاب ''نزہۃ المجالس'' میں ایک واقعہ بیان فرمایا کہ ''ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ''میں نے حرمِ کعبہ میں ایک شخص کو بڑی شان وشوکت سے طواف کرتے ہوئے دیکھا، اس کے حشم وخدم اس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو طواف کرنے سے روک رہے تھے، مجھے بڑا تعجب ہوا، لیکن اس سے زیادہ تعجب اس وقت ہوا جب اسی شخص کو میں نے اپنی آنکھوں سے بغداد کے پل پر لوگوں سے سوال کرتے ہوئے دیکھا، میں نے حیرت سے اس کا سبب پوچھا، تو اس نے جواب میں کہا کہ ''حضرت! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنی عادت کے مطابق اس جگہ بھی تکبر کیا جہاں لوگ تواضع اختیار کرتے ہیں، یہ اسی کی سزا ہے''۔ (نزہۃ المجالس ص:۱/ ۲۸۹) العیاذ باللہ العظیم۔

کبر اور تکبر کا فرق اور ان کی مذمت:

پھر یہ تو متکبر کے لیے دنیا کی نقد سزا ہے کہ حق تعالیٰ اسے ذلیل کرتے ہیں، آخرت کی سزا یہ ہوگی کہ اس کو جنت اور اپنی رحمت سے محروم کردیں گے، حدیث میں ہے:

''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ''

''جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرّہ برابر کبر ہوگا۔'' ان حقائق کے پیش نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جیسے ایٹم بم کا ایک ذرّہ بھی ہلاکت برپا کردیتا ہے ایسے ہی ذرّہ برابر تکبر بھی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے۔

اس موقع پر ہر ایک نکتہ قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ یہاں کبر کو بیان فرمایا، تکبر کو نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں میں کچھ فرق ہے۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ ''کبر یہ ہے کہ کسی دینی یا دنیوی کمال کی وجہ سے دل میں بڑائی پیدا ہوجائے، اور تکبر یہ ہے کہ اپنے کسی انداز واداا ور قول وفعل سے دوسروں کے مقابلہ میں اپنی

بڑائی جتلانے کے لیے اس کا اظہار کرے، اور یہ تکبر کبر ہی کا نتیجہ ہوتا ہے“۔ (اصلاحی مجالس ۱/۲۵۱) کبر و تکبر کی مذمت کا اندازہ اسی حدیث سے لگایئے جس میں فرمایا گیا کہ ”کسی کے دل میں ذرّہ برابر بھی کبر ہوگا، یعنی اپنی افضلیت اور بڑائی کے ساتھ دوسروں کی حقارت کا خیال دل میں ہوگا تو وہ جنت داخل نہ ہوگا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے ”فَبِئۡسَ مَثۡوَى الۡمُتَكَبِّرِيۡنَ﴾ (الزمر: ۷۱)

لیکن یاد رکھو! یہاں بعض علماء نے ایک تاویل یہ بیان کی کہ حدیث میں کبر سے مراد کفر ہے، اس لیے کہ عموماً کبر ہی کفر کا سبب ہوتا ہے، جیسا کہ اسی حدیث پاک کے اگلے جملہ سے واضح ہوتا ہے، لہٰذا جب کبر سے مراد کفر ہے تو ظاہر ہے کہ کفر و شرک کے مرتکب پر جنت حرام ہے۔ مگر دوسری تاویل یہ ہے کہ کبر سے مراد تو تکبر ہی ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ متکبر شخص اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک وہ تکبر کے رذیلہ سے بالکل پاک وصاف نہ ہو جائے، اب یہ پاکی خواہ اس طرح ہو کہ اسے اپنے کبر کا عذاب بھگتنا پڑے، یا رب العالمین اپنی رحمت سے اسے معاف فرما کر پہلے اس کو برائی سے پاک فرما دے، پھر اگر وہ صاحب ایمان ہے تو اس کے ایمان کی وجہ سے فضل فرما کر جنت میں داخل کر دے؛ کیوں کہ آگے حدیث کا دوسرا جز یہ ہے:

”وَلَا يَدۡخُلُ النَّارَ مَنۡ كَانَ فِيۡ قَلۡبِهٖ مِثۡقَالُ ذَرَّةٍ مِنۡ إِيۡمَانٍ“

”وہ شخص بھی ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل نہیں ہوسکتا جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی ایمان ہے۔“ ایمان کے بدولت اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوگی اور وہ ضرور بالضرور جنت میں جائے گا۔

تکبر کی حقیقت:

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی یہ مذمت بیان فرمائی تو ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ عموماً جو لوگ متکبر ہوتے ہیں ان کے کپڑے اور جوتے وغیرہ

نہایت اعلیٰ وعمدہ ہوتے ہیں، کہیں یہ چیزیں تکبر کی علامت تو نہیں؟ انہوں نے جب اس خیال کا اظہار کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمدہ لباس زیب تن کرنا اور اچھے جوتے پہننا یہ تو تہذیب وشائستگی اور خوش ذوقی کی علامت ہے، جس سے شریعت نے منع نہیں فرمایا؛ کیوں کہ

''إِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَيُحِبُّ الْجَمَالَ''.

''حق تعالیٰ جمیل ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں۔''

''اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ''. (رواه مسلم/ مشكوٰة/ص: ٤٣٣ باب الغضب والكبر/ الفصل الأول)

جہاں تک کبر اور تکبر کی بات ہے تو درحقیقت یہ اس کیفیت وحالت کا نام ہے جو انسان کو صدق وحق کے راستے سے ہٹادے، اور انسان کسی دینی یا دنیوی کمال کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر اور افضل اور دوسروں کو خود سے کمتر اور احقر خیال کرنے لگے، لہٰذا متکبر وہ ہے (۱) جو حق کو ٹھکرائے (۲) اور لوگوں کو حقیر جانے۔ واقعہ یہ ہے کہ تکبر کی یہ دونوں علامتیں ایسی خطرناک ہیں جن سے متکبر بہت سی برائیوں اور خباثتوں کا مرتکب ہو کر دارین کی سعادتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

انکارِ حق، تکبر کی پہلی علامت:

مثلاً دیکھئے! تکبر کی پہلی علامت انکارِ حق ہے، اس سے متکبر بسا اوقات دینِ حق اور راہِ ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے، شیطان، قارون، فرعون، ہامان وغیرہ اسی تکبر یعنی انکارِ حق کی وجہ سے محروم ہوئے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْأَرْضِ﴾ (العنكبوت: ۳۹)

''اور ہم نے قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہلاک کیا؛ کیوں کہ ان کے پاس

(حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کھلی دلیلیں لے کر آئے تھے، مگر انہوں نے تکبر کیا۔" حق کا انکار کیا (جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک کردیے گئے) ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُونَ﴾ (الصافات:۳۵)

"وہ لوگ ایسے تھے جب ان سے کہا جاتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو وہ تکبر کرتے تھے۔"

آج بھی بہت سے لوگ دین اسلام کو حق جانتے ہیں، اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ اس کی صداقت وحقانیت کا اظہار بھی کرتے ہیں، لیکن اپنی دنیوی قیادت، سیادت اور مال ودولت کی وجہ سے قبول نہیں کرتے، اس انکارِ حق ہی کو تکبر کہتے ہیں، قرآن کہتا ہے:

﴿وَيْلٌ لِكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ يَسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلَى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (الجاثية : ۷-۸)

"بڑی خرابی ہوگی ہر ایسے شخص کے لیے جو جھوٹا ہے، نافرمان ہے، جو اللہ کی آیتوں کو سنتا ہے جب وہ اس کے روبرو پڑھی جاتی ہیں، پھر بھی وہ تکبر کرتا ہے اور اس طرح اڑا دیتا ہے جیسے ان کو سنا ہی نہیں، سو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔"

اسی طرح بہت سے مدعیانِ اسلام کا بھی یہی حال ہے کہ وہ شریعت کے احکام اور طور وطریق کو بظاہر درست اور حق جانتے ہیں، مگر بہت سی باتوں پر عمل نہیں کرتے، مثلاً شریعت اسلامیہ کے مطابق اپنی شکل وصورت نہیں بناتے، صالحین کا لباس نہیں پہنتے، طریقِ سنت کے خلاف بدعات اور رسومات اختیار کرتے ہیں، یہ سب عملی طور پر حق کا انکار ہی تو ہے، جو تکبر کی علامت ہے، حتیٰ کہ بعض لوگ تو زبانی طور پر بھی انکار کردیتے ہیں، جب انہیں کسی اسلامی ہدایت اور حکم کی طرف توجہ دلائی جائے تو کہتے ہیں: "ہمیں سب معلوم ہے۔" یعنی ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ ہم ماننے والے نہیں، یہ سب تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اسی طرح "بَطَرُ الْحَقِّ" میں یہ بھی داخل ہے کہ - العیاذ باللہ - کوئی عالم دین قصداً یا غلطی سے مسئلہ غلط بتا دے، پھر جب اسے تنبیہ کی جائے تو اپنی بات یا فتویٰ سے رجوع کرنے کے بجائے اسی پر جما رہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

بر سماعِ راست ہر کس قدیر نیست

طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

"یاد رکھو! اچھی اور سچی بات سننے کی طاقت ہر کسی کو نہیں ہوتی، جس طرح انجیر جیسے مزیدار عجیب الخواص پھل کھانے کی طاقت ہر کسی پرندہ کو نہیں ہوتی۔"

غرض! حق کو جس طرح بھی ٹھکرایا جائے یہ سب تکبر میں داخل ہے۔

لوگوں کو کمتر سمجھنا، تکبر کی دوسری علامت:

دوسری علامت یہ بیان فرمائی کہ "غَمْطُ النَّاسِ" مطلب یہ ہے کہ اپنے ظاہری علم، ظاہری عبادت، حسب نسب، حسن و جمال یا مال و منال کی وجہ سے خود کو افضل و بہتر اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھنا یہ بھی ایسی خطرناک برائی ہے جس سے بہت سی باطنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، کائنات میں سب سے پہلا گناہ جو شیطان سے سرزد ہوا وہ اسی کبر کا تو نتیجہ تھا، شیطان اپنے آپ کو افضل اور سیدنا آدم علیہ السلام کو احقر سمجھ کر کہنے لگا: ﴿أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ﴾ (الأعراف : ۱۲) بالآخر اس کا کبر اور اس کی انانیت ہی اس کی ہلاکت کا سبب بنی۔

ایک عبرت آموز واقعہ:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے علامہ دمیری کی حیاۃ الحیوان کے حوالہ سے دوسری صدی ہجری کے قریب الختم کا ایک عبرت آموز واقعہ بیان کیا کہ مدینۃ الاسلام بغداد کے ایک مشہور بزرگ حضرت ابوعبداللہ اندلسیؒ جو عابد، زاہد اور عارف باللہ ہونے کے ساتھ حدیث و تفسیر میں بھی ایک جلیل القدر امام تھے، ان کو تیس ہزار حدیثیں حفظ تھیں اور قرآنِ کریم کو تمام

روایاتِ قرائت کے ساتھ پڑھتے تھے، اکثر اہل عراق آپ کے مرید اور شاگرد تھے، ایک مرتبہ سفر کا ارادہ کیا تو تلامذہ اور مریدین میں سے بہت سے لوگ ساتھ ہو لیے، جن میں حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت شبلیؒ بھی تھے، حضرت شبلیؒ کا بیان ہے کہ دورانِ سفر ہمارا گذر عیسائیوں کی ایک بستی پر ہوا، نماز کا وقت تھا، اس لیے پانی کی تلاش میں بستی کا چکر لگایا، وہاں کے مندروں اور گرجا گھروں میں ایک بڑے مجمع کو باطل پرستی میں مبتلا دیکھ کر ہم ان کی گمراہی پر حیرت کرتے ہوئے آگے بڑھے، اور بستی کے کنارے ایک کنویں پر پہنچے، جس پر چند لڑکیاں موجود تھیں، اتفاق سے ان میں ایک نہایت خوبصورت سردار کی لڑکی پر شیخ کی نظر پڑی تو حالت ہی بدل گئی، حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ سر جھکائے بیٹھے رہے، نہ کچھ کھاتے پیتے، نہ بات چیت کرتے، بس وقت پر نماز پڑھ لیتے، ہمیں جب کوئی تدبیر نظر نہ آئی تو میں نے پیش قدمی کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''شیخ! آپ کے مریدین آپ کے مسلسل خاموش رہنے سے سخت حیران پریشان ہیں، کچھ تو فرمائیے!'' اس پر کہا کہ ''عزیزو! میں کب تک اپنی حالت تم سے پوشیدہ رکھوں! بات یہ ہے کہ جس لڑکی کو میں نے دیکھا تھا اس کی محبت مجھ پر غالب آگئی، اب میرے لیے ممکن نہیں کہ کسی طرح اس بستی کو چھوڑوں، مجھ سے ولایت کا لباس اتار لیا گیا، ہدایت سلب کر لی گئی، قضا و قدر نافذ ہوگئی، معاملہ میرے بس کا نہیں ہے'' حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ کی اس حالت سے ہم حیرت و حسرت سے روتے ہوئے وطن کی طرف لوٹے، پھر ایک سال اسی حالت پر گذر گیا، اس کے بعد ہم مریدوں نے ارادہ کیا کہ جا کر دوبارہ شیخ کی خبر لیں، چناں چہ جب ہم دوبارہ بستی میں پہنچے تو پتہ چلا کہ شیخ نے سردار کی لڑکی سے رشتہ مانگا تو اس نے اس شرط پر منظور کیا کہ وہ ایک سال تک جنگل میں سُوّر چرائیں گے، جس کو انہوں نے بخوشی قبول کیا، لہٰذا اس وقت وہ جنگل میں خنزیر چرا رہے ہیں، ہم نے جنگل جا کر دیکھا تو شیخ کی عجیب حالت تھی کہ سر پر نصاریٰ کی ٹوپی اور کمر پر زنار ہے اور اُس عصا پر ٹیک لگائے خنزیر چرا رہے تھے جس پر وعظ اور خطبہ کے وقت سہارا لیتے، اس منظر نے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا، میں نے قریب جا کر کہا کہ ''شیخ! اس علم و فضل کے ہوتے ہوئے

آج یہ حالت!'' تو شیخ نے کہا: ''اللہ نے جس طرح چاہا مجھ میں تصرف کیا، لوگو! اس اللہ کے قہر سے ڈرو! اور اپنے علم وفضل پر غرور نہ کرو اور اپنے غیر کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو'' پھر شیخ نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا: ''میرے مولیٰ! میرا گمان تیرے بارے میں ایسا بالکل نہ تھا کہ تو مجھے ذلیل اور خوار کر کے اپنے در سے نکال دے گا'' یہ کہہ کر رونا شروع کیا، تو ہم ہی نہیں، بلکہ جنگل کے جانوروں پر بھی رقت طاری ہوگئی، بالآخر سچی توبہ اور آہ وزاری کے نتیجہ میں دربارِ الٰہی سے معافی مل گئی، اور پہلے سے زیادہ علم وفضل سے نوازا گیا، حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے دریافت کیا کہ ''حضرت! زمانۂ ابتلا میں قرآن وحدیث میں سے آپ کو کچھ یاد بھی رہا؟'' فرمایا: ''صرف دو آیتیں اور ایک حدیث۔ پہلی آیت:

﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُّكْرِمٍ إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ (الحج: ۱۸)

یعنی ''حق تعالیٰ جس کو ذلیل کر دے اسے کوئی تکریم اور عزت نہیں دے سکتا، اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' دوسری آیت:

﴿وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ (البقرۃ: ۱۰۸)

یعنی ''جس نے ایمان کو کفر کے بدلے اختیار کیا تحقیق وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا۔''

ایک حدیث یہ یاد رہی کہ "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" ''جو اپنا دین بدل دے اس کو قتل کر دو۔''

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے دریافت کیا: ''حضرت! اس ابتلاء کا کوئی سبب؟'' فرمایا: ہاں، جس وقت عیسائیوں کی بستی میں ہمارا گذر بتخانوں اور گرجا گھروں پر ہوا تو وہاں مجمع عام کو باطل پرستی میں دیکھ کر میرے دل میں ان کی حقارت کے ساتھ تکبر اور بڑائی پیدا ہوگئی کہ ہم مومن اور موحد ہیں اور یہ کم بخت کیسے احمق ہیں کہ ایسی بے شعور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، بس اسی وقت ایک غیبی آواز آئی کہ ''ایمان وتوحید کچھ تمہارا ذاتی کمال تھوڑا ہی ہے، یہ سب تو ہماری توفیق سے ہے، اگر چاہو تو ابھی بتلا دیں۔'' شیخ کہتے ہیں کہ اس

کے فوراً بعد ایک پرندہ میرے اندر سے نکل کر اڑ گیا جو درحقیقت ایمان تھا۔ (مستفاد از: منتخب تقاریر اور دور حاضر کے مسائل ص: ۹۰ تا ۹۶)

دل کے کانوں سے سن فغاں میری
درسِ عبرت ہے داستاں میری

تکبر ام الامراض ہے:

واقعہ یہ ہے کہ جب دل میں یہ خیال خام پیدا ہو کر راسخ ہو جاتا ہے کہ میں بڑا اور دوسروں سے اچھا ہوں، تو اس کے اثر سے دل میں حسد، غصہ، کینہ وغیرہ جیسی بہت سی روحانی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً اپنی افضلیت کا خیال دل میں جم جانے کے بعد اب اگر اسے کوئی کسی موقع پر نصیحت کرتا ہے تو ناک بھوں چڑھانے لگتا ہے، خصوصاً جب کوئی کم عمر اور کم درجہ والا نصیحت کرے، گناہ چھوڑنے کو کہے تو کہتا ہے: ''آج کل کا آیا ہوا ہمیں نصیحتیں کرنے لگا'' اس طرح حق کا انکار کر دیتا ہے، پھر جسے وہ خود سے کم تر سمجھتا تھا وہ اگر دینی یا دنیوی اعتبار سے ترقی کر گیا تو یہ دل میں حسد کرنے لگتا ہے کہ یہ مجھ سے آگے کیسے بڑھ گیا؟ اس طرح تکبر کے ذریعہ حسد پیدا ہوتا ہے، اور بسا اوقات غصہ بھی تکبر کے اثر سے ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنی افضلیت کا خیال دل میں جم جانے کے بعد اب اگر کسی مجلس میں صدر مقام یا عزت کی جگہ پر بیٹھنے کو نہ ملے، یا کوئی سلام میں پیش قدمی نہ کرے یا تعظیم نہ کرے تو دل ہی دل میں غصہ آتا ہے، لیکن اس کا اظہار تو کر نہیں سکتا، اس لیے یہی غصہ بالآخر کینہ میں بدل جاتا ہے، پھر جب دل میں کینہ آ گیا تو اس کے نتیجہ میں تجسس اور غیبت جیسے روحانی مہلک امراض وجود میں آتے ہیں، تو ان سب کی اصل جڑ کبر ہے، اس لیے امام غزالیؒ نے تکبر کو ''ام الامراض'' فرمایا۔ یعنی تمام بیماریوں کی ماں، اس لیے کہ دل کی بہت سی پوشیدہ روحانی بیماریاں اسی سے پیدا ہوتی ہیں، لہٰذا اس کے اسباب معلوم کر کے علاج کرنا ضروری ہے۔

تکبر کے اسباب:

علماءِ محققین فرماتے ہیں کہ تکبر کے پانچ اسباب ہیں، جن کی وجہ سے عموماً انسان تکبر میں مبتلا ہوجاتا ہے:

(۱) پہلا سبب: ''ظاہری علم'' ہے، جو تعلّی کا سبب ہے، خواہ یہ علم دین کا ہو یا دنیا کی معلومات؛ کیوں کہ علم کے برابر کسی چیز کی فضیلت نہیں، اس لیے جب کوئی شخص محض ظاہری علوم کو حاصل کرلیتا ہے، حقائق تک نہیں پہنچتا، تو اس علم سے انسان میں تکبر پیدا ہوجاتا ہے، اور یہی علم کی ہلاکت و آفت ہے، مشہور ہے کہ ''آفۃُ الْعِلْمِ الْخُیَلَاءُ''، علم کی آفت تکبر ہے۔ ہمارے حضرت شیخ الزماں مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ''جس علم سے تکبر پیدا ہو وہ علم جہل سے بھی بدتر ہے۔'' لیکن اگر علم اپنی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ حاصل ہوگا تو یہ حقیقی علم جس قدر نصیب ہوگا اللہ تعالیٰ کی معرفت وخشیت میں اضافہ ہوگا، ایسے علم سے انسان تکبر کے بجائے تواضع والا بنتا ہے۔ اس لیے بزرگوں نے فرمایا کہ ''علم دو دھاری تلوار ہے، اگر اس میں اللہ تعالیٰ نور اور نافعیت پیدا کرے تو پھر سبحان اللہ! یہ علم بہت ہی خیر اور برکت کی چیز ہے، لیکن خدانخواستہ اس میں نور اور نافعیت نہ ہو تو پھر اس سے زیادہ مہلک چیز بھی کوئی نہیں ہے۔''

(۲) دوسرا سبب: ''ظاہری عبادت'' ہے، جس شخص کی نظر اپنی عبادت کی کثرت پر ہوتی ہے، سب سے پہلے تو وہ عبادت کی حلاوت سے محروم ہوجاتا ہے، پھر شیطان اس کے اندر احساسِ برتری پیدا کردیتا ہے، جس کے سبب وہ خدا پرست بننے کے بجائے عبادت پرست بن جاتا ہے، اس کی نظر اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت پر نہیں، اپنی عبادت پر ہوتی ہے، اس طرح وہ عبادت کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہوکر خود کو بڑا اور گویا عرشِ معلیٰ پر پہنچا ہوا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھنے لگتا ہے، حالاں کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں۔

کہتے ہیں کہ ''بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا، ایک فاسق شخص ایک مرتبہ اس کے

پاس اس نیت سے آ بیٹھا کہ حق تعالیٰ اس کی برکت سے مجھ پر رحم فرما دے گا، عابد اس کو اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر دل میں خیال کرنے لگا کہ مجھے اس سے کیا نسبت؟ کہاں میں اور کہاں یہ؟ اس کے بعد اس عابد نے فاسق سے کہا: ''جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ!'' بس اللہ تعالیٰ کو اس عابد کا کبر پسند نہ آیا، اسی وقت اس زمانہ کے پیغمبر پر وحی نازل ہوئی کہ ان دونوں سے کہہ دو کہ از سر نو عمل کریں، اس لیے کہ پہلا کیا کرایا برا تھا یا بھلا، دونوں کا ضائع کر دیا گیا، فاسق کے گناہ (نیک نیتی کی وجہ سے) محو کر دیے گئے، اور عابد کی نیکیاں (کبر و تکبر کی وجہ سے) مٹا دی جاتی ہیں۔'' (از شفائے دل/ص:۲۷۰)

شیطان کے دماغ میں بھی تو اسی ظاہری عبادت کے نتیجہ میں خلل اور تکبر آ گیا تھا، جس کے بعد وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔

(۳) تیسرا سبب: ''حسب ونسب'' ہے۔ بعض اوقات ایک انسان اپنے اونچے خاندان اور اعلیٰ حسب ونسب کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میرا تعلق فلاں خاندان سے ہے، حالاں کہ اللہ رب العزت کے یہاں شرافت اور عزت کا معیار اعلیٰ خاندان نہیں، ایمان اور اچھے اعمال ہیں، قرآن یہی کہتا ہے کہ قیامت کے دن اچھے حسب ونسب کی وجہ سے کام نہ بنے گا، ایمان اور اچھے اعمال کی وجہ سے کام بنے گا:

﴿ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴾ (المؤمنون:۱۰۱)

''سو اس دن نہ ان میں قرابتیں ہوں گی اور نہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔''

بقولِ شاعر:

جائیں گے جب لوگ پیش ذوالجلال ☆ اور ہوگا اعمال کی نسبت جب سوال
پوچھیں گے: تم لائے ہو کیا اعمال؟ ☆ یہ نہ پوچھیں گے کہ ''کس کے ہو لال؟''

اس لیے اعمالِ صالحہ کے بجائے حسب ونسب پر اکتفا کر لینا اور اسی کو عزت و برائی کا معیار سمجھ لینا عقلمندی ہرگز نہیں۔

(۴) چوتھا سبب: ''حسن و جمال'' ہے۔ عموماً حسن و جمال کی وجہ سے انسان میں بڑائی آ ہی جاتی ہے، وہ اپنی خوبصورتی پر ناز کرنے لگتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حسن وخوبصورتی ایک عارضی چیز ہے، جو بیماری یا بوڑھاپے کی وجہ سے ختم ہو جانے والی ہے، لہٰذا یہ ہرگز فخر کے قابل نہیں۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

حضرت مالک بن دینارؒ کا ایک واقعہ ہے کہ آپ نے ایک خوبصورت باندی کو دیکھا جس کو اپنے حسن و جمال پر بڑا ناز تھا، آپ نے سوچا کہ اس متکبر باندی کا دماغ ٹھیک کیا جائے (کیوں کہ حدیث میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ''جب تم تواضع کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے ساتھ تواضع اختیار کرو، اور جب متکبروں کو دیکھو تو انہیں تکبر دکھاؤ، کہ اس میں ان کی حوصلہ شکنی ہوگی اور تمہیں صدقہ کا اجر ملے گا۔'') (تنبیہ الغافلین مترجم/ص:۲۰۴)

اس لیے آپ نے حقیقت سے باخبر کرنے کے لیے اس کے مالک سے فرمایا کہ ''اس باندی کو میں دو خشک کھجوروں کے بدلہ خریدنا چاہتا ہوں، کیا تم بیچنے کے لیے تیار ہو؟'' اس کو بڑا تعجب ہوا کہ ایسی رشکِ قمر پری صورت باندی کی اتنی معمولی قیمت بالآخر کس مناسبت سے لگائی گئی؟ آپ نے فرمایا: ''بات دراصل یہ ہے کہ اس میں بہت سارے عیوب ہیں، وہ اس طرح کہ اگر غسل نہ کرے اور خوشبو نہ لگائے تو بدن سے بو آئے، منھ اور دانت صاف نہ کرے تو منھ سے بو آئے، سر صاف نہ کرے تو جوئیں پڑ جائیں، ذرا عمر دراز ہو تو بوڑھی ہو جائے، حیض اس کو آتا ہے، پیشاب و پاخانہ جیسی گندی چیزیں اس سے نکلتی ہیں، خود غرض اور بے وفا ایسی کہ آج تیرے پاس ہے، کل کو تیرے مرنے کے بعد کسی اور کے پہلو میں ہوگی، یہ تیری باندی کی حالت ہے، اس صورت میں اس کی قیمت دو خشک کھجوروں سے زائد کیسے ہو سکتی ہے؟ جب کہ میرے پاس اس سے ہزار درجہ بہتر باندی ہے، جو کافور سے بنی،

مشک وزعفران سے پیدا کی گئی، جنت میں پلی، وہ اگر کھارے پانی میں تھوک دے تو وہ میٹھا ہو جائے، اس کے نور سے سورج بے نور ہو جائے، وہ کبھی وعدہ خلافی اور بے وفائی نہیں کرتی، وہ ہرجائی نہیں، پھر عجیب بات یہ ہے کہ اس کی قیمت نہایت کم، جو ہر وقت ہر زمانہ میں ہر ایک کے پاس موجود ہے اور وہ ہے (۱) نماز تہجد، (۲) اپنے کھانے یا دعوت میں غریب کو شامل کرنا، (۳) اللہ کی خوشی کو اپنی خوشی پر قربان کرنا، (۴) کسی کو اپنی ذات سے تکلیف نہ دینا، (۵) دنیا میں رہ کر آخرت کی فکر کرنا۔'' شیخ کی ان باتوں کا اس باندی اور اس کے آقا پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت ان کی چشمِ حقیقت کھل گئی، فوراً توبہ کی اور بقیہ زندگی رضائے الٰہی میں گذاری۔ (فضائل صدقات/ص: ۲۶۷)

(۵) پانچواں سبب: ''مال ومنال'' ہے۔ جب مال بے دینی کے راستہ سے آتا ہے تو اس سے انسان میں فحش اور فخر پیدا ہو جاتا ہے، پھر وہ سمجھتا ہے کہ مال ہے تو سب کچھ ہے، اور میرے پاس مال ہے اس لیے میں بہت کچھ ہوں، اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ مال بھی ایک ناپائیدار چیز ہے، اگر چوری ہو جائے، لٹ جائے، ڈاکہ پڑ جائے تو سب کچھ جاتا رہتا ہے، یا موت کے وقت یہ سارا مال دھرا کا دھرا رہ جائے گا، اور خود خالی ہاتھ دنیا سے چلا جائے گا، اس لیے مال کی بنیاد پر بھی اِترانا اور فخر کرنا بالکل مناسب نہیں۔

تین بدنصیب آدمی:

اور یہ بات تو بہت ہی عجیب ہے کہ بعض لوگوں کے پاس نہ مال ہے نہ جمال، نہ کوئی اور کمال، پھر بھی تکبر سے مرے جاتے ہیں، حدیث پاک میں ہے کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ کلام فرمائیں گے نہ ان کا تزکیہ (پاک) فرمائیں گے اور نہ ان کی طرف نگاہِ کرم ڈالیں گے، ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا، وہ تین بدنصیب آدمی یہ ہیں:

''شَيْخٌ زَانٍ، وَمَلِكٌ كَذَّابٌ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ''. (رواہ مسلم، مشکوٰۃ /ص: ۴۳۳)

(۱) **بوڑھا زناکار:** جس کی شہوت تو کمزور ہو چکی، مگر ہوس ختم نہیں ہوئی، جوانی میں اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب ہو تو اس کا یہ گناہ کبیرہ ہونے کے باوجود قابل درگذر ہو سکتا ہے؛

کیوں کہ جوانی کی حالت میں شہوت سے مغلوب ہونا ایک فطری کمزوری ہے، لیکن اگر کوئی بوڑھا بوڑھاپے میں یہ حرکت کرے تو یہ اس کی طبیعت کی سخت خباثت کی علامت ہے۔

(۲) جھوٹا بادشاہ: جو شخص صاحب اقتدار ہونے کے باوجود جھوٹ بولتا ہے، اگر کوئی عام آدمی اپنی ضرورت نکالنے کے لیے جھوٹ بول دے تو اس کا گناہ بھی کبیرہ ہونے کے باوجود قابل معافی ہوسکتا ہے، لیکن ایک صاحب اقتدار حکمراں اگر جھوٹ بولتا ہے تو یہ اس کی طبیعت کی انتہائی گندگی اور اپنے رب سے بے باکی کی نشانی ہے۔

(۳) فقیر متکبر: کوئی دولت مند اگر تکبر کرے تو یہ انسان کی عام فطرت کے لحاظ سے کچھ مستبعد نہیں، لیکن گھر میں فقر و فاقہ کے باوجود اگر کوئی شخص غرور اور تکبر کی چال چلتا ہے تو بلاشبہ یہ اس کی انتہائی دنائت اور کمینہ پن کی علامت ہے۔ (مستفاد از: معارف الحدیث: ۲/۲۸۴)

تکبر کا علاج:

غرض! تکبر خواہ کوئی بھی کرے، امیر ہو یا غریب، عامی یا نامی، بہر حال یہ بہت بڑی اور بری بلا ہے، یاد رکھو! شریعت نے ہمیں ترقی سے نہیں، تکبر سے روکا ہے، اور اس سے حفاظت کے لیے مختلف نسخے اور علاج بتلائے ہیں:

(۱) انسان اپنی اوقات اور اصلیت کو سوچے، قرآنِ کریم بھی اسی طرف متوجہ کرتا ہے:

﴿ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ﴾ (الطارق: ۵-۶)

”انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ وہ اچھلتے ہوئے (گندے) پانی سے پیدا کیا گیا۔ وہ کسی نے کہا نا!

فرش ہے تیرا مسکن، عرش پر اڑتا ہے تو
یاد رکھ اپنی حقیقت، خاک کا پتلا ہے تو

نیز ملاحظہ ہو:

جو اونچی اڑان پر ہیں، یہ رکھیں خیال میں
کہ لمحوں کا فاصلہ ہے عروج و زوال میں

جب یہ حقیقت ہے تو اب یہ بھی سوچے کہ تکبر کی وجہ سے جس شخص کو میں حقیر سمجھتا

ہوں، میں اور وہ ایک ہی چیز سے پیدا کیے گئے ہیں، یعنی نطفۂ منی سے، اور دنیا کے پیٹ میں آنے سے پہلے ہم سبھی نے ماں کے پیٹ میں ماں کے خونِ حیض سے پرورش پائی ہے، پھر حیاتِ دنیوی میں حالت یہ ہے کہ مختلف قسم کی کمزوریوں اور پیٹ میں بھری نجاستوں کے ساتھ جیسے تیسے جی رہے ہیں، اور انجام کار موت کا شکار ہوکر قبر میں جا کر مٹی ہو جائیں گے، ان حقائق کے بعد اب تکبر کس طرح مناسب ہوسکتا ہے، جب بھی تکبر اور اپنی بڑائی کا خیال دل میں آئے تو ان حقائق کا تصور کرے، ان شاء اللہ تکبر کے علاج کے لیے یہ علمی علاج بھی کافی ہو جائے گا۔

(۲) اپنے تمام دنیوی یا دینی کمالات کو اپنے استحقاق کے بغیر محض رب العالمین کا عطیہ اور انعام سمجھے۔ اپنے علم کو، اپنی عبادت کو، اپنے اعلیٰ حسب ونسب کو، اپنے حسن و جمال کو اور مال ومنال کو اپنی صلاحیت کا ثمرہ ونتیجہ نہ سمجھے، بلکہ یہ سمجھے کہ یہ سب کچھ میرے کسی استحقاق کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور انعام ہے، لہٰذا مجھ پر اس کا بے حد شکر واجب ہے، نیز کبر کا دوسرا علاج کثرتِ شکر ہے، حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ ”نعمت پر فخر کرنا تو کبر ہے، اور اپنی نااہلی کو مستحضر رکھتے ہوئے اس کو عطائے حق سمجھنا شکر ہے۔“

(۳) علانیہ طور پر تواضع والے کام کرنا، خواہ بتکلف ہی کیوں نہ ہو، مثلاً اپنے والدین، اساتذہ، مشائخ اور علماء حتیٰ کہ طلباء کے جوتے اٹھالے یا سیدھے کر دے، یا غرباء اور حقیر سمجھے جانے والے لوگوں کے ساتھ تعظیم وتواضع کا معاملہ کرے، ان سے خوشی اور خوش اخلاقی سے ملے، شیریں کلامی سے پیش آئے، جب وہ ملنے آئیں تو کھڑا ہو جایا کرے، ان کی دلجوئی کرے، ان کو اہمیت دے، یا پھر گھر والوں کے کام میں ہاتھ بٹائے، ان کا ساتھ دے، گھریلو کاموں میں حتیٰ کہ صفائی تک میں بھی عار محسوس نہ کرے، یہ باتیں تکبر کے ازالہ کے لیے عملی طور پر تیر بہدف علاج کے مانند ہیں۔

حق تعالیٰ کبر وتکبر اور تمام رذائل سے ہماری کامل اور مکمل طور پر حفاظت فرمائے۔ آمین۔

”اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ“.

(۲۰)

غصہ کی حقیقت

اس کے احکامات اور نقصانات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَ ةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَیۡسَ الشَّدِیۡدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِیۡدُ الَّذِیۡ یَمۡلِكُ نَفۡسَهٗ عِنۡدَ الۡغَضَبِ". (متفق علیه، مشكوٰة ص: ٤٣٣/ باب الغضب والكبر)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بہادر وہ نہیں ہے جو کسی پہلوان کو پٹخ دے، بہادر تو وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر کنٹرول کرلے۔''

غیظ وغضب کے بارے میں اکثر لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں:

انسان کی عادتوں اور خصلتوں میں سے ایک بہت ہی بری خصلت وعادت اس کا ''مغلوب الغضب'' ہونا ہے، یعنی بے جا غیظ وغضب اور غصہ سے بدحال اور بے قابو ہوجانا، یہ نہایت ہی خطرناک اور بہت ہی بری عادت ہے، اس میں انسان غیر معتدل مزاج ہوجاتا

ہے، اس لیے اس کے نتائج جسمانی وروحانی اور دنیوی واخروی ہر اعتبار سے تباہ کن ہیں، مگر اس سے غفلت وعدم واقفیت کی بنا پر یہ عادت افسوس ناک حد تک آج لوگوں میں موجود ہے، اور اس سلسلہ میں اکثر لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ بے جا غیظ وغضب کی مذمت اور اس کے احکامات ونقصانات کو واضح کیا جائے۔

غیظ اور غضب میں فرق:

غصے کے لیے دو لفظ استعمال ہوتے ہیں: ایک غیظ، اور دوسرا غضب، قرآنِ کریم میں بھی یہ دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان میں تھوڑا سا فرق ہے، علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: ''غیظ کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب آدمی کو کسی پر غصہ تو آئے، لیکن وہ اندر ہی اندر کڑھتا اور گھٹتا رہے، کچھ کرے نہیں، ضبط کر لے، اسے غیظ کہتے ہیں۔ فرمایا: ﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ اور غضب اس غصے کو کہتے ہیں جس میں انتقام کا ارادہ شامل ہو، فرمایا: ﴿وَذَا النُّوْنِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا﴾ (الأنبیاء: ۸۷) پہلی آیت میں غیظ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دوسری آیت میں غضب کا، اور یہ دونوں الفاظ مخلوق کے لیے استعمال ہوتے ہیں، جب کہ اللہ رب العزت کے لیے فقط ''غضب'' کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے، اس لیے کہ جب اس کو غصہ آتا ہے تو وہ انتقام کے ارادے کے ساتھ ہی ہوتا ہے، وہاں اندر اندر جلنے کا سوال ہی نہیں، وہ قادرِ مطلق ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف غیظ کی نسبت کرنا جائز نہیں، جب کہ بندوں کے لیے ''غیظ'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اور ''غضب'' کا بھی۔ (از: علاج الغضب، حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ)

غصہ انسانی فطرت ہے، اس کا غلط استعمال بری عادت ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ غصہ اللہ تعالیٰ کو بھی آتا ہے، اور غصہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آتا تھا، چناں چہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''أَغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُ الْبَشَرُ''

مجھے بھی غصہ آتا ہے ایسے ہی جیسے کسی انسان کو آتا ہے، مگر غصہ میں بھی ہمیشہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے وہی بات نکلتی تھی جو حق ہوتی تھی، غصہ میں بھی خلافِ حقیقت وشریعت کوئی بات آپ ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان سے نہ نکلتی تھی، جب کبھی خلافِ شرع امور آپ ﷺ دیکھتے تو آپ ﷺ کو غصہ اس لیے آتا تھا کہ یہ ایک فطری چیز ہے، غصہ آنا انسان کی فطرت ہے، یہ مطلقاً بری بات نہیں، بلکہ غصہ کا غلط استعمال بری عادت ہے، اس وقت عموماً عام آدمی کا غصہ اس کے قابو میں نہیں رہتا، اس لیے جب وہ غصے میں آجاتا ہے تو غصہ اس کی عقل کے چراغ کو بجھا دیتا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیا بول رہا ہے؟ بس ایک ہنگامہ برپا ہوجاتا ہے، اس وقت انسان اپنے بس میں نہیں ہوتا، بلکہ شیطان کے قابو اور اس کی مٹھی میں ہوتا ہے، اس حالت میں گویا شیطان انسان کے ساتھ اس طرح کھیلتا ہے جیسے بچے فٹ بال اور گیند سے کھیلتے ہیں، اس اعتبار سے غصہ انسانیت کے لیے سمِّ قاتل ہے۔

غصے کے جسمانی نقصانات:

اس غصہ کے نتیجہ میں انسان کو جسمانی وایمانی دونوں اعتبار سے نقصان بھگتنا پڑتا ہے، چناں چہ ماہرین کی تحقیق ہے کہ غصہ براہِ راست انسانی صحت کو متاثر کرتا ہے، اس سے دل کی دھڑکن غیر معمولی ہوجاتی ہے، خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے، جو لوگ بلڈ پریشر کے مریض ہیں غصہ کی کیفیت ان کو اکثر اوقات اپنے توازن سے محروم کر دیتی ہے، اور وہ مجنون و پاگل جیسی حرکتیں کرنے لگتے ہیں، بعض اوقات یہ غصہ ہارٹ اٹیک کا بھی سبب بن جاتا ہے، جیسا کہ اسٹاک ہوم کے سائنسدانوں نے طویل تحقیقات کے بعد انکشاف کیا ہے کہ جتنا زیادہ غصہ کیا جائے گا ہارٹ اٹیک کے خدشات میں اتنا ہی اضافہ ہوگا؛ کیوں کہ غصہ کا اثر پورے جسم پر پڑتا ہے، چناں چہ غصہ سے انسان میں تناؤ پیدا ہوجاتا ہے، مٹّھیاں بھنچ جاتی ہیں، ناک کے نتھنے پھولنے لگتے ہیں، دانت بجنے لگتے ہیں، آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں، رگیں پھول جاتی ہیں، حرارت اور جسمانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، جس کا لازمی اثر دِل پر پڑتا ہے، اور پھر اس

کے سبب (Heart Attack) ہونے کے خدشات وامکانات میں (۱۵٪) پندرہ فی صد اضافہ ہوجاتا ہے۔

اس لیے زیادہ سے زیادہ ریلیکس اور پرسکون رہنا چاہیے، اور حتی الامکان بے جا اور بے حد غصہ سے دور رہنا چاہیے، ورنہ اچھا خاصا تندرست وتوانا انسان بھی ڈھیر ہوجاتا ہے، چناں چہ مشہور ہے کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پہلوان کو دیکھا کہ غصہ سے بھرا ہوا ہے، جھاگ منہ سے نکل رہا ہے، پوچھنے پر کسی نے بتایا کہ اس پہلوان کو ایک شخص نے کوئی تلخ بات کہہ دی اور چلا گیا، جس کی وجہ سے یہ سخت غصہ میں ہے، شیخ سعدیؒ نے فرمایا: ''تعجب ہے کہ یہ پہلوان دس من کا پتھر تو بآسانی اٹھالیتا ہے، لیکن غصہ کی وجہ سے ایک بات اٹھانے اور برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔'' (گلستان)

غصے کے روحانی نقصانات:

پھر اس سے جس قدر جسمانی نقصانات ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ایمانی اور روحانی نقصانات ہوتے ہیں، بزرگوں کا تجربہ ومشاہدہ ہے کہ انسان پر شیطان کا قابو جتنا غصہ کی حالت میں چلتا ہے اتنا شاید کسی دوسری حالت میں نہیں چلتا، یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات انسان غصہ میں حیوانیت سے بڑھ کر شیطنت والی حرکتیں کرنے لگتا ہے، حد یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں انسان کبھی کبھی اللہ پاک کو گالیاں دینے لگتا ہے، شریعت مطہرہ کا انکار کرنے لگتا ہے، کفریہ کلمات بھی بکنے لگتا ہے، والدین اور اپنے بڑوں سے بدتمیزی کرنے لگتا ہے، شاگرد اپنے استاذ کو، اولاد اپنے والدین کو، مرید اپنے پیر کو اور بندہ اپنے رب کو چھوڑ دیتا ہے، اس حالت میں عموماً انسان کو نہ اللہ تعالیٰ کی حدود کا خیال رہتا ہے، نہ اپنے جسمانی وایمانی نفع نقصان کا۔ بعض محدثینؒ نے فرمایا کہ ''غضب وغصے کی کیفیت دراصل شیطانی اثر اور وسوسوں سے پیدا ہوتی ہے، جس کی وجہ سے انسان ظاہر وباطن میں اعتدال کی حد پار کر جاتا ہے اور ایسے اعمال وافعال کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے جو شرعی واخلاقی ہر اعتبار سے غلط ہوں۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کے ان مفاسد اور نقصانات سے بچانے کے لیے ایک صحابیؓ کو جو غیر معمولی قسم کے تیز مزاج اور مغلوب الغضب تھے، بار بار یہی وصیت اور نصیحت فرمائی کہ "لَا تَغْضَبْ". (بخاری، مشکوٰۃ ص: ٤٣٣) کہ غصہ نہ کرو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت ان ہی صحابیؓ کے لیے خاص نہ تھی، بلکہ ساری امت کے لیے عام ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الإِيمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ". (مشکوٰۃ/ص: ٤٣٤)

"غصہ ایمان کو ایسا خراب اور برباد کر دیتا ہے جیسا کہ ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے۔" ایلوا ایک نہایت کڑوی دوا ہے، اگر کوئی دور بھی کوٹ رہا ہو تو حلق کڑوا ہو جائے، حکیم العصر مولانا محمد اختر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "ایک من شہد میں ذرا سا ڈال دیجیے سارا شہد کڑوا ہو جائے گا"۔ (از علاج الغضب) یہی حال غصہ کا ہے کہ اس کی تلخی حلاوتِ ایمانی کو کم کر دیتی یا مٹا دیتی ہے، مراد یہ ہے کہ آدمی کا ایمان غصہ کی حالت میں صحیح سالم اور محفوظ رہنا نہایت دشوار ہے۔

غصہ ہر برائی کی جڑ اور فساد کی بنیاد ہے:

غصے کے ان ہی جسمانی و ایمانی مفاسد کے پیش نظر کہا گیا کہ "اَلْغَضَبُ مِفْتَاحُ كُلِّ شَرٍّ" (روضه الأدب/ص: ٥١) یعنی "بے جا غصہ ہر برائی کی جڑ اور ہر مفسدہ کی بنیاد ہے"۔ جو اس سے بچ گیا وہ بہت سے نقصانات سے محفوظ ہو گیا، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادیؒ فرماتے تھے کہ "یہ غصہ اتنی خراب چیز ہے کہ اگر وہ مجھے راستہ میں مل جائے تو میں اس کو ذبح کر ڈالوں"۔ (از دوائے دل، بیانات: مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی مدظلہ)

صاحبو! پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر نوعمری و نوجوانی میں ہی غصے پر قابو پا لیا تب تو خیر ہے، ورنہ اگر یہ سنپولیا بڑھ کر اژدہا بن گیا تو اس کے نقصانات بھی بڑھ جائیں گے، سن اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کی گرفت بھی سخت سے سخت ہوتی جائے گی، پھر انسان خسارہ اور خمیازہ

اٹھائے گا، پچھتائے گا، مگر اس کے پنجہ سے رہائی آسان نہ ہوگی، اس لیے کہتے ہیں کہ ''عموماً غصہ کی ابتداء حماقت سے ہوتی ہے اور انتہاء ندامت پر ہوتی ہے۔'' اور یہ انسان کے ایمانی وجسمانی کمزوری کی علامت ہے۔

غصے کے اسباب:

علماءِ امت نے غصے کے اسباب مجموعی طور پر تین بیان فرمائے ہیں:

(۱) **پہلا سبب:** ''کمزوری'' ہے۔ جو آدمی کمزور ہو، اعصاب میں تحمل نہ ہو، برداشت کی طاقت نہ ہو، اسے عموماً غصہ بھی جلدی اور زیادہ ہی آتا ہے، چناں چہ تندرست کی بہ نسبت بیمار کو، جوان کی بہ نسبت بوڑھے کو اور مرد کی بہ نسبت عورت کو جلد غصہ آتا ہے۔ اس لیے غصہ کا زیادہ اور جلدی آنا اور غصہ میں بے قابو ہو جانا دراصل کمزور ہونے کی نشانی ہے، اور اپنے غصہ کو قابو میں کر لینا یہ قوت اور بہادری کی علامت ہے، اسی لیے حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا گیا:

''لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِیْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ''.

یعنی محض دشمن کو اور مدِ مقابل کو شکست دینا کمالِ قوت کی علامت نہیں، اصل قوت یہ ہے کہ آدمی غصہ کے وقت اپنی طبیعت اور نفس پر قابو رکھے، بہادری کا صحیح امتحان اس وقت ہوتا ہے جب مد مقابل خود اپنا نفس ہو؛ کیوں کہ انسان دوسروں کو پچھاڑنے میں تو عام طور سے بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کرتا ہے، لیکن جو نفسانی خواہشات اور محرکات دل میں چھپے ہیں انہیں زیر کرنے اور قابو میں رکھنے کے معاملہ میں نہایت بزدلی اور کمزوری کا مظاہرہ کرتا ہے، خاص کر غصہ کے وقت، اس لیے فرمایا کہ طاقت ور اور پہلوان کہلانے کا اصلی حقدار وہی مردِ مومن ہے جو غصہ اور اشتعال کے وقت نفس کو قابو میں رکھے، یہ ہے مردانگی اور ہمت کی بات۔

بہادر شاہ ظفرؒ نے فرمایا کہ

ظفؔر! آدمی ہرگز اسے نہ جانئے گا
گرچہ کیسا ہو صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(۲) دوسرا سبب: غصہ کا سب سے بڑا سبب عُجب وکبر ہے، جو شخص تکبر سے جتنا دور ہوگا اتنا ہی وہ غصہ سے پاک ہوگا، اس کے برخلاف جو شخص اپنے کمالات پر نظر رکھتا ہے اور خود کو دوسروں کے مقابلہ میں اچھا اور بڑا سمجھتا ہے، جب اس کے مزاج ومذاق کے خلاف یا رائے کے خلاف کوئی بات پیش آتی ہے تو وہ فوراً غصہ ہو جاتا ہے، یہ اس کے عُجب وکبر کی نشانی ہے، اور فی الحقیقت غصہ کی تہہ میں عجب وکبر پوشیدہ ہے، یہی وجہ ہے کہ جس پر غصہ آتا ہے عموماً اس کی حقارت اور اپنی برتری ذہن میں ہوتی ہے، اس وقت وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اپنے مزاج ومذاق کے خلاف کوئی بات برداشت کر لینے میں اپنی بے عزتی ہوگی اور رعب جاتا رہے گا، پھر بعض بدطینت لوگ بھی ایسے موقع پر اسی طرح کی فضول باتیں کہہ کر اکساتے اور آگ پر تیل چھڑکتے ہیں، مگر نبی اکرم، شفیع اعظم، شاہِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

”مَنْ كَظَمَ غَيْظًا، وَهُوَ يَقْدِرُ عَلىٰ أَنْ يُنَفِّذَهٗ، دَعَاهُ اللّٰهُ عَلٰى رُؤُوْسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، حَتّٰى يُخَيِّرَهٗ فِيْ أَيِّ الْحُوْرِ شَآءَ“. (ترمذی وأبو داوٗد، مشکوٰۃ/ص: ۴۳۲)

”جو شخص غصہ کو ضبط کر لے، جب کہ اس میں اتنی طاقت ہو کہ اپنے غصہ کے تقاضے کو پورا کر سکے، (لیکن اس کے باوجود محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے غصہ پی جائے) تو قیامت کے دِن اسے ساری مخلوق کے روبرو بلا کر اختیار دیا جائے گا کہ جنت کی جس حور کو چاہے اپنے لیے پسند کر لے۔“ بعض علماء نے فرمایا کہ غصہ ضبط کرنے پر اتنا اونچا مقام اس لیے دیا جائے گا کہ غصہ دراصل نفس امارہ کی ہیجانی کیفیت کا نام ہے، لہٰذا اب جس نے غصہ کو

ضبط کرلیا گویا اس نے اپنے نفس امارہ کو کچل ڈالا، اس کا یہ انعام ہے۔

بہر حال قرآنِ کریم اور احادیث طیبہ کی ہدایات سے ثابت ہوا کہ اپنے ذاتی اور نفسانی معاملات میں حتی الامکان بے جا غصہ کے تقاضے پر عمل کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

(۳) غصہ کا ایک اور سبب: اور وہ ہے شریعت کی خلاف ورزی، کبھی رب العالمین کی نافرمانی اور شریعت اسلامی کی خلاف ورزی کے باعث غصہ آتا ہے، اس میں کوئی برائی نہیں، بلکہ یہ غصہ تو کمالِ ایمان کی نشانی اور جلالِ ربانی کا عکس ہے، جب شریعت کے کسی حکم کو پامال کیا جائے، سنت کی بے حرمتی کی جائے، اسلام کے ساتھ استہزاء اور مذاق کیا جائے، یا مسلمانوں کے شعائر اور ان کے مفادات پر ضرب لگائی جائے، تو ایسے موقع پر غصہ نہ آنا اور مرعوبیت اختیار کرتے ہوئے مصلحت کوشی سے کام لینا ایمانی تقاضے کے خلاف ہے، اس وقت غصہ آنا ہی باعث اجر وثواب ہے؛ کیوں کہ یہ غصہ اپنے ذاتی مفاد یا نقصان کے لیے نہیں، بلکہ ایمان کی محبت کی وجہ سے آرہا ہے، دشمنانِ دین سے جہاد وغیرہ کے موقع پر یہی غصہ کام آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ یہ نہیں کہ بندہ کے دل میں وہ کیفیت ہی پیدا نہ ہو جس کو غیظ وغضب اور غصہ کے لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، ورنہ قرآنِ کریم میں ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ کے بجائے "وَالْعَادِمِيْنَ الْغَيْظَ" نازل ہوتا، جس کے معنیٰ ہیں کہ (جنتی) لوگ وہ ہیں جو غصہ کو بالکل معدوم اور مفقود وفنا کردیتے ہیں، جب کہ ایسا نہیں فرمایا، اس لیے کہ جب غصہ انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے تو اس کو معدوم اور زائل کرنا ممکن بھی نہیں، لہٰذا غصہ کا ازالہ نہیں بلکہ امالہ مطلوب ومقصود ہے، غصہ کو بالکل فنا اور زائل تو نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس کا رخ پھیرا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ انسان اپنی اصلاح کرلے، چناں چہ اصلاح سے پہلے اگر انسان اپنے نفس کی کمزوری اور عُجب وکبر کی وجہ سے غصہ کرتا تھا تو اب اصلاح کے بعد وہ اپنے رب کے لیے اس کے احکام وشریعت کی خلاف ورزی پر غصہ کرے گا۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "غصہ شکاری

کتے کی طرح سدھایا ہوا ہونا چاہیے، اور جس کا غصہ سدھایا ہوا اور مہذب نہیں وہ باؤلے کتے کی طرح ہے''۔

الغرض! انسان کی اچھی اور بری عادات میں ایک عادت ''غصہ'' بھی ہے، عجیب بات یہ ہے کہ غصہ نہ مطلق اچھا ہے نہ برا، بس رب کے لیے غصہ کرنا اچھا ہے، یہ محمود اور پسندیدہ ہے، اور نفس کے لیے غصہ کرنا مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔

غصہ ضبط کرنے کی فضیلت:

اگر غصہ کے وقت اس کو اللہ تعالیٰ کے لیے ضبط کرلیا تو یہی عمل بے شمار اجر وثواب کا سبب ہے، حتیٰ کہ جن خوش خصال اور پاکیزہ صفات انسانوں کے لیے جنت آراستہ کی گئی ہے قرآنِ کریم نے ان کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے:

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ (اٰل عمران: ۱۳٤)

یعنی ''جنتی لوگ وہ ہیں جو غصہ کو پی جانے والے اور دوسرے کی زیادتی یا قصور کو معاف کردینے والے ہیں۔''

اس سلسلہ میں خاندانِ نبوت کے ایک چشم و چراغ حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما جن کا لقب زین العابدین ہے ان کا ایک عجیب وغریب واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ کی ایک کنیز ایک مرتبہ وضو کرا رہی تھی، اچانک پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر حضرت کے اوپر گرا جس سے تمام کپڑے بھیگ گئے، غصہ آنا طبعی امر تھا، کنیز کو خطرہ ہوا تو اس نے فوراً اس آیت کریمہ کا ایک حصہ تلاوت کیا: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ یہ سنتے ہی آپ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، بالکل خاموش ہو گئے، اس کے بعد کنیز نے آیت کا دوسرا حصہ: ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ پڑھ دیا، تو آپ نے فرمایا: ''میں نے تجھے دل سے معاف کردیا۔'' کنیز بھی ہوشیار تھی، اس نے آخری جملہ بھی سنا دیا: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ جس میں احسان اور حسن سلوک کی ہدایت ہے، آپ نے سن کر فرمایا: ''جا، میں نے تجھے آزاد کردیا۔'' (از:

معارف القرآن:۲/ ۱۸۹)

قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے ایک اور مقام پر اپنے خاص بندوں کی ایک صفت یہی بیان فرمائی ہے:

﴿وَ إِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾ (الشوریٰ : ۳۷)

''جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ اللہ کے لیے معاف کر دیتے ہیں۔'' ایک اور آیت مبارکہ: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِيَ أَحْسَنُ﴾ کی تفسیر حدیث شریف میں اس طرح منقول ہے: ''اَلصَّبْرُ عِنْدَ الْغَضَبِ، والعَفْوُ عَنْدَ الإِسَاءَةِ''. یعنی غصہ کے وقت صبر وضبط سے کام لینا اور برائی کے وقت عفو ودرگذر سے۔

''فَإِذَا فَعَلُوا عَصَمَهُمُ اللّٰهُ، وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوُّهُمْ، كَأَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ قَرِيْبٌ''. (رواه البخاری تعلیقا، مشکوٰۃ/ص: ٤٣٤)

''جب وہ ایسا کریں گے تو حق تعالیٰ بھی ان کی حفاظت فرمائیں گے، اور ان کے دشمن کو ان کے سامنے اس طرح جھکا دیں گے گویا وہ قریب حمیم (رشتہ دار دوست) ہے، ایک اور حدیث میں ہے:

''مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى إِنْفَاذِهٖ، مَلَأَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَلْبَهٗ أَمْنًا وَّ إِيْمَانًا''. (أبو داوٗد: ٢/ ٦٥٩)

''جس شخص نے غصہ کو ضبط کر لیا، حالاں کہ وہ غصہ نافذ کرنے کی طاقت رکھتا تھا، تو حق تعالیٰ اس کا دل امن وسکون اور ایمان وایقان کے نور سے بھر دیں گے، غصہ کا وہ تلخ گھونٹ نور بن کر دارین میں سرور کا ذریعہ بنے گا، اسی لیے مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

کظم غیظ است اے پسر خطِّ اماں
خشم حق یاد آور و در کش عناں

’’اے بیٹے! غصہ کا پی جانا امن کا خط اور فرمان ہے، اللہ تعالیٰ کا غصہ یاد کر اور باگ کھینچ لے۔‘‘

غصے کا علمی علاج:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غصہ اور جلال کو یاد کرنا، اس کی عظمت وطاقت کا تصور اور استحضار یہ غصے کا کامیاب اور مجرب علمی علاج ہے۔ غصے کے وقت اگر آدمی یہ سوچے کہ اگر مجھے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا غصہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت وطاقت مجھ سے بہت ہی زیادہ ہے، اور میری ساری اچھائیاں اور برائیاں اس کے سامنے ہیں، اب اگر وہ مجھ پر غصہ کرنے لگے تو میرا کیا بنے گا؟ اس تصور کے بعد ان شاء اللہ غصہ فوراً ختم ہو جائے گا۔

چناں چہ اس بارے میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ’’عباسی خلیفہ ہارون رشید کے سامنے ایک باغی کو ہتھکڑیوں میں لایا گیا، جو ایک خطرناک شخص تھا، جس کے متعلق ہارون رشید فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے قتل کر دے گا، قتل کا حکم صادر کرنے سے پہلے ہارون رشید نے غضبناک آواز میں باغی سے پوچھا: ’’تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟‘‘ اس نے جواب دیا: ’’وہی جو رب العالمین آپ کے ساتھ کرے گا جب آپ اس کے سامنے جائیں گے‘‘ سنتے ہی ہارون رشید کا غصہ کافور ہو گیا، سر جھکا لیا، چند لمحوں کے بعد درباریوں نے اس کی تھکی ہوئی آواز سنی کہ ’’اسے آزاد کر دیا جائے‘‘ اس حکم کے بعد سپاہیوں نے ہتھکڑیاں کھول دیں اور باغی دربار سے چلا گیا۔ (ماہنامہ راہِ عافیت/ص:۱۵/ بابت: نومبر/ ۲۰۰۷ء)

صاحبو! جب انسان کسی معاملہ کو اپنے اور دوسرے کے درمیان رکھ کر سوچتا ہے تو غصہ بڑھ جاتا ہے اور انتقام کی چنگاری شعلہ بن جاتی ہے، مگر جب وہی انسان اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان اپنے رب کو رکھ کر سوچتا ہے تو غصہ کی آگ محبت کی شبنم میں تبدیل ہو جاتی ہے، پھر معاف کرنا نہ صرف آسان ہو جاتا ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی لذت محسوس ہونے لگتی

ہے۔صحیح کہا جس نے کہا:

اپنے کردار کی عظمت کو رسوا نہ کیا ہم نے
دھوکے تو بہت کھائے، دھوکہ نہ دیا ہم نے

غصے کا عملی علاج:

بہر کیف غصہ چوں کہ ایک طبعی چیز بھی ہے، لہٰذا اگر کسی غیر مناسب بات پر غصہ آ ہی جائے تو حکم یہ ہے کہ اس کے تقاضے پر عمل کرنے کے بجائے پہلی فرصت میں اسے دفع کرنے کی کوشش کریں، جس کے مختلف طریقے کتاب وسنت میں عملی طور پر بتائے گئے ہیں:

(۱) **اعوذ باللہ پڑھیں:** اس لیے کہ عام طور پر غصہ شیطان دلاتا ہے، اور اعوذ باللہ پڑھنے سے شیطان بھاگ جاتا ہے اور انسان پر شیطان کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں، حدیث میں ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سخت غضبناک دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر وہ اس کو پڑھ لے تو اس کا غصہ جاتا رہے۔'' پھر پوچھنے پر فرمایا: ''وہ کلمہ ''أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم'' ہے۔ (الترغیب والترہیب: ۳/۳۰۳)

(۲) **وضو کریں:** (یا پانی پی لیں) اس لیے کہ غصہ آگ ہے، جس کو پانی بجھاتا ہے، لہٰذا جب آدمی پانی استعمال کرے گا تو پانی کا پینا یا وضو کرنا اس کے اندر غصہ کی آگ کو خود بخود بجھا دے گا۔ حدیث میں ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غصہ شیطان کے اثر سے ہوتا ہے، اور شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے، اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، اس لیے جب کسی کو غصہ آئے تو وضو کر لیا کرے۔ (ابوداود، مشکوٰۃ ص: ۴۳۴، الترغیب والترہیب: ۳/۳۰۴)

(۳) **بیٹھ جائیں یا لیٹ جائیں:** اس لیے کہ انسان کی اصل مٹی ہے، اور اس طریقہ سے وہ اپنی اصل کے قریب ہو جائے گا، جب کھڑا تھا تو زمین سے دور تھا، بیٹھا تو قریب ہو گیا، اور لیٹا تو بالکل ہی قریب ہو گیا، اور زمین میں چوں کہ عاجزی اور نرمی ہے، لہٰذا جب انسان اپنی اصل یعنی مٹی کے قریب ہو گا تو اس کی وجہ سے حق تعالیٰ اس کے اندر بھی عاجزی اور نرمی پیدا

فرما کر غصہ کو دور فرما دیں گے، حدیث میں ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ”جب کسی کو غصہ آئے تو اسے چاہیے کہ وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھنے سے بھی غصہ نہ جائے تو لیٹ جائے۔“ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ ص:۴۳۴، الترغیب والترہیب:۳۰۲/۳)

(۴) خاموش ہو جائیں، یا موقع سے ہٹ جائیں: علاوہ ازیں جب کبھی غصہ آ جائے تو خاموشی اختیار کر لیں، بالکل نہ بولیں؛ اس لیے کہ اس وقت اگر کچھ بولے گا تو یا تو کسی شر کا دروازہ کھولے گا، یا غصہ میں کوئی ایسی بات کر دے گا جس سے فساد اور بڑھے گا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی بات پر غصہ آتا تو بسا اوقات آپ ﷺ بالکل خاموش ہو جاتے تھے، بس آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک انار کی طرح سرخ ہو جاتا، جس سے صحابہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے غصہ کا اندازہ لگا لیا کرتے، تو یہ بھی ایک پیارا نسخہ ہے کہ غصہ کے وقت خاموش ہو جائیں، اس سے غصہ دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جائے گا اور بات آگے نہ بڑھے گی، حدیث میں ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو چاہیے کہ وہ اس وقت خاموشی اختیار کر لے۔“ (مسند احمد از معارف الحدیث:۲۳۰/۲)

یا پھر جس کسی پر غصہ آئے تو بہتر ہے کہ اس کے سامنے سے ہٹ جائے، بالخصوص گھر والوں یا بیوی پر غصہ ہو تو سامنے سے ہٹ کر کسی کمرہ میں چلا جائے یا گھر سے باہر آ جائے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کیا تھا، اس لیے کہ اگر وہیں کھڑے رہیں گے تو بات آگے بھی بڑھ سکتی ہے، لہٰذا اس جگہ سے ہٹ جائیں، مسجد چلے جائیں، یا کسی نیک آدمی کے پاس چلے جائیں، ذکر واذکار یا اچھے کام میں مشغول ہو جائیں۔ ان شاء اللہ ان طریقوں پر عمل کرنے سے غصہ مہذب اور مسخر ہو کر قابو میں آ جائے گا، جس کے نتیجہ میں بہت سے نقصانات اور مہلکات سے حفاظت ہوگی۔

حق تعالیٰ ان حقائق کو سمجھا دے اور توفیق عمل عطا فرما دے۔ آمین۔

”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

(۲۱)

حسد کی حقیقت
اس کے احکامات اور نقصانات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِىۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ”إِيَّاكُمۡ وَ الۡحَسَدَ، فَإِنَّ الۡحَسَدَ يَأۡكُلُ الۡحَسَنَاتِ كَمَا تَأۡكُلُ النَّارُ الۡحَطَبَ“. (رواه أبو داوٗد، مشكوٰة/ ص: ۴۲۸/ باب ما يُنۡهى عنهُ من التهاجر والتقاطع واتباع العورات/ الفصل الثانى)

ترجمہ: حسد سے لازمی طور پر بچو! بلاشبہ حسد حسنات (نیکیوں) کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

حسد روحانی بیماریوں کا مجموعہ اور گناہوں کا پیش خیمہ ہے:

احکامِ الٰہی دو طرح کے ہیں: (۱) ظاہری۔ (۲) باطنی۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ احکام تو ظاہری اعتبار سے فرض وواجب ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اسی طرح ہر قسم کے گناہوں سے بچنا، یہ سب فرض ہے، ان سے ترقی ہوتی ہے، لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ احکام

باطنی طور پر فرض ہیں، جیسے حسد، کینہ، بغض وعداوت وغیرہ سے بچنا فرض ہے، ان کے ارتکاب سے تنزلی ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات ان باتوں سے اجتناب نہ کرنے کی صورت میں ظاہری احکام وفرائض کی ادائیگی بھی بے معنیٰ اور بے سود ہو جاتی ہے۔ چناں چہ حدیث مذکور سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے، جس میں ارشاد ہوا کہ ''حسد سے بچو، ورنہ طاعات اور حسنات مٹ جائیں گی، گویا نیکی برباد اور گناہ لازم آئے گا۔ کیوں کہ حسد کئی باطنی وروحانی اور نفسانی بیماریوں کا مجموعہ اور گناہوں کا پیش خیمہ ہے، مثلاً حسد سے کینہ، قطع رحمی، بہتان تراشی، دروغ گوئی، پردہ دری، غیبت، تجسس اور ایذاءِ مسلم وغیرہ بہت سی روحانی بیماریاں اور برائیاں وجود میں آتی ہیں، جیسا کہ آئندہ اس کی حقیقت اور نقصانات سے واضح ہو جائے گا۔

حسد کی حقیقت:

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ حسد کی حقیقت اور تعریف ہے: ''تَمَنِّی زَوَالِ نِعْمَةِ الْغَیْرِ'' (شرحِ مسلم: ۲/۳۱۵) ''کسی بندۂ خدا کو حاصل دینی، دنیوی، علمی، عملی، مالی، جسمانی اور اخلاقی وایمانی نعمت الٰہی کو دیکھ کر ناراض ہونا اور دل ہی دل میں اس کے زوال اور خاتمہ کی تمنا کرنا اصطلاح شریعت میں حسد کہلاتا ہے۔'' پھر عجیب بات یہ ہے کہ جسے جتنی بڑی نعمت ملتی ہے اس پر اتنا ہی زیادہ حسد کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے تھے: ''جس پر حسد نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں، اور جو محسود نہیں وہ عظیم نہیں، اور سب سے زیادہ محسود تو حضور اکرم ﷺ تھے، جن پر آپ ﷺ کے قبیلے والوں نے حسد کیا۔'' درحقیقت یہ حسد تقدیرِ الٰہی و تقسیم خداوندی پر ناراضگی کا اظہار بلکہ اعتراض ہے؛ کیوں کہ حاسد کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو مال و دولت، جاہ وعزت، علم وحکمت اور حسن سیرت و صورت وغیرہ کی جو نعمت ملی ہے وہ اس کو نہیں ملنی چاہیے تھی، قَسَّامِ ازل، قادرِ مطلق، فعالٌ لما یرید اور عالم الغیب والشہادۃ نے اس کا انتخاب اور سلیکشن غلط کیا ہے۔ (العیاذ باللہ العظیم) کبھی کبھی حاسد محسود کے بارے میں زبانِ حال کے ساتھ زبانِ قال سے بھی اس کا اظہار کرتا

ہے، ظاہر ہے کہ شریعت مطہرہ میں یہ حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

حسد کی قسمیں:

علماءِ محققین نے حسد کی کئی قسمیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) **پہلی قسم:** یہ ہے کہ حاسد کے دل میں یہ تمنا ہو کہ محسود کے پاس جو دینی و دنیوی کمال اور نعمت ہے خواہ وہ مجھے ملے یا نہ ملے، لیکن اس سے بہرحال زائل اور ختم ہو جائے۔ یہ حسد کی انتہائی گھناؤنی قسم ہے، منافقین اسی قسم کے حسد میں مبتلا تھے، وہ مومنین کے ایمان کی دولت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مٹ جانے کے متمنی تھے، اور حسد منافق کا کام ہے، مومن کا نہیں۔

(۲) **دوسری قسم:** یہ ہے کہ حاسد کے دل میں یہ آرزو ہو کہ محسود کے پاس جو دینی و دنیوی کمال اور نعمت ہے وہ اس سے زائل اور ضائع ہو کر ہمیں مل جائے، یہ بھی حسد کی بہت بری قسم ہے، بدباطن یہودِ بے بہبود اسی حسد میں مبتلا تھے، وہ بھی مومنین سے ایمان کی دولت ختم ہو جانے کے خواہش مند تھے۔ ان کے متعلق قرآنِ کریم کی صراحت ہے:

﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ ﴾ (البقرة: ۱۰۹)

''اکثر اہل کتاب (مراد یہود وغیرہ ہیں ان) کے دل میں بر بنائے حسد یہ آرزو مچلتی ہے کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف لوٹا دیں۔'' (تاکہ ایمان کی بدولت جو مرتبہ و مقام تمہیں میسر ہوا وہ انہیں مل جائے) ان کی اسی عادتِ بد کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا:

﴿ أَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ (النسآء: ۵۴)

حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو جو کچھ دیا

اس پر وہ حسد کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسد ہر نعمت پر برا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (النسآء: ۳۲)

''حق تعالیٰ نے جس چیز میں تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تم اس کی ہوس نہ کرو۔'' اس سے باہم تحاسد وتباغض پیدا ہوتا ہے اور حکمت الٰہی کی مخالفت بھی لازم آتی ہے، البتہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو ظلم ومعصیت میں استعمال کرتا ہو تو اس پر حسد کرنا منع نہیں ہے، اس وقت اس کے زوالِ نعمت کی تمنا جائز ہے۔

(۳) تیسری قسم: یہ ہے کہ حاسد کے دل میں محسود کی دینی ودنیوی نعمت کو دیکھ کر صرف جلن اور تکلیف ہو، لیکن اس کا کسی طرح اپنے قول وفعل سے نہ اظہار کرے اور نہ حسد کے مقتضیٰ پر عمل کرے، بلکہ محسود کو نقصان پہنچانے سے مکمل اجتناب کرے، علماء نے فرمایا کہ حسد میں مبتلا یہ شخص ذاتی طور پر بچنے کی کوشش کے باوجود بلا ارادہ مبتلا ہو جائے تو معذور تسلیم کیا جائے گا اور گنہگار نہ ہوگا۔

(۴) چوتھی قسم: یہ ہے کہ کسی کی دینی ودنیوی نعمت کو دیکھ کر انسان اپنے لیے اس جیسی نعمت کی تمنا تو کرے، لیکن صاحب نعمت کے بارے میں کوئی غلط خیال اپنے دل میں نہ لائے، عربی میں حسد کی اس قسم کو ''غبطہ'' اور اردو میں ''رشک'' کہتے ہیں، شرعی اعتبار سے اس میں کوئی ممانعت اور قباحت نہیں، بلکہ جائز ہے؛ کیوں کہ یہ بھی انسانی فطرت میں داخل ہے، شاید اسی لیے کہا گیا ہے: ''مَا خَلَا جَسَدٌ عَنْ حَسَدٍ'' کوئی جسد (جسم) حسد سے خالی نہیں ہوتا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ مومن کامل میں رشک ہوتا ہے، جو کہ جائز ہے، جب کہ فاسق اور منافق میں حسد ہوتا ہے۔ جو بہت بری بلا اور باطنی اور روحانی بیماری ہے۔

حسد کے اسباب:

پھر یہ روحانی مرض کن کن علل اور وجوہ سے ہوتا ہے اس کا حقیقی علم تو اللہ علیم بذات الصدور ہی کو ہے، مگر ظاہری اعتبار سے حسد کے چند اسباب ہیں:

(۱) دشمنی: حسد کا پہلا سبب بغض وعداوت ہے، اکثر جذبۂ عداوت ہی حسد کی راہ ہموار کرتا ہے، اس سبب سے پیدا ہونے والا حسد عام ہوتا ہے، اس میں مساوات کی قید نہیں، ایک پڑھا لکھا اور اَن پڑھ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص سے حسد کر کے اس کا بدخواہ ہوسکتا ہے، بدقسمتی سے دورِ حاضر میں آئے دن اس کے نمونے اور مظاہر نظر آتے رہتے ہیں، سماج کے بے کار اور بے توفیق افراد عموماً ہمہ دانی کے مدعی اور جہل مرکب میں مبتلا ہو کر قوم کی قابل رشک علمی وعملی ہستیوں پر حسد کرنے لگتے ہیں، اور ان کی ترقی کی راہ میں خواہ مخواہ حائل ہونے کی بے فائدہ کوشش کرتے ہیں، جس سے ان قابل احترام شخصیتوں کا تو خاص کچھ نقصان ہوتا نہیں، البتہ خود ان حاسدوں کو بلا وجہ حسد کی آگ میں جلنا پڑتا ہے اور کف افسوس ملنا پڑتا ہے، ان سے کہہ دیجئے گا:

کیوں حسد کی آگ میں جل رہے ہو؟
کف افسوس کیوں مل رہے ہو؟
اللہ کے فیصلے سے ناراض کیوں ہو رہے ہو؟
جہنم کی طرف تم کیوں چل رہے ہو؟

امامِ تعبیر حضرت محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے الحمدللہ کبھی کسی پر حسد نہیں کیا؛ کیوں کہ محسود اگر جنتی ہے تو اس پر حسد کرنے کا کیا مطلب؟ اور اگر وہ (جس پر حسد کیا جائے) جہنمی ہے تو اس پر بھی حسد کرنا بے معنیٰ اور بے فائدہ ہے، گویا حسد کرنا بہرحال فائدہ سے خالی عمل ہے۔

اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حسد کی آگ میں جل کر کباب ہو جانے سے محبت کی فضا میں کھل کر گلاب ہو جانا بہتر ہے۔

(۲) بڑائی: حسد کا دوسرا سبب فخر وتکبر ہے، چناں چہ اس سبب سے سب سے پہلے آسمانوں پر حسد شیطان نے کیا تھا، جب ابوالبشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ رب

العزت نے اپنی خلافت کے لیے پسند فرمایا تو شیطان کے دل میں اپنی بڑائی کا احساس اور کبر کا جذبہ پیدا ہوا، جس کے سبب اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے حسد کیا، نتیجہ کیا ہوا؟ شیطان اس کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا، حکم ہوا:

﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ o وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (ص: ۷۸)

”نکل جا یہاں سے کہ تو مردود ہے، اور میری رحمت سے اب قیامت تک تو دور ہے۔“ جس کے دل میں اپنی بڑائی کا احساس اور دوسروں کی حقارت ہوتی ہے وہ عموماً دوسروں کی اچھائی اور نیک نامی دیکھ نہیں سکتا، اس سے اس متکبر کے دل میں جلن اور حسد پیدا ہوتا ہے، جو دراصل شیطانی روِش ہے، لہٰذا ایک مومن کامل اور عقلمند کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس ملعون کی چال چلے۔

(۳) ہم عصری: حسد کا تیسرا سبب محسود اور صاحب نعمت کا ہم عصر، ہم عمر اور ہم درجہ وہم مرتبہ ہونا ہے، بعض اوقات معاصرین میں سے کسی کو جب دینی یا دنیوی نعمت ملتی ہے تو اس کے سبب بھی حسد ہوتا ہے کہ یہ ہمارے لیول اور لائن کا آدمی ہے، پھر ہم پر فوقیت کیسے لے گیا؟ اپنے ہم عصر کی برتری بعض لوگ دیکھ نہیں سکتے، یوں تو یہ بات ہر لائن کے لوگوں میں پائی جاتی ہے، لیکن افسوس صد افسوس کہ بعض علماء بھی اس میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ أعاذنا اللّٰه.

(۴) حب جاہ اور حب باہ: حسد کا چوتھا سبب شہرت اور شہوت کی محبت ہے۔ جب حاسد پر اس کا غلبہ ہوتا ہے تو ان چیزوں کو وہ محسود کے پاس دیکھ کر حسد کرنے لگتا ہے کہ جیسی عزت، دولت، شہرت اور حسن سیرت وصورت وغیرہ چیزیں اسے ملی ہیں یہ سب کچھ مجھے بھی ضرور ملے، پھر نہ ملنے کی صورت میں حسد ہونے لگتا ہے۔ چناں چہ روئے زمین پر سب سے پہلا قتل بے گناہ حسد کی اسی قسم کی بنا پر ہوا تھا، حضرت ہابیل کے مقدر میں عزت اور خوبصورت بیوی آئی اور قابیل اس سے محروم رہا، وہ چاہتا تھا کہ یہ مجھے مل جائے، لیکن جب

اس کے من کی مراد پوری نہ ہوئی تو حسد میں مبتلا ہو کر اپنے حقیقی بھائی کو قتل کر بیٹھا، یہ زمین پر سب سے پہلا قتل تھا جو حسد کے سبب ہوا تھا۔ عربی کا شاعر کہتا ہے:

كُلُّ الْعَدَاوَاتِ قَدْ تُرْجٰى إِزَالَتُهَا ☆ إِلَّا عَدَاوَةَ مَنْ عَادَاكَ مِنْ حَسَدٍ

''ہر دشمنی کو ختم کرنا آسان ہے، لیکن اس دشمنی کے خاتمہ کی امید نہیں جو بر بنائے حسد ہو۔'' اس کا نتیجہ کبھی قتل ناحق اور ہلاکت ہوتا ہے، دیکھئے سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اسی حسد کے نتیجہ میں کیا، تو معلوم ہوا کہ ہمیشہ اس حسد نے انسان کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔

حسد کے متعلق ایک واقعہ:

کہتے ہیں کسریٰ کے دربار میں ایک مچھیرا خوبصورت مچھلی بطورِ تحفہ لے کر حاضر ہوا، جس کا وزن تقریباً چار کلو تھا، شاہ کسریٰ نے اس کو بخوشی قبول کرلیا اور چار ہزار درہم انعام میں پیش کیے، یہ دیکھ کر اس کی ایک منہ لگی لونڈی کو حسد ہوا، وہ کہنے لگی: ''حضور! میں اس مچھیرے سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں'' اجازت ملنے پر اس نے پوچھا: ''یہ مچھلی نر ہے یا مادہ؟'' اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر جواب میں مچھیرا نر کہے گا تو میں کہوں گی کہ بادشاہ کے لیے مادہ مچھلی مفید ہے، اور اگر مادہ کہے گا تو میں نر کی خصوصیات بیان کر کے انعام واپس کرالوں گی، لیکن مچھیرا بھی بڑا ہوشیار تھا، کہنے لگا: ''لَا ذَكَرٌ وَّلَا أُنْثٰى، بَلْ هِيَ خُنْثٰى'' نہ نر ہے نہ مادہ، بلکہ یہ تو خنثیٰ ہے۔ بادشاہ اس جواب سے بہت محظوظ و مسرور ہوا اور مزید چار ہزار انعام کا حکم دیا، مچھیرا خوشی خوشی لے کر جانے لگا تو ایک درہم اس کے ہاتھ سے گر گیا، تو اس نے فوراً اسے اٹھا لیا، اب یہ بات دربارِ کسریٰ کے خلاف تھی، اس لیے اس حاسد لونڈی کو پھر ایک موقع مل گیا، کہنے لگی: ''میرے آقا! یہ شخص تو بڑا لالچی اور حریص معلوم ہوتا ہے، آپ نے اسے مالا مال کر دیا، پھر بھی محض ایک درہم زمین پر گرا وہ بھی اٹھا لیا، جو دربار شاہی کے شایان شان نہیں ہے'' بادشاہ نے اس کی وجہ پوچھی، تو اس نے کہا: ''عالی جاہ! بات یہ ہے کہ درہم پر

آپ کی تصویر اور نام ہے، اسے زمین پر کیسے پڑا رہنے دوں؟'' جواب سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور مزید چار ہزار درہم انعام میں پیش کیے، یہ دیکھ کر مارے حسد کے لونڈی کی حالت اور خراب ہوگئی اور دانت پیس کر رہ گئی، یہی حال ہوتا ہے حاسد کا۔ (از: ماہنامہ حرم/ص:۲۱/ بابت: جنوری/۲۰۱۲ء)

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے وقت اللہ جل شانہ کے حکم سے اپنی امت کے مومنین کو لے کر جب کشتی میں سوار ہوئے تو ایک بوڑھا بھی اس میں سوار ہوگیا، جس کو کوئی جانتا نہ تھا، پھر آپ نے چوں کہ ہر چیز کا جوڑا لیا تھا، اور وہ بوڑھا تنہا تھا، اس لیے مشکوک ہوگیا، شک کی بنیاد پر اسے گرفتار کر کے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس لایا گیا، آپ نے پوچھا: ''کون ہو تم؟'' کہنے لگا: ''حضرت! میں ہی بدنامِ زمانہ شیطان ہوں'' آپ نے اسے بھگانا چاہا تو خوشامد کرنے لگا اور بولا: ''حضرت! آپ مجھے کشتی سے مت اتاریئے، میں آپ کو وہ گر بتاتا ہوں جس سے لوگوں کا بہت نقصان ہوتا ہے'' آپ نے فرمایا: ''ٹھیک ہے، پھر جلدی بتا'' شیطان نے کہا: ''حضرت! دو باتوں سے انسانوں کو میں بہت نقصان پہنچاتا ہوں: (۱) حسد۔ (۲) حرص۔ ان میں حسد تو ایسی خطرناک برائی ہے کہ میں خود اس کی وجہ سے برباد ہوا، اور حرص وہ چیز ہے جس نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتروایا، اس لیے میں ان ہی دو چیزوں کی وجہ سے انسانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہوں۔ (از: بکھرے موتی ص:۵/۱۶۴)

حسد کے نقصانات:

واقعہ یہ ہے کہ حسد ایسی مہلک وموذی اور روحانی برائی و بیماری ہے کہ اس کے نقصانات کا دائرہ بہت وسیع ہے، جو بسا اوقات انسان کو تباہ اور ہلاک کر دیتا ہے۔

(۱) پہلا نقصان: حسد کا یہ ہے کہ اس سے ربِ کریم ناراض ہو کر اپنی نعمتوں سے حاسد کو محروم کر دیتا ہے، اسی لیے طبرانی کی حدیث میں ہے: ''لَا یَزَالُ النَّاسُ بِخَیْرٍ مَا

لَمْ یَتَحَاسَدُوْا''. ''لوگ آپس میں اگر حسد نہ کریں تو حق تعالیٰ ان سے اپنی عطا کردہ نعمتوں کو زائل نہ کریں اور وہ خیر پر رہیں گے۔'' معلوم ہوا کہ حسد سے بھی نعمتیں ضائع ہوتی ہیں۔

(۲) دوسرا نقصان: حسد کا یہ ہے کہ اس سے نیکیوں کا حسن وکمال ختم ہوجاتا ہے۔ اسی کو حدیث پاک میں فرمایا گیا: ''إِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ؛ فَإِنَّ الْحَسَدَ یَأْکُلُ الْحَسَنَاتِ، کَمَا تَأْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ''. لوگو! حسد سے بچو؛ کیوں کہ جو معاملہ آگ اور لکڑی کا ہے وہی حسد اور نیکی کا ہے، جیسے آگ لکڑی کو جلا کر ختم کردیتی ہے اسی طرح حسد نیکی کو برباد کرتا ہے۔ رومیٔ زمانہ حضرت حکیم العصر مولانا حکیم محمد اختر صاحب اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں:

مصطفیٰ فرمود نیکی را حسد
ہمچو آتش چوبہا را می خورد

''احمد مصطفیٰ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھاجاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو۔''

لیکن یہاں ایک وضاحت ضروری ہے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک چوں کہ گناہوں سے اعمال حبط (مکمل طور پر ضائع) نہیں ہوتے، (جیسا کہ معتزلہ کا خیال ہے) اس لیے اس قسم کی احادیث کے پیش نظر حضراتِ محدثین فرماتے ہیں کہ نیکیوں کو مٹانے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کا حسن وکمال مٹ جاتا ہے۔ فافهم، والله أعلم وعلمه أحكم وأتم. (مستفاد از: مفتاح الاسرار: ۱/۳۲۷)

(۳) تیسرا نقصان: حسد کا یہ ہوتا ہے کہ حاسد حسد سے حسرت میں مبتلا ہوکر بعض اوقات ڈیپریشن تک کا شکار ہوجاتا ہے، حاسد محسود کے بارے میں دل ہی دل میں غلط اور برا سوچ سوچ کر جلتا رہتا ہے؛ کیوں کہ حسد کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حاسد اپنی تکلیف سے زیادہ محسود کی خوشی سے پریشان ہوتا ہے، اور اپنی راحت سے زیادہ محسود کی تکلیف سے خوش ہوتا ہے، غرض یہ کہ حاسد کا شر بڑا خطرناک ہوتا ہے، اسی لیے اس کے شر سے پناہ مانگنے کا ذکر

قرآن میں ہے:

﴿ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ (الفلق : ۵)

فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ فرماتے ہیں کہ ''حسد کے اثرات محسود تک پہنچنے سے پہلے ہی حاسد کو پانچ قسم کے نقصانات ہوتے ہیں: (۱) دائمی غم وفکر۔ (۲) بلا اجر مصیبت۔ (۳) ناقابل تحمل مذمت۔ (۴) اللہ پاک کی ناراضگی۔ (۵) عمل اور نیکی سے محرومی۔''

(از تنبیہ الغافلین مترجم: ص: ۱۹۵)

(۴) چوتھا نقصان: حسد کا یہ ہے کہ اس سے ایمان اور نجات خطرہ میں پڑ جاتی ہے، اس کو بعض علماء نے ایک عجیب وغریب علمی نکتہ سے ثابت کیا ہے کہ دیکھئے! حدیث میں وارد ہے کہ اللہ کے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ قیامت سے قبل بہتّر فرقے وجود میں آئیں گے، ان میں سے ایک فرقہ جو میرے اور میرے اصحاب رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر ہوگا وہ نجات پائے گا، باقی بہتّر فرقے ہلاک ہوجائیں گے، اب حدیث میں جو بہتّر کا عدد ہے غور کیا جائے تو حسد کا وہی عدد ہے۔ (علم الاعداد کے اعتبار سے) ''ح'' کے آٹھ، ''س'' کے ساٹھ، اور ''د'' کے چار، یہ سب مل کر بہتّر ہوگئے۔ پس حسد کرنے والے کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ- العیاذ باللہ العظیم- کہیں وہ اس کی وجہ سے ایمان ونجات سے محروم ہوکر بہتّر جہنمی فرقوں میں شامل نہ ہوجائے۔ علاوہ ازیں ایک اور نکتہ یہ بھی بڑا دلچسپ ہے کہ حسد میں جتنے بھی حروف ہیں کسی میں نقطہ نہیں ہے، سب خالی اور بغیر نقطے کے ہیں، اسی طرح جس کے دل میں حسد ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا دل خیر اور نیکی کے کمال سے بالکل خالی ہوجائے۔

حسد کا علاج:

اس خطرناک مرض سے یقینی طور پر نجات پانے کے لیے چند علاج ہیں:

(۱) پہلا علاج: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس سے نجات کی دعا کریں اور کتاب وسنت میں حسد کی جو تباہ کاریاں اور نقصانات بتائے گئے ہیں انہیں مستحضر رکھیں، ٹھنڈے دل

سے تنہائی میں بیٹھ کر سوچیں، اسی کے ساتھ یہ بھی سوچیں کہ میرے حسد سے محسود کا نہیں، خود میرا اپنا ہی نقصان دینی و دنیوی اعتبار سے ہوگا۔

(۲) دوسرا علاج: حسد سے بچنے کی ایک تدبیر یہ ہے کہ ہمیشہ دنیوی امور میں نظر خود سے نیچے والوں پر رکھیں، تا کہ جذبۂ شکر پیدا ہو اور حسد سے حفاظت ہو۔

(۳) تیسرا علاج: غائبانہ طور پر محسود کے حق میں دعائیں کریں اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریفیں کریں، خواہ بتکلف ہی کیوں نہ ہو، نیز محسود کے ساتھ محبت و احسان کا معاملہ کریں، سلام میں پہل کریں۔

(۴) چوتھا علاج: اپنے پاس جو کچھ نعمتیں ہیں ان پر قناعت اختیار کریں، اور قضائے الٰہی پر راضی ہو جائیں، اگر بتقاضائے بشریت حسد کا خیال دل میں آجائے تو اس کے مقتضا پر عمل نہ کریں۔ اس کے باوجود اگر حسد دور نہ ہو تو اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے معافی مانگ لیں۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دے اور عمل کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین۔

یومِ عرفہ/ ۱۴۳۱ھ

مطابق: ۱۶/ نومبر/ ۲۰۱۰ء/ بروز: منگل

" اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

☆......☆......☆

(۲۲)

رشوت کی حقیقت
اس کے احکامات اور نقصانات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ عَبۡدِ اللّٰهِ بۡنِ عَمۡروٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: "لَعَنَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ الرَّاشِيَ وَالۡمُرۡتَشِيَ". (رواه أبوداود وابن ماجه و رواه الترمذی عنه وعن أبی هريرةؓ، و رواه أحمد والبيهقی فی شعب الإيمان عن ثوبانؓ، وَزَادَ: "والرَّائِشَ" يَعۡنِیۡ الَّذِیۡ يَمۡشِیۡ بَيۡنَهُمَا. (مشكوة/ص: ٣٢٦/باب رزق الولاة وهداياهم/الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے اور لینے والے پر لعنت فرمائی اور اس شخص پر بھی جو ان دونوں کے درمیان واسطہ بنے۔''

رشوت کی حقیقت:

مال دنیوی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے، اس لیے مناسب طریقے سے اس کا حصول بھی ضروری ہے، لیکن اس کو حاصل کرنے کے کچھ اسباب وذرائع تو جائز اور پسندیدہ

ہیں، اور بعض اسباب وذرائع ناجائز اور ممنوع ہیں، منجملہ ان میں سے ایک سبب رشوت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی حکومت یا کسی ادارہ و کمپنی کی جانب سے کسی کام کے لیے مقرر و متعین ہے، اور وہ اس کام اور ذمہ داری نبھانے پر تنخواہ وصول کرتا ہے، اس کے باوجود اسی کام و ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے لوگوں سے ناحق معاوضہ اور رقم وغیرہ لیتا ہے، یہ رشوت ہے، اسی طرح وہ مال جو کسی ملازم، افسر یا جج وغیرہ کو غیر شرعی و غیر قانونی کام انجام دینے کے لیے یا دوسرے لفظوں میں غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط قرار دینے کے لیے دیا جائے اسے بھی رشوت کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی شریف انسان اور کوئی سنجیدہ قانون و مذہب اسے صحیح نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ اس کی ہلاکتوں کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے، رشوت سے افراد ہی نہیں، بلکہ قوموں اور ملکوں کی معیشت تباہ ہو کر اس میں مبتلا لوگوں کے معاش و معاد دونوں برباد ہو جاتے ہیں، اس لیے شرعاً وعقلاً ہر اعتبار سے رشوت حرام، ناجائز اور ناپسندیدہ ہے۔

قرآن وحدیث میں رشوت کی مذمت:

قرآن وحدیث میں رشوت کا معاملہ کرنے والوں کی سخت مذمت آئی ہے، قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرة : ۱۸۸)

’’اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقوں سے نہ کھاؤ، اور نہ اس کا مقدمہ حاکموں کے پاس اس غرض سے لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہڑپ کرنے کا گناہ کرو۔‘‘

علماءِ مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ مال حاصل کرنے کی جتنی بھی ناجائز صورتیں ہیں ان تمام پر حاوی ہے، جن میں بطورِ خاص رشوت داخل ہے، اس ممانعت کے باوجود اگر کوئی شخص حرص ولالچ کی وجہ سے ناجائز طریقہ سے مال حاصل کرتا ہے اور رشوت

وغیرہ کا معاملہ کرتا ہے تو وہ اللہ رب العزت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں مستحق لعنت ہے، چناں چہ حدیث مذکور میں فرمایا کہ "لَعَنَ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ" رشوت کا لین دین کرنے والوں پر لعنت ہے۔ اس حدیث میں "راشی" کا جو لفظ آیا ہے تو اس سے مراد وہ شخص ہے جو رشوت دیتا ہے، خواہ مال کی شکل میں یا کوئی ایسی صورت اختیار کرتا ہے جس میں رشوت لینے والے کو غلط و ناجائز طریقہ پر فائدہ پہنچتا ہے، پھر عموماً چوں کہ رشوت دینے والا پہل کرتا ہے؛ اس لیے اس کا تذکرہ حدیث مذکور میں پہلے کیا گیا۔ (واللہ اعلم) دوسرا لفظ ہے: "مرتشی" اس سے مراد وہ شخص ہے جو رشوت وصول کرتا ہے اور اس کے بدلہ میں رشوت دینے والے کو ناجائز طریقہ پر نفع پہنچاتا ہے، جس کے سبب دوسرے حقدار کا حق مارا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اس حدیث کی بعض روایتوں میں ایک لفظ "وَالرَّائِشَ" کا اضافہ ہے، تو رائش سے مراد وہ شخص ہے جو رشوت لینے اور دینے والے کے درمیان واسطہ اور وسیلہ بنتا ہے، جیسے کوئی بڑا ذمہ دار یا افسر وغیرہ ہے، وہ براہِ راست رشوت کی رقم وصول نہیں کرتا، بلکہ درمیانی آدمی (ایجنٹ) کا سہارا لیتا ہے، تو یہ درمیانی آدمی رائش کہلاتا ہے، جو باطل اور فساد میں مددگار رہوتا ہے، اس لیے یہ تینوں مستحق لعنت ہیں۔

رشوت اور لعنت:

اور رشوت کے ساتھ لعنت کا جو لفظ وارد ہوا ہے دراصل یہ نہایت ہی سنگین سزا ہے؛ کیوں کہ کسی گناہ گار و مجرم کے لیے اللہ تعالیٰ یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لعنت ان ملعونوں سے انتہائی ناراضگی و بے زاری کا اظہار و اعلان ہے، قرآن کا اعلان ہے:

﴿وَمَنْ يَلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِيْرًا﴾ (النساء: ۵۲)

"جس پر اللہ تعالیٰ خود لعنت کرے تو آپ اس کے لیے کوئی حامی و مددگار ہرگز نہیں پائیں گے۔" جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائے، یا اس میں کچھ کمی کرائے۔ حضرت محقق اسلام مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی پر

لعنت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ربِ رحمٰن ورحیم نے اس مجرم کو اپنی وسیع رحمت سے محروم کر دینے کا فیصلہ فرما دیا ہے، اور اللہ کے رسول یا فرشتوں کی طرف سے لعنت کا مطلب اس شخص سے بے زاری اور اس کے قابل لعنت ہونے کا اعلان اور اللہ کی رحمت سے محروم کر دیے جانے کی بددعا ہوتی ہے، اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے یا دینے (اور ان کے مابین واسطہ بننے) والوں سے اپنی انتہائی ناراضگی و بیزاری کا اظہار فرمایا اور ان کے لیے بددعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے محروم کر دے۔ اللہ کی پناہ! رحمۃ للعالمین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم جس بدنصیب سے بے زاری کا اعلان فرمائیں اور اس کے لیے رحمت الٰہی سے محروم کیے جانے کی بددعا فرمائیں اس بدبخت کا کہاں ٹھکانہ۔
(از: معارف الحدیث: ۷/۲۰۶)

رشوت اور ہلاکت:

ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ رشوت کوئی معمولی جرم نہیں، بلکہ شرعی وسماجی اور دینی ودنیوی ہر اعتبار سے بہت بڑا ظلم ہے، یوں سمجھ لیجئے گا کہ جس طرح ایڈز انسانی جسم کو چاٹ کر اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے اور انجام کار ایڈز میں مبتلا انسان موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے، ایسے ہی رشوت انسانی سماج ومعاشرہ کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے، قانون کو غیر مؤثر، نظامِ حکومت کو معطل، ضابطۂ عدل وانصاف کو ناکارہ، شعبۂ مالیات کا دیوالیہ اور انسانیت کو مردہ کر دیتی ہے۔ بقولِ شاعر:

ہم کو رشوتوں کے حلقے جکڑ رہے ہیں ☆ روپیہ تو بن رہا ہے، مگر شہر اجڑ رہے ہیں
چلتی ہیں دکانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی ☆ لیکن امید کیا ہو؟ جب دل اجڑ رہے ہیں

پھر رشوت کی مہلک وبا جس سماج میں پھیل جاتی ہے اس میں نہ انسانیت ومروت باقی رہتی ہے اور نہ دیانت وامانت کا تصور پایا جاتا ہے، اور نہ اخلاقی اقدار کا وجود رہتا ہے اور نہ ہی قانونِ شریعت وحکومت کی پاسداری ہوتی ہے، رشوت کا عادی معاشرہ کام چور، مفاد

پرست اور بے مروت ہوتا ہے، اس سے قوم وملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار
کے شناسد ظالم از مظلومِ زار؟

جب قاضی (افسر اور ذمہ دار وغیرہ) دل میں رشوت (کا ارادہ) طے کر لے تو وہ ظالم اور مظلوم میں کب فرق کرسکتا ہے؟

رشوت کے عادی فسادی ہیں:

یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے رشوت لینے، دینے اور ان کے درمیان واسطہ بننے والوں کو شیطان کے ساتھ تشبیہ دی ہے، کہ ان کا مذاق ومزاج شیطان سے بہت ملتا جلتا ہے، وہ اس طرح کہ شیطان انسانیت کا دشمن ہے:

﴿ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلإِنْسَانِ عَدُوًّا مُبِيْنًا ﴾ (بنی إسرائیل : ۵۳)

''بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔'' تو رشوت کے عادی بھی انسانیت، ملک وملت اور اجتماعی مفاد کے دشمن ہیں، وہ اپنے مفاد کے خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

شیطان انسانوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے:

﴿ إِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ﴾ (بنی إسرائیل : ۵۳)

''بلاشبہ شیطان انسانوں کے درمیان فساد ڈالتا ہے۔'' تو رشوت کے عادی بھی یہی کام کرتے ہیں، وہ رشوت لے کر حقداروں کو حق سے محروم کر کے ملزم کو مجرم ثابت کر کے اور غنڈوں اور بدمعاشوں کو من مانی کے پروانے دے کر انسانی معاشرہ اور ملک میں فساد پھیلاتے ہیں۔

نیز جس طرح شیطان کو رب العالمین کی ربوبیت ورزاقیت کا یقین نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ انسانوں کو فقر وفاقہ سے ڈراتا ہے:

﴿ الشَّيۡطٰنُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ ﴾ (البقرة : ٢٦٨)

''شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے۔''

اسی طرح جو لوگ رشوت کے عادی ہیں ان کا بھی رب العالمین کی ربوبیت و رزاقیت پر یقین کمزور ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ عموماً روپۓ پیسے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر رشوت (کی حرام بالائی) رُک گئی تو ہم فقر وفاقہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ان حقائق کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ رشوت کے عادی فسادی ہیں اور ان کا اصل تعلق شیطان کے ساتھ ہے، یہ انسان نما شیطان ہیں۔

علاوہ ازیں ایک اور عبرتناک پہلو سے دیکھا جائے تو رشوت خوروں اور کتوں میں بھی کئی پہلوؤں سے مناسبت نظر آتی ہے، مثلاً پہلی مناسبت یہ ہے کہ کتا حریص اور لالچی ہوتا ہے، چلتے پھرتے زمین وغیرہ کو سونگھتا رہتا ہے کہ شاید کہیں سے کھانے کی بو آئے، جس سے وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکے، اسی طرح رشوت کے عادی بھی ہر ایک کو تاڑتے رہتے ہیں، اور ہر وقت چھیچھڑوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں، دنیوی ساز وسامان کی ہوس اور دولت جمع کرنے کی خواہش ان حریصوں اور رشوت خوروں کو دنیا کا کتا بنا دیتی ہے۔دوسری مناسبت یہ ہے کہ کتے کو جہاں سے کچھ ملنے کی امید ہوتی ہے وہاں دُم ہلاتا ہے اور گویا خوشامد کرتا ہے، لیکن جہاں سے کچھ ملنے کی امید نہیں ہوتی وہاں چلاتا اور اپنی بےسُری آواز میں خوب بھونکتا ہے، یہی حال رشوت کے عادی کا بھی ہوتا ہے، چوں کہ غریبوں سے تو اسے کچھ ملنے کی امید نہیں ہوتی اس لیے ان کے سامنے کتے کی طرح گھورتا اور گویا کاٹ کھانے دوڑتا ہے، ہاں، اگر کوئی غریب اس کے سامنے کچھ پھینک دے تو ایک دم نرم پڑ جاتا ہے، اور مالداروں کے سامنے ایسا بن جاتا ہے گویا بدبخت میں جان ہی نہ ہو، آٹومیٹک انداز میں جی، سر! جی! سر! کہتا

ہوا اپنی فتنہ ساز کھوپڑی ہلاتا جاتا ہے، ایسے ہاتھ باندھے کھڑا ہوجاتا ہے جیسے نماز میں کھڑا ہو۔ پھر کتے میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں ہوتی، تو رشوت کے عادی کو بھی قومی وملکی ہمدردی نہیں ہوتی، اس میں خودغرضی ومطلب پرستی ہوتی ہے، ہر وقت اپنی جیب بھرنے کی فکر رہتی ہے، خواہ قوم وملک کا دیوالیہ نکل جائے۔

اس کے علاوہ ایک اور پہلو سے دیکھئے گا، تو رشوت کے عادی اور بھکاری میں بھی ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے، فرق اتنا ہے کہ ایک باعزت طریقے سے بھیک مانگتا ہے تو دوسرا ذلت کے ساتھ۔ کہتے ہیں کہ ایک ناتجربہ کار جونیر بھکاری نے اپنے کسی سینئر بھکاری سے دریافت کیا کہ "بھیک مانگنے کا طریقہ اور اس کا ضابطہ کیا ہے؟" تو اس نے جواب میں کہا کہ "بیٹا اس سلسلہ میں تین باتیں ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے:

(۱) ہر ایک سے مانگو۔ (۲) ہر چیز مانگو۔ (۳) اور ہر وقت مانگو۔" اب غور کیجئے تو رشوت کے عادی کے یہاں بھی یہی اصول وطریقہ نظر آتا ہے کہ وہ ہر ایک کو لوٹتے ہیں، ہر چیز لوٹتے ہیں اور ہر وقت لوٹتے ہیں۔

رشوت کا دنیاوی عذاب:

غرض یہ کہ رشوت کے عادی بہت بڑے فسادی ہوتے ہیں، ان کے اثرات سے انسانی سماج ومعاشرہ میں برائی، بدامنی، خودغرضی اور ظلم وزیادتی تو پھیلتی ہی ہے، مزید اس کا ایک اثر مرعوبیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، یہ لوگ دوسروں سے اور خصوصاً اپنے حریفوں سے بہت ہی زیادہ مرعوب اور خوف زدہ رہتے ہیں، اس کو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت پہلے فرمادیا تھا:

"عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "مَا مِنْ قَوْمٍ يَظْهَرُ فِيهِمُ الزِّنَا إِلَّا أُخِذُوْا بِالسَّنَةِ، وَمَا مِنْ قَوْمٍ يَظْهَرُ فِيهِمُ الرُّشَا إِلَّا أُخِذُوْا بِالرُّعْبِ". (رواه أحمد، مشكوة/ص:۳۱۳/ كتاب الحدود/ الفصل الثالث)

''جس قوم میں زنا پھیل جاتا ہے وہ قوم قحط (اور گرانی ومہنگائی) میں مبتلا کردی جاتی ہے، اور جس قوم میں رشوت عام ہوجاتی ہے اس پر خوف ورعب طاری کردیا جاتا ہے۔'' اللہ رب العزت کا ڈر دل سے نکلنے کے بعد ہر کسی کا ڈر دل پر مسلط ہوجاتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذہنی سکون اور قلبی اطمینان ختم ہوجاتا ہے، اس بات کا مشاہدہ آج کے معاشرہ پر ایک نظر ڈال کر بھی کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ بدقسمتی سے اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ایک عام آدمی سے لے کر اعلیٰ ذمہ دار تک عموماً اس میں مبتلا ہے، کوئی فائل رشوت کے بغیر آگے نہیں بڑھتی، کوئی افسر اس کے بغیر دستخط اور کام نہیں کرتا، نیچے سے اوپر تک رشوت کی وبا تقریباً عام ہوچکی ہے، جس کا اثر حدیث پاک کے مطابق یہ ہوا کہ پورا معاشرہ بلکہ پورا ملک رعب وخوف اور اَن دیکھے اندیشوں میں مبتلا ہے، جس سے زندگی اجیرن بن گئی، دلوں کا سکون ختم ہوگیا، بزدلی سوار ہوگئی، پھر رشوت خوری کا یہ تو صرف دنیوی عذاب ہے، اخروی عذاب اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

رشوت کا اخروی عذاب اور طریقۂ نجات:

احادیث مبارکہ میں رشوت خوروں کے لیے جو شدید ترین وعیدوں کا تذکرہ ہے اس سے ان کے بھیانک انجام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ایک حدیث پاک میں ہے:

''الرَّاشِیُ وَالْمُرْتَشِیُ فِی النَّارِ''. (رواہ الطبرانی/ الترغیب والترھیب:۳/۱۲۵)

''رشوت لینے والا اور (بخوشی وبلا مجبوری) رشوت دینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔''

البتہ جب اپنا حق ضائع ہورہا ہو یا سخت نقصان کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں مجبوراً رشوت دینے والا ان وعیدوں میں شامل نہ ہوگا، اس لیے کہ فقہاء نے ضرورۃً رشوت دینے کی اجازت دی ہے۔ (شامی) ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص رشوت لے کر ناحق فیصلہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اتنی گہری جہنم میں ڈالے گا کہ پانچ سو سال تک برابر گرتے چلے

جانے کے باوجود اس کی تہہ تک نہ پہنچ پائے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔ (الترغیب والترہیب: ۳/ ۱۲۶)

ظاہر ہے کہ رشوت خور جہنم کی اتنی گہرائی میں ڈالے جانے کے بعد فضل الٰہی کے بغیر کیسے چھٹکارا پا سکے گا؟

ان وعیدوں کے باوجود آج دنیا کی جیتی جاگتی زندگی کا جب ہم جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہی رشوت جسے دینی اور دنیوی قانون میں بدترین جرم قرار دے کر سخت وعید سنائی گئی ہے نہایت آزادی کے ساتھ بلکہ حق سمجھ کر لی اور دی جارہی ہے، ایک معمولی کانسٹیبل سے لے کر اونچے درجے کے افسران تک بخوشی اس کو قبول اور وصول کر لیتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اب جس کی جیب گرم ہو وہ سینکڑوں جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دندناتا پھرتا ہے، اور جس کی جیب خالی ہو وہ بعض اوقات سو فیصد بے گناہ اور برحق ہونے کے باوجود انصاف کو ترس ترس کر جان دے دیتا ہے۔ اس سے نجات کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شعبہ کو باصلاحیت اور ایماندار افراد کے ذریعہ پہلے تو مضبوط کیا جائے؛ کیوں کہ اس صورتِ حال کو بڑی حد تک مضبوط اور ایماندار انتظامیہ ہی ختم کر سکتی ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی بھی اس کا مرتکب اور مجرم ہو تو انتظامیہ اسے علی الاعلان عبرت ناک سزا دے تو ممکن ہے کہ اس طرح رفتہ رفتہ یہ لعنت ختم ہو جائے۔

رشوت چھوڑنے کی تدابیر:

علاوہ ازیں انفرادی طور پر بھی ضرورت ہے کہ اپنے آپ کو اور پورے انسانی سماج وملک کو رشوت کی اس مہلک وبا سے بچایا جائے، اور ہر سطح پر رشوت خوری کی حوصلہ شکنی کی جائے، اس کے لیے ہمارے علماء نے جو تدابیر بیان فرمائی ہیں انہیں اختیار کیا جائے۔

پہلی تدبیر تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خوب دعا کرے کہ یا اللہ! اس مہلک مرض سے مجھے اور ساری انسانیت کو پاک فرمادے، کہ اس نے ہمیں تباہ و برباد کر دیا ہے، اسی کے ساتھ

آئندہ کے لیے سچی پکی توبہ کرے اور توبہ کے لیے ضروری ہے کہ جس کا مال بطورِ رشوت لیا ہو اسے واپس لوٹا دے، یا اس سے معاف کرالے، ورنہ اس کی طرف سے اتنی رقم صدقہ کردے اور اس کا ثواب اس کو پہنچادے، امید ہے کہ حق تعالیٰ اس طریقہ سے صاحب حق کو اس سے راضی کر کے رشوت کا گناہ اس کے اعمال نامہ سے مٹادے گا۔

دوسری تدبیر یہ ہے کہ رشوت خوری کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہوئے اس کی جو وعیدیں اور دنیوی واخروی عذاب ونقصانات ہیں ان کو سوچے، ان شاء اللہ اس کی وجہ سے رشوت سے بچنا آسان ہوگا۔

تیسری تدبیر یہ ہے کہ سادہ زندگی گذارنے کی عادت ڈالے؛ کیوں کہ جو شخص جتنا زیادہ فضول خرچی وریاکاری سے بچتا ہے عموماً وہ تھوڑی سے آمدنی میں بھی رشوت لیے بغیر گزارہ کرلیا کرتا ہے، وہ اپنی جائز ضروریات کے لیے ناجائز وسائل اختیار نہیں کیا کرتا، وہ اپنی حلال روزی پر قناعت کرلیتا ہے، جس کی وجہ سے منجانب اللہ اسے برکت نصیب ہوتی ہے۔

حق تعالیٰ رشوت اور ہر حرام سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین۔

”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

☆......☆......☆

(۲۳)
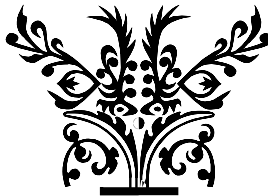
عصبیت کی حقیقت

اس کے احکامات اور نقصانات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ وَاثِلَةَ بۡنِ الۡأَسۡقَعِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قُلۡتُ: " يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ! مَا الۡعَصَبِيَّةُ؟" قَالَ: "أَنۡ تُعِيۡنَ قَوۡمَكَ عَلىٰ الظُّلۡمِ". (رواه أبوداود، مشكوٰة/ص: ٤١٨/ باب المُفَاخَرَةِ وَالعَصَبِيَّةِ/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! عصبیت کیا چیز ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "عصبیت (کی حقیقت) یہ ہے کہ تم اپنی قوم کی ظلم پر حمایت کرو۔"

اسلام کا ایک پاکیزہ اصول:

اسلام سے قبل دنیا کی تمام اقوام و امم پر قومی، مذہبی، علاقائی وقبائلی عصبیت اور اس کے زبردست اثرات چھائے ہوئے تھے، مثلاً یہودی ونصرانی خود کو اللہ تعالیٰ کی اولاد اور چہیتے قرار دیتے ہوئے کہتے تھے:

﴿نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ؕ﴾ (المائدۃ : ۱۸)

شاہانِ ایران اپنی رگوں میں خدائی خون کے دعوے دار تھے، چینی اپنے بادشاہ کو آسمان کا فرزند تصور کرتے تھے، ایرانی اپنے رنگ پر فخر سے اتنے مغلوب تھے کہ وہ حبشیوں اور بدّوؤں کو ''کوّا'' کہتے تھے، عربی اپنی نخوت اور فصاحت کے مدنظر ساری دنیا کو عجم یعنی بے زبان سمجھتے تھے، نیز ہندوستانیوں نے بھی طبقاتی تفوّق کے لیے ذات پات کا خودساختہ نظام وضع کررکھا تھا، اس باہمی عصبیت نے نہ صرف آپس کی جنگ وخوں ریزی کو روا کھا تھا، بلکہ اس کی وجہ سے نفرت وحقارت کا ایک ایسا سیلاب اُمڈ آیا تھا جو تھمتا نہ تھا، ان حالات میں اسلام دنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم کرنا چاہتا تھا جو عصبیت سے پاک ہو اور عدل واحسان اور نیکی وبھلائی کے پاکیزہ اصولِ حیات پر مشتمل ہو، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروؤں اور ماننے والوں کو خصوصی طور پر ان اصول واحکام کا پابند کیا جن پر اگر کما حقہ عمل ہو جائے تو اس سے ایک ایسا منفرد اور مثالی معاشرہ قائم ہو جس میں ظلم وجبر اور بے جا تشدد وتعصب ختم ہوکر عدل واحسان اور نیکی وبھلائی کی نورانی فضا عام ہو جائے، چناں چہ اس سلسلہ میں اسلام اور اس کے پیغمبر ﷺ نے سب سے پہلے کتابِ ہدایت کے حوالہ سے ایک دستور العمل اور بنیادی حکم یہ دیا:

﴿وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ﴾ (المائدۃ:۲)

اس پاکیزہ اصول کا خلاصہ یہ ہے کہ نیکی میں تعاون اور بدی سے گریز کرو۔ غور کر لیجئے گا! یہاں قرآن نے یہ انداز اور عنوان اختیار نہیں کیا کہ مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہی تعاون وتناصر کا معاملہ کرو اور غیروں کے ساتھ نہ کرو؛ اس لیے کہ یہ بھی ایک طرح کا تعصب ہے، اس لیے تعاون کی اصل بنیاد نیکی اور پرہیزگاری کو قرار دے کر حکم دیا کہ جہاں کہیں تمہیں نیکی اور اچھائی نظر آئے اس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھا دو، اس کے بالمقابل برائی اور ظلم وزیادتی میں کبھی کسی کا ساتھ ہرگز نہ دو، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بالفرض اگر کوئی مسلمان

بھی خواہ وہ تمہارا عزیز وقریب ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہ حق کے خلاف غلط اور گناہ یا ظلم وجور کی طرف چل رہا ہو تو اس میں اس کی بھی مدد نہ کی جائے، بلکہ اس طرف اس کے بڑھتے قدم روکے جائیں، یہی اس کا صحیح تعاون ہے اور تقاضائے عدل ہے۔

عصبیت کی حقیقت:

اسلام نے اپنے اس پاکیزہ اصول سے یہ واضح کر دیا کہ نیکی وبدی یا عدل واحسان اور ظلم وزیادتی دنیا کی کسی خاص قوم ونسل اور گروہ کی خصوصیت نہیں؛ اس لیے کہ ہر قوم و جماعت میں نیک بھی ہوتے ہیں اور بد بھی، منصف مزاج بھی ہوتے ہیں اور ہٹ دھرم وضدی بھی، برحق بھی ہوتے ہیں اور ناحق بھی، جب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے تو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ساتھ ہمیشہ حق اور اہل حق کا دیا جائے، اور آواز ظلم وجور کے خلاف اٹھائی جائے، کسی خاص قوم یا نسل کے خلاف نہیں، اور مدد ونصرت ہمیشہ مظلوم کی کی جائے (خواہ وہ کوئی بھی ہو) کسی خاص قوم وجماعت کی نہیں۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اپنوں کو چھوڑو نہیں جب تک وہ حق پر ہوں، اور دوسروں کو چھیڑو نہیں "إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ". لیکن ان حقائق سے قطع نظر کر کے محض قومیت کو اگر آپسی تعاون وتناصر کی بنیاد بنایا جائے تو یہ عصبیت ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، یاد رکھو! اپنی قوم وبرادری کی حمایت حق کے معاملہ میں کی جائے تو بلا شبہ یہ اچھی اور ضروری چیز ہے، لیکن اگر ناحق اور ظلم کے معاملہ میں اپنی قوم کی حمایت کی جائے تو اسی کا نام تعصب اور عصبیت ہے، جیسا کہ حدیث مذکور سے واضح ہوتا ہے، حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ سے ایک مرتبہ عصبیت کی حقیقت دریافت کی کہ "مَا الْعَصَبِيَّةُ ؟" تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أَنْ تُعِيْنَ قَوْمَكَ عَلَى الظُّلْمِ". اپنی قوم وبرادری کی بے جا حمایت اور ناحق کام میں ان کی اعانت کرنا عصبیت ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ سے دریافت کیا گیا:

”یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! مِنَ الْعَصَبِیَّۃِ أَنْ یُّحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَہٗ ؟“

حضور! اپنی قوم وبرادری سے تو ہر کسی کو محبت ہوتی ہے، تو کیا یہ بھی عصبیت ہے؟
”قَالَ: لَا“ فرمایا: نہیں، یہ عصبیت نہیں، بلکہ تمہیں حق ہے کہ جائز اور خیر کے امور میں ان کی اعانت ونصرت کرو، اگر تم اپنی قوم کے واجبی وقانونی حقوق ومفادات کے حصول وتحفظ کے لیے اس طرح جد وجہد کرو کہ دوسروں کے حقوق ومفادات پر زد نہ پڑے تو یہ عصبیت میں داخل نہیں ہے۔

”وَلٰکِنْ مِنَ الْعَصَبِیَّۃِ أَنْ یَنْصُرَ الرَّجُلُ قَوْمَہٗ عَلَی الظُّلْمِ“ . (رواہ أحمد وابن ماجہ، مشکوٰۃ/ص: ٤١٨)

البتہ اگر اپنی قوم وبرادری کی اس طرح حمایت کی جائے جس سے دوسروں کے متعلق ظلم وتعدی کے جذبات ظاہر ہوں، یا ان کے ایسے معاملوں میں مداخلت ومعاونت کرنا جو سراسر زیادتی اور انتہا پسندی پر مبنی ہوں، نیز اس جد وجہد کا کوئی قانونی جواز موجود نہ ہو تو یہ عصبیت ہے۔ (از مظاہر حق جدید: ۵/ ۴۹۸)

آپ ﷺ نے عصبیت کا عملاً خاتمہ کرنے کے لیے مختلف قبائل میں متعدد نکاح فرمائے۔

سرکار دو عالم ﷺ نے مختلف قبائل واقوام میں متعدد نکاح فرما کر ان کے مابین پائی جانے والی قومی، علاقائی، لسانی وغیرہ اقسام کی عصبیت کو خاک میں ملا دیا؛ کیوں کہ ازواجِ مطہرات پر جغرافیائی اعتبار سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ وہ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف خاندانوں اور قبائل کی نمائندگی کر رہی تھیں، ساتھ ہی اعلیٰ نسب اور بڑے رتبے والے خاندانوں سے ہونے کی حیثیت سے وہ بڑے اقتدار اور اثر ورسوخ کی حامل تھیں، چناں چہ گیارہ ازواجِ مطہرات میں سے حضرت خدیجہؓ اور حضرت سودہ بنت زمعہؓ خاندانِ قریش (کی دو شاخوں بنو اسد اور بنو عامر) سے تھیں، حضرت عائشہؓ کا تعلق بنو تیم

سے تھا، حضرت حفصہ ؓ کا تعلق بنوعدی سے تھا، حضرت زینب بنت خزیمہ ؓ کا تعلق یمن کے طاقتور قبیلہ صعصعہ سے تھا، حضرت ام سلمہ ؓ کا تعلقہ بنومخزوم سے تھا، حضرت زینب بنت جحش ؓ کا تعلق بنو سعد بن خزیمہ سے تھا۔ حضرت جویریہ ؓ وسط عرب کے بنی مصطلق کے سردار کی بیٹی تھیں، حضرت میمونہ ؓ بنت حارث ؓ کا تعلق بھی یمن کے طاقت ور قبیلہ صعصعہ سے تھا۔ (جو حضور ﷺ کی آخری بیوی تھیں) مذکورہ بالا حقائق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رحمت عالم ﷺ کی ایک سے زائد شادیاں قبائلی عصبیت کے خاتمہ اور پورے عرب اور مسلمان قوم کو وحدتِ اسلامی کی لڑی میں پروکر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی راہیں ہموار کرنے کے لیے تھیں، اور آپ ﷺ کی یہ کوشش پوری طرح بارآور ثابت ہوئی۔ (ماہنامہ: ''الفاروق'' کراچی، شعبان/ ۱۴۱۷ھ، مستفاد از: تحفۃ الائمہ/ص: ۲۵۵)

اور اس طرح آپ ﷺ نے خاندانی تفاخر کے تصورِ پارینہ کو پارہ پارہ کردیا اور نسلی وقومی احساسِ برتری کو پاش پاش کردیا اور مروجہ رنگ ونسل کے امتیازات مٹائے، اس طرح قومی، خاندانی اور قبائلی اختلافات فنا ہوئے، پھر عصبیت سے محفوظ ودور اور اتفاق وامن سے بھرپور ایک مثالی معاشرہ قائم ہوا۔

عہدرسالت کے واقعات:

اس سلسلہ میں عہدرسالت کے مختلف واقعات ہیں، چناں چہ حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں کہ ''میں ایک جنگ میں شامل تھا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنوالمصطلق عرب کا ایک قبیلہ تھا جس کے بارے میں حضور ﷺ کو یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ مدینہ منوّرہ پر حملہ کرنے کے لیے لشکر جمع کررہا ہے، تو آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ خود وہاں تشریف لے گئے، ان سے جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی، (بعد میں یہ قبیلہ والے بھی مسلمان ہوگئے) جنگ کے بعد کچھ دن آپ ﷺ نے وہاں ایک چشمہ کے قریب پڑاؤ ڈالا جس کا نام مریسیع تھا، اسی دوران اتفاق سے ایک مہاجر اور انصاری کے درمیان پانی کے معاملہ میں بات بگڑ گئی، تو

مہاجر نے انصاری کے سرین پر لات ماردی اور ہوتے ہوتے بات بڑھ گئی، جس سے دورِ جاہلیت کے مطابق مہاجر نے مدد کے لیے مہاجرین کو پکارا، تو انصاری نے انصار کو، جب رحمت عالم ﷺ کو پتہ چلا تو آپ ﷺ نے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''مہاجر اور انصار کے نام پر لڑائی کرنا وہ جاہلانہ عصبیت ہے جس سے اسلام نے نجات دی ،لہٰذا یہ زمانۂ جاہلیت کے نعرے کیوں لگاتے ہو؟'' لوگوں نے جھگڑے کا سبب بتایا کہ مہاجر نے انصاری کو لات ماردی تھی، اس پر بات بگڑی تب ارشاد فرمایا: "دَعُوهَا، فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ". ''ان عصبیت کے نعروں کو چھوڑ دو، یہ بدبودار ہیں۔'' (بخاری: ۲/۷۲۸/ کتاب التفسیر/سورة المنافقین) ہاں، مظلوم کوئی بھی ہو اس کی مدد کرنی چاہیے، اور ظالم کوئی بھی ہو اسے ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس کے علاوہ بھی آپ ﷺ نے وقتاً فوقتاً عصبیت کی کھل کر مذمت فرمائی ہے، یہاں تک کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اس کی سخت نفرت بیٹھ گئی، چناں چہ سیر الصحابہ میں ایک اور واقعہ ملتا ہے کہ حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ جو فتح مکہ کے موقع پر روسائے قریش میں سب سے آخر میں مشرف باسلام ہوئے تھے، اسلام لانے کے بعد جاہلیت کے تمام جذبات ان میں بالکل ہی فنا ہوگئے تھے، مشہور فاضل صحابی سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے قرآنِ کریم کی تعلیم حاصل کرنے لگے، ایک دن حضرت سہیل رضی اللہ عنہ سے ان کے خاندان کے ایک فرد ضرار بن ازور نے کہا کہ ''تم اس خزرجی کے پاس کیوں قرأت پڑھنے جاتے ہو؟ اپنے ہی خاندان کے کسی آدمی سے کیوں نہیں پڑھتے؟'' یہ متعصّبانہ اعتراض سن کر حضرت سہیل رضی اللہ عنہ نے ناراض ہوکر فرمایا: ''ضرار! اس تعصب نے ہماری یہ گت بنادی ہے کہ ہم بہت پیچھے اور دوسرے ہم سے بہت آگے بڑھ گئے، اللہ کی قسم! میں ضرور معاذ کے پاس جاکر ہی تعلیم قرآن حاصل کروں گا، اسلام نے جاہلیت کے تمام تعصّبات وامتیازات کو مٹادیا ہے۔'' (سیر الصحابہ: ۷/۹۱)

واقعہ یہ ہے کہ عصبیت سے دلوں میں تحاسد اور پھر تباغض پیدا ہو کر بات آپس کی لڑائی تک جا پہنچتی ہے، حالاں کہ حکم ہے کہ جب کبھی دو آدمیوں اور گروہوں کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو اس وقت اگر ضرورت ہو تو حق کا ساتھ دو یا پھر صلح کرا دو، بے جا حمایت کسی کی نہ کرو۔

بھائی بھائی سب کو بنا دو ☆ عصبیت کا نام مٹا دو
آپس میں لڑنے سے تو اپنا ہے نقصان ☆ پھر کیوں بھٹک گیا انسان؟

عصبیت کی ابتداء:

صاحبو! یہ حقیقت ہے کہ عصبیت دورِ جاہلیت کی وہ بدترین اور بدبودار خصلت ہے جس کی بدبو سے بسا اوقات سارا سماج متاثر بلکہ مسموم ہو جاتا ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ابتداء میں جب تک انسانی آبادی زیادہ نہیں تھی تو دنیا کی چار سمتوں کے اعتبار سے چار قومیں بن گئیں: (۱) مشرقی۔ (۲) مغربی۔ (۳) شمالی۔ (۴) جنوبی۔ پھر جہالت کے سبب ان میں سے ہر ایک سمت کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم اور دوسروں کو دوسری قوم سمجھنے لگے اور اسی بنیاد پر آپس میں تعاون اور تناصر کرتے، اس طرح وہ عصبیت میں مبتلا ہو گئے، اس کے بعد جب آبادی زیادہ پھیلی تو ہر سمت کے لوگوں میں نسبی اور خاندانی بنیادوں پر قومیت اور اجتماعیت کا تصور ایک اصول بن گیا اور اس طرح وطنی ولسانی بنیادوں پر انسانیت آپس میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، پھر یہی سکہ تقریباً ساری دنیا میں چل پڑا، آج بظاہر تہذیب نو کے دعوے دار اور ترقی پسند سمجھی جانے والی اقوامِ مغرب میں تعصب کس قدر عروج پر ہے اس کا اندازہ ایک رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ ''برطانیہ میں نسلی امتیاز ایک بار پھر شدید نفرت کا روپ دھار رہا ہے۔'' یہ انکشاف ایک سروے رپورٹ کے مطابق کیا گیا ہے، ''لنڈن ٹائمز'' نے اپنے اداریہ میں اس سروے رپورٹ سے نسلی امتیازات کے کئی واقعات پیش کیے ہیں، مثلاً ایک سیاہ فام شخص ملازمت کے لیے گیا، لیکن گورے مالک نے

اسے ٹال دیا، بعد میں اس نے کہا کہ ”کالے کتے مطلوب نہیں ہیں۔“ حتیٰ کہ دفتروں میں سفید فام سیاہ فام باشندوں کے بیت الخلا میں جانا پسند نہیں کرتے۔ (از تراشے/ص:۱۴۱)

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیسی کیسی؟
تعصب، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

عصبیت کے سبب ہلاکت:

لیکن دوسروں سے گلہ وشکوہ اب کیوں کر کیا جائے! بدقسمتی سے اس وقت یہ عصبیت کا جادو خود ہم مسلمانوں پر بھی چل پڑا۔ (الا ماشاء اللہ) آج صرف عربی وعجمی ہی کی تقسیم پر بس نہیں ہوتا، بلکہ ان میں بھی تقسیم در تقسیم ہو کر مصری، شامی، حجازی، بالخصوص نجدی اور ہمارے یہاں پنجابی، بنگالی، سندھی وہندی، پھر ان میں سید اور شیخ، پٹھان اور پٹیل وغیرہ الگ الگ ایسی تقسیم ہوگئی ہے کہ بہت سے کام کاج انہیں بنیادوں پر ہوتے ہیں، آپس میں تعاون وتناصر اسی بنیاد پر ہونے لگا۔ فیا للعجب! شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہ فرماتے ہیں: ”اس وقت تین نشے ایسے ہیں جو بار بار چوٹ کھانے کے باوجود بھی لوگوں کے سر سے نہیں اترتے: (۱) اقتدار اور سیاست کا نشہ۔ (۲) فرقہ واریت کا نشہ۔ (۳) عصبیت کا نشہ۔
(از: ذکر وفکر ص:۲۲۱)

واقعی عصبیت بھی ایک نشہ ہی ہے، اس لیے جس طرح نشہ والے کو صحیح اور غلط کی پہچان نہیں ہوتی اسی طرح عصبیت میں مبتلا لوگوں کا حال بھی کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے، اور بالآخر یہی عصبیت ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے، حدیث میں ہے کہ ”اپنی قوم کی بے جا حمایت کرنے والا (عصبیت میں مبتلا شخص) اس اونٹ کے مانند ہے جو کنویں میں گر پڑے اور پھر اس کی دم پکڑ کے اس کو کھینچا جائے۔“

”كَالْبَعِيرِ الَّذِیْ رَدٰی، فَهُوَ یُنْزَعُ بِذَنَبِهٖ“. (أبو داوٗد، مشکوٰۃ/ص: ۴۱۸)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کنویں میں گر کر ہلاک ہوجاتا ہے اسی طرح

عصبیت کے گہرے کنویں میں گرنے والا شخص بھی ہلاک ہو جاتا ہے، اور اس سے بڑھ کر اور کیا ہلاکت ہو سکتی ہے کہ ایسے شخص سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی برأت کا اظہار فرمایا ہے، حدیث میں ہے:

”عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:” لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلٰى عَصَبِيَّةٍ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِيَّةً، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلٰى عَصَبِيَّةٍ“.

(رواه أبو داوٗد، مشكوٰة/ ص: ٤١٨)

”جو شخص عصبیت کی (اپنے قول و عمل کے ذریعہ) دعوت دے، یا جو عصبیت کا حامی ہو وہ ہم میں سے نہیں، اسی طرح نہ وہ شخص ہم میں سے ہے جو عصبیت کی خاطر لڑے اور نہ وہ شخص ہم میں سے ہے جو عصبیت پر مرے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ ایک سچے مسلمان میں بے جا تعصب ہو ہی نہیں سکتا، اور جس کا دامن اس خار سے پاک نہیں وہ اپنے ایمان کی فکر کرے۔ عصبیت سے حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی مذمت اور ہلاکت کو پیش نظر رکھیں، علاوہ ازیں اس سلسلہ میں کتاب وسنت کا بھولا ہوا سبق دہرایا جائے اور اسلام کے پاکیزہ اصول کو دستورِ زندگی بنایا جائے۔

عصبیت سے حفاظت کیسے ہو؟

ہم مسلمانوں کو یہ سبق پڑھایا اور ذہن نشین کرایا گیا تھا:

﴿يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى﴾ (الحجرات: ١٣)

”اولوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد (آدم علیہ السلام) اور ایک عورت (حوا علیہا السلام) سے پیدا کیا۔“ اسی کو حدیث میں یوں ارشاد فرمایا کہ ”اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ بَنُوْا آدَمَ“. (ترمذی، مشكوٰة/ ص: ٤١٨) یعنی اصلاً تم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو، خواہ گورے ہو یا کالے، لال ہو یا پیلے، عامی ہو یا نامی، عربی ہو یا عجمی، مشرقی ہو یا مغربی، شمالی ہو یا جنوبی، چینی ہو یا فلسطینی، شہری ہو یا دیہاتی، امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھے۔

غرض! انسانی برادری کے اعتبار سے تم سب کے سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو، ایک ہی خاندان کے مختلف افراد ہو، ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں، ایک ہی پھول کی مختلف پنکھڑیاں، ایک ہی سمندر کی مختلف لہریں اور ایک ہی سورج کی مختلف کرنیں ہو، اگر ان میں تقسیم ہے تو صرف ایمان وکفر اور حق وباطل کی تقسیم ہے؛ لہٰذا اسی بنیاد پر ایک دوسرے کا تعاون کرو، یعنی ایمان، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ میں ایک دوسرے کا ساتھ دو، کفر وظلم اور گناہ کے کاموں میں ہرگز ساتھ نہ دو۔

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى صلے وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ (المائدة:۲)

کے اصول پر زندگی گذارو، جو اسلام کی پاکیزہ تعلیم کا ایک بنیادی اصول ہے، جس کو لائحہ عمل بنانے سے دنیا میں ایمان، عدل واحسان اور نیکی وبھلائی وجود میں آئے گی اور کفر وظلم اور بدی وبرائی ختم ہو کر ایک صالح سماج اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں آئے گا۔

حق تعالیٰ ہمیں حقائق سمجھا دیں اور بے جا تعصب سے حفاظت فرمائیں۔ آمین۔

”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

☆......☆......☆
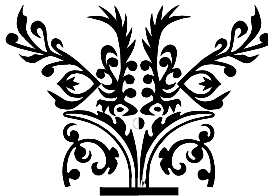
(۲۴)

اصلاحِ معاشرہ کے لیے اصل نسخہ اور طریقہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ : ''اَلۡمُؤۡمِنُ مِرۡآةُ الۡمُؤۡمِنِ، وَالۡمُؤۡمِنُ أَخُوۡ الۡمُؤۡمِنِ، يَكُفُّ عَنۡهُ ضَيۡعَتَهٗ، وَيَحُوۡطُهٗ مِنۡ وَرَآئِهٖ'' . (رواه أبو داوٗد والترمذی، مشکوۃ/ص:۴۲۴/ باب الشفقة والرحمة علی الخلق/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ایک مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے، اور ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے، اس کے نقصان کو اس سے دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے اس کی پاسبانی و نگرانی کرتا ہے۔''

اصلاحِ معاشرہ کے سلسلہ میں نبوی ہدایات کو پیش نظر رکھا جائے:

اس وقت انسانی سماج میں خوفِ خدا اور فکر عقبیٰ نہ ہونے کے سبب ایمانی، عملی و اخلاقی اعتبار سے جو عمومی بگاڑ اور فساد ہے، اس سے سماج کا ہر طبقہ تقریباً متاثر ہے، جس کے سبب سماج کا صالح، سنجیدہ اور فکر مند طبقہ اب بھی یہ چاہتا ہے کہ سماج کا یہ بگاڑ اور فساد ختم ہو

جائے اور ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل پائے، اور یہ اسی فکر کا اثر اور نتیجہ ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے انفرادی واجتماعی طور پر مختلف اعتبار سے آج بھی کوششیں اور فکریں ہورہی ہیں، لیکن اس کے باوجود صورتِ حال یہ ہے کہ اصلاحِ معاشرہ کے سلسلہ میں کوئی خاص ثمرہ اور قابل ذکر نتیجہ ہمارے سامنے نہیں آرہا ہے، بلکہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس رفتار سے اصلاحِ معاشرہ کے لیے جدوجہد ہورہی ہے اس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ بگاڑ اور فساد معاشرہ میں پھیل رہا ہے، آخر ایسا کیوں ہورہا ہے؟

اس نکتہ پر اگر کتاب وسنت کی روشنی میں غور کیا جائے تو اس کی دو وجہیں سامنے آئیں گی: ایک تو یہ کہ دلوں سے خوفِ خدا نکل گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اب فکرِ عقبیٰ بھی دلوں میں نہ رہا۔ اس کے علاوہ دو باتیں اور بھی ہیں: ایک تو یہ کہ زمانۂ نبوت سے دوری اور قربِ قیامت کا یہ اثر ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ کہ مصلحِ اعظم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاحِ معاشرہ کا اصل نسخہ اور جو طریقہ منجانب اللہ بتلایا تھا آج ہم نے اسے تقریباً بھلا دیا ہے، جس کی وجہ سے اصلاحِ معاشرہ کے سلسلہ کی ہماری کوشش اتنی کامیاب نہیں ہورہی جتنی ہونی چاہیے، ورنہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سلسلہ کی شرعی اور نبوی ہدایات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ہماری اور معاشرہ کی کافی حد تک اصلاح آسان ہوسکتی ہے۔

مومن ایک آئینہ ہے:

چناں چہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے من جانب اللہ ہماری اور معاشرہ کی اصلاح کے جو نسخے اور طریقے تعلیم فرمائے ہیں ان میں سے ایک کامیاب نسخہ اور طریقہ تو وہ ہے جس کو حدیث مذکور میں نہایت لطیف انداز میں ایک مثال دے کر ذکر کیا گیا: ''اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ'' یعنی ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہے، مومن کو آئینہ کے ساتھ اس لیے تشبیہ دی کہ تمثیل سے تفہیم میں تسہیل ہوجاتی ہے، یعنی مثال سے بات جلدی اور بآسانی سمجھ میں آتی ہے، اس لیے مثال دے کر اس طرف توجہ دلائی کہ ایک مومن دوسرے کے لیے

اگر آئینہ کی طرح بن جائے اور آئینہ کی جو صفات اور خصوصیات ہیں اگر ایک مومن اپنی عملی زندگی میں انہیں اختیار کر لے تو اس سے خود اس کی اور معاشرہ کی اصلاح آسان ہو جائے، یہ حدیث یوں تو بہت ہی مختصر ہے، لیکن اس میں ہمارے لیے نافع ہدایات وتعلیمات کا ایک ذخیرہ پوشیدہ ہے؛ کیوں کہ حدیث پاک کی اس تمثیل میں ایسے کئی روشن اشارے ملتے ہیں جن کو اپنانا ہماری اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے ضروری ہے، اس کے بغیر کامیابی حاصل کرنا آسان نہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ (الحجرات : ۱۰)

اہل ایمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح قائم کرو۔" لیکن اسی کے ساتھ ہر مسلمان اسی سماج کا ایک فرد اور انسان بھی ہے، اس لیے ہر کسی سے خطا اور غلطی کا امکان بھی ہے، لہٰذا جب اپنے کسی بھائی سے کوئی قابل اصلاح بات پیش آ جائے تو اصلاح کی فکر کرو۔

آئینہ کی پہلی خصوصیت:

اس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ آئینہ کی کچھ عجیب وغریب خصوصیات اور صفات ہیں، جن میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اچھا آئینہ صاف اور بے داغ ہوتا ہے، تو ایک اچھے مومن کا دل بھی حسد، کینہ، بغض وعداوت وغیرہ سے صاف اور اس کی زندگی بے داغ ہونی چاہیے، اور اگر کبھی آئینہ پر کوئی داغ لگ جاتا ہے تو پاؤڈر یا پانی وغیرہ سے اسے صاف کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ہماری زندگی میں بھی گناہ کا کوئی داغ لگ جائے تو ندامت کے آنسو اور توبہ کے پاؤڈر سے اسے صاف کر دینا چاہیے، اسے باقی نہیں رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی لوگ پسند ہیں جن کا دل صاف اور زندگی بے داغ ہو۔

ایک واقعہ:

حدیث پاک میں ایک واقعہ منقول ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابھی جو شخص مسجد میں اس طرف سے داخل ہوگا وہ جنتی ہے۔'' ہم نے اس طرف کو نگاہ اٹھائی تو تھوڑی دیر میں ایک صاحب مسجد نبوی میں اس طرح داخل ہوئے کہ ان کے چہرے سے وضو کا پانی ٹپک رہا تھا اور بائیں ہاتھ میں جوتے اٹھائے ہوئے تھے، ہمیں ان پر بہت رشک آیا، بعض روایات میں ہے کہ یہ صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے، جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس ختم ہوگئی تو ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما ان کے ساتھ ہوگئے، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ دیکھیں ان کا ایسا کون سا عمل ہے جس کی بنا پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام سے ان کے جنتی ہونے کی بشارت سنائی؟ راستہ میں حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص رضی اللہ عنہما نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ''میں دو تین دن آپ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، انہوں نے اجازت دے دی، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں ان کے ساتھ ساتھ رہنے لگا، جب رات ہوئی تو میں بستر پر لیٹ کر جاگتا رہا، تاکہ میں یہ دیکھوں کہ رات کے وقت وہ اٹھ کر کیا خاص عمل کرتے ہیں؟ لیکن میں نے دیکھا کہ ساری رات گذر گئی مگر حضرت سعد تو اٹھے ہی نہیں، پڑے سوتے رہے، البتہ جب رات کو ان کی آنکھ کھل جاتی تو بستر پر اپنی کروٹ بدلتے تو تھوڑا سا اللہ کا ذکر کرتے، اللہ اکبر کہتے اور فجر کے وقت اٹھ کر نماز پڑھ لیتے، باقی دن رات میں نے ان کو خاص کسی عمل کا اہتمام کرتے نہیں دیکھا، بلکہ ان کے تمام اعمال عام معمول کے مطابق پائے، ہاں جب کبھی آپ کوئی بات کرتے تو خیر ہی کی بات کرتے، میں حیران ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان کے لیے اتنی بڑی بشارت دی، مگر ان کا ایسا کوئی مخصوص عمل بھی نہیں، تو میں نے ان سے عرض

کیا کہ ’’حضرت! اصل بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے جنتی ہونے کی بشارت دی، تو میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ کو یہ مقام کس عمل کی وجہ سے حاصل ہوا؟ تا کہ میں بھی اس کا اہتمام والتزام کروں، لیکن میں نے دو تین دن آپ کے پاس رہ کر کوئی خاص عمل نہیں دیکھا، آپ تو بس فرائض، سنن اور واجبات وغیرہ ادا کرتے ہیں اور عام معمول کے مطابق زندگی گذارتے ہیں، اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے بشارت دی تو واقعی یہ میرے لیے سعادتِ کبریٰ اور نعمت عظمیٰ ہے، ورنہ میرا کوئی خاص عمل تو ہے نہیں، وہی معمول ہے جو تم نے دیکھا، لیکن ایک بات ضرور ہے، اور وہ یہ کہ الحمد للہ (رحمت عالم ﷺ کی صحبت کے نتیجہ میں) کسی شخص سے حسد اور بغض کا میل کبھی میرے دل میں نہیں آیا، (میرا دل آئینہ کی طرح بالکل صاف ہے) شاید اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بشارت کا مصداق بنا دیا ہو۔‘‘

(أخرجه أحمد بإسنادٍ حسن، والنسائی، ورواه أبو يعلىٰ والبزار بنحوه، كذا فی الترغيب، از: حياة الصحابة مترجم: ۵۴۸/۲، واصلاحی خطبات: ۷۳/۵)

مومن کا دل آئینہ کی طرح صاف ہونا چاہیے:

واقعہ یہ ہے کہ کوشش کر کے یا بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اگر ہم بھی اپنے دل کو آئینہ کی طرح بنا لیں تو نہ صرف یہ کہ ہماری اصلاح ہو جائے، بلکہ کامیابی ہمارے قدم چومنے لگے، قرآن کہتا ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (الأعلىٰ: ۱۴) اور ایک مومن کو آئینہ کی طرح صاف دل والا ہی ہونا چاہیے، مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

چوں کہ مومن آئینۂ مومن بود
روئے او ز آلودگی ایمن بود

یعنی حدیث شریف کے بیان کے مطابق جب ایک مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہوتا ہے، تو ضروری ہے کہ اس کا چہرہ (مراد ظاہر و باطن گناہوں کی) آلودگی سے محفوظ اور

صاف رہے؛ کیوں کہ دل کی صفائی کے بغیر اصلاح نہیں ہوسکتی اور اس کے لیے صحبت صالحین ضروری ہے۔

آئینہ کی دوسری خصوصیت:

اس کے علاوہ آئینہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آئینہ بے غرض ہو کر حقیقت حال کو واضح کرتا ہے، ایک انسان جب آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو پیش کرتا ہے تو وہ آئینہ شکل وصورت کی تمام اچھائیاں اور برائیاں جو فی الواقع اس میں موجود ہیں صحیح صحیح اور بلا کسی کمی بیشی کے بتلا دیتا ہے، انسان میں بظاہر بہت سی خوبیاں اور خامیاں وہ ہوتی ہیں جن کو بذاتِ خود وہ نہیں جانتا، مگر آئینہ بتلا دیتا ہے کہ تمہارے اندر یہ خوبی یا یہ خامی ہے۔ پھر آئینہ کا وصف یہ ہے کہ اگر کسی انسان میں کوئی عیب ہو تو وہ اس کو صرف اسی عیب پر مطلع کرتا ہے، جو اس کے سامنے ظاہر ہے، لیکن اس کے پوشیدہ عیوب کو تلاش نہیں کرتا، اور نہ اس کے عیب کی اطلاع کسی اور کو دیتا ہے، اسی طرح ایک مومن کو بھی آئینہ کی یہ خصوصیت اختیار کرنی چاہیے، اس لیے کہ حدیث پاک کے مطابق ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہے، ہم کسی اور کے لیے آئینہ ہیں تو کوئی اور ہمارے لیے آئینہ ہے۔ اور ایک انسان خواہ کتنا ہی شریف اور سمجھدار کیوں نہ ہو، لیکن بشری تقاضوں سے بہر حال بے زار نہیں ہوتا، اس لیے جب ہمیں اپنے کسی بھائی میں کوئی خامی یا برائی نظر آئے تو آئینہ کی طرح بے غرض ہو کر حکمت اور موعظت کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے حقیقت حال پر اسے مطلع تو کر دیں، لیکن اس کی تشہیر نہ کریں اور ٹوہ میں بھی نہ لگیں؛ کیوں کہ کسی کے پوشیدہ عیبوں کو کریدنا اور تلاش کرنا کوئی اخلاقی خوبی نہیں، بلکہ ایک تباہ کن برائی اور اخلاق سوز عیب ہے، جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے:

عَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ” إِنَّكَ إِذَا اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ أَفْسَدْتَّهُمْ“. (أبو داوٗد، مشکوٰۃ : ۳۲۲)

''جب تم لوگوں کے پوشیدہ عیوب کو تلاش کرو گے تو ان کو خرابی میں مبتلا کر دو گے۔'' (اس سے خرابی پیدا ہوگی نہ کہ اصلاح، اس لیے اس سے احتیاط کرو۔)

افسوس! صد افسوس! آج کی دنیا میں تجسس اور احتسابِ غیر بڑھ رہا ہے، اور احتسابِ خویش سے بے پروائی برتی جا رہی ہے، آج کا انسان اوروں کے لیے تو بہت بینا ہے مگر اپنے لیے نابینا بنا ہوا ہے، مصلح تو بننا چاہتا ہے مگر صالح بننا نہیں چاہتا، ظاہر ہے کہ اس طرح نہ اپنی اصلاح ہوسکتی ہے نہ معاشرہ کی۔

اصلاح کا بہتر طریقہ اور ایک واقعہ:

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اگر واقعی اصلاح کا ارادہ ہے تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب کسی کو برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھے، یا کسی میں قابل اصلاح بات نظر آئے، تو (بہتر یہ ہے کہ دو رکعات نماز پڑھ کر اللہ رب العزت سے دعا کریں کہ یا اللہ! مجھے اخلاص عطا فرما اور میں اپنے بھائی کی اصلاح کے لیے جو بات کہنا چاہتا ہوں اس میں اثر پیدا فرما، اس کے بعد موقع بنا کر) اسے تنہائی میں اس کی عزتِ نفس کو ملحوظ رکھتے ہوئے پوری دل سوزی اور نرمی کے ساتھ اس برائی اور گناہ کی طرف متوجہ کر دیں، ارشادِ ربانی ہے:

﴿اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ (النحل: ۱۲۵)

اس آیت کریمہ میں اسی کا گویا حکم دیا گیا ہے، یقین مانئے! اصلاح کا یہ طریقہ جب ہم کسی اور کے لیے اختیار کریں گے تو اس کے لیے نافع ہوگا، اسی طرح جب کوئی اور بندہ ہمارے لیے یہ طریقہ اختیار کرے گا تو ہماری اصلاح کے باب میں بھی نہایت کار آمد اور کامیاب ثابت ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ پھر جس طرح آئینہ کو دیکھ کر ایک انسان اپنے آپ کو سنوارتا ہے اصلاح کے اس طریقہ سے بھی ایک انسان اپنی زندگی کو سنوار لے گا۔ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ ہے منقول ہے کہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب

کاندھلویؒ (جو حضرت جی مولانا محمد الیاسؒ اور مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کی حقیقی نانی کے والد تھے) ایک مرتبہ جلال آباد یا شاملی تشریف لے گئے، نماز کے وقت ایک مسجد میں پہنچے، جو بالکل ویران تھی، آپ نے اس کی صفائی کی اور نماز کے لیے اذان دی، جب نماز کے لیے کوئی آیا نہیں تو بستی کے ایک شخص سے پوچھا کہ ''یہاں کوئی نمازی نہیں ہے؟'' اس نے کہا کہ ''سامنے ایک خان صاحب ہیں، اگر وہ نمازی بن جائیں تو دو چار لوگ اور بھی نمازی بن جائیں، مگر وہ شرابی اور رنڈی باز زانی ہیں'' یہ سن کر آپؒ خان صاحب کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: ''خان صاحب! آپ اگر نماز پڑھ لیا کریں تو آپ کی وجہ سے بستی کے اور لوگ بھی نمازی بن جائیں اور اس طرح اللہ کا گھر آباد ہو جائے'' خان صاحب کہنے لگے: ''حضرت جی! میرے لیے پہلی مشکل یہ ہے کہ وضو نہیں ہوتی، دوسری بات یہ کہ شراب اور زنا کی عادت نہیں جاتی، لہٰذا اس صورت میں نماز کیسے پڑھ سکتا ہوں؟'' حضرت نے فرمایا: ''آپ صرف مسجد میں آجائیں، رہی بات وضو نہ کر سکنے کی تو بلا وضو ہی پڑھ لیا کریں، اور جہاں تک تعلق ہے گناہ کا تو نماز کے لیے اسے چھوڑنے کی حاجت بھی نہیں، ان شاء اللہ نماز خود اسے چھڑا دے گی'' خان صاحب بڑے خوش ہوئے اور نماز کا وعدہ کر لیا، حضرت ان سے وعدہ لے کر مسجد میں آئے اور دو رکعات نماز پڑھ کر سجدہ میں رو کر دعا کرنے لگے کہ ''یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا کہ کسی طرح محبت سے کام لے کر ہمت دلاؤں اور تیرے گھر تک لے آؤں، اب آگے کا کام تیرا ہے، جو تیرے کرم کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا کرم فرما دے۔'' اس کا اثر یہ ہوا کہ جب نمازِ ظہر کا وقت ہوا تو خان صاحب کو اپنا حضرت سے کیا ہوا وعدہ یاد آگیا، مسجد آنے کی تیاری کرنے لگے، ساتھ ہی خیال آیا کہ آج پہلا دن ہے، اس لیے غسل کر لینا بہتر ہے، کل سے بے وضو ہی نماز پڑھ لیا کریں گے، لہٰذا غسل کر کے پاک کپڑے پہن کر مسجد میں آئے اور نمازِ ظہر ادا کی، بعد میں اپنے باغ چلے گئے اور عصر و مغرب اسی وضو سے ادا کیں، مغرب بعد جب گھر پہنچے تو رنڈی موجود تھی، اولاً کھانے کے ارادہ سے اندر زنان خانہ میں گئے تو بیوی پر نظر پڑتے ہی فریفتہ ہو گئے، شادی کو سات برس ہو گئے تھے، مگر اب

تک بیوی کو دیکھا نہ تھا، اب جو نظر پڑی تو ''جب نظریں ہوئیں چار تو دل میں آیا پیار'' فوراً باہر آئے اور رنڈی سے کہا: ''چلی جا اور پھر کبھی نہ آنا'' اس کے بعد خادم سے بھی کہہ دیا کہ ''اب کے بستر گھر بھیج دو'' کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان کی حالت ایسی بدلی کہ پچاس سال تک فرض نماز تو کجا تہجد بھی قضا نہیں ہوئی۔ (مستفاد از: تذکرۃ الخلیل/ص:۱۱۹)

سچ ہے کہ

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

الغرض! اگر ہم آئینہ کی طرح صاف دل بن جائیں، پھر بے غرض ہو کر حکمت وموعظت کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاحی کوشش کریں تو نتیجہ اچھا ہی نکلے گا۔

آئینہ کی تیسری خصوصیت:

لیکن اگر اس کوشش کے باوجود کوئی خاص نتیجہ نظر نہ آئے تو مایوس ہو کر یا ناراض اور بددل ہو کر اصلاحی کام اور کوشش چھوڑنی نہیں چاہیے، بلکہ جب کبھی موقع مل جائے پھر کوشش کریں، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا یہی طریقہ رہا اور یہ سبق بھی اسی حدیث سے مل رہا ہے؛ کیوں کہ آئینہ کی ایک (تیسری) خصوصیت یہ بھی ہے کہ آئینہ انسان کو اس کا عیب اس وقت تک بتلاتا رہتا ہے جب تک وہ اپنی اصلاح کر کے عیب دور نہیں کر لیتا، اسی طرح ایک مومن بھی دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہے، لہٰذا ہمیں اپنے کسی بھائی میں قابل اصلاح کوئی بات نظر آئے تو اس کی اصلاح کی فکر اور کوشش اس وقت تک کرتے رہنا چاہیے جب تک وہ اپنی اصلاح نہیں کر لیتا، صاحبو! حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن جب اخلاص کے ساتھ صحیح طریقہ سے اصلاح کی کوشش کرتا رہے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا رہے تو اس کی برکت سے بگڑا ہوا ماحول بہت حد تک سدھر سکتا ہے، شرط اتنی ہے کہ ان آداب اور نبوی ہدایات کو ملحوظ رکھا جائے؛ کیوں کہ مومن کی شان خیر وصلاح قبول کرنا اور حق کو طلب کرنا ہے، اسی لیے

حکم خداوندی ہے:

﴿وَ ذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الذاريٰت : ٥٥)

’’آپ نصیحت کرتے رہیں، اس لیے کہ نصیحت ایمان والوں کو فائدہ دیتی ہے۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ جب بھی مومن کے سامنے خیر وصلاح کی بات آتی ہے تو وہ اسے قبول کر کے اپنی اصلاح کرتا ہے، محروم وہی رہتا ہے جو دولت ایمان سے محروم ہو، اس لیے ہمت سے کام لیتے ہوئے خود بھی بیدار ہوں اور محبت سے کام لیتے ہوئے دوسروں کو بھی بیدار کرنے کی فکر کریں، اس طرح ان شاء اللہ العزیز پورا معاشرہ صالح ہو جائے گا۔

آؤ! باہم مل کر اصلاحِ معاشرہ کی فکر کریں
اور معاشرہ اس طرح بنائیں کہ ملائکہ رشک کریں

حق تعالیٰ اپنے کرم سے ہماری اور معاشرہ کی بعافیت مکمل اصلاح فرمادیں۔ آمین۔

یومِ عرفہ/۱۴۳۲ھ
مطابق: ٦/نومبر/۲۰۱۱ء
بروز: یکشنبہ (بزمِ صدیقی، بڑودا)

’’اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ‘‘.

☆......☆......☆
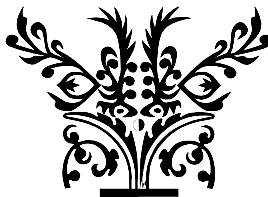
(۲۵)

خدمتِ خلق کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَنَسٍ وَعَبۡدِ اللّٰہِ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡهُمَا قَالَا: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ’’اَلۡخَلۡقُ عِیَالُ اللّٰہِ، فَأَحَبُّ الۡخَلۡقِ إِلَی اللّٰہِ مَنۡ أَحۡسَنَ إِلٰی عِیَالِہٖ‘‘. (رواہ البیہقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ/ص:۴۲۵/ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق/الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت انس اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال یعنی کنبہ ہے، پس اللہ تعالیٰ کو اپنی ساری مخلوق میں زیادہ محبت اس شخص سے ہے جو اس کے عیال (مخلوق) کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہو‘‘۔

خدمتِ خلق کی حقیقت:

ہر چیز کا کمال اس کے اوصاف کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے، مثلاً پتھر کا کمال یہ ہے کہ وہ سخت اور مضبوط ہو، لیکن ریشم کا کمال یہ ہے کہ وہ نرم اور لطیف ہو، نیز آگ کا کمال یہ ہے کہ وہ گرم ہو، مگر برف کا کمال یہ ہے کہ وہ ٹھنڈا ہو، اس اصول کے مطابق ایک انسان کا اور سچے مسلمان کا کمال یہ ہے کہ اس میں (۱) اللہ جل شانہ کی عبادت، (۲) اتباعِ سنت، (۳) اور مخلوق کی خدمت کا جذبہ اور اہتمام ہو۔ ’’خِــدۡمَۃٌ‘‘ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب

ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے دوسروں کی دینی اور دنیوی ضروریات میں کام آنا۔ اس اعتبار سے خدمتِ خلق کا مفہوم نہایت وسیع ہے، اس میں ہر وہ عمل داخل ہے جو بلا کسی فرق کے اللہ تعالیٰ کی کسی بھی مخلوق کی بھلائی، خیر خواہی اور ضرورت پوری کرنے یا تعاون کرنے کی نیت سے بلا اجرت وغرض کے انجام دیا جائے، نیز اس میں مالی تعاون کی تمام شکلیں اور جسمانی تعاون کی تمام صورتیں داخل ہیں، اس کے بعد اب اگر غور کیا جائے تو قرآن وحدیث کی تعلیمات وہدایات کا لبِ لباب اور خلاصہ بھی یہی تین چیزیں ہیں، اس لیے اس پر عمل کیے بغیر ایک انسان دنیا وعقبیٰ میں کمالات اور اعلیٰ مراتب ودرجات حاصل نہیں کرسکتا، کتاب وسنت میں اللہ جل شانہ کی عبادت اور اتباعِ سنت کے ساتھ مخلوق کی خدمت کے بھی بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں۔

خدمتِ خلق عبادت ہے:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدمت خلق بھی خوشنودیٔ خلق کے علاوہ رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے، اور یہی بڑی کامیابی ہے، اس لیے فرمایا گیا:

﴿ وَ افۡعَلُوا الۡخَیۡرَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ﴾ (الحج : ۷۷)

”بھلائی کے کام کرو، تاکہ تمھیں (بھلائی) کامیابی حاصل ہو۔“

مطلب یہ ہے کہ خیر کی نیت سے خیر کے کام کرو تو تمھیں خالق ومخلوق کی خوشنودی ملے گی، جو بڑی کامیابی ہے۔

نیز حدیث میں ہے:

”عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ”السَّاعِيُ عَلَی الۡأَرۡمَلَةِ وَالۡمِسۡکِیۡنِ کَالسَّاعِيۡ فِيۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ، وَأَحۡسِبُهٗ قَالَ: ”کَالۡقَائِمِ لَا یَفۡتُرُ وَکَالصَّائِمِ لَا یُفۡطِرُ“. (متفق علیه، مشکوٰة: ۴۲۲/ باب الرحمة والشفقة علی الخلق)

اللہ کا جو بندہ بیوہ اور کسی بے سہارا عورت، اسی طرح کسی مسکین حاجتمند کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتا ہو، ان کی خدمت کا کوئی کام کرتا ہو تو وہ عمل بھی عبادت ہے، اور اجر وثواب میں اس مجاہد کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جدو جہد کرنے والا ہے، دونوں کا اجر وثواب برابر ہے۔'' آگے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''خدمت خلق پر وہ اجر وثواب ملتا ہے جو صائم النہار اور قائم اللیل کو دیا جاتا ہے۔'' یعنی خدمت خلق کرنے والا بھی اس شب بیدار بندہ کی طرح ہے جو رات بھر نماز پڑھتا ہے اور تھکتا نہیں، اور اس دائمی روزہ دار کی طرح ہے جو کبھی بے روزہ نہیں رہتا، ظاہر ہے کہ رات بھر نمازیں پڑھنا اور دن بھر روزے رکھنا یہ سب کے بس کی بات نہیں، مگر خدمت خلق ایک ایسی آسان عبادت ہے جسے اپنی بساط کے مطابق ہر کوئی صاحب توفیق بندہ انجام دے کر صائم النہار اور قائم اللیل کی فضیلت کا مستحق بن سکتا ہے؛ کیوں کہ عبادت صرف نماز وروزہ ہی کا نام نہیں، بلکہ خلوص سے خدمت خلق کا کوئی کام کرنا بھی عبادت ہے، جس طرح ایک مومن عبادت کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا و جنت کا حقدار بن سکتا ہے اسی طرح خدمت کے ذریعہ بھی اس کا مستحق بن سکتا ہے۔

قربان ہوں اس پیغمبر پر جس نے یہ حقیقت سمجھائی
مخلوق کی خدمت کرنے سے خالق کی عبادت ہوتی ہے

ایک عبرتناک واقعہ:

منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ایک خوشحال گھرانہ بلخ میں سکونت پذیر تھا، اسی اثنا میں گھر کے ذمہ دار مرد کا انتقال ہو گیا، تو کچھ عرصہ کے بعد اس کی بیوہ اور یتیم بیٹیاں فقر وفاقہ کی شکار ہو گئیں، وہ بیوہ اپنی بچیوں کے ساتھ دوسرے شہر سمرقند میں منتقل ہو گئی، اور اس دوسرے شہر کی ایک غیر آباد مسجد میں اپنی یتیم اور معصوم بچیوں کو چھوڑ کر ان کے خورد ونوش کا انتظام کرنے چلی، اتفاق سے ایک دیندار مسلمان ملا، پس وہ اسے اپنا حالِ

زار سنانے لگی کہ ''میں علوی خاندان کی ایک بیوہ ہوں، میرے ساتھ یتیم بچیاں ہیں، جن کو اسی شہر کی غیر آباد مسجد میں چھوڑ کر مدد چاہنے آئی ہوں'' وہ دیندار مسلمان کہنے لگا: ''تم علوی خاندان کی مستحق بیوہ ہو اس پر کوئی پروف اور گواہ پیش کرو'' عورت نے کہا: ''میں شہر میں اجنبی ہوں، کوئی مجھے جانتا نہیں، اس صورت میں کیسے گواہ پیش کر سکتی ہوں؟'' اس شخص نے منہ پھیر لیا اور مدد کرنے سے ہاتھ روک لیا، وہ بیوہ مایوس ہو کر جانے لگی کہ ایک مجوسی ملا، شکستہ دل بیوہ نے اسے بھی وہی حالات سنائے جو پہلے شخص کو سنائے تھے، اس پر وہ مجوسی بلا تحقیق اس کی مدد کے لیے تیار ہو گیا، اس بیوہ کو یتیم بچیوں سمیت گھر لایا اور گھر کی خواتین کو ہدایت کی کہ ان کے لیے خوراک و پوشاک کا عمدہ انتظام کیا جائے اور عزت کے ساتھ اپنے گھر ٹھہرایا جائے، چناں چہ ایسا ہی ہوا، اُدھر اسی رات پہلے والے مسلمان نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا کہ گویا قیامت قائم ہو گئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور قریب ہی جنت کا ایک سبز زمرد کا خوبصورت محل ہے، اس شخص نے خواب میں حضور ﷺ سے دریافت کیا: ''یا رسول اللہ! یہ محل کس کا ہے؟'' فرمایا: ''ایک مسلمان موحد کا'' اس نے عرض کیا: ''حضور! الحمد للہ میں بھی مسلمان اور موحد ہوں'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''پروف اور گواہ پیش کرو کہ تم مسلمان موحد ہو'' وہ شخص حیران پریشان ہو گیا، پھر اس سے کہا گیا کہ ''جب تمہارے پاس ایک علوی خاندان کی شریف خاتون مدد کے لیے آئی تھی، تو تم نے کہا تھا کہ گواہ پیش کرو کہ تم علوی اور ضرورت مند ہو، اسی طرح اب تم بھی گواہ پیش کرو کہ تم مسلمان اور موحد ہو''، بس اسی وقت گھبراہٹ سے آنکھ کھل گئی، صبح ہوتے ہی وہ شخص اس بیوہ عورت کی تلاش میں نکل پڑا، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک مجوسی کے گھر مقیم ہے، جا کر مجوسی سے کہا کہ براہِ کرم اس بیوہ اور یتیم بچوں کو میری کفالت میں دے دو، صاحب خانہ نے انکار کر دیا اور کہا کہ ''مجھے اور میرے اہل خانہ کو ان کی خدمت سے وہ برکتیں میسر آئیں جو بیان سے باہر ہیں، الحمد للہ! ہم نے اس خاتون کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیا ہے، اور مزید سنو! کل رات جنت کے محل کا جو خواب تم نے دیکھا، الحمد للہ وہ میں نے بھی دیکھا، بلکہ مجھے اس کی بشارت دی گئی کہ یہ اس بیوہ

اور یتیم بچیوں کی مدد اور خدمت کا صلہ ہے۔'' (مستفاد از: کتاب الکبائر للذہبی: ۷۰، از: ماہنامہ ''المحمود''، صفحہ: ۱۷تا۱۹/ بابت: مئی ۲۰۱۰ء، بکھرے موتی: ۷/ ۱۷)

بعض خدمت گزار عبادت گزار سے بہتر ہوتے ہیں:

حضرت عارف شیرازیؒ اسی لیے کہتے ہیں نا! کہ

ز تسبیح وسجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمت خلق نیست

اس کا مطلب یہ ہے کہ تسبیح ہاتھ میں لے کر، مصلیٰ پر بیٹھ کر گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے اور گدڑی پہننے کا نام ہی عبادت نہیں، بلکہ خیر کی نیت سے خیر کے کام انجام دینا نیز ضرورت کے موقع پر مخلوق کے کام آنا اور ان کی اپنے علم وعمل اور مال کے ذریعہ خدمت کرنا بھی نہایت اہم عبادت ہے۔

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو عبادت میں مشغول پا کر دریافت فرمایا کہ ''تمہارا مشغلہ کیا ہے؟'' اس نے عرض کیا کہ ''عبادت کے علاوہ اور کچھ نہیں'' دریافت فرمایا: ''تمہاری کفالت کون کرتا ہے؟'' عرض کیا: ''میرا بھائی'' ارشاد فرمایا: ''تمہارا جو بھائی تمہاری خدمت کرتا ہے وہ تم سے زیادہ عبادت گزار (اور اجر وثواب کا حقدار) ہے۔'' واقعی بعض خدمت گزار عبادت گزار سے بہتر ہیں۔ (از فضائل زراعت/ص: ۵۳، مؤلفہ مفتی عبدالرزاق بھوپالی مدظلہٗ)

خدمت خلق کی فضیلت:

احادیث مبارکہ میں خدمت خلق کے بے شمار فضائل ہیں، خواہ وہ کسی کے لیے کسی بھی طرح کی اور کتنی ہی معمولی خدمت کیوں نہ ہو، اس لیے کہ معمولی خدمت کی توفیق بھی بہت بڑی سعادت بلکہ نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے، ایک حدیث میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يُصَفُّ أَهْلُ النَّارِ، فَيَمُرُّ بِهِمُ الرَّجُلُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَيَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ: "يَافُلَانُ! أَمَاتَعْرِفُنِيْ؟ أَنَا الَّذِيْ سَقَيْتُكَ شَرْبَةً"، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: " أَنَا الَّذِيْ وَهَبْتُ لَكَ وَضُوْءً"، فَيُشَفَّعُ لَهٗ، فَيُدْخِلُهُ الْجَنَّةَ". (ابن ماجه، مشكوٰة/ص:٤٩٤/ باب الحوض والشفاعة، شرح السنة للبغوى/ ص:١٨٤)

قیامت کے دن جب علماء وصلحاء اور ابرار واخیار کے جنت والے راستہ میں اہل دوزخ (مراد فاسق وگنہگار مسلمان) صف بنا کر کھڑے کیے جائیں گے (جس طرح فقراء اور مساکین اہل دولت کی گذرگاہوں پر بھیک مانگنے کے لیے (دنیا میں کھڑے ہوتے ہیں) اس وقت ان کے پاس سے ایک جنتی گذرے گا تو ایک دوزخی کہے گا: "اے فلاں! کیا تو مجھے جانتا نہیں؟ میں وہی ہوں جس نے تجھے ایک مرتبہ پانی (شربت یا دودھ وغیرہ) پلایا تھا" اور ان ہی میں سے ایک کہے گا کہ "میں وہ ہوں جس نے تجھے ایک مرتبہ وضو کے لیے پانی پیش کیا تھا" (یعنی دوزخی اپنی خدمت کا حوالہ دے گا تو اس پر وہ جنتی خدمت کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور) اس (خدمت کرنے والے) کے لیے شفاعت کرے گا اور اس کو جنت میں داخل کرادے گا۔ (انوار السنن ص: ۱/ ۹۷، الفیۃ الحدیث)

اس سے معلوم ہوا کہ نیک لوگوں کی تو معمولی خدمت بھی قیامت میں شفاعت و مغفرت کا سبب ہوگی۔

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا، نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ". (رواه مسلم والترمذى:٢/ ٣٦٢، مشكوٰة/ص:٣٢/ كتاب العلم/الفصل الأول)

جوشخص دنیا کی پریشانی میں سے کوئی معمولی پریشانی بھی کسی مسلمان (یا اللہ تعالیٰ کے کسی بھی بندے اور بندی) سے دور کردے تو یہ ایک بڑی خدمت ہے، جس کا اجر قیامت میں یہ ملے گا کہ حق تعالیٰ قیامت کی تکلیف اس سے دور کردیں گے، اور جو شخص کسی تنگدست کے ساتھ کسی بھی طرح سے آسانی کا معاملہ کرے گا تو یہ بھی ایک زبردست خدمت ہے، جس کا صلہ یہ ہے کہ رب العالمین اس کے لیے دونوں جہاں میں آسانی پیدا کردیں گے اور جو شخص دنیا میں کسی کی پردہ پوشی کرے گا، جس کی ایک ظاہری صورت یہ بھی ہے کہ کسی ننگے کو کپڑا پہنا کر اس کی ستر پوشی کا انتظام کرنا اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کی برائی پر مطلع ہونے کے بعد اسے لوگوں میں بلا وجہ ظاہر کر کے رسوا نہ کرنا، یہ بھی تو عظیم خدمت ہے، اس لیے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کا بدلہ یہ ملتا ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرماتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا ایک عیب چھپاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ستّر عیوب پر پردہ ڈالتے ہیں، اور اگر کوئی کسی کے ایک عیب کا افشا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ستّر عیوب ظاہر فرماتے ہیں، (پھر جس کے عیوب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ظاہر نہ کیے ہوں گے اسے) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بلا کر آہستہ سے کہیں گے کہ تم نے فلاں وقت فلاں جگہ فلاں گناہ کیا تھا، وہ بندہ اقرار کرے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے دنیا میں اسے چھپایا، اس لیے آج بھی چھپاتے ہیں اور تمہیں اجر عظیم سے نوازتے ہیں۔ (از: اشرف المشکوٰۃ: ۲/ ۳۴۵)

لیکن اگر کوئی ظالم یا فتنہ انگیز علانیہ ظلم اور فتنہ و فساد کے درپے ہو اور تنبیہ کے باوجود اس سے باز نہ آئے تو حکومت یا اس کے ذمہ دار تک اس کی اطلاع پہنچانی چاہیے، اس وقت اس کے اس عیب اور گناہ کو ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر اس میں کسی فساد کا خطرہ ہو تو پھر خاموشی بہتر ہے۔ فافہم۔

آگے فرمایا کہ اللہ رب العزت بندہ کی مدد کرتے رہتے ہیں جب تک بندہ اپنے بھائی کی نصرت (اور خدمت) میں رہتا ہے، ظاہر ہے کہ جس کا معاون و مددگار خود اللہ جل

شانہ ہو جائے اس کی ضروریات کیسے رک سکتی ہیں؟ یقیناً ایسے آدمی کی ہر حاجت وضرورت پوری ہوتی ہے، بلکہ اس کا پردۂ غیب سے انتظام ہوتا ہے۔اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ بڑوں کی بڑی بڑی خدمت کے بجائے چھوٹوں کی معمولی حاجت پوری کرنا بھی بہت بڑی خدمت اور اللہ تعالیٰ کی رضا ومحبت کا سبب ہے۔

خدمت خلق سے مقبولیت ملتی ہے:

حدیث مذکور میں فرمایا گیا: ’’اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ‘‘. ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے،اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک شخص بظاہر اپنے اہل وعیال کی روزی، روٹی اور ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے اسی طرح ساری مخلوق کی روزی، روٹی اور ضروریاتِ زندگی کا حقیقی کفیل اللہ تعالیٰ ہی ہے،اس لیے قرآنِ کریم نے ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ‘‘ کہا: کہ وہ ’’رَبُّ الْمُسْلِمِیْنَ، رَبُّ الْمُؤْمِنِیْنَ، رَبُّ الْمُتَّقِیْنَ‘‘ ہی نہیں، بلکہ وہ رب العالمین ہے، یہ قرآن کا صاف اعلان ہے۔

یہ پہلا سبق ہے کتابِ ہدیٰ کا
کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا

حدیث پاک میں مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی عیال کہا گیا تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ عیال کے معنیٰ متعلقین کے ہیں، اور اپنے عیال و متعلقین سے ہر ایک کو محبت ہوتی ہے، بلکہ ان کے ساتھ محبت وسلوک کرنے والوں سے بھی محبت ہوتی ہے،لہٰذا اس حدیث میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی یہی ہے:’’فَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَی اللّٰہِ مَنْ أَحْسَنَ إِلٰی عِیَالِہٖ‘‘ کہ جو کوئی خدمت خلق کا کام کرے، اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرے،ان کی دینی ودنیوی ضروریات میں کام آئے تو وہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کر لیتا ہے، اس کے بعد اسے خلوص کے ساتھ خدمت کے نتیجہ مقبولیت نصیب ہوجاتی ہے اور وہ خادم سے مخدوم بن جاتا ہے۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
ہرکہ خود را دید او محروم شد

خدمت نفس سے آدمی محروم اور خدمت خلق سے مخدوم ومقبول ہوتا ہے۔

ہم نے درد بن کے درد نہ بانٹا تو کیا جیے؟
مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لیے جیے
کچھ دردِ دل بھی چاہیے انسان کے لیے
جیتاہے وہ جو مرچکا ہو اوروں کے لیے

اللہ تعالیٰ کی سنت اور عادت یہی ہے کہ جن کے علم وعمل اور مال سے لوگ متمتع، مستفیض اور فیضیاب ہوتے ہیں انہیں مجبوبیت کا وہ درجہ حاصل ہوتا ہے کہ ان کے دنیا سے جانے کے بعد بھی ان کا ذکر خیر باقی رہتا ہے:

﴿ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ﴾ (الرعد : ۱۷)

''لیکن وہ چیز جو لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی اور قائم رہتی ہے۔'' جس طرح نفع بخش چیز کو باقی اور قائم رکھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح وہ لوگ بھی جو مخلوق کے لیے خدمت وغیرہ کے ذریعہ نفع بخش ہوتے ہیں تو ان کا ذکر خیر بھی زمین میں قائم اور باقی رہتا ہے۔

خدمت خلق کا واقعہ:

چناں چہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور صالحین کا تذکرہ آج تک زندہ وپائندہ ہے تو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے خدمت خلق کو اپنی پہچان بنایا، ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور مخلوق کا درد تھا، ان ہی کی شان میں یہ کہا گیا ہے:

ان کی نفرت بھی عمیق، ان کی محبت بھی عمیق
قہر بھی ان کا ہے، اللہ کے بندوں پہ شفیق

اس سلسلہ کے بے شمار واقعات ملتے ہیں، مثلاً صحابہ رضی اللہ عنہم میں حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا واقعہ بہت ہی مشہور ہے کہ مدینہ طیبہ کے باہر ایک بیوہ اندھی بوڑھی عورت رہتی تھی، سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ روزانہ صبح ہی جا کر اس کی گھریلو ضروریات خاموشی اور خلوص کے ساتھ سرانجام دیتے تھے، کچھ دنوں بعد آپ نے محسوس کیا کہ کوئی شخص مجھ سے بھی پہلے آ کر اس بوڑھی عورت کا سارا کام کاج کر جاتا ہے، تو آپ کو بڑا تعجب ہوا، آپ تحقیق کے ارادہ سے نمازِ تہجد کے بعد فجر سے قبل اس بوڑھیا کے گھر آئے تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس بوڑھی عورت کی خدمت گزاری سے فارغ ہو کر جھونپڑی سے باہر نکل رہے تھے۔ (کشکول حسن ۱۶۴، از روح پرور حالات اور حیرت انگیز واقعات ص:۱۵۴) بڑے اور اچھے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔

کسی کو تکلیف نہ دینا بھی خدمت ہے:

ایک بہترین انسان اور سچے مسلمان کے اوصاف میں بنیادی وصف یہی ہے کہ وہ لوگوں کے لیے نفع بخش بن کر رہے، جسے قرآنِ کریم ﴿ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ کہتا ہے۔ نیز بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ اللہ کے نبی علیہ السلام نے مومن بندہ کو کھجور کے درخت کے ساتھ تشبیہ دی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کھجور کا درخت دیگر درختوں سے زیادہ نفع بخش ہوتا ہے، لہٰذا مومن بندہ کو بھی چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ نفع بخش بنا رہے۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ (ذکر و فکر ص:۳۴۹ میں) فرماتے ہیں کہ ''اسلام کی تقریباً تین چوتھائی تعلیمات حقوق العباد سے متعلق ہیں اور ان کا محور رحمت عالم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: ''خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ''. (كنز العمال: ٤٤١٥٤) ''تمام لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔'' یعنی ان کی خدمت کرے، خدمت کے طریقے اور انداز الگ الگ ہیں، لیکن سب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان سب کا بھلا چاہے اور ایثار سے کام لے کر دوسروں کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے، آج کی مادّہ پرست دنیا میں ہم نے

لذت وراحت کو روپئے اور پیسے سے اس طرح وابستہ کرلیا ہے کہ ہم صرف اسی لذت کو لذت سمجھتے ہیں جو نوٹوں کی گنتی اور اسبابِ راحت کی فراہمی سے حاصل ہوتی ہے، ہمیں اُس لذت اور قلبی سکون کی ہوا بھی نہیں لگی جو اپنے کسی بھائی بہن کے دُکھ درد کو دور کر کے یا اسے آرام پہنچا کر حاصل ہوتا ہے، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے خدمت خلق کا ذوق عطا فرمایا ہے ان کے دل سے پوچھئے کہ کسی ضرورت مند کا کام کر کے یا کسی غمزدہ کے چہرے پر مسکراہٹ اور اطمینان لا کر قلب وروح کو جو تسکین ولذت میسر آتی ہے اس کے آگے نفسانی خواہشات کی ساری لذتیں ہیچ ہیں۔

صاحبو! اگر ہم میں سے ہر شخص اپنے غیر اختیاری عہدوں کے ساتھ مفت کا یہ خدمت والا اختیاری عہدہ بھی حاصل کرلے اور اسے مستقبل میں سنبھالے رکھے، اس طرح کہ اپنی بساط اور حیثیت کے مطابق حسب موقع خدمت خلق کا فریضہ انجام دے، جس کی ابتداء والدین، اقارب اور سماج کے معذور وضعیف لوگوں سے کرے، تو یقیناً اس سے معاشرے کے بہت سے زخم بھر جائیں اور زخم خوردوں کا مرہم فراہم ہوجائے گا، لیکن اگر ہم کسی وجہ سے خدمت خلق کا کوئی خاص قابل ذکر کام نہیں کر سکتے، ہم اگر دوسروں کا سامان نہیں اٹھا سکتے، ضرورت مندوں اور بیواؤں کے کام نہیں آسکتے، تو کم از کم اتنا ہی کرلیں کہ اپنی ذات سے یعنی اپنے قول وفعل سے بلاوجہ کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں، یہ بھی ایک طرح کی خدمت ہی ہے جس میں انسانیت کا نفع ہے، لہٰذا اگر نفع بخش بن کر خدمت خلق نہیں کر سکتے تو اپنے نقصان سے بچا کر خدمت خلق کیجئے، اتنا بھی کافی ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں خدمت خلق کے صحیح مواقع عطا فرما کر خلوص کے ساتھ اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

(۲۶)

خصوصیاتِ قرآنِ کریم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡھُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "إِنَّ ھٰذِہِ الۡقُلُوۡبَ تَصۡدَأُ کَمَا یَصۡدَأُ الۡحَدِیۡدُ إِذَا أَصَابَہُ الۡمَاءُ، قِیۡلَ: "یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ! وَمَا جَلَاؤُھَا؟" قَالَ: "کَثۡرَۃُ ذِکۡرِ الۡمَوۡتِ وَتِلَاوَۃُ الۡقُرۡآنِ". (رواہ البیھقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ/ ص:۱۸۹/ کتاب فضائل القرآن/ الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: ''بنی آدم کے قلوب پر اسی طرح زنگ چڑھ جاتا ہے جس طرح پانی لگ جانے سے لوہے پر زنگ آجاتا ہے، عرض کیا گیا: ''یا رسول اللہ! دلوں کے اس زنگ کے دور کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآنِ کریم کی بکثرت تلاوت کرنا۔''

قرآنِ کریم کی سب سے بڑی خصوصیت:

اللہ رب العزت نے اس دنیا میں پیدا کرنے کے بعد زندگی گذارنے کا جو دستور اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانیت کو عطا فرمایا اسے قرآنِ کریم کہتے ہیں۔

یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا شاہی فرمان ہے، قرآن کتاب اللہ کے ساتھ کلام اللہ بھی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی اور خصوصی نعمت اور دولت ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ رب العزت کا کلام ہے، یعنی اس کے الفاظ و مضامین سب ہی اللہ رب العزت کی جانب سے ہیں:

﴿تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الحاقة : ٤٣)

''یہ کلام رب العالمین کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔'' یہ کسی اور کا نہیں، بلکہ کائنات کے خالق و مالک کا کلام ہے۔ مسند احمد میں منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اسلام لانے سے پہلے کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مسجد حرام پہنچا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ حاقہ کی تلاوت میں مشغول پایا، میرے دل میں اس کا ایک خاص اثر ہوا، سوچنے لگا کہ قریش ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ شاعر کا کلام ہے، اس وقت آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَلَا بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ﴾

''یہ کوئی شاعر کا کلام نہیں، مگر تم یقین کم کرتے ہو۔ میں نے خیال کیا کہ اچھا، چلو شاعر نہ سہی، کاہن کا کلام تو ضرور ہے، ادھر آپ ﷺ نے اگلی آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ﴾

''یہ کسی کاہن کا بھی کلام نہیں، مگر تم نصیحت کم حاصل کرتے ہو۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے آگے تلاوت فرمائی، یہ پہلا موقع تھا کہ میرے دل میں اسلام کی سچائی کلامِ الٰہی سن کر گھس گئی تھی۔ (گلدستۂ تفاسیر:۲/۳۸۶)

قرآنِ کریم کی حفاظت وفضیلت کا راز بھی یہی ہے کہ وہ کلام الٰہی ہے، جیسے نظامِ الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکتا اسی طرح کلامِ الٰہی میں بھی کوئی تبدیلی نہیں لاسکتا، اور جب یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو اسے دیگر کلاموں اور کتابوں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو خالق کو مخلوق

پر۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

كَلَامُ الْمُلُوكِ مُلُوكُ الْكَلَامِ عِبَادَةُ السَّادَةِ سَادَةُ الْعِبَادَةِ

''بادشاہوں کا کلام بھی کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے اور سرداروں کی عبادت عبادتوں کی سردار ہوتی ہے۔

پہلی خصوصیت: ''موعظة من ربكم''

تو قرآنِ کریم کا کلام اللہ ہونا اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، اس کے علاوہ بھی اس کی بہت سی خصوصیات ہیں جنہیں قرآنِ کریم میں موقع بہ موقع بیان کیا گیا ہے، من جملہ ان میں سے چار عظیم الشان خصوصیات وہ ہیں جن کو اس آیت کریمہ میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

﴿يَآأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس: ۵۷)

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت آگئی ہے اور شفاء بھی ان بیماریوں کے لیے جو سینوں میں ہوتی ہیں، اور ہدایت ورحمت بھی ہے مومنین کے لیے۔'' آیت کریمہ کو ﴿يَآأَيُّهَا النَّاسُ﴾ سے شروع فرما کر ساری انسانیت کو خطاب فرمایا کہ اللہ رب العزت کا یہ کلامِ بلاغت نظام ساری انسانیت کے لیے ہے، لہٰذا اس کا پیغام بھی ساری انسانیت کے لیے عام ہے، اس حقیقت کو بتلانے کے لیے ﴿يَآأَيُّهَا النَّاسُ﴾ ارشاد فرمایا۔ اس کے بعد اس جگہ قرآنِ کریم کی جو صفات اور خصوصیات بیان فرمائی ہیں ان میں پہلی خصوصیت: ﴿مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ کا ذکر ہے، یعنی یہ قرآنِ کریم جو رب العالمین کی جانب سے بواسطۂ جبرئیل امین علیہ السلام رحمۃ للعالمین ﷺ پر نازل ہوا اس میں شروع سے اخیر تک جابجا ہدایت وحکمت سے بھرے ہوئے بہترین مواعظ ونصائح ہیں، اور وعظ و نصیحت سے دل متاثر ہوتے ہیں چناں چہ قرآنِ کریم سے بھی انسانی قلوب متاثر ہوتے ہیں،

اگر انسانی وعظ سے اتنا اثر ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات اس سے زندگی میں صالح انقلاب پیدا ہوتا ہے تو ربانی اور قرآنی وعظ سے تو بدرجۂ اولیٰ انقلاب آنا چاہیے، اس سے تو لوہے کی طرح سیاہ اور سخت، پتھر دل بھی موم اور منوّر بن جاتے ہیں اور بگڑے ہوئے دل بھی سنور جاتے ہیں، جیسا کہ حدیث مذکور میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اس کی تائید ہوتی ہے جس میں فرمایا:

"إِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الحدِيدُ إِذَا أَصَابَهُ المَاءُ".

"انسانوں کے دلوں پر بھی اسی طرح زنگ چڑھ جاتا ہے جس طرح پانی لگ جانے سے لوہے پر زنگ آجاتا ہے۔" اور دل کا زنگ یہ ہے کہ اس میں قساوت اور غفلت پیدا ہو جائے، اور یہی دراصل سارے گناہوں کی جڑ ہے، اس لیے کہ گناہ غفلت کی وجہ سے ہوتے ہیں، حدیث میں ہے کہ جب دلوں پر گناہوں کی وجہ سے غفلت کا زنگ چڑھ جائے تو اس کو صاف کرنے یعنی بگڑے ہوئے دل کو سنوارنے کے لیے دو کام کرنے چاہیے:

(۱) كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ: اپنی موت کو بہت زیادہ یاد کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت موت کا مراقبہ، دھیان اور استحضار رکھنا کہ ایک دن ہمیں مرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور پوری زندگی کا حساب دینا ہے۔ اس خیال کے بعد انسان کا گناہ سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، اس لیے حدیث میں اس کی ترغیب آئی ہے، اور اسی کے ساتھ دوسری بات دل کو سنوارنے کے لیے یہ بتلائی ہے:

(۲) وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ: ادب اور اخلاص کے ساتھ قرآنِ کریم کی صحیح صحیح تلاوت کرنا۔ ایسی تلاوت ان شاء اللہ دل کے زنگ کو دور کر کے اس کو منوّر کر دے گی، اس سے سخت دل نرم ہوگا اور بگڑا ہوا دل سنور جائے گا؛ کیوں کہ جس طرح موت واعظِ صامت ہے جو خاموشی کے ساتھ بہت کچھ سمجھا دیتی ہے اسی طرح قرآن کریم بھی واعظِ ناطق ہے، دنیا میں واعظوں کی کمی نہیں، چھوٹے بڑے، اچھے برے، بہت سے واعظ ہیں، لیکن سب سے

بہترین واعظ قرآنِ کریم ہے، اس کی تلاوت وسماعت سے بھی انسانی قلوب متاثر ہوتے ہیں۔ پھر عجیب بات تو یہ ہے کہ سمجھنے والے تو اس سے متاثر ہوتے ہی ہیں، جو نہیں سمجھتے وہ بھی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور متاثر ہوتے ہیں۔

قرآنی نصیحت کا ایک نمونہ:

اس سلسلہ میں اسلامی اور قرآنی تاریخ میں اس کی بہت سی روشن مثالیں ملتی ہیں، مثلاً سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں عرض کیا گیا کہ اسلام سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآنِ کریم کو جب انہوں نے سنا تو ان کا دل اسی وقت کسی حد تک نرم پڑ گیا تھا، لیکن انہوں نے جوشِ عداوت میں اس کے اظہار سے گریز و پرہیز کیا، اس کے بعد جب کفار کے ابھارنے پر حضور اکرم ﷺ کا کام تمام کرنے کے لیے نکلے اور بہن و بہنوئی کے یہاں ابتدائی مرحلے کے بعد جب قرآنِ کریم کی چند آیتیں سنیں تو اب دل کی دنیا ہی بدل گئی، بگڑا ہوا دل سنور گیا اور نورِ ایمانی سے لبریز ہو گیا، حضرت حفیظ جالندھریؒ نے کہا ہے:

کلامِ پاک کو پڑھتے ہی آنسو ہوگئے جاری
خدائے واحد و قدوس کی ہیبت ہوئی طاری

بے اختیار بول پڑے: "مَا أَحْسَنَ هٰذَا الْكَلَامَ وَمَا أَكْرَمَهٗ" یہ کتنا دلکش اور کتنا شاندار کلام ہے۔ چناں چہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اسلام کی لازوال دولت سے مالا مال ہو گئے۔ (سیرتِ مصطفیٰ: ۱/ ۲۶۱)

اسی طرح حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ آپ اپنی قوم کے سردار تھے، جب ان کو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور اسلامی دعوت وتبلیغ کی خبر ملی تو حاضر خدمت ہو کر مزید تحقیقات ومعلومات حاصل کرنے کا ارادہ کیا، مگر قوم کے لوگوں نے کہا کہ آپ ہم سب کے بڑے ہیں، لہٰذا آپ کا خود جانا مناسب نہیں، کسی اور کو اپنا قاصد بنا کر تحقیق حال کے لیے بھیجا جائے، چناں چہ قبیلے کے دو آدمی منتخب کر کے

حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجے گئے، انہوں نے حاضر ہوکر اکثم بن صیفی کی طرف سے عرض کیا: "مَنْ أَنْتَ وَمَا أَنْتَ؟ آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے پہلے سوال کے جواب میں تو صرف اتنا ہی فرمایا کہ "میں محمد بن عبداللہ ہوں۔" اور دوسرے سوال کے جواب میں فرمایا کہ "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔" اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۂ نحل کی آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الإِحْسَانِ وَ إِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ (النحل: ۹۰)

جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں عدل واعتدال، نیکی واحسان اور رشتے داروں کے ساتھ ادائے حقوق وحسن سلوک کا حکم دیتے ہیں، اور فحش و بے حیائی (کھلی برائی) اور منکر (مطلق برائی) اور کسی بھی طرح کی ظلم وزیادتی سے منع فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو مذکورہ امور کی اس لیے نصیحت فرماتے ہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ یہ آیت قرآنِ کریم کی جامع ترین آیت ہے، اس میں تمام اسلامی تعلیمات وہدایات کو چند الفاظ میں بیان کردیا گیا ہے۔ یہ دراصل قرآنی نصیحت کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

اصلاح عالم کا قرآنی پروگرام:

آیت کریمہ میں چھ باتوں کی طرف توجہ دلاکر حق تعالیٰ نے انسانیت کی صلاح و فلاح کا ایک مکمل نظام و پروگرام پیش فرمایا ہے، جن میں سے تین کا تعلق امر سے ہے اور تین کا نہی سے۔ پہلی چیز جس کا اس جگہ حکم دیا گیا وہ ہے عدل، اس کا مطلب تو ہے انصاف کرنا، لیکن اس عدل کے تین مفہوم بیان کیے گئے ہیں:

(۱) اپنے رب اور نفس کے درمیان عدل قائم کرنا۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان لائے، اس کی ذات اور مخصوص صفات میں کسی کو شریک نہ کرے، اگر انسان اس طرح زندگی گزارے تو یہ عادلانہ زندگی ہے۔

﴿ اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يَلۡبِسُوۡۤا اِيۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓـئِكَ لَهُمُ الۡاَمۡنُ وَهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴾ (الأنعام: ۸۲)

اپنے رب اور نفس کے درمیان عدل کا دوسرا تقاضا یہ بھی ہے کہ مرضیاتِ ربانی کو خواہشاتِ نفسانی پر مقدم کرے، یعنی اگر کسی مرحلے پر حکم ربانی اور خواہش نفسانی میں ٹکراؤ ہو جائے تو نفس کی خواہش کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرے، یہی تقاضائے عدل ہے۔

(۲) عدل کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہم خود اپنے نفس کے ساتھ انصاف کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہر اس چیز سے بچائیں جو جسمانی و ایمانی دنیوی اور اخروی ہر اعتبار سے ہلاکت کا ذریعہ ہو۔

﴿ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ﴾ (البقرة: ۱۹۵)

''تم اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔''

(۳) عدل کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے درمیان انصاف کریں۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کیا جائے، یا امورِ خیر میں جو اپنے لیے پسند ہو وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کیا جائے۔

آیت کریمہ ﴿ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى ﴾ (المائدة: ۸) میں اسی کا حکم دیا گیا ہے۔

صاحبو! ان حقائق سے معلوم ہوا کہ عدل کی ضرورت صرف عدالتوں ہی میں نہیں، بلکہ زندگیوں میں بھی ہے، اور ساری زندگی میں ہے، اور عدل قائم کرنا صرف حکومت ہی کی نہیں، بلکہ پہلے ہماری اپنی ذمہ داری ہے کہ ہم رب اور نفس کے درمیان عدل قائم کریں، یاد رکھو! نظامِ عدل کے قیام کے لیے پہلے خود اپنی زندگی اور عمل کے دائرے میں عدل قائم کرنا ضروری ہے، اگر ہر شخص اس طرح عادلانہ زندگی اختیار کرے تو دنیا جنت کدہ بن

جائے۔

دوسرا حکم احسان کا دیا جو عدل کے آگے کا درجہ ہے۔اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ انسان اپنے اللہ تعالیٰ پر نظر رکھتے ہوئے اعمال واخلاق میں حسن وخوبی پیدا کرے۔

﴿ وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ﴾ (القصص : ۷۷)

احسان کا یہ مقام اس وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا استحضار نصیب ہوجائے، جیسا کہ حدیث جبرئیل میں احسان کی یہی حقیقت بیان کی گئی ہے:

"أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ". (متفق عليه، مشكوٰة/ص: ۱۱)

احسان کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا جائے۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (البقرة : ۱۹۵) حتیٰ کہ جور وجفا کرنے والے کے بھی نیکی پر آنے کی امید ہو تو اس کے ساتھ بھی انفرادی امور میں احسان کرنے کی ترغیب ہے: "صِلْ مَنْ قَطَعَكَ."

تیسرا حکم ہے: "إِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى" جس کا مطلب قرابت والوں کو دینا ہے۔اب کیا دینا ہے؟ تو اسے دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾ (بنی إسرائيل : ۲٦)

یعنی ان کے حقوق ادا کیے جائیں۔ حالاں کہ احسان میں اداءِ حقوق داخل ہے، لیکن اداءِ حقوق کی اہمیت بتلانے کے لیے اس کو علیحدہ بیان فرمایا۔ پھر یہ حقوق کئی طرح کے ہیں، مثلاً اگر رشتہ دار غریب ہوں تو مالی امداد حسب حیثیت ان کا حق ہے، اگر وہ معذور ہوں تو جسمانی خدمت حسب حیثیت ان کا حق ہے، اگر بیمار ہوں تو بیمار پرسی ان کا حق ہے، غم زدہ اور رنجیدہ ہوں تو تسلی دینا ان کا حق ہے، اسی اداءِ حقوق کو حسن سلوک یعنی صلہ رحمی بھی کہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے اس کی تاکید ابتدائی دورِ اسلام میں اس وقت سے فرمائی ہے جب کہ ابھی حلال حرام کے احکام بھی نازل نہ ہوئے تھے۔

اس کے بعد تین چیزوں کی ممانعت آئی ہے، ان میں ایک فحش ہے، اس سے مراد وہ گناہ ہیں جو شہوتِ نفس کے تقاضے سے ہوں، جیسے زنا وغیرہ، اور منکر اس برائی کو کہتے ہیں جس کو شریعت اور شریف طبیعتیں برا سمجھتی ہیں، مثلاً جھوٹ بولنا، خیانت کرنا، وعدہ خلافی کرنا وغیرہ، اس طرح ان دونوں لفظوں میں ہر طرح کے ظاہری اور باطنی گناہوں کو ترک کرنے کا حکم دیا گیا:

﴿ وَذَرُوا ظَاهِرَ الإِثْمِ وَبَاطِنَهٗ﴾ (الأنعام: ۱۲۰)

اخیر میں لفظ "بغي" ہے، اس میں ہر قسم کی ظلم وزیادتی، قانون شکنی وغیرہ سے ممانعت فرمائی گئی ہے، غرض یہ آیت ہر خیر وشر کی جامع ہے، اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ "یہ ایک ایسی آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے ہر خیر کا حکم دے کر ہر برائی سے روک دیا۔" حتیٰ کہ بعض علماء نے تو فرمایا کہ اگر قرآنِ کریم میں کوئی دوسری آیت نہ ہوتی تو تنہا یہی آیت ﴿تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ﴾ (النحل: ۸۹) کا ثبوت دینے کے لیے کافی تھی، شاید اسی وجہ سے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب ۹۹ھ میں خلیفہ مقرر ہوئے تو آپ نے حکم فرمایا کہ خطبۂ جمعہ کے اخیر میں اس آیت کو پڑھا جائے اور سب سے پہلے آپ ہی نے خطبۂ جمعہ میں اس آیت کو پڑھا، جیسا کہ سب سے پہلے خطبۂ جمعہ میں ﴿إِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ......الخ﴾ والی آیت خلیفہ مہدی عباسی نے پڑھی، اور آج تک یہ طریقہ جاری ہے، پورے عالمِ اسلام میں اس پر عمل کیا جاتا ہے، البتہ یہ ضرور دھیان رہے کہ یہ دونوں آیتیں خطبہ میں لازم تو نہیں اور نہ ہی یہ خطبہ کا جزو ہیں، اسی لیے (بعض علماء فرماتے ہیں کہ) بہتر ہے کہ کبھی کبھی انہیں ترک بھی کر دینا چاہیے، تاکہ عوام الناس ان کو خطبہ کا جزوِ لازم نہ سمجھ لیں۔ (انوار البیان/ص: ۲۶۵، گلدستۂ تفاسیر: ۴/۱۲۴)

بہر کیف! حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ عنہ کے قاصدوں نے قرآنی نصیحت کی اس جامع ترین آیت کو جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تو بہت متاثر ہوئے اور بار بار

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے کی درخواست کی، یہاں تک کہ ان کو بھی یہ آیت یاد ہوگئی، پھر واپسی میں انہوں نے یہی آیت اکثم بن صیفی کو سنائی تو یہی آیت ان کے قبولِ اسلام کا ذریعہ بن گئی۔(ابن کثیر ومعرفۃ الصحابہ، از: معارف:۵/ ۳۷۸)

صدق اللّٰہ العظیم:﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ تْکُمْ مَوْعِظَۃٌ مِنْ رَّبِّکُمْ﴾

قرآنِ کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ایک نصیحت نامہ ہے،جن کے سینے میں سِل نہیں بلکہ دل ہے یا جو قرآن کی طرف رُخ کرتے ہیں پشت نہیں، وہ ضرور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔

دوسری خصوصیت: ”شِفَاءٌ لِّمَا فِیْ الصُّدُوْرِ“

آیت کریمہ میں قرآنِ کریم کی دوسری خصوصیت: ﴿وَشِفَآءٌ لِمَا فِیْ الصُّدُوْرِ﴾ ارشاد فرمائی۔

مطلب یہ ہے کہ لوگو! اگر تم نے قرآنی وعظ ونصیحت پر صحیح طور پر عمل کرلیا، جو نزولِ قرآن کا اصلی اور حقیقی مقصد ہے تو اس کی برکت سے تمہاری ہر طرح کی ساری بیماریاں ختم ہوجائیں گی؛ اس لیے کہ قرآنِ کریم دل کے روحانی مریضوں کے لیے تو بہترین وکامیاب ترین علاج ہے ہی، جسمانی مریضوں کے لیے بھی مفید ترین نسخۂ شفاء ہے،قرآن قوموں کا روحانی وجسمانی ہر طرح کا بخار اتار دیتا ہے،رب العالمین نے فرمایا:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَاھُوَ شِفَآءٌ﴾ (بنی إسرائیل : ۸۲)

قرآن صحت وشفاء کا بہترین نسخہ ہے،اس سے وابستہ ہوکر بڑے بڑے روحانی و جسمانی مریض شفایاب ہوگئے، بے شمار واقعات اور تجربات اس پر شاہد ہیں۔ مثلاً سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا ایک عجیب واقعہ ہے کہ شاہِ روم قیصر نے آپ کو ایک خط لکھا کہ میرے سر میں درد رہتا ہے، براہِ کرم آپ کوئی علاج بتائیں، میں تھک چکا ہوں،آپ نے اپنی ایک ٹوپی بھیج دی اور حکم فرمایا کہ اسے ہمیشہ اپنے سر پر رکھا کرو، ان شاء

اللہ دردِ سر (ہی نہیں بلکہ دردِ دل بھی) ختم ہو جائے گا، اور پھر ایسا ہی ہوا، ٹوپی پہنتے ہی اس کا دردِ سر ختم ہوگیا، مگر عجیب بات یہ پیش آئی کہ جب کبھی وہ ٹوپی اپنے سر سے اتارتا تو دوبارہ درد لوٹ آتا، اس نے تجسس کرتے ہوئے ٹوپی کو پھاڑا تو اس کے اندر ایک رقعہ پایا، جس پر قرآنِ کریم کی ایک مشہور و معروف آیت کریمہ کا حصہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا ہوا تھا۔ بس قیصر کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی، کہنے لگا کہ اللہ کا کلام اور دین اسلام کس قدر معجز ہے، جب اس کی ایک آیت باعث شفاء ہے تو پورا دین اسلام اور اللہ تعالیٰ کا کلام باعث شفاء و نجات کیوں نہ ہوگا؟ اور اس نے اسی وقت اسلام قبول کرلیا۔ (المواہب اللدنیہ، شرح شمائل ترمذی/ص:۳۰، از: کتابوں کی درسگاہ میں/ص:۸۱)

صدق اللّٰه العليم: ﴿يَآأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾

یہ قرآن رب العالمین کا نصیحت نامہ اور نسخۂ شفاء ہے۔ یہ دوا ہے ہر درد کی اور شفاء ہے ہر مرض کی، لیکن یاد رکھو! اس نصیحت نامہ اور نسخۂ شفاء سے وہی لوگ فیض یاب ہوتے ہیں جو قرآن کو محض زبان تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ دل میں اتارتے ہیں، یعنی جو اس کے ساتھ عقیدت و اطاعت کا معاملہ کرتے ہیں، اور جو اس کی نصیحت پر عمل ہی نہیں کرتے ان کی مثال اس مریض کی طرح ہے جس کو کسی ماہر حاذق حکیم اور ڈاکٹر نے شفاء کا نسخہ لکھ دیا، مگر وہ اسے استعمال کرنے کے بجائے جیب میں لیے پھرتا ہے، یا اپنے پاس فریم میں سجا کر رکھتا ہے، تو بھلا اسپیشیل ڈاکٹر کا بہتر سے بہتر نسخۂ شفاء بھی اسے کیا کام دے سکتا ہے! اس میں کمی نسخۂ شفاء کی نہیں، مریض کی ہے۔ اسی طرح قرآنِ کریم تو ﴿مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ ہے، ساری انسانیت کو نصیحت کا پیغام دیتا ہے، اور ﴿شِفَآءٌ لِمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ ہے، سبھی کے لیے نسخۂ شفا ہے، لیکن اگر بے ایمان اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو اس میں کمی، کوتاہی اور نادانی خود ان ہی کی ہے۔

تیسری خصوصیت: ”هُدًی“

آگے تیسری خصوصیت: ”هُـــدًی“ ذکر فرمائی کہ قرآنِ کریم کتابِ ہدایت ہے، انسانیت کی ہدایت ہی کے لیے حق تعالیٰ نے اسے نازل فرمایا، نزولِ قرآن کا اصل مقصد ہدایت ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿كِتٰبٌ أَنْزَلْنٰهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ ۙ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾ (إبراهيم: ٢)

محبوبم! یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا، تاکہ آپ اس کتابِ ہدایت کے ذریعہ تمام عالم کے موجودہ اور آئندہ آنے والے انسانوں کو کفر وشرک اور ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر ایمان اور حق و ہدایت کی روشنی کی طرف لے آئیں، ان کے رب کے حکم اور اجازت سے۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ذریعہ قرآنِ کریم میں زندگی گذارنے کے لیے جو پیغام واحکام دیے گئے وہ ایسے ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو دنیا میں ہدایت اور امن و عافیت عام ہو جائے، چناں چہ خیر القرون میں اس کا مشاہدہ ہو چکا، اور اب بھی جہاں جن کی زندگی میں مکمل قرآن کی حکمرانی ہے اور جو قرآنی حقوق کو ادا کرتے ہیں مراد قرآن کی تصدیق و تعظیم، تلاوت مع التجوید، تذکر و تدبر، تعامل اور پھر حسب صلاحیت اس کی تبلیغ و تعلیم کرتے ہیں ایسے لوگ ہی ہدایت اور امن و عافیت کی دولت سے مالا مال ہیں، اس کے برخلاف آج جو لوگ ان قرآنی حقوق سے غفلت برتتے ہیں وہ اس نعمت سے محروم ہیں، وہ اس لیے کہ انہوں نے قرآنی تعلیمات و ہدایات سے غفلت برتی ہے، اسی لیے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی نے فرمایا:

غضب ہے ہم کو اب حاصل نہیں ہے لطف روحانی
بھلادی آہ! دل سے ہم نے تعلیماتِ قرآنی
وہ قرآن آخری پیغام ہے جو رب العزت کا

مبارک ہو مبارک! قدر اس کی جس نے پہچانی
عمل جو شوق سے کرتا ہے قرآنِ معظم پر
وہی ہوتا ہے بے شک موردِ الطافِ ربانی

افسوس! آج موبائل کے دور میں بہت سے لوگ روزانہ موبائل کا اِن باکس کھول کر میسج تو چیک کرتے ہیں اوراس کے میسج بڑی دلچسپی اور پابندی سے پڑھتے ہیں، لیکن قرآن کھول کر اللہ رب العزت کا میسج اتنے اہتمام سے پڑھنے کی فرصت نہیں ہوتی، ضرورت ہے آج اس طرزِ عمل کو بدلنے کی۔

چوتھی خصوصیت: ''رَحْمَةٌ''

آیت کریمہ کے اخیر میں قرآنِ کریم کی چوتھی خصوصیت: ﴿وَ رَحْـمَةٌ﴾ بیان فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم سے جن لوگوں نے ہدایت حاصل کرلی یہ قرآن ان کے لیے دارین میں رحمت کا ذریعہ ہے؛ کیوں کہ قرآنِ کریم تو سراپا رحمت ہے، جیسے مقناطیس میں لوہے کو کھینچنے کی صلاحیت ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کھینچنے کی صلاحیت ہے، یہ کلامِ الٰہی رحمت الٰہی کا ذریعہ ہے، مگر کن کے لیے؟ فرمایا: ﴿لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ جو عقل سلیم اور قلب مستقیم کے مالک ہیں ان اہل ایمان کے لیے قرآنِ کریم سراپا شفا اور رحمت ہے، جو قرآنی ہدایات کی طرف زندگی کا رخ کیے ہوئے ہیں۔

اس کے برخلاف جو لوگ جوہر ایمان سے محروم ہیں، جن کی عقل شل ہے اور جن کے دل کا برتن ہی ٹیڑھا اور الٹا ہے، ان کے حق میں قرآنِ کریم کی شکل میں رحمت الٰہی کی موسلا دھار بارش بھی بے فائدہ ہے، ان کے لیے قرآنِ کریم رحمت نہیں، بلکہ اتمامِ حجت اور گمراہی کی آخری مہر ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ جس طرف انسان کا رُخ ہوتا ہے اس طرف کی معمولی سوئی بھی اسے نظر آتی ہے، لیکن جس طرف اس کی پشت ہوتی ہے اس طرف کا کوہِ ہمالیہ بھی نظر نہیں

آتا، بالکل اسی طرح جن لوگوں نے اپنی زندگی کا رُخ قرآن کی طرف کرلیا انہیں تمام مسائل کا حل قرآن سے مل جاتا ہے، قرآن ان ہی کے حق میں موعظت، شفاء، ہدیٰ اور رحمت ہے، لیکن جن لوگوں نے قرآن کی طرف رُخ کرنے کے بجائے پشت کی، قرآن سے انہیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا، نہ قرآن سے ان کے بیمار دل نصیحت حاصل کرتے ہیں، نہ شفا، نہ ہدایت ورحمت۔

صاحبو! اگر ہم نے اپنے ٹیڑھے اور الٹے دل کو توبہ کے ذریعہ سیدھا کرلیں گے تو اس قرآن کی نصیحت سے ہمارا دل شفایاب ہوکر ہدایت پائے گا اور ہمیں دارین میں اللہ جل شانہ کی رحمت کا مستحق بنائے گا۔

حق تعالیٰ ہمیں عامل قرآن، عاشق قرآن، اور داعیٔ قرآن بنا کر اپنی بارگاہ میں قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

" اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

☆......☆......☆
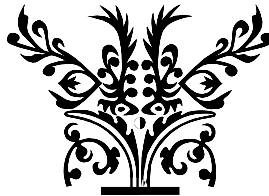
(۲۷)

مدارس کی اہمیت وافادیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَنَسِ بۡنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "هَلۡ تَدۡرُوۡنَ مَنۡ أَجۡوَدُ جُوۡدًا ؟" قَالُوۡا: "اَللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ أَعۡلَمُ"، قَالَ: "اَللّٰهُ تَعَالٰى أَجۡوَدُ جُوۡدًا، ثُمَّ أَنَا أَجۡوَدُ بَنِيۡ آدَمَ، وَأَجۡوَدُهُمۡ مِنۡ بَعۡدِيۡ رَجُلٌ عَلِمَ عِلۡمًا فَنَشَرَهٗ، يَأۡتِيۡ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ أَمِيۡرًا وَحۡدَهٗ"، أَوۡ قَالَ: "أُمَّةً وَّاحِدَةً". (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة/ص: ۳۷/ كتاب العلم)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے (ایک موقع پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے) فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ سب سے بڑا سخی کون ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں،'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ سب سے بڑا سخی ہے، (کہ اس نے بغیر کسی استحقاق کے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا) پھر (اس کی مخلوق اور بنی نوع انسانی میں) سب سے بڑا سخی میں ہوں، اور میرے (مرتبۂ نبوت یا زمانۂ نبوت) کے بعد سب سے بڑا سخی وہ شخص ہے جس نے علم حاصل کیا، پھر (تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ اور درس وتدریس کے ذریعہ) اس کی اشاعت کی، قیامت کے دن ایسا شخص تنہا ایک امیر کی شکل میں آئے گا، یا آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ایک گروہ اور جماعت بن کر آئے گا۔'' (اور اس کی خوب پذیرائی

اور تعظیم وتکریم ہوگی)۔

قیامِ مدارس کا بنیادی مقصد تعلیم اور تربیت ہے۔

قیامِ مدارس کا پہلا بنیادی اور اصلی مقصد قرآن و حدیث کی تعلیم اور ان کی نشر واشاعت ہے، اور یہ وہ عمل ہے جو اللہ رب العزت کے نزدیک نہایت ہی مقبول ومحبوب ہے، یہی وجہ ہے کہ خود رب العالمین نے انسانِ اوّل سیدنا آدم علیہ السلام کو روزِ اوّل ہی سے تعلیم دے کر گویا اس اہم اور قابل قدر عمل کی بنیاد ڈالی، جیسا کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ: ۳۱) سے اس طرف اشارہ ملتا ہے، اس کے بعد حق تعالیٰ نے انسانیت کی ابدی سعادت ونجات کے لیے جن محبوب، چیدہ اور برگزیدہ ہستیوں کو بھیجا، یعنی انبیاء ورسل علیہم السلام کو وحی کے ذریعہ تعلیم دے کر انہیں بھی تعلیم اور علم کی نشر واشاعت والے مبارک سلسلہ سے منسلک فرمایا، اس مقدس اور سنہرے سلسلہ کی آخری کڑی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ ﷺ کو بھی حق تعالیٰ نے کتاب وحکمت کی تعلیم دی اور تاحیات اسی سلسلہ سے وابستہ رکھا، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿وَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ط وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (النسآء: ۱۱۳)

”اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب وحکمت نازل کی ہے اور آپ کو ان باتوں کا علم دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا فضل ہمیشہ بہت زیادہ رہا ہے۔“

رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ پر کتاب وحکمت کا نزول فرما کر جن علوم سے آپ ﷺ واقف نہ تھے آپ ﷺ کے سینہ کو ان علوم کا خزینہ بنا دیا، تو معلوم ہوا کہ از آدم علیہ السلام تا رحمت عالم ﷺ تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کو خود حق تعالیٰ نے تعلیم دی، ان کے معلم واستاذ براہِ راست اللہ تعالیٰ ہیں، اور چوں کہ استاذ کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے اور حضراتِ انبیاء ورسل علیہم السلام مرتبہ کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بڑے ہوتے ہیں اس

لیے دنیا والوں میں کوئی ان کا استاذ اور معلم نہیں ہوتا، وہ ساری دنیا کے استاذ اور معلم ہوتے ہیں، اوران کی ذاتِ عالی علم الٰہی کا چلتا پھرتا مدرسہ وادارہ ہوتا ہے، ان کے دامن سے وابستہ ہونے والا علم وعمل سے مالا مال ہوجاتا ہے، مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

''ان کی صحبت وملاقات ہی ہر سوال کا جواب تھی، ان کی مجلس میں حاضر ہونے والا بے چوں وچرا ہر مشکل کا حل کرالیتا اور ہر مسئلہ کا تسلی بخش جواب پالیتا تھا۔''

ایک روایت جس میں محاسنِ شریعت کی نہایت جامعیت کے ساتھ تعلیم دی گئی:

اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب روایت ہے (اگرچہ بعض علماء نے اس میں کلام کیا ہے، مگر) اس میں محاسن شریعت کی نہایت جامعیت کے ساتھ تعلیم دی گئی، حافظ مستغفری نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے واسطے سے نقل کیا کہ ایک شخص رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ''حضور! اگر اجازت ہو تو میں کچھ ایسی باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں جو دارین میں کامیاب کردیں'' جب آپ ﷺ نے اجازت دی تو عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں چاہتا ہوں کہ لوگوں میں سب سے بڑا عالم بن جاؤں'' قَالَ: ''اِتَّقِ اللّٰهَ، تَكُنْ أَعْلَمَ النَّاسِ'' فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو تو سب سے بڑے عالم ہوجاؤ گے'' عرض کیا: ''میں سب سے بڑا مالدار ہونا چاہتا ہوں'' قَالَ: ''كُنْ قَنِعًا، تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ'' فرمایا: ''قناعت اختیار کرو، سب سے بڑے مالدار ہوجاؤ گے'' عرض کیا: ''میں سب سے اچھا آدمی بننا چاہتا ہوں''، قَالَ: ''خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ، فَكُنْ نَافِعًا لَهُمْ'' فرمایا: ''سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو لوگوں کے کام آئے، لہٰذا تم بھی کام کے

اور نافع بنو تو سب سے اچھے ہو جاؤ گے‘‘ عرض کیا: ’’میں سب سے انصاف پسند بننا چاہتا ہوں‘‘ ’’قَالَ: ’’أَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ، تَكُنْ أَعْدَلَ النَّاسِ‘‘ فرمایا: ’’لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، تو سب سے زیادہ انصاف پسند کہلاؤ گے‘‘ عرض کیا: ’’میں لوگوں میں سب سے خاص بندہ بننا چاہتا ہوں‘‘ قَالَ: ’’أَكْثِرْ ذِكْرَ اللّٰهِ، تَكُنْ أَخَصَّ الْعِبَادِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى‘‘ فرمایا: ’’ذکر اللہ کی کثرت کرو، اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہو جاؤ گے‘‘ عرض کیا: ’’میں نیک بننا چاہتا ہوں‘‘ قَالَ: ’’اُعْبُدِ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهٗ يَرَاكَ‘‘ فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو اس استحضار کے ساتھ عبادت کرو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے‘‘ عرض کیا: ’’میں چاہتا ہوں کہ میرا ایمان مکمل ہو جائے‘‘ قَالَ: ’’حَسِّنْ خُلُقَكَ، يَكْمُلْ إِيْمَانُكَ‘‘ فرمایا: ’’حسن اخلاق اختیار کرو، اس سے تمہارا ایمان مکمل ہو جائے گا‘‘ عرض کیا: ’’میں اطاعت گزار بندہ بننا چاہتا ہوں‘‘ قَالَ: ’’أَدِّ فَرَائِضَ اللّٰهِ تَكُنْ مُطِيْعًا‘‘ فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ کے فرائض کی پابندی کرو، اس کے اطاعت گزار ہو جاؤ گے‘‘ عرض کیا: ’’میں اللہ تعالیٰ سے پاک صاف ہو کر ملنا چاہتا ہوں‘‘ قَالَ: ’’اِغْتَسِلْ مِنَ الْجَنَابَةِ مُتَطَهِّرًا، تَلْقَ اللّٰهَ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَا عَلَيْكَ ذَنْبٌ‘‘ فرمایا: ’’غسل جنابت خوب اہتمام سے کرو، تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملو گے کہ کوئی گناہ تم پر نہ ہوگا‘‘ عرض کیا: ’’میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن نور کے ساتھ اٹھایا جاؤں‘‘ قَالَ: ’’لَا تَظْلِمْ أَحَدًا، تُحْشَرْ فِي النُّوْرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ‘‘ فرمایا: ’’کسی پر ظلم نہ کرو، تو تم قیامت کے روز نور کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے‘‘ عرض کیا: ’’میں چاہتا ہوں کہ میرا رب میرے ساتھ رحم کا معاملہ فرمائے‘‘ قَالَ: اِرْحَمْ نَفْسَكَ وَارْحَمْ خَلْقَ اللّٰهِ، يَرْحَمْكَ رَبُّكَ‘‘ فرمایا: ’’اپنے آپ پر (ترکِ معاصی کے ذریعہ) رحم کرو، اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ بھی رحم کا معاملہ کرو، تو حق تعالیٰ تم پر بھی رحم کرے گا‘‘ عرض کیا: ’’میں چاہتا ہوں کہ میرے گناہ کم ہو جائیں‘‘ قَالَ: ’’اِسْتَغْفِرِ اللّٰهَ قَائِمًا تَقِلَّ ذُنُوْبُكَ‘‘ فرمایا: ’’رات کی عبادت میں اللہ تعالیٰ سے استغفار (مغفرت طلب) کرو، تمہارے گناہ کم (بلکہ

معاف) ہو جائیں گے'' عرض کیا: ''میں لوگوں میں باعزت رہنا چاہتا ہوں'' قَالَ: "لَا تَشْتَكِ مِنَ اللّٰهِ إِلَى الْخَلْقِ، تَكُنْ أَكْرَمَ النَّاسِ" فرمایا: ''مخلوق سے اللہ تعالیٰ کی شکایت مت کرو، سب سے زیادہ باعزت رہو گے'' عرض کیا: ''میں چاہتا ہوں کہ سب سے زیادہ طاقتور رہوں'' قَالَ: "تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ، تَكُنْ أَقْوَى النَّاسِ" فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو، سب سے زیادہ طاقتور رہو گے'' عرض کیا: ''میں چاہتا ہوں کہ میرا رزق وسیع کر دیا جائے'' قَالَ: "دُمْ عَلَى الطَّهَارَةِ، يُوَسَّعُ عَلَيْكَ الرِّزْقُ" فرمایا: ''ہمیشہ باوضو رہو، تمہارا رزق وسیع کر دیا جائے گا'' عرض کیا: ''میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا محبوب بننا چاہتا ہوں'' قَالَ: "أَحِبَّ مَا أَحَبَّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ، وَأَبْغِضْ مَا أَبْغَضَهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" فرمایا: ''جس چیز کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پسند کرتے ہیں تم بھی اس کو پسند کرو، اور جس سے انہیں نفرت ہو تم بھی اس سے نفرت کرو'' عرض کیا: ''میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے محفوظ رہوں'' قَالَ: "لَا تَغْضَبْ عَلَى أَحَدٍ، تَأْمَنْ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ وَغَضَبِهٖ" فرمایا: ''کسی پر (بے جا) غصہ نہ کرو، تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے غضب سے محفوظ رہو گے'' عرض کیا: ''میں چاہتا ہوں کہ میری دعا قبول ہو'' قَالَ: "اِجْتَنِبِ الْحَرَامَ، تُسْتَجَبْ دَعْوَتُكَ" فرمایا: ''حرام سے بچو، تمہاری دعا قبول ہو گی'' عرض کیا: ''میں چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ مجھے تمام مخلوق کے سامنے (قیامت کے دن) رسوا نہ کریں'' قَالَ: "اِحْفَظْ فَرْجَكَ كَيْ لَا تَفْتَضِحَ عَلَى رُؤُوْسِ الْأَشْهَادِ" فرمایا: ''اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرو، تاکہ برسرِ عام رسوا نہ کیے جاؤ'' عرض کیا: ''میں چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ مجھ سے میرا عیب پوشیدہ رکھیں'' قَالَ: "اُسْتُرْ عُيُوْبَ إِخْوَانِكَ، يَسْتُرِ اللّٰهُ عُيُوْبَكَ" فرمایا: ''تم اپنے بھائیوں کے عیوب پوشیدہ رکھو، تمہارے عیوب کو اللہ تعالیٰ پوشیدہ رکھے گا'' عرض کیا: ''کونسی چیز میرے گناہوں کو ختم کر سکتی ہے؟'' قَالَ: "اَلدُّمُوْعُ وَالْخُضُوْعُ وَالْأَمْرَاضُ" فرمایا: ''گناہوں پر اشک ندامت (آنسوؤں کی جھڑی) خشوع وخضوع اور امراضِ جسمانی'' عرض کیا: ''کونسی نیکی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل اور بڑھ کر ہے؟'' قَالَ: "حُسْنُ الْخُلُقِ وَالتَّوَاضُعُ

وَالصَّبْرُ عَلَى الْبَلِيَّةِ وَالرِّضَاءُ بِالْقَضَاءِ“ فرمایا: ”اچھی سیرت وکردار (اچھے اخلاق) تواضع، مصیبت پر صبر اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی رہنا“ عرض کیا: ”کونسی بدی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ سنگین ہے؟“ قَالَ: ”سُوْءُ الْخُلُقِ وَالشُّحُّ الْمُطَاعُ“ فرمایا: ”بد اخلاقی اور وہ بخل جس کی اطاعت کی جائے“ عرض کیا: ”کونسی چیز اللہ تعالیٰ کا غضب ٹھنڈا کر سکتی ہے؟“ قَالَ: إِخْفَاءُ الصَّدَقَةِ وَصِلَةُ الرَّحِمِ“ فرمایا: ”پوشیدہ طریقہ سے صدقہ کرنا اور صلہ رحمی کرنا“ عرض کیا: ”نارِ دوزخ کو کونسی چیز بجھا سکتی ہے؟“ قَالَ: ”اَلصَّبْرُ“ فرمایا: ”صبر کرنا۔“ (دلائل النبوۃ: ۱/ ۱۲۶، از: ماہنامہ الشارق/ ص: ۵۴ تا ۵۸/ بابت: مئی- جون/ ۲۰۱۲ء)

مدارس کے کاموں کا محور چار باتیں ہیں:

الغرض! قرآن وحدیث کی تعلیم اور ان کی نشر واشاعت جو ہمارے مدارس کے قیام کا اصلی اور بنیادی مقصد ہے، یہ دراصل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے پسندیدہ عمل کی نقل ہے، پھر ان مدارس کے تین ارکان ہیں: (۱) تعلیم۔ (۲) متعلم۔ (۳) معلم۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے تو ان مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس سے اعلیٰ تعلیم اور کوئی نہیں ہو سکتی، چناں چہ مدارس کے اندرونی حالات اور ان کے تعلیمی نصاب کا ذرا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اس سے بھی مدارس کی اہمیت وافادیت سمجھ میں آ سکتی ہے، اس لیے کہ مدارس کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تربیت کی اصل بنیاد وہ چار امور ہیں جن کے لیے اللہ رب العزت نے رحمت عالم ﷺ کو مبعوث فرمایا، قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کی بعثت کے چار مقاصد بیان فرمائے ہیں:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (اٰل عمران: ۱٦٤)

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں

پاک کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔''

پھر عجیب بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ان مقاصد اربعہ کو چار مقامات پر بیان کیا، سورۂ بقرہ میں دو جگہ یعنی آیت نمبر: ۱۲۹ اور ۱۵۱ میں، پھر سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیت کے علاوہ سورۂ جمعہ کی آیت نمبر: ۲ میں۔ ان میں آپ ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد تلاوتِ آیات کو بیان کیا، دوسرا مقصد تزکیۂ نفوس (اصلاحِ قلوب) کو بیان کیا، تیسرا مقصد تعلیم کتاب اور چوتھا مقصد تعلیم حکمت کو بیان کیا، حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے لے کر وفات تک کی ساری زندگی ان ہی کاموں کے لیے وقف تھی۔

اب مدارس کے کاموں کو دیکھا جائے تو ان کا محور بھی یہی چار باتیں ہیں، مدارس کا نصابِ تعلیم اور نظامِ تربیت ان ہی کے گرد گھومتا ہے، چناں چہ تلاوتِ آیات کے لیے ہمارے مدارس میں شعبۂ دینیات اور حفظ وتجوید کے درجات ہیں، جن میں دِن رات الفاظِ قرآن کی تصحیح اور تلاوتِ آیات کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور یہ کوئی معمولی کام نہیں، بلکہ بڑے بڑے فوائد وفضائل کا حامل ہے، اس سے دل کا زنگ دور ہوتا ہے، ہر ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، اور حدیث میں ایسے لوگوں کو سب سے بہترین بتلایا گیا۔ (اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ)

اور جہاں تک تعلیم کتاب وحکمت کا تعلق ہے تو اس کے لیے ہمارے مدارس میں عالمیت کے مختلف درجات ہیں، جن میں کتاب وحکمت کو سمجھنے کی صلاحیت وقابلیت پیدا کرنے کے لیے ابتدائی درجات میں طلبہ کو نحو وصرف، اور فقہ وادب پڑھایا جاتا ہے، پھر اس کے بعد تعلیم کتاب کے لیے قرآنِ کریم کے تراجم وتفاسیر اور تعلیم حکمت (سے یہاں مراد سنت ہے) کے لیے احادیث مبارکہ کی مختلف کتب خصوصاً صحاح ستہ پڑھائی جاتی ہیں۔ اس کی تعلیم وتدریس کا درجاتِ علیا میں اہتمام کیا جاتا ہے، اور یہ درس وتدریس بھی وہ مبارک اور مقدس مشغلہ ہے جو بہت سی نفلی عبادتوں پر اہمیت وفوقیت رکھتا ہے، حضرت عبد اللہ بن

عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

عن ابن عباسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُمَا "تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِنْ إِحْيَاءِ هَا". (رواه الدارمي، مشكوٰة/ص:٣٦)

تعلیم وتدریس کی تھوڑی سی مشغولیت بھی رات بھر کی (نفلی) عبادت سے بہتر ہے؛ کیوں کہ عبادت کا نفع محدود اور علم کا نفع غیر محدود ہے۔ رہی بات تزکیۂ نفوس اور اصلاحِ قلوب کی، تو الحمد للہ، ہمارے مدارس میں اس کا بھی کسی درجہ میں اہتمام کیا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ مدارس صرف تعلیم وتدریس کی درسگاہیں نہیں، بلکہ درحقیقت ایمانی، اخلاقی اور عملی تربیت کی روحانی خانقاہیں بھی ہیں، ان میں قرآن وحدیث کی تعلیم کے ساتھ حیوانیت اور ظلم وبربریت سے نجات دلانے کے لیے اعمال کی اصلاح اور اخلاق کی تربیت بھی کی جاتی ہے، حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ "حقیقی مدرسہ تو وہی ہے جس میں علم کے ساتھ عمل کی بھی تعلیم اور نگہداشت ہو۔" اور تربیت تعلیم سے اہم ہے؛ کیوں کہ تعلیم کا مقصد ہی تربیت ہے، تعلیم سے حضور اکرم ﷺ کا علم زندہ ہوگا اور تربیت سے حضور اکرم ﷺ کا عمل۔

ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ "تعلیم تربیت کے بغیر تو حاصل ہوسکتی ہے، مگر تربیت تعلیم کے بغیر نہیں ہوسکتی۔"

صاحبو! نرا علم کافی نہیں، اس کے ساتھ تزکیہ بھی ضروری ہے، جس نے تعلیم کے ساتھ تربیت بھی حاصل کرلی وہ کامیاب ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (الأعلىٰ: ١٧)

مگر افسوس! آج کل ہمارے اہل مدارس اس سلسلہ میں غفلت برتتے نظر آرہے ہیں، غالبًا یہی وجہ ہے کہ اب مدارس بھی رسمی اور نمائشی ہو کر رہ گئے ہیں، الا ماشاء اللہ۔ حالاں کہ قیامِ مدارس کے بنیادی مقاصد دو ہی ہیں: تعلیم اور تربیت۔ عاجز کا خیالِ ناقص ہے کہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں، اگر ان میں سے ایک نہ ہو تو وہ یک چشم (کانے) انسان کے

مانند ہے، اوران دونوں کے بغیر مدارس ایسے ہیں جیسے روح کے بغیر جسم، کاش! اہل مدارس نصابِ تعلیم کے ساتھ نظامِ تربیت کی طرف مکمل توجہ دیں تو پھر مدارس کی مٹی بڑی زرخیز ثابت ہوگی، بقولِ اقبالؒ:

نہیں ہے نومید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اس سے مدارس کا ماحول مزید علمی، عملی، عرفانی اورنورانی بنے گا، پھراس ماحول میں تعلیم وتربیت پانے والا طالب علم مال والا مالوی نہیں، بلکہ علم مولیٰ والا مولوی بنے گا، اورزمانہ کا کوئی غلط رنگ اس پرنہیں چڑھ سکے گا، ان شاء اللہ۔ لیکن اس کے لیے مدارس کے اساتذہ کو سب سے پہلے اپنے اندراخلاصِ نیت، صلاحیت اورصالحیت پیدا کرنی ہوگی، علمی اختصاص اورصلاحیت پیدا کرنے کے لیے علمی مزاج اور مطالعہ کا ذوق بنائیے، نیز کسی بھی شعبہ میں تخصص کیجیے اورحاصل شدہ علم پرقناعت نہ کیجیے، اخلاصِ نیت اورصالحیت پیدا کرنے کے لیے شیخ کامل کی صحبت اختیار کیجئے۔

مفت تعلیم مدارس کی خدمات کا اہم حصہ ہے۔

بہرکیف! مدارس کے نصابِ تعلیم اورنظامِ تربیت کی اصل بنیاد وہی چار امور ہیں جوحضورِاکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد تھے، مدارس کا قیام اوران میں تعلیمی وتربیتی نظام ان ہی کوروبعمل لانے کے لیے ہے، مدارس کی اہمیت وافادیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کتاب وحکمت کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم اوراس کے مطابق تربیت کا بہترین وسیلہ اور ذریعہ ہیں، لیکن اس کے علاوہ ایک اورظاہری پہلو پرغورکیا جائے تو اس سے بھی مدارس کی اہمیت وافادیت اجاگر ہوتی ہے، اوروہ یہ ہے کہ مدارس میں غریب اورنادار طلبہ کے لیے مفت تعلیم اورمفت قیام وطعام کا انتظام ہوتا ہے، اوریہ بھی انبیاءعلیہم السلام کے عمل کی ایک نقل ہے، وہ قوم کوعلم کی تعلیم بلا معاوضہ دیتے تھے۔

﴿ وَيٰقَوْمِ لَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًاؕ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ (هود : ۲۹)

’’اور اے میری قوم! میں اس (تعلیم وتبلیغ) پر تم سے کچھ مال نہیں مانگتا، میرا اجر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے ذمے نہیں۔‘‘

بقولِ شاعر:

ہر دم برس رہے ہیں انوار مدرسوں میں ☆ آ کر تو کوئی دیکھے اک بار مدرسوں میں
ہر پل محبتوں کا اظہار مدرسوں میں ☆ گفتار مدرسوں میں، کردار مدرسوں میں
دِن بھر تلاوتیں ہیں، شب بھر عبادتیں ہیں ☆ ہوتا نہیں کوئی دِن اتوار مدرسوں میں

اور سچی بات یہ ہے کہ دنیا میں دین اسلام ہی نے سب سے پہلے فری (Free) تعلیم کا نظام پیش کیا، گرانی کے اس دور میں مفت تعلیم اور قیام وطعام کا انتظام مدارس کی گراں قدر خدمات کا اہم حصہ ہے، اہل مدارس جس طرح بے سروسامانی کے عالم میں بھی عموماً پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مفت تعلیم کے تصور کو عام کر رہے ہیں اس کی مثال انسانی تاریخ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی، آج کل جتنی بھی تعلیم گاہیں چل رہی ہیں خواہ وہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم تک محدود ہوں یا اعلیٰ تعلیم کے لیے قائم ہوں، ان کا انتظام وانصرام پرائیوٹ ہاتھوں میں ہو یا حکومت کے ہاتھوں میں، بہر حال وہ قوم کے نونہالوں کو اسی وقت تعلیم سے بہرہ ور کرتے ہیں جب ان کا پورا خرچ ادا کر دیا جائے، ان تعلیم گاہوں کو تجارت کی منڈیاں بنا دیا گیا ہے، جہاں ڈگریاں صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر نہیں ملتیں یا کم ملتی ہیں، ڈگریاں بڑی بڑی رقمیں دے کر خریدی جاتی ہیں، جب کہ اہل مدارس کی سخاوت کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے زیر تعلیم غریب اور نادار طلبہ سے ڈونیشن بلکہ فیس کے نام سے بھی (تقریباً) کچھ نہیں لیتے، وہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے نہج پر لینے کے بجائے دینے کے اصول پر عمل کرتے ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ حدیث مذکور میں انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد سب سے بڑا سخی کہا گیا، ان کی یہ علمی سخاوت مالی سخاوت سے بہتر ہے؛ کیوں کہ علم افضل

ہے مال سے، ان حقائق کے پیش نظر غور کیجئے! کیا غریبوں اور شکستہ حال مفلسوں کے بچوں کو نوشت وخواند (لکھنے پڑھنے) سے آشنا کر کے انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم مفت دے کر مدارس نے ملک وملت پر بڑا احسان نہیں کیا؟ آج اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو مزدوروں، غریبوں اور بیواؤں کے نونہالوں کے مستقبل کو کون سنوارتا؟

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ایک موقع پر مدارس کی اہمیت وافادیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ان عربی مدارس کا اگر کوئی دوسرا فائدہ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہیں، اوران سے فائدہ اٹھا کر ہمارا غریب طبقہ اونچا ہوتا ہے۔''

سچ ہے:

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ وبالا

حضرت امام یوسفؒ کا واقعہ:

تاریخ اسلام میں اس کی بہت سی روشن مثالیں ملتی ہیں، منجملہ ان میں حضرت امام ابو یوسفؒ کا واقعہ بہت ہی مشہور ہے، جو امامنا العلام امامِ اعظم ابوحنیفہ النعمانؒ کے جلیل القدر شاگرد ہیں، آپ ایک بیوہ ماں کے یتیم بچے تھے، ان کی والدہ نے فکر معاش کی وجہ سے انہیں دھوبی کے حوالے کر دیا، لیکن انہیں پڑھنے کا شوق تھا، یہ جا کر امام ابوحنیفہؒ کے درس میں بیٹھنے لگے، ان کی والدہ کو پتہ چلا تو انہوں نے منع کیا، اس بنا پر وہ مجبوراً کئی روز تک امام صاحبؒ کے درس میں شرکت نہ کر سکے، ذہین اور شوقین طالب علم کی طرف استاذ کی توجہ طبعی بات ہے، جب کئی دنوں کے بعد پھر وہ درس میں پہنچے تو امام صاحب نے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی، انہوں نے سارا ماجرا بیان کر دیا، حضرت امام ابوحنیفہؒ نے انہیں درس کے بعد بلایا اور ایک تھیلی حوالے کی جس میں سو درہم تھے، فرمایا کہ ''اس سے کام چلاؤ، اور جب ختم ہو جائیں تو مجھے بتانا۔'' حضرت امام ابو یوسفؒ خود فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے کبھی امام صاحبؒ کو یہ

بتانے کی نوبت نہیں آئی کہ تھیلی ختم ہوچکی ہے، ہمیشہ جب پیسے ختم ہوجاتے تو امام صاحب خود ہی مزید پیسے عطا فرمادیتے، جیسے انہیں ختم ہونے کا الہام ہوجاتا ہو، ان کی والدہ شاید یہ سمجھتی ہوگی کہ یہ سلسلہ کب تک چل سکتا ہے؟ کوئی مستقل ذریعۂ معاش ہونا چاہیے، اس لیے ایک مرتبہ انہوں نے امام صاحبؒ سے کہا کہ ''یہ یتیم بچہ ہے، میں چاہتی ہوں کہ کوئی کام سیکھ کر کمانے کے لائق ہوجائے، اس لیے آپ اسے اپنے درس میں شریک ہونے سے روکیے۔''

اس وقت امام صاحب نے فرمایا: ''یہ تو پستے کے گھی میں فالودہ کھانا سیکھ رہا ہے۔'' والدہ نے اسے مذاق سمجھا اور چلی گئیں، اس کے بعد امام ابو یوسفؒ فکر معاش سے بے فکر ہوکر تحصیل علم میں تقریباً سترہ سال تک مشغول رہے، یہی وہ غریب طالب علم تھے جو آگے چل کر بنی عباس کے جلیل القدر خلیفہ ہارون الرشید کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے، جن کے فتاویٰ ساری مملکت بنی عباس میں مراکش سے لے کر ملتان تک نافذ العمل ہوتے تھے۔ بابا سعدیؒ نے سچ فرمایا:

ترا علم در دین و دنیا تمام
کہ کارِ تو از علم گیرد نظام

''تجھ کو علم، دین ودنیا میں کافی ہے، بس تیرا کام علم سے آراستہ ہونا ہے۔''

اس لیے کہ

بنی آدم از علم یابد کمال
نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

''انسان کا کمالِ حقیقی علم ہی کے ذریعہ ہے، نہ کہ نوکر چاکر اور مال ومنال سے۔''

خود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے علم کی بدولت وہ قدر ومنزلت عطا فرمائی کہ میں قضا کے منصب تک پہنچا اس دوران بکثرت خلیفۂ وقت ہارون رشید کے دسترخوان پر کھانے کا اتفاق ہوتا رہا، ایک روز میں ہارون رشید کے پاس بیٹھا تھا کہ انہوں نے ایک پیالہ مجھے پیش

کیا اور بتایا کہ ''یہ بڑی خاص چیز ہے جو ہمارے لیے بھی کبھی بنتی ہے'' میں نے پوچھا: ''امیر المومنین! یہ کیا ہے؟'' کہنے لگے کہ ''یہ پستے کے روغن میں بنا ہوا فالودہ ہے۔'' یہ سن کر مجھے حیرت کی وجہ سے ہنسی آ گئی، ہارون رشید نے وجہ پوچھی تو میں نے اپنے دورِ بچپن کا سارا واقعہ سنایا تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گئے، اور فرمانے لگے: ''اللہ امام ابوحنیفہؒ پر رحم فرمائے، وہ اپنی عقل کی آنکھ سے وہ کچھ دیکھتے تھے جو چشم سر سے نظر نہیں آ سکتا۔'' (سچ ہے: ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'')۔ (تاریخ بغداد للخطیب: ۱/۲۴۵، از جہانِ دیدہ: ص/۳۶، اساتذہ کے لیے تربیتی واقعات: ص/۳۳)

اہل مدارس کا عظیم کارنامہ' نادار اور ناکارہ بچوں کو کارآمد بنانا:

آج بھی مدارس کے ان نادار طلبہ میں نہ جانے کتنے ہی ایسے ہوں گے جو اپنے وقت کے ابوحنیفہ وابویوسف اور مفسر قرآن ومحدثِ عصر، مفکر ملت ومفتیٔ اعظم اور رہنمائے قوم ہوں گے، وہ خود اپنے مستقبل سے اگرچہ باخبر نہیں، مگر ان کے اساتذہ ان حقائق سے آگاہ ہوتے ہیں، اس لیے وہ انہیں اپنی روحانی اولاد سمجھ کر ان کی تعلیم وتربیت کرتے ہیں، اور اہل مدارس کا یہ کتنا عظیم کارنامہ اور کمال ہے کہ وہ قوم کے نادار بلکہ ناکارہ بچوں پر بے لوث اور پرخلوص محنت کر کے انہیں حافظ وقاری، عالم ومفتی، امام وخطیب بنا کر کارآمد بنا دیتے ہیں، کیوں کہ بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں عموماً قوم کے نادار اور ناکارہ بچے ہی بھیجے جاتے ہیں، یا تو وہ غریب ہوتے ہیں یا پھر شریر، جو لوگ ناداری وغریبی کی وجہ سے اپنے بچوں کو عصری تعلیم دلا نہیں سکتے، اسکولوں میں پڑھا نہیں سکتے، یا جو بچے ناکارہ ہونے کی وجہ سے پڑھ نہیں سکتے، اسکولوں میں فیل ہوتے ہیں، انہیں عام طور پر مدارس کے حوالہ کیا جاتا ہے کہ ''اَلا بلا بر گردنِ ملّا''۔

حضرت تھانویؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''کیا وجہ ہے کہ اب مدارس سے رازی وغزالی جیسے پیدا نہیں ہوتے؟'' فرمایا: ''کہاں سے پیدا ہوں؟ کم حوصلہ، احمق اور غبی قسم کے تو علم دین پڑھنے لگے، اور جو بلند حوصلہ وذہین ہیں انہوں نے علم دین حاصل کرنا چھوڑ دیا، انتخاب

کا اختیار ہمیں دے دیجیے پھر دیکھئے گا! ہم رازی وغزالی پیدا کر کے دکھلا دیں گے۔'' ان شاء اللہ۔ (العلم والعلماء/ص: ۲۹۵) کیوں کہ علم نبوت رازی وغزالی پر ختم نہیں ہو گیا، وہ باقی ہے اور قیامت تک رہے گا، ہمارے علماء آج بھی الحمد للہ ناامید نہیں ہوئے، یہ اہل مدارس کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ ان ہی سنگ ریزوں (کنکریوں) کو کُندن (خالص سونا) بناتے ہیں، کیچڑ میں کنول کھلاتے ہیں اور مختلف میدان کے رجالِ کار تیار کر کے قوم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، یہ جہاں اہل مدارس کا ایک عظیم کارنامہ ہے وہیں مدارس کی اہمیت وافادیت کا ایک بڑا ثبوت بھی ہے، یہ مدارس واقعی ملک وملت کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، ان مدارس نے ہمیشہ ملک وملت کو بڑے بڑے کام کے لوگ دیے ہیں اور دیتے رہیں گے، ان شاء اللہ۔

اسی لیے علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ''ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مدرسوں میں پڑھنے دو؛ کیوں کہ اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا اسے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اُسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمرا اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔''

(اوراقِ گم گشتہ/ص: ۵۷، از: حسن تدبیر کا مدارس نمبر ص: ۲۳۵)

کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس ملت و مذہب کا علم ختم ہو جاتا ہے وہ مذہب بھی دنیا سے ختم ہو جاتا ہے، یا اپنی اصلیت اور حقیقت کھو دیتا ہے، ہمارا دین الحمد للہ قیامت تک کے لیے ہے تو اس کا علم بھی قیامت تک باقی رہے گا، اور علومِ اسلامیہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے یہ مدارس بھی قیامت تک رہیں گے، حق تعالیٰ دین کے ساتھ دینی علوم کے ان مراکز کی

حفاظت کا بھی غیبی انتظام فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

ضرورت ہے کہ ان مدارس کی اہمیت و افادیت اور ان کے مقاصد کو سمجھا جائے اور مدارس کے ساتھ خلوص و محبت اور نصرت کا معاملہ کیا جائے، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ارشادِ ربانی:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ز یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ﴾ (البقرة : ۲۷۳)

میں اہل مدارس کا ہر طرح سے تعاون کرنے کی ترغیب ہے۔ یہ ہماری سعادت ہے کہ ہم اہل مدارس سے محبت و نصرت کا معاملہ کریں، ورنہ حق تعالیٰ ان کے انتظام و انصرام میں کسی کے محتاج بالکل نہیں ہیں۔

حق تعالیٰ اپنے فضل سے خلوص اور حسن تدبیر کے ساتھ ہمیں ان مدارس سے کامل وابستگی عطا فرمائے۔ آمین۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ".

☆......☆......☆
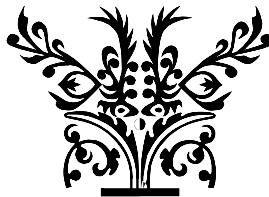
(۲۸)

اللہ رب العالمین کی شانِ رحمت اور اس کی وسعت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ رَحۡمَةٍ، أَنۡزَلَ مِنۡهَا رَحۡمَةً وَاحِدَةً بَيۡنَ الۡجِنِّ وَالإِنۡسِ وَالۡبَهَائِمِ وَالۡهَوَامِّ، فَبِهَا يَتَعَاطَفُوۡنَ، وَبِهَا يَتَرَاحَمُوۡنَ، وَبِهَا تَعۡطِفُ الۡوَحۡشُ عَلٰى وَلَدِهَا، وَأَخَّرَ اللّٰهُ تِسۡعًا وَتِسۡعِيۡنَ رَحۡمَةً يَرۡحَمُ بِهَا عِبَادَهٗ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ". (متفق علیه، مشکوۃ/ص: ۲۰۷ / باب فی سعة رحمة اللّٰه / الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حق تعالیٰ کی رحمت کے سو حصے ہیں، جن میں سے ایک حصہ نازل فرما کر جنوں، انسانوں، جانوروں اور زہریلے جانوروں کے درمیان تقسیم فرمایا، چناں چہ اسی ایک رحمت کے سبب وہ آپس میں میل ملاپ رکھتے ہیں، اور اسی کے سبب وہ آپس میں رحم کرتے ہیں اور وحشی جانور تک اپنی اولاد سے الفت رکھتے ہیں، اور ننانوے رحمتوں کو مؤخر کیا ہے، جن کے ذریعہ وہ قیامت میں اپنے (مومن) بندوں پر رحم کرے گا۔

رحمتِ الٰہی کی وسعت اور اس کا مطلب:

حق تعالیٰ کی نعمتوں کی طرح اس کی رحمتوں کا سلسلہ بھی اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ کائنات کی کوئی چیز اس سے باہر نہیں، کیا مرد، کیا عورتیں، کیا جوان، کیا بوڑھے، کیا نیک، کیا بد، کیا پڑھے لکھے، کیا اَن پڑھ، کیا عوام، کیا خواص، حتیٰ کہ کیا مسلم اور کیا غیر مسلم، ہر ایک کو اس کی وسیع رحمت سے بے شمار فوائد حاصل ہو رہے ہیں، اب جہاں تک عذاب کی بات ہے تو قرآن کہتا ہے:

﴿قَالَ عَذَابِیْ أُصِیْبُ بِهٖ مَنْ أَشَآءُ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (الأعراف: ۱۵۶)

رب العالمین نے فرمایا: ''میرا عذاب تو میں اسی گنہگار پر نازل کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں، جہاں تک میری رحمت کا تعلق ہے تو وہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔'' یہ عجیب بات ہے کہ عذابِ الٰہی میں ہر گنہگار کو مبتلا نہیں کیا جاتا، مگر رحمت الٰہی سے ہر ایک کو نوازا جاتا ہے، یہ رحمت کیا ہے؟ حضرت تھانویؒ نے رحمت کے چار معانی بیان فرمائے ہیں، جن میں سے دو کا تعلق دنیا اور دو کا عقبیٰ سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جسے اپنی رحمت سے نوازنا چاہتے ہیں اسے چار چیزیں عطا فرماتے ہیں: (۱) توفیق ایمان وطاعت۔ (۲) فراخیٔ معیشت۔ (یعنی رزق کی وسعت وبرکت) (۳) مغفرت۔ (۴) دخولِ جنت۔ (مواہب ربانیہ: ۱۲۱) مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جس کسی کو نیکی، بھلائی، خیر خواہی اور طاعت الٰہی کی توفیق ملتی ہے وہ درحقیقت رحمت الٰہی کا اثر ہے، پھر اس پر جو اجر وثواب اور بدلہ ہے وہ غیر اہل ایمان کو دنیا ہی میں اور ایمان والوں کو دونوں جہاں میں دیا جاتا ہے وہ بھی رحمت الٰہی کا تو اثر ہے۔ اسی لیے فرمایا:

﴿جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا﴾ (النبأ: ۳۶)

یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے صلہ ہوگا (اللہ کی) ایسی دین ہوگی جو کسی استحقاق کے بغیر لوگوں کو ان کے اعمال کے حساب سے دی جائے گی۔ کیوں کہ اعمال کی جزا بھی در اصل عطا ہی ہے، اسی لیے یہاں جزا کے بعد عطا کو بیان فرمایا۔

گنہگاروں کو موقع دینا اور امید دِلانا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اثر ہے۔

علاوہ ازیں دنیا میں اللہ رب العالمین کا اپنی نافرمانی کے باوجود فوری طور پر گنہگاروں کی پکڑ نہ کرنا اور بے شمار نعمتوں سے نوازنا بھی تو رحمت الٰہی کا اثر ہے، ورنہ اگر حق تعالیٰ اپنی نافرمانی کرنے والوں سے نعمتوں کو سلب کر لیتے یا فوراً مواخذہ فرماتے تو یہ اس کا ظلم نہیں، عدل ہوتا، لیکن اس نے عدل کے بجائے فضل سے کام لیا؛ کیوں کہ اگر وہ عدل کا معاملہ کرتا تو روئے زمین پر کوئی زندہ باقی نہ رہتا، قرآن کہتا ہے:

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (فاطر: ٤٥)

''اللہ رب العالمین اگر لوگوں کی ظلم وزیادتی اور نافرمانی پر فوراً پکڑ فرمالے تو اس کے نتیجہ میں کوئی جاندار زندہ نہ رہتا۔'' عذابِ الٰہی سے سب کے سب ہلاک ہوجاتے؛ کیوں کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے فرماں برداروں سے زیادہ نافرمان بستے ہیں، احکامِ الٰہی کی اطاعت کرنے والے کم اور بغاوت کرنے والے زیادہ ہیں، حتیٰ کہ اس گلشن ہستی میں وہ لوگ بھی ہیں جو نہ صرف اللہ رب العالمین کا انکار کرتے ہیں، بلکہ اس کا استہزا اور مذاق کرتے ہیں اور حق پرستوں پر ظلم وزیادتی کرتے ہیں، اللہ جل شانہ اگر ان سے انتقام لے تو نہ ان کو کھانے کے لیے ایک دانہ میسر آئے اور نہ پانی کا کوئی قطرہ ان کے حلق کو تر کر سکے۔ یہ تو اس کی رحمت واسعہ کا نتیجہ ہے کہ نہ نافرمانوں اور گنہگاروں کا فوری طور پر مؤاخذہ کیا جاتا ہے نہ ان سے ان کا رزق بند کیا جاتا ہے، نہ نعمتوں کا سلسلہ منقطع کیا جاتا ہے نہ ان کے گناہوں کو ظاہر کیا جاتا ہے، بلکہ انہیں توبہ کے لیے موقع اور بار بار مہلت دی جاتی ہے، انہیں امید دِلائی جاتی ہے، فرمایا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ط إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (الزمر: ٥٣)

محبوبم! میرے اُن بندوں سے کہہ دیجیے جنہوں نے گناہ کر کے اپنی ذات پر ظلم کیا

ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، وہ غفورٌ رحیم تمہارے سارے گناہوں کو معاف کرنے کے لیے تیار ہے۔ بس گنہگار اپنی اصلاح کا پختہ ارادہ کر کے پچھلی زندگی سے سچی پکی توبہ کرلے تو حق تعالیٰ اس کے تمام گناہوں کو معاف کرنے کا وعدہ فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ! کس قدر امید دلانے والی یہ آیت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''مَا أُحِبُّ أَنَّ لِيَ الدُّنْيَا بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ''. (مسند أحمد، مشكوٰة/ص: ٢٠٦) مجھے اس آیت رحمت کے بدلہ میں ساری دنیا اور اس کی نعمتیں لینا بھی پسند نہیں۔

آیت رحمت کا شانِ نزول:

اس آیت کریمہ کے شانِ نزول کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے (پیشہ ور قاتل) وحشی بن حرب نے مکہ مکرمہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک پیغام روانہ کیا کہ میں توبہ کر کے اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں، مگر میرے لیے قرآنِ کریم کی ایک آیت سبب رکاوٹ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ج وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا﴾ (الفرقان: ٦٨)

''اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس جان کو اللہ تعالیٰ نے حرمت بخشی ہے اسے ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں، اور جو شخص بھی یہ کام کرے گا اسے اپنے گناہ کے وبال کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

اس میں تین جرائم نہ کرنے والوں کے لیے معافی کا وعدہ فرمایا گیا: (۱) شرک۔ (۲) قتل ناحق اور (۳) زنا۔ وحشی نے کہا: ''میں نے تو یہ تینوں جرائم کیے ہیں تو کیا میرے لیے بھی معافی کی گنجائش ہے؟'' اس پر اگلی آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ

حَسَنٰتٍ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَحِيْمًا﴾ (الفرقان: ۷۰)

البتہ جو سچی توبہ کر کے ایمان لے آئے اور ایمان اور اعمالِ صالحہ والی زندگی اختیار کرلے تو نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ اس کی توبہ سے پہلے والی خطاؤں کو معاف کردے گا بلکہ اس کی سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت لکھ کر وحشی کو بھیجی، جواباً اس نے عرض کیا کہ ''اس میں توبہ کی قبولیت کے لیے ایمان کے بعد اعمالِ صالحہ کی شرط ہے، اور کیا معلوم میرا نفس مجھے عمل نہ کرنے دے، تو کیا ہوگا؟ اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء: ۱۱۶)

''بالیقین اللہ تعالیٰ شرک کرنے والے کو نہیں بخشے گا، مشرک کے علاوہ جس کو چاہے گا معاف کردے گا۔'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت سے بھی اسے باخبر کردیا، مگر وحشی بڑا احساس تھا، اب کی بار اس نے عرض کیا: ''حضور! گستاخی معاف ہو، یہاں بھی اللہ جل شانہٗ نے مشرک کے علاوہ کسی بھی گنہگار کی مغفرت کا جو وعدہ فرمایا ہے تو اس کو اپنی مشیت وچاہت پر موقوف رکھا ہے، ہوسکتا ہے کہ مجھ جیسے سیاہ کار، خطاکار اور بدکار کو معاف نہ کرنا چاہے، تب میرا کیا بنے گا؟ مجھے تو گارنٹی چاہیے، اب کی مرتبہ حق تعالیٰ نے آیت رحمت کو نازل فرمایا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (الزمر: ۵۳)

میرے محبوب! کہہ دیجئے میرے ان بندوں کو جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا ہے کہ وہ میری رحمت سے مایوس نہ ہوں، میں غفورٌ رحیم ہوں، تمہارے سارے گناہوں کو معاف کرنے لیے تیار ہوں۔ آؤ تو سہی۔ اس موقعہ پر ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ''جبین نیاز کو جھکاؤ تو سہی، طلب کا دامن پھیلاؤ

توسہی، اشک ندامت بہاؤ توسہی، میرے لطف وکرم کوآزماؤ توسہی، تمہارے آنے میں دیر ہوسکتی ہے، میرے راضی ہونے میں دیر نہ ہوگی۔'' اس آیت رحمت کے نازل ہونے کے بعد وحشی اور اس جیسے مجرموں کا تو کام ہی بن گیا۔ کہنے لگا: ''نِعْمَ هٰذَا'' واہ واہ! کیا ہی اچھی آیت ہے! اس کے بعد دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوگیا۔ (تنبیہ الغافلین مترجم:۱۱۰)

بعض روایات میں ہے کہ آیت رحمت کے نازل ہونے کے بعد کسی نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! یہ آیت خاص وحشی کے لیے ہے یا ساری امت کے لیے؟'' ارشاد فرمایا: ''بَلْ لِلْمُسْلِمِيْنَ عَامَّةً'' سب ہی کے لیے ہے، جو بھی اللہ جل شانہ کے عذاب یا موت سے قبل اپنی مکمل اصلاح کے ارادہ سے سچی پکی اور صحیح توبہ کرلے ان سب کے لیے ہے، یہ اس کا فضل اور رحمت نہیں تو اور کیا ہے؟

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدیؔ سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی گر تو کسی قابل ہوتا

(''اللہ بندوں سے کتنی محبت کرتے ہیں'' /ص:۳۹۶)

حق تعالیٰ کا وعدۂ رحمت میں مبالغہ فرمانا:

بلاشبہ اس میں ہر قسم کے گنہگاروں کے لیے ایک بہترین آفر اور خود ان کے پروردگار کی طرف سے عظیم بشارت ہے؛ کیوں کہ آیت رحمت کا آغاز لفظ ''عِبَادِيْ'' سے فرمایا گیا، جس میں اشارہ اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ جو ایمان لاکر سچی توبہ کرکے صحیح معنوں میں اس کا بندہ بن جائے گا تو اس کے گناہ ایمان وتوبہ کی برکت سے خواہ سمندر کے جھاگ کے برابر بھی ہوں تو انہیں معاف کردیا جائے گا۔ (واللہ اعلم) حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

أَيَا صَاحِبَ الذَّنْبِ لَا تَقْنَطَنْ فَإِنَّ الإِلٰهَ رَؤُوْفٌ رَؤُوْفٌ

''اے گنہگار! مایوس اور ناامید مت ہوجا؛ کیوں کہ تیرا معبود مہربان ہے، بڑا ہی مہربان۔'' جس کی شان قرآنِ کریم نے یوں بیان کی ہے: ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ

الــرَّحْــمَةَ﴾ (الأنعام: ٥٤) ’’تمہارے رب نے رحمت کا معاملہ کرنا تمہارے ساتھ اپنے آپ پر لازم کرلیا ہے۔‘‘ دنیا کا کوئی شریف اور بھلا آدمی بھی جب وعدہ خلافی نہیں کرتا تو رب العالمین قرآنِ کریم میں کیے ہوئے اس تحریری وعدہ کے خلاف کیسے کرے گا؟ جب کہ اس کریم نے آیت رحمت میں لفظ ’’إِنَّ‘‘ اور ’’جَـمِيْعًا‘‘ حروفِ تاکید لاکر وعدۂ رحمت میں مبالغہ فرمایا ہے، تاکہ اس کے وعدۂ رحمت ومغفرت میں کسی کو کسی قسم کا شبہ نہ رہے، یہ بھی اس کی رحمت کا اثر ہے۔ سبحان اللہ! ہمارا رب کیسا مہربان اور رحم وکرم والا ہے، کسی نے کیا خوب کہا:

ندارم ہیچ گونہ توشۂ راہ ☆ بجز لَا تَـقْـنَـطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ

نفرمودی کہ نومیدی بیارید ☆ زمن لطف وعنایت چشم دارید

بدیں معنیٰ بسے امید داریم ☆ بخشائے زاں کہ بس امید داریم

امید دردمنداں بجا کن ☆ دلِ امید داراں را دوا کن

(وعظ بے نظیر/ص:۷۹)

الٰہ العالمین! ہمارے پاس تو تیری رحمت کی امید کے سوا آخرت کے لیے کوئی توشہ اور زادِ راہ نہیں، تو نے یہ تو نہیں فرمایا کہ ناامید ہوکر میرے پاس آؤ، بلکہ اپنے لطف وکرم ہی پر نظر رکھنے کو فرمایا، اسی لیے تو ہم گناہگاروں کو تجھ سے بے پناہ رحمت کی امید ہے اور تجھ سے امید نہ رکھیں تو اور کس سے رکھیں۔ اے ہمارے رب! دردمندوں کی امید کو پورا کر، تیری رحمت کی امید رکھنے والوں کے دلوں کو خوش کر، کہ تیری وسیع رحمت کا یہی تقاضا ہے، اور تو بہانہ انتقام کا نہیں بلکہ انعام کا ڈھونڈتا ہے، تو تو احسان وعنایت کا متلاشی ہے۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے:

تنگ دستی کے عالم میں جو میں گھبراتا ہوں
پر درِ غیر پہ جاتے ہوئے شرماتا ہوں
ہاتھ پھیلانے میں محتاج کو شرم کیسی؟
شرم اتنی ہے کہ بندہ تیرا کہلاتا ہوں

دنیا میں اللہ رب العالمین کی شانِ رحمت کا اثر:

مزید حق تعالیٰ کی کمالِ رحمت کو بتانے کے لیے حدیث میں رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کی مخلوق آپس میں جو محبت اور رحمت کا معاملہ کرتی ہے یہ اللہ کی شانِ رحمت کا اثر ہے، فرمایا کہ "إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ رَحْمَةٍ" اللہ جل شانہ کی رحمت کے سو حصے ہیں۔

"أَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً بينَ الْجِنِّ وَالإِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ."

ان میں سے صرف ایک ہی رحمت کو محض اپنے لطف وکرم سے کائنات کے جنوں، انسانوں، جانوروں اور موذی کیڑے مکوڑوں اور ساری مخلوق کے درمیان تقسیم فرمایا:

"فَبِهَا يَتَعَاطَفُونَ، وَبِهَا يَتَرَاحَمُونَ، وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلىٰ وَلَدِهَا".

خالق کائنات کی صفت رحمت کا ایسا پرتو مخلوق پر پڑا کہ ان میں باہمی محبت وشفقت پیدا ہوگئی، آج ہمیں ان کے آپس میں جو محبت وشفقت کے مناظر نظر آتے ہیں یہ اس کی شانِ رحمت کا اثر ہے، چڑیا جو ایک ننھی سی جان ہے، مگر وہ اپنی اولاد کے لیے گھونسلہ بناتی ہے، دانہ دنکا چن کر لاتی ہے، اپنی چونچ میں پانی بھر بھر کر لاتی ہے اور بچوں کو پلاتی ہے، حدیث بالا کے مطابق یہ اللہ رب العالمین کی شانِ رحمت کا اثر ہے، یہ رحم کا مادہ رب العالمین نے ان میں اپنی رحمت سے رکھا ہے، اسی طرح ایک مرغی کمزور سہی مگر اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے بلی تک سے ٹکرا جاتی ہے۔ انسان تو بہر حال اشرف المخلوقات ہے، عقل کے نور سے منوّر ہے، اس میں اپنی اولاد کے لیے محبت وشفقت کا ہونا ایک فطری، قدرتی اور قابل فہم بات ہے، اسی محبت کے خاطر ماں باپ بعض اوقات اپنا سب کچھ اولاد کے لیے قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اس میں بھی پھر ماؤں کی مامتا اور محبت کی تو مثال دی جاتی ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

مادراں را مہر من آموختم
چوں بود شمعے کہ من افروختم

''دنیا والو! اپنی ماؤں کی محبت پر ناز کرنے والو! تمہاری ماؤں میں محبت تو میں نے پیدا کی ہے۔'' یہ میری عطا ہے، "أَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً" یہ تو میری رحمت کے سوویں حصہ کا ایک اثر ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والی مخلوق میں تقسیم ہوگا، جب تمہیں اپنی ماں کی مامتا اور محبت پر ناز ہے تو پھر میری محبت اور رحمت پر بدرجۂ اولیٰ ناز ہونا چاہیے۔

قیامت میں اللہ رب العالمین کی شانِ رحمت کا اثر:

"أَخَّرَ اللّٰهُ تِسْعًا وَتِسْعِينَ رَحْمَةً، يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

حدیث شریف میں دنیا کی مخلوق کے مابین آپس میں جو رحمت کا ذکر ہے یہ دنیا میں ربِ کریم کی صرف ایک ہی رحمت کا اثر ہے، لیکن قیامت میں جب اللہ رب العالمین کی ننانوے رحمتوں کا ظہور ہوگا، اور صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق اس دنیا کی ایک رحمت کو ملا کر جب سو کا عدد پورا کر دیا جائے گا اس وقت اللہ کی رحمت کا کیا حال ہوگا؟ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔

حضرت فقیہ الاسلام مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ ''صحیح مسلم، کتاب الایمان، "باب الدليل على دخول طوائف المسلمين الجنة بغير حساب ولا عذاب'' میں ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے ستر ہزار آدمی ایسے ہیں جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے (یہ سن کر) حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: ''حضرت! دعا فرمائیے کہ میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں، آپ ﷺ نے دعا فرمادی، تو ایک اور صحابی کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے: حضور! میرے لیے بھی دعا فرمادیجیے'' فرمایا: ''عکاشہ تم سے سبقت لے گئے۔''

اس حدیث سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس میں تو صرف ستر ہزار کے لیے بلا حساب و کتاب کے جنت میں داخلہ کی بشارت ہے، حالاں کہ صحابہ کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے،

ان کے بعد تابعین اور بزرگانِ دین تو لاتعداد ہیں، پھر ہم کس شمار وقطار میں جو اس جماعت میں شامل ہونے کی دعا مانگیں! لیکن اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو، انہوں نے مسلم کی شرح (فتح الملہم :۲/۵۵۲) میں اس روایت کے تحت ایک اور حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے نقل فرمائی ہے، جس میں یہ جملہ زائد ہے کہ "مَعَ كُلِّ أَلْفٍ سَبْعُوْنَ أَلْفًا". (ان ستر ہزار کے مجمع میں) ہر ایک ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور بھی ہوں گے (جو بلا حساب و کتاب جنت میں داخل ہوں گے)۔ اس کے بعد ایک اور روایت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے سند جید کے ساتھ نقل فرمائی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: "ثُمَّ يَحْثِيْ رَبُّكَ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ" پھر تمہارا رب اپنے تین لپ (انسانوں کے) بھرے گا، یعنی پھر مزید تین لپ انسانوں کے بھر کر انہیں بھی ان لوگوں میں شامل کر دے گا جو بلا حساب و کتاب جنت میں داخل ہوں گے، اور ظاہر ہے کہ جب رب العالمین کے ایک ہی لپ میں کروڑوں اور اربوں انسان آجائیں گے تو تین لپوں میں کتنے ہوں گے۔"

(خطباتِ فقیہ الاسلام ص: ۷/صفحہ ۳۳ تا ۳۵)

ان حقائق کے بعد اب تو عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ صاحبو! قیامت میں جب اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سورج طلوع ہوگا تو یقیناً ایمان والوں کے گناہوں کی ساری تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور ہر ایمان والا یا تو قانونِ الٰہی سے بخشا جائے گا یا رحمت الٰہی سے، ورنہ شفاعت نبوی سے۔

ایک حدیث قدسی میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ يُدْنِيْ الْمُؤْمِنَ" حق تعالیٰ فردِ مومن (یا جنس مومن) کو اپنی رحمت سے قریب کرے گا اور "فَيَضَعُ عَلَيْهِ كَنَفَهٗ وَيَسْتُرُهٗ" اس پر اپنی حفاظت وعنایت کا پردہ رکھے گا (تا کہ اہل محشر کے سامنے رسوائی نہ ہو) "فَيَقُوْلُ: أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟" پھر فرمائے گا: کیا تو اپنا فلاں گناہ جانتا ہے؟ کیا تو اپنا فلاں گناہ جانتا ہے؟ "فَيَقُوْلُ: "نَعَمْ أَيْ رَبِّ! حَتّٰى قَرَّرَهٗ

بِذُنُوبِهٖ وَرَأَى فِيْ نَفْسِهٖ أَنَّهٗ قَدْ هَلَكَ" وہ کہے گا: ''جی ہاں اے میرے رب!'' یہاں تک کہ اس سے اس کے تمام گناہوں کا اقرار کرایا جائے گا، اس وقت وہ بندہ اپنے دل میں خیال کرے گا کہ اب وہ ہلاک ہوگیا۔ "قَالَ: "سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا، وَأَنَا أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ، فَيُعْطٰى كِتَابَ حَسَنَاتِهٖ" اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے تیرے یہ ذنوب وعیوب جس طرح دنیا میں چھپائے آج بھی چھپاتا ہوں اور تیری مغفرت کرتا ہوں، پھر اس کی نیکیوں کا دفتر اسے دے دیا جائے گا۔ (متفق عليه، مشكوٰة/ ص:٤٨٥/ باب الحساب والقصاص والمیزان، حدیث قدسی نمبر:۴)

اور اس طرح ہر مومن اپنے عمل سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے جنت میں داخل کردیا جائے گا۔ اسی کو دوسری حدیث میں اس طرح فرمایا:

"لَا يُدْخِلُ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، وَلَا يُجِيْرُهٗ مِنَ النَّارِ، وَلَا أَنَا إِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ." (رواه مسلم، مشكوٰة:٢٠٧)

تم میں سے کسی کا عمل نہ اسے جنت میں داخل کرائے گا نہ دوزخ سے بچائے گا، اور نہ خود مجھے، ہاں مگر وہ (عمل) جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ ہو۔ لیکن ایمان اور عمل صالح کی توفیق یہ رحمت الٰہی کے بغیر ممکن نہیں؛ اس لیے بعض علماء نے رحمت سے توفیق ایمان وطاعت مراد لی ہے، البتہ دخولِ جنت کے بعد جو درجات عطا کیے جائیں گے وہ اعمال کے مطابق ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ اس دن نہ جاہ وشہرت کام آئے گی، نہ مال ودولت، کام آئے گی تو صرف اور صرف رب العالمین کی رحمت۔ لہٰذا ہمیں اپنے عمل پر ناز کرنے کے بجائے اس کے فضل وکرم اور اس کی رحمت پر نظر رکھنی چاہیے، ہم گنہگاروں کا ہر کام اسی سے بنے گا؛ کیوں کہ اللہ جل شانہ کی رحمت جس کے شامل حال ہوگی دنیا میں فراخیٔ معیشت کے علاوہ اسے قیامت میں (۳) مغفرت۔ (۴) اور دخولِ جنت سے مالا مال کیا جائے گا، اور قیامت میں رحمت سے یہی مراد ہے۔ حق تعالیٰ دونوں جہاں میں اپنی وسیع رحمتوں کا سایہ ہم تمام کو نصیب فرمائے۔ آمین۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

(۲۹)

ماہِ صفر المظفر منحوس نہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَاعَدْوٰى وَلَا هَامَةَ وَلَا نَوْءَ وَلَا صَفَرَ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص: ۳۹۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ ایک بیماری کا حکم الٰہی کے بغیر دوسرے کو لگ جانا، پرندہ سے بدفالی ونحوست لینا نیز اُلّو اور ماہِ صفر کو منحوس سمجھنے کی کوئی حقیقت نہیں۔

توحید کا صحیح تصور انسان کو توہمات سے نجات دلاتا ہے۔

دین اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے، یعنی اللہ جل شانہ کو ایک ماننا، اور اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی یکتا ہے اور اپنی عالی صفات و اختیارات کے اعتبار سے بھی تن تنہا و بے مثل ہے، اس کا کوئی ساجھی وشریک نہیں، موت وحیات کی کلید اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، نفع نقصان کا خالق و مالک وہی ہے، کامیابی وناکامی اسی کے حکم سے وابستہ ہے، سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، توحید کا صحیح تصور انسان کو ایک طرف تو در در کی غلامی سے بچاتا ہے، اور دوسری طرف توہمات سے بھی نجات دلاتا ہے۔ توہمات کہتے ہیں خواہ مخواہ کسی وہم اور انجانے خوف

میں مبتلا ہونا، اور نفع نقصان کو اللہ پاک کی ذاتِ عالی کے علاوہ کسی اور کے ساتھ وابستہ کر لینا، مثلاً کسی چیز یا شخص یا جانور یا پرندہ یا مہینہ، دن اور گھڑی کو نا مبارک، منحوس اور اَشُبھ سمجھ لینا، یا کسی خاص پتھر کی انگوٹھی یا نمبر سے کامیابی و نفع کی امید قائم کر لینا، یہ سب توہمات ہیں، جو شخص جس قدر توحید میں پختہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ پر اس کا جتنا زیادہ یقین ہوگا وہ اسی قدر توہم پرستی کی اس مصیبت سے آزاد اور توہمات کا قیدی و غلام بننے سے محفوظ رہے گا۔ اس کے برخلاف اگر ایمان میں خامی اور یقین میں کمزوری ہو تو اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی بہت سی بے بنیاد باتوں اور توہمات کا شکار ہو سکتے ہیں۔

ماہِ صفر کے توہمات کی نفی قرآن و حدیث میں:

چناں چہ دیکھئے! اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں عقیدۂ توحید سے محروم ہونے کی وجہ سے لوگ قسم قسم کے توہمات اور خرافات میں مبتلا تھے، مثلاً سفر میں جانے سے قبل پرندے کو اڑایا جاتا، اگر وہ دائیں جانب اڑتا تو اسے نیک فال تصور کرتے اور سفر کرتے، لیکن اگر بائیں طرف سے اڑتا تو بدفالی لیتے اور سفر سے گریز کرتے۔ اسی طرح اُلّو کو منحوس پرندہ خیال کرتے، وہ بیچارہ بے زبان جب کسی کے مکان پر بیٹھ جاتا تو سمجھتے کہ یہ گھر اجڑ جائے گا۔ نیز اسلامی سال کا جو دوسرا مہینہ ہے "صفر" اسے ناکامی کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا، ان کا خیال تھا کہ اس ماہ میں جو کاروبار کیا جائے گا نقصان سے دوچار ہوگا، جو سفر ہوگا وہ نامراد اور سقر (جہنم یعنی مصیبت کا سبب) ہوگا، جو شادی ہوگی وہ خانہ بربادی ہوگی، وغیرہ، اس کی بنیاد وہ نحوست تھی جو گناہوں کی وجہ سے فتنوں، وباؤں امراض و مصائب و حوادثات کی شکل میں کبھی اس مہینہ میں پیش آئی تھی، اور اس بنیاد پر جہلاء نے عقیدہ بنالیا کہ صفر کا مہینہ نحوست و مصیبت کا مہینہ ہے۔

صفر کے متعلق بعض لوگوں کا گمان یہ تھا کہ وہ ایک قسم کا سانپ ہے جو انسان کے معدہ میں پرورش پاتا ہے، اور جو بھوک کی شدت میں تکلیف محسوس ہوتی ہے اس کی اصل وجہ

وہی سانپ ہے جو اندر سے انسان کو ڈستا ہے۔اس تصور سے ہی انسان لرز اٹھتا تھا اور صفر کی آمد سے اس کے تصورات و احساسات میں ایک ہلچل سی پیدا ہو جاتی تھی۔ اسی طرح دورِ جاہلیت میں ”نسیء“ والا عمل اپنی اغراضِ نفسانی کی وجہ سے ”صفر“ میں جائز سمجھا جاتا تھا، ”نسیء“ کہتے ہیں مہینہ آگے پیچھے کرنے کی رسم کو، اور یہ رسم عام طور پر صفر میں ہوا کرتی تھی، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (جس دن آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تھا اسی دن سے سال کے بارہ مہینوں میں سے) چار مہینوں کو حرام قرار دیا تھا، یعنی ان میں قتل وقتال کی اجازت نہ تھی، (یہ چار مہینے ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، اور رجب تھے، مگر یہ حکم پہلے تھا، جمہور کا قول ہے کہ اب ان کی حرمت منسوخ ہوگئی) قریش مکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور کعبہ شریف کے متولی بھی تھے، جو ان کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا تھا، ان لوگوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں سے جو باتیں باقی رہ گئی تھیں ان میں حج کرنا اور چار مہینوں کو محترم سمجھتے ہوئے ان میں قتل وقتال کو حرام سمجھنا بھی تھا، لیکن ان میں اور عرب کے دیگر قبائل میں جہالت کی وجہ سے شر وفساد اور جنگ و جدال ایک پیشہ بن کر رہ گیا تھا، اسی وجہ سے وہ کبھی ان مہینوں میں سے کسی محترم مہینہ میں لڑائی کی ضرورت محسوس کرتے تو اپنی طرف سے اس مہینہ کو مؤخر کر دیتے۔ مثلاً ماہِ محرم کو صفر اور صفر کو محرم قرار دے کر جنگ کر لیتے تھے، اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مہینہ حرمت والا تھا اس کو اپنی طرف سے حلال اور جو مہینہ حلال تھا اسے اپنی طرف سے حرام قرار دیتے تھے۔ قرآنِ کریم نے سب سے پہلے اس رسم جاہلیت کی تردید کی اور اسے گمراہ کن طریقہ بتلایا:

﴿إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (التوبة :۳۷)

”نسئی“، یعنی مہینوں کی حرمت کو آگے بڑھا دینا کفر میں ترقی کرنا ہے، جس سے کافر لوگ گمراہ کیے جاتے ہیں۔ (انوار البیان: ۲/۵۳۱)

معلوم ہوا کہ ماہِ صفر نامبارک سمجھنے کے علاوہ اس کے متعلق یہ نسئی والی رسم بھی گمراہ

کن خرافات میں سے ایک تھی، اس لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہِ صفر کے متعلق ان تمام خرافات اور توہمات کی کلیۃً نفی فرمادی، بلکہ اس کے علاوہ بھی جو توہمات تھے ان سب کی تردید فرمائی، ارشاد فرمایا: ”لَا عَدْوٰی وَلَا ھَامَۃَ وَلَا نَوْءَ وَلَا صَفَرَ“ چھوت چھات یعنی ایک کی بیماری کا حکم الٰہی کے بغیر خود بخود کسی اور کو لگ جانا، کسی چیز سے بدفالی اور نحوست لینا، اُلّو وغیرہ کو منحوس سمجھنا اور صفر کے جملہ توہمات سب کے سب باطل اور بے حقیقت ہیں۔ آپ ﷺ نے صفر کے منحوس ہونے کی نفی فرما کر اس کے مظفر ہونے کو واضح فرمادیا۔ اس مفہوم کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں بکثرت وارد ہوئی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ جاہلی معاشرہ میں اس طرح کے باطل نظریات اور توہمات عقیدہ کی شکل اختیار کر چکے تھے، اور شرک کا چور دروازہ بند کرنے کے لیے ان توہمات سے معاشرہ کو پاک کرنا ضروری تھا؛ کیوں کہ کسی چیز کو نفع یا نقصان میں براہِ راست مؤثر سمجھنا شرک ہے، اس لیے کہ مؤثر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ اس وجہ سے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس طرح کے باطل نظریات اور بے بنیاد توہمات کی کھل کر نفی فرمائی اور ساتھ ہی انسانی معاشرہ کو کامیاب زندگی کی راہوں میں صالح عقیدہ کی روشنی بھی بخشی، آپ ﷺ نے عقیدۂ توحید کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ایسا راسخ کر دیا کہ پھر وہ اس قسم کے تصورات اور توہمات کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔

دورِ فاروقی کا ایک عجیب واقعہ:

اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا واقعہ بڑا مشہور ہے کہ جب مصر کا علاقہ فتح ہوا تو اس کی معیشت کا مدار بڑی حد تک دریائے نیل پر تھا، یہاں کے لوگوں کا معمول تھا کہ جب دریا خشک ہوجاتا تو ایک کنواری لڑکی کو دُلہن بنا کر دریا کے بیچ میں ڈال دیا جاتا، دریا کی بلاخیز موجیں اٹھتیں اور اسے بہا کر موت کی نیند سلا دیتیں، جب مصر خلافت اسلامیہ کے زیرِ نگیں آنے کے بعد دریا خشک ہوا اور گورنر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو

اس رسم بد کی اطلاع ملی تو اس موحد نے اس وہم اور رسم بد کا انکار کر دیا، مگر لوگوں کا یہ عقیدہ بن گیا تھا؛ اس لیے اصلاح کی غرض سے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو صورتِ حال لکھ دی اور مشورہ طلب کیا، جواباً آپ نے ایک تحریر دریائے نیل کے نام لکھ کر ہدایت دی کہ اسے دریائے نیل میں ڈال دیا جائے، جس میں آپ نے دریائے نیل کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اے دریا! اگر تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جاری ہے (جیسا کہ ہمارا ایمان ہے) تو میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے جاری رکھے، اور اگر تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے نہیں، بلکہ کنواری لڑکی کے بھینٹ دینے سے جاری ہے جیسا کہ یہاں کے توہم پرست لوگوں کا عقیدہ ہے تو پھر ہمیں تیری کوئی ضرورت نہیں، ہماری ضرورت کا انتظام اللہ تعالیٰ کرنے والا ہے۔ حسب ہدایت یہ تحریر دریا میں ڈال دی گئی، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی کرامت یہ ظاہر ہوئی کہ دریائے نیل اس شان سے جاری ہوا کہ دوسرے دن (جو ہفتہ کا دن تھا) سولہ ہاتھ پانی ہوگیا۔ (البدایہ والنہایہ) اور پھر آج تک کبھی نہیں تھما۔ (ازراہِ عمل ص:۳۷۲) سچ ہے:

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل! کہ مغلوبِ گماں تو ہے

ماہِ صفر کے توہمات کی بنیاد جہالت ہے:

صاحبو! حقیقت یہ ہے کہ اگر ایمان قوی ہو، توحید کا عقیدہ مضبوط ہو، اللہ تعالیٰ ہی سے نفع ونقصان اور سب کچھ ہونے اور اس کے غیر سے کچھ نہ ہونے کا پختہ یقین ہو تو ایک مسلمان کبھی ایسے خرافات اور توہمات میں مبتلا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ قرآنِ پاک کے اس فرمان پر ہر مسلمان کا ایمان ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (التوبة : ٥١)

’’کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہمیں اس کے سوا کچھ نہیں پہنچ سکتا، وہی ہمارا رکھوالا ہے، اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔‘‘

اس آیت کریمہ پر جس کا ایمانِ کامل ہوگا ایسا مسلمان کبھی فضول توہمات میں مبتلا نہیں ہوسکتا، مگر افسوس صد افسوس! ایمان وعقیدہ کی کمزوری، جہالت اور غیروں کی صحبت کی وجہ سے جہاں بہت سے مسلمانوں نے برادرانِ وطن سے زندگی کے دوسرے شعبوں اور سماجی رسومات وخرافات میں ہندو معاشرت کا اثر قبول کیا وہیں فکر ونظر اور عقیدہ کے باب میں بھی بہت سے مسلمان ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، منجملہ ان کے توہمات بھی ہیں، آج بہت سے مسلمان طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہیں، مثلاً یہ کہ بلی راستہ کاٹ دے تو سفر ملتوی کردینا چاہیے، اُلّو کا گھر پر بیٹھنا اب بھی نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے، اگر بہو کے گھر میں آنے کے بعد سسرال میں کسی کا انتقال ہوجائے تو اسے ڈاکن تصور کیا جاتا ہے، حالاں کہ ان سب باتوں اور صفر سے متعلق بے جا توہمات کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مستند اور صحیح حدیثوں میں تردید فرمائی ہے، اس کے باوجود کمزور عقیدہ کے لوگ اب بھی صفر کو منحوس سمجھتے ہیں، بلکہ آسمان سے بلائیں نازل ہونے والا مہینہ سمجھتے ہیں، اسی وجہ سے اس میں شادی وغیرہ کوئی خوشی کا کام نہیں کیا جاتا، حتیٰ کہ اس میں بچہ کی ولادت کو بھی پریشانیوں کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے، بالخصوص صفر کی ۱۳ تاریخ کو ’’تیرہ تیزی‘‘ اور آخری ’’بدھ‘‘ کو منحوس دن تصور کیا جاتا ہے، یاد رکھو! ماہِ صفر کے متعلق جو کچھ توہمات ہیں ان کی بنیاد پہلے بھی جہالت پر تھی اور آج بھی جہالت ہی پر ہے، جہلاء کے یہاں یہ صفر صِفر سمجھا جاتا ہے، جب کہ ہمارے یہاں صفر بھی ماہِ ظفر سمجھا جاتا ہے۔

ماہِ صفر سے متعلق پیش کی جانے والی روایت کا تحقیقی جائزہ:

رہی بات اس روایت کی جس میں یہ کہا گیا کہ ’’مَنْ يَّسُرُّنِیْ بِخُرُوْجِ صَفَرٍ بَشَّرْتُهٗ بِالْجَنَّةِ‘‘ ’’جو مجھے ماہِ صفر کے ختم ہونے کی بشارت دے میں اسے جنت کی بشارت

دوں گا۔'' اس سے استدلال کرتے ہوئے بعض لوگوں نے صفر کے نحوست والا ہونے کو ثابت کیا ہے، تو اس بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت موضوع اور من گھڑت ہے۔ ملا علی قاریؒ نے اسے ''الموضوعات الکبریٰ'' ص: ۶۹ میں بے اصل قرار دیا ہے، لہٰذا اس سے ماہِ صفر کے منحوس ہونے پر استدلال کرنا جہالت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس موضوع روایت کے مقابلہ میں بہت سی صحیح اور معتبر روایتیں ایسی ہیں جو صفر کے منحوس اور نا مبارک ہونے کی نفی کرتی ہیں، اس لیے بھی صحیح روایت کے مقابلہ میں موضوع روایت کو پیش کرنا غلط اور اصول کے خلاف ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس موضوع روایت سے بذات خود صفر کا منحوس ہونا کہیں ثابت نہیں ہوتا، یہ صرف جہلاء کا اختراع اور خیال ہے۔ لیکن اگر موضوع ہونے سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کو تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے تب بھی اس کا مطلب وہ نہیں جو صفر کے منحوس ہونے کے بارے میں مراد لیا جاتا ہے، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ربیع الاول میں ہونے والا تھا اور آپ ﷺ وصال کے بعد اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے مشتاق تھے، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو صفر کے ختم ہونے اور ربیع الاول کے آنے کا بڑا انتظار تھا، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ اس خبر کے لانے پر آپ ﷺ نے بشارت مرتب فرمائی ہو، تو اس سے صفر کی نحوست کا کیا تعلق؟

خلاصہ:

یہ ہے کہ یا تو یہ روایت خود ساختہ ہے یا پھر اس کا مضمون و مفہوم خود ساختہ ہے، کسی بھی پہلو سے اس سے صفر کا منحوس ہونا ثابت نہیں ہوتا، ہمارے علماء نے صفر کے ساتھ مظفر یا خیر کا لفظ بڑھایا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ منحوس نہیں، بلکہ مبارک مہینہ ہے، خیر و برکت والا اور سراسر ظفر ہے، نحوست سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اصل نحوست گناہوں میں ہے، سارا وبال اسی سے آتا ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُم مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ﴾ (الشوریٰ: ۳۰)

''اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے ہی پہنچتی ہے اور بہت سے کاموں سے تو وہ درگذر ہی کرتا ہے۔''

عاجز کے خیالِ ناقص میں آفات و بلیات کی اصل وجہ معاصی اور خواہشات کا اتباع ہے، جس سے اجتناب ضروری ہے، حضرت یحیٰ بن معاذ رازیؒ کا اس بارے میں ارشاد ہے کہ جو شخص پیٹ بھر کر خوب کھاتا ہے (عموماً) اس کا گوشت زیادہ ہوجاتا ہے، جس کا گوشت زیادہ ہوتا ہے (عموماً) اس کو شہوت زیادہ ہوتی ہے، اور جس کی شہوت زیادہ ہوتی ہے اس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں، اور جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کا دل سخت ہوجاتا ہے، اور جس کا دل سخت ہوجاتا ہے وہ آفات و بلیات میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ (تنبیہات ابن حجر، از: ماہنامہ المحمود/ص:۲۹/ بابت: ماہ اگست/ ۲۰۰۷ء)

لہٰذا دل اور عقیدہ کی اصلاح ضروری ہے، اس کے بغیر گناہوں سے بچنا آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

'' اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''.

☆......☆......☆
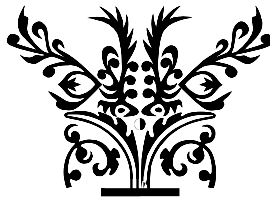
(۳۰)

عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت قرآن وحدیث کی روشنی میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: ”مَامِنۡ أَيَّامٍ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ فِيۡہِنَّ أَحَبُّ إِلیٰ اللّٰہِ مِنۡ ھٰذِہِ الۡأَيَّامِ الۡعَشَرَةِ“ قَالُوۡا: ”يَارَسُوۡلَ اللّٰہِ! وَلَا الۡجِہَادُ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰہِ؟“ قَالَ: ”وَلَا الۡجِہَادُ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰہِ، إِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ بِنَفۡسِہٖ وَمَالِہٖ فَلَمۡ يَرۡجِعۡ مِنۡ ذٰلِكَ بِشَيۡءٍ“. (رواہ البخاری: ۱/۱۳۲، مشکوٰۃ/ص: ۱۲۸ / باب فی الأضحیة)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”ذی الحجہ کے دس دنوں میں نیک عمل کرنا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک دوسرے تمام دنوں میں نیک عمل کرنے سے زیادہ محبوب ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ”یارسول اللہ! کیا ان دنوں کا نیک عمل دوسرے دنوں میں جہاد کرنے سے بھی زیادہ افضل ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ہاں، جہاد کرنے سے بھی افضل ہے، مگر یہ کہ کوئی شخص اپنی جان و مال کے ساتھ دشمنوں سے مقابلہ کے لیے نکلا، پھر کچھ بھی لے کر واپس نہ ہوا۔“ (اس کا سب

کچھ کام آ گیا اور خود بھی شہید ہو گیا)۔

عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت:

تمام دن و رات حق تعالیٰ ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں، لیکن اس نے اپنی خاص حکمت سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے، مثلاً ہفتہ کے سات دنوں میں جمعہ کے دن کو بقیہ ایام پر فضیلت عطا فرمائی، اور سال کے بارہ مہینوں میں رمضان المبارک کو دیگر مہینوں پر فضیلت عطا فرمائی، بالکل اسی طرح رمضان کے علاوہ سال بھر کے دنوں میں ماہِ ذی الحجہ کے پہلے عشرہ کو دیگر تمام دنوں پر فضیلت عطا فرمائی، واقعہ یہ ہے کہ رمضان المبارک کے بعد اسلامی سال کے اس آخری مہینہ کے پہلے عشرہ کو جس قدر فضیلت، اہمیت اور خصوصیت حاصل ہے سال بھر کے دنوں اور راتوں میں کسی اور کو وہ حاصل نہیں، اس کا ہر دن مبارک ہے اور ہر رات بڑی بابرکت ہے، اس کی فضیلت، اہمیت اور عظمت کو قرآنِ کریم میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ (الفجر: ۱-۲) ”قسم ہے فجر کی اور قسم ہے دس راتوں کی۔“ فجر سے مفسرین کی ایک جماعت نے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ یعنی یوم النحر کی صبح مراد لی ہے، رہی بات ”لیال عشر“ کی، تو اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ ”ان دس راتوں سے ذی الحجہ کی ابتدائی راتیں مراد ہیں؛ کیوں کہ حدیث پاک میں ان کی بڑی زبردست فضیلت آئی ہے۔“ (معارف القرآن: ۸/ ۷۳۸)

درِ منثور میں بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ خود رحمت عالم ﷺ سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے (کہ ”لیال عشر“ سے مراد ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں) انوار البیان: ۷/ ۶۰۹)

ایک واقعہ:

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ”یہ دس راتیں وہی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آئی ہیں۔ (معارف القرآن: ۸/ ۷۳۹) آیت کریمہ ﴿وَأَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ﴾

(الأعراف:۱٤۲) میں جن کا تذکرہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل بہت زیادہ مقہور ومجبور تھی، اس لیے فرعون کے دورِ حکومت میں انہیں حکم تھا کہ ایمان لائیں اور گھروں میں نماز پڑھ لیا کریں، جب فرعونیوں سے نجات پاکر بنی اسرائیل سب پریشانیوں سے مطمئن ہوگئے تو اب انہیں احکام الٰہی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے کتاب اور شریعت کی ضرورت تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے حق تعالیٰ سے دعا فرمائی، تو حق تعالیٰ نے آپ کو تورات شریف دینے کے لیے کوہِ طور پر بلایا اور وہاں تیس دن تک اعتکاف کرنے اور روزے رکھنے کا حکم فرمایا، تو جس ماہ میں آپ نے تیس روزے رکھے وہ مہینہ ذیقعدہ کا تھا، لیکن تیس راتیں گذرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کرلی، (جس کی انہیں اجازت نہ تھی، اور امت محمدیہ کے روزے داروں کے لیے اس کی اجازت ہی نہیں، بلکہ حدیث کے مطابق ''مِنْ خَيْرِ خِصَالِ الصَّائِمِ السِّوَاكُ'' اسے روزہ دار کا بہترین عمل قرار دیا گیا ہے) جس سے وہ خاص قسم کی بو جاتی رہی جو روزہ دار کے منہ میں پیدا ہوتی ہے۔

حق تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ ''موسیٰ! روزہ دار کی بوئے دہن میرے نزدیک بوئے مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اور تم نے اسی کو ختم کردیا۔'' لہٰذا روزوں میں مزید دس دنوں کا اضافہ فرمایا یئے، یہ دس دن اور راتیں عشرہ ذی الحجہ کی تھیں؛ کیوں کہ یہی دس راتیں سال کے ایام میں افضل ہیں۔ (معاف القرآن ۸/ ۳۹۷،۴/ ۵۶، انوارالبیان: ۲/ ۳۷۲، الجواہر الزواہر: ۱/ ۵۳۲)

ان ہی دس راتوں کی قسم حق تعالیٰ نے قرآن میں کھائی، فرمایا: ﴿وَ لَيَالٍ عَشْرٍ﴾ یوں تو حق تعالیٰ کو ضرورت نہیں ہے کہ بندوں کو یقین دلانے کے لیے کسی چیز کی قسم کھائے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کی قسم کھالیں تو یہ اس چیز کی عظمت واہمیت، عزت وحرمت اور فضیلت میں مزید اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا عشرۂ ذی الحجہ کی ابتدائی راتوں کی قسم کھانا صاف بتلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی بڑی اہمیت ہے۔

عشرۂ ذی الحجہ میں نیک اعمال کی فضیلت:

عشرۂ ذی الحجہ کے ابتدائی ایام کی فضیلت واہمیت کا اندازہ حدیث مذکور سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جس میں رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان ایام میں کیے ہوئے نیک اعمال دیگر ایام کی بہ نسبت زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ رمضان المبارک کے بعد نفلی عبادت کا سب سے بہترین زمانہ فضیلت کے اعتبار سے عشرۂ ذی الحجہ ہے۔ایک روایت میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَامِنْ أَیَّامٍ أَحَبُّ إِلَی اللّٰهِ أَنْ یُّتَعَبَّدَ فِیْهَا مِنْ عَشْرِ ذِی الْحِجَّةِ، یَعْدِلُ صِیَامُ كَلِّ یَوْمٍ مِنْهَا بِصِیَامِ سَنَةٍ وَقِیَامُ كُلِّ لَیْلَةٍ بِقِیَامِ لَیْلَةِ الْقَدْرِ". (رواہ الترمذی و ابن ماجہ بسند ضعیف، مشکوٰۃ/ص:۱۲۸)

''دنوں میں سے کسی دن میں بھی بندے کا عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کو اتنا محبوب اور پسند نہیں ہے جتنا کہ عشرۂ ذی الحجہ (کے ابتدائی دنوں) میں محبوب اور پسند ہے، عشرۂ ذی الحجہ کے ہر دن کا روزہ (سوائے صومِ عرفہ کے کہ اس کی فضیلت یہ ہے کہ ایک سال اگلے اور پچھلے گناہوں کا کفارہ ہے) سال بھر کے روزوں کے برابر ہے، اور اس کی ہر رات کی (نفلی) عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر ہے۔'' یعنی جو اجر وثواب ایک سال کے روزے رکھنے سے حاصل ہوتا ہے اگر کوئی صاحب توفیق بندہ ان ایام میں سے کسی ایک دن کا روزہ رکھ لے تو اس کو وہی ثواب حاصل ہوجاتا ہے، اور شب قدر میں عبادت کی جو فضیلت ہے ان ایام کی ایک رات میں عبادت کرنے کی وہی فضیلت ہے، یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک کے بعد خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی خصوصی طور پر ان دنوں میں عبادت کا اہتمام فرماتے تھے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

عَنْ حفْصَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: "أَرْبَعٌ لَمْ تَكُنْ یَدَعُهُنَّ النَّبِيُّ ﷺ: صِیَامُ

عَاشُوْرَاءَ، والْعَشْرِ، وَثَلاثَةِ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ، وَرَكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ". (رواه النسائی، مشکوٰۃ/ص: ۱۸۰/ باب صیام التطوع)

''رحمت عالم ﷺ چار چیزوں کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے: (۱) عاشوراء کے روزے۔ (۲) عشرۂ ذی الحجہ کے روزے۔ (۳) ہر ماہ کے تین روزے۔ (۴) اور فجر سے پہلے کی دو رکعتیں۔''

یہ چار چیزیں اگرچہ فرض یا واجب نہیں، لیکن رحمت عالم ﷺ ان کا اتنا اہتمام اور ایسی پابندی فرماتے تھے کہ کبھی یہ چیزیں ترک نہیں ہوتی تھیں، مگر اس موقع پر ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہاں عشرہ سے مراد پورے دس دن نہیں ہیں، بلکہ یکم ذی الحجہ سے یومِ عرفہ تک کے ایام مراد ہیں، مرقاۃ المفاتیح میں اس کی صراحت ہے: "الْمُرَادُ مِنَ الْعَشَرَةِ تِسْعَةُ أَيَّامٍ مَجَازًا". (مرقاۃالمفاتیح: ٤/ ٣٠٥) اور دس سے مراد نو ایام ہی ہیں۔

حدیث میں نو دنوں کو مجاز کے طور پر دس دن کہہ دیا گیا ہے؛ کیوں کہ دسویں تاریخ یعنی عیدالاضحیٰ کے دن تو روزہ رکھنا ممنوع ہے۔

ماہِ ذی الحجہ کی دس خصوصیات:

الغرض! رمضان المبارک کے بعد ماہِ ذی الحجہ عبادات اور نیک اعمال کے لحاظ سے نہایت مبارک اور فضیلت والا مہینہ ہے؛ کیوں کہ فضائل و خصائص کے مختلف اسباب اس میں موجود ہیں، چناں چہ علماء نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ماہِ ذی الحجہ کی جو خصوصیات بیان فرمائی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اس مہینہ کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ یہ مہینہ بھی نہایت محترم مہینوں میں سے ایک ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ﴾ (التوبة: ٣٦)

''بلا شبہ مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارہ ہے اللہ کی کتاب میں جس دن اس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔''

اب سال بھر کے وہ چار مہینے جو قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق پہلے سے ہی نہایت محترم ہیں، حتیٰ کہ جہلاء عرب بھی انہیں قابل احترام سمجھتے تھے وہ کون ہیں؟ تو حجۃ الوادع کے خطبہ میں رحمت عالم ﷺ نے ان مہینوں کے تشریح فرمادی کہ وہ ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب ہیں۔ (معارف القرآن :۳۷۲/۴) لہٰذا ان مہینوں میں عبادت گزاری اور شب بیداری کا خصوصیت کے ساتھ اہتمام کرتے ہوئے ظلم ومعاصی سے بچنا چاہیے۔

(۲) اس مہینہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ حج کا مہینہ ہے، ذی الحجہ کے معنیٰ ہیں حج والا مہینہ، ویسے حج کے متعلق قرآن نے کہا کہ ﴿اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَعْلُوْمٰتٌ﴾ (البقرۃ : ۱۹۷) ''حج کے چند مہینے (جن سے قبل احرام باندھنا جائز نہیں وہ) مشہور ہیں۔'' یعنی شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے ابتدائی ایام، بالخصوص وہ پانچ ایام جن میں حج ادا کیا جاتا ہے وہ اسی مہینہ کی آٹھ، نو، دس، گیارہ، اور بارہویں تاریخیں ہیں، اس مہینہ کے ایام کے علاوہ میں حج کی ادائیگی ممکن نہیں ہے، یعنی حج جیسا نہایت پسندیدہ اور تقرب الی اللہ والا مقدس فرض اور عبادت بھی اسی مہینہ کی عظیم خصوصیات میں سے ایک ہے۔

(۳) اس مہینہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پہلے عشرہ میں عبادت کرنے کی بہت زیادہ فضیلت وارد ہوئی ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا، پھر قرآنِ کریم نے ﴿وَالْفَجْرِ وَ لَيَالٍ عَشْرٍ﴾ فرما کر فجر اور دس راتوں کی قسم کھا کر ان کی عظمت کا اظہار فرمایا تو ''فجر'' اور ''لیال عشر'' دونوں کا تعلق بھی علماءِ مفسرین کی ایک جماعت کے بقول اسی مہینہ سے ہے۔ (جس کی تفصیل ما قبل میں آچکی ہے)

(۴) اس مہینہ کی چوتھی عظیم خصوصیت یہ ہے کہ یومِ عرفہ اسی مقدس مہینہ میں ہے، جس میں روزہ رکھنے سے ایک سال کے اگلے اور ایک سال کے پچھلے (صغیرہ) گناہ

معاف ہوجاتے ہیں۔(مشکوٰۃ/ص:۱۸۹،رواہ مسلم) نیز علامہ طیبیؒ کے قول کے مطابق سال کی راتوں میں سب سے افضل رات شب قدر ہے اور سال کے دنوں میں سب سے افضل دن یومِ عرفہ ہے۔(مرقاۃ:۲۳۲/۲) کیوں کہ یومِ عرفہ ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو ہے،اس طرح یومِ عرفہ سے بھی ذی الحجہ کی خصوصیت بڑھ جاتی ہے۔

(۵) اس مہینہ کی پانچویں اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسلام میں عیداور خوشی کے لیے جودودن مقرر ہوئے ان میں سے عیدالاضحیٰ اسی مہینہ کی دسویں تاریخ کو ہے،ظاہر ہے کہ اس سے بھی اس مہینہ کی عظمت وخصوصیت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

(۶) اس مہینہ کی چھٹی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قربانی والا مبارک عمل بھی اسی مہینہ کے مخصوص ایام میں ادا کیا جاتا ہے،یعنی دس، گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کو،ان مخصوص ایام کے علاوہ اس کی ادائیگی ممکن نہیں۔

(۷) اس مہینہ کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ سال بھر میں پانچ دن ایسے ہیں جن میں کسی بھی طرح کے روزے رکھنا ممنوع قرار دیا گیا ہے،ان میں سے ایک تو عیدالفطر (یکم شوال المکرّم) ہےاور بقیہ چارایام اسی مہینہ میں ہیں،یعنی دس ذی الحجہ سے تیرہویں ذی الحجہ تک،یہ بھی اس ماہ کی خصوصیت ہے۔

(۸) اس مہینہ کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ جن ایام میں تکبیراتِ تشریق کہی جاتی ہیں وہ اسی مہینہ کے پانچ دن ہیں،جن میں پہلا دن ۹/ ذی الحجہ کا ہےاور پانچواں دن ۱۳/ ذی الحجہ کا ہے۔(احناف کے یہاں اس دن عصر کی نماز تک تکبیر کہی جاتی ہے)

(۹) اس مہینہ کی نویں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں چوں کہ صاحب نصاب پر قربانی واجب ہے،تو جولوگ قربانی کرنے والے ہیں ان کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ (اگر چالیس دن نہ ہوئے ہوں تو) اپنے بال اور ناخن نہ کاٹیں،حدیث میں ہے:

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " مَنْ رَأَىٰ هِلَالَ

ذِی الْحِجَّةِ وَ أَرَادَ أَنْ يُّضَحِّيَ، فَلَا يَأْخُذُ مِنْ شَعْرِهٖ وَلَا مِنْ أَظْفَارِهٖ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص:۱۲۷)

یعنی جو شخص عید الاضحیٰ کا چاند دیکھ لے اور اس کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو تو وہ قربانی تک اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے۔ (قربانی کے بعد بال اور ناخن کاٹے تو اسے ہر بال اور ناخن پر ایک نیکی ملے گی)۔ (مظاہر حق جدید/ص:۱۰۵۹)

ظاہر ہے کہ یہ بھی ماہِ ذی الحجہ ہی کی ایک خصوصیت ہے، حتیٰ کہ یہ خصوصیت رمضان کی بھی نہیں۔

(۱۰) اس کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصل عبادات جمع ہو جاتی ہیں، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی کتاب فتح الباری میں ذکر کیا ہے کہ عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت وخصوصیات کا سبب جو محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان ہی دس دنوں میں اصل عبادات جمع ہو جاتی ہیں، جن میں نماز، روزہ، صدقہ، زکوٰۃ اور حج داخل ہیں، جب کہ ان ایام کے علاوہ یہ عبادات کسی ایک جگہ پر اکٹھی نہیں ہوتیں۔

ہماری ذمہ داری:

عاجز کے خیالِ ناقص کے مطابق ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ ماہِ ذی الحجہ کو ایسی خصوصیات حاصل ہیں کہ دیگر مہینوں کا دامن ان خصوصیات سے خالی ہے۔ اس لیے ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم ان خصوصیات کا استحضار رکھیں، اس میں بکثرت عبادات کا اہتمام کریں اور ظلم ومعاصی سے خصوصی طور پر اجتناب کریں، ارشادِ باری ہے:

﴿فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ أَنْفُسَكُمْ﴾ (التوبة : ٣٦)

یعنی تم ان مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرنا، مراد گناہ کرنا ہے، جلالین شریف میں ہے کہ "فَإِنَّهَا (أَيْ : الْمَعَاصِيْ) فِيْهَا (أَيْ : فِي الْأَشْهُرِ الْحُرُمِ) أَعْظَمُ وِزْرًا". (جلالین/ص:١٥٨) جس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ تو ہر وقت برا ہے، مگر ان چار مہینوں میں (رمضان کی

طرح) گناہ کا وبال بھی بڑھ جاتا ہے، امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں کہ ''ان مہینوں کا خاصہ یہ ہے کہ جو شخص ان میں عبادت کرتا ہے اس کو بقیہ مہینوں میں بھی عبادت کی توفیق مل جاتی ہے، اور اسی طرح جو شخص ان چار مہینوں میں کوشش کر کے اپنے آپ کو گناہوں اور برے کاموں سے بچالے تو بقیہ مہینوں میں اس کے لیے برائیوں سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔(معارف القرآن:۴/۳۷۲)

حق تعالیٰ ہمیں ہر حال میں اپنی یاد و مناجات اور عبادات سے کامل وابستگی نصیب فرما کر ہر طرح کے معاصی سے مکمل اجتناب کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

یومِ عرفہ/قبل الجمعہ/۱۴۳۳ھ

مطابق:۲۶/اکتوبر/۲۰۱۲ء

بزم صدیقی، بڑودا

''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ''.

☆......☆......☆
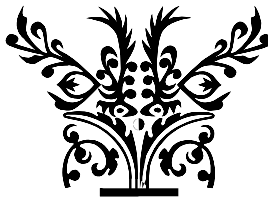
(۳۱)

فضائل حج وعمرہ قرآن وحدیث کی روشنی میں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ سَعِيۡدِ نِ الۡخُدۡرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ''إِنَّ اللّٰهَ تعالٰی يَقُوۡلُ: ''إِنَّ عَبۡدًا صَحَّحۡتُ لَهٗ جِسۡمَهٗ، وَ وَسَّعۡتُ عَلَيۡهِ فِیۡ الۡمَعِيۡشَةِ، تَمۡضِیۡ عَلَيۡهِ خَمۡسَةُ أَعۡوَامٍ لَا يَفِدُ إِلَيَّ لَمَحۡرُوۡمٌ''. (صحیح ابن حبان ص:٤/٢٠٤، حدیث: ٣٧٠٥، مسند أبی یعلی الموصلی:١/٤٤٤، حدیث: ١٠٢٧، انوار مناسك ص: ٥٦، مؤلفه مفتی شبیر احمد قاسمی مراد آبادی)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ ''حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''بلا شبہ میں نے اپنے جس بندہ کے بدن میں صحت دی اور رزق میں وسعت، پھر اس پر پانچ ایسے سال گذر جائیں جن میں اس نے ایک بار بھی میرے گھر کی حاضری نہ دی تو یقیناً وہ خیر و برکت سے محروم رہے گا۔'' (حدیث قدسی نمبر:۵)

حج وعمرہ اور زیارتِ بیت اللہ:

رب العالمین نے روئے زمین پر اپنی خاص رحمت وعنایت کے لیے جس جگہ کو خاص فرمایا اسے کعبۃ اللہ کہتے ہیں، یہ عین وسط زمین میں جہاں قائم ہے بالکل اس کے سامنے اوپر ساتویں آسمان پر بیت المعمور قائم ہے، جو فرشتوں کی عبادت کے لیے خاص جگہ ہے، بیت اللہ روئے زمین پر انسانوں کا قبلہ ہے تو بیت المعمور آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے، روئے زمین پر بیت اللہ شریف کو رب العالمین نے جو عظمت وحرمت عطا فرمائی ہے آسمان پر وہی عظمت وحرمت بیت المعمور کو عطا فرمائی ہے، روئے زمین پر بیت اللہ کا طواف انسان کرتے ہیں تو آسمانوں پر بیت المعمور کا طواف فرشتے کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ”وہاں روزانہ ستر ہزار فرشتے عبادت کرتے ہیں، اور جن کا نمبر ایک بار آچکا دوبارہ ان کی باری قیامت تک نہیں آسکتی۔“ (مرقاۃ: ۱۰/۱۴۶)

جب کہ ہمارے لیے کعبۃ اللہ کے طواف کا یہ معاملہ نہیں ہے، پھر بیت المعمور کے بالکل سامنے اوپر عرشِ الٰہی موجود ہے، وہیں سے حق تعالیٰ شانہ کی خاص توجہات، انوارات وتجلیات کا نزول سب سے پہلے بیت اللہ شریف پر ہوتا ہے، پھر وہاں سے اس کی نورانی شعاعیں ساری دنیا میں پھیلتی ہیں، اس لیے حج وعمرہ میں بیت اللہ شریف کی زیارت سے بڑھ کر کسی کے لیے اور کیا سعادت ہوسکتی ہے؟ کہ وہاں حاضر ہونے والا براہِ راست ربِ کریم کے وسیع دامنِ رحمت میں آجاتا ہے، پھر زیارتِ بیت اللہ کے دو خاص مواقع ہیں، ایک حج، دوسرا عمرہ، انہیں یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح نماز میں کچھ تو فرض نمازیں ہیں جو پانچ مخصوص اوقات میں ادا کی جاتی ہیں، لیکن اس کے علاوہ کچھ نوافل ہیں جو اس لیے بھی مشروع کی گئیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے (روزانہ اوقاتِ مکروہ کے علاوہ) جب اپنے مولیٰ سے راز ونیاز اور قربِ خاص حاصل کرنا چاہیں تو کرلیں، اسی طرح بیت اللہ شریف کی زیارت کے لیے ایک تو حج کا موقع ہے جو سال کے پانچ مخصوص ایام میں ہوتا ہے، جو زندگی

میں ایک بار استطاعت کی شرط کے ساتھ ہر بالغ عاقل مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے، اس کے علاوہ زیارتِ بیت اللہ کا دوسرا موقع عمرہ ہے، جسے مشتاقِ زیارتِ بیت اللہ حج کے پانچ دنوں کے علاوہ کبھی بھی کر سکتے ہیں۔ عمرہ کے لغوی معنیٰ ہیں زیارت کرنا، اور فقہاء کی اصطلاح میں چند مخصوص شرائط کے ساتھ (یعنی کسی بھی میقات سے احرام باندھ کر) بیت اللہ شریف کی زیارت (کر کے طواف، اس کے بعد صفا مروہ کی سعی اور حلق یا قصر) کرنے کا نام عمرہ ہے۔ لہٰذا عمرہ بھی زیارتِ بیت اللہ کا بہترین ذریعہ ہے، جو عمر بھر میں ایک مرتبہ سنت مؤکدہ ہے، اسے چھوٹا حج بھی کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو حج کے فضائل، برکات وثمرات ہیں تقریباً وہی سب عمرہ کے بھی ہیں، ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ (البقرة:١٩٦)

یہ آیت کریمہ جعرانہ کے مقام پر نازل ہوئی۔ (صحیح البخاری/کتاب المغازی، از تاریخ مکہ مکرمہ ص:۱۹، ڈاکٹر محمد الیاس عبدالغنی)

یعنی حج وعمرہ اللہ (کی رضا) کے لیے پورا کرو۔ علماء نے فرمایا ہے کہ اگر کسی خوش نصیب نے حج وعمرہ بتمامہ وکمالہ پورے ذوق وشوق، صحیح نیت اور مکمل سنن ومستحبات کی رعایت کے اور اجتنابِ معصیت کے ساتھ ادا کیا تو اس مقبول حج وعمرہ کے متعلق کتاب وسنت میں بڑے فضائل ہیں۔

مقبول حج وعمرہ کی علامت وفضیلت:

ایک حدیث میں ہے:

(١) عَنْ أَبِیْ نَجِیْحٍ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ السلمِی رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ حَجَّةٌ مَبْرُوْرَةٌ أَوْ عُمْرَةٌ مَبْرُوْرَةٌ". (رواه الطبرانی)

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "سب سے افضل عمل حج مبرور یا عمرۂ مبرور ہے۔" مراد مقبول حج وعمرہ ہے (جو

اللہ رب العزت کے یہاں مقبول ہوجائے) یادرکھو کہ ایک ہے حج وعمرہ کی ادائیگی، اورایک ہے اس کی قبولیت۔ادائیگی تو اسی وقت ہوجاتی ہے جب اس کے افعال شریعت کے قواعد کے مطابق ادا کر لیے جائیں، اس سے حج وعمرہ ادا تو ہوجائے گا، لیکن اگر وہ مقبول نہ ہوا تو اجر وثواب اور فضیلت حاصل نہ ہوگی۔اور حج وعمرہ اس وقت مقبول ہوگا جب وہ ریا کاری، جملہ معاصی اور جنایات (یعنی احرام اور حرم وغیرہ سے متعلق احکام کی خلاف ورزی) سے پاک ہو، مطلب یہ ہے کہ جو حج وعمرہ اخلاصِ نیت، اتباعِ سنت، اللہ تعالیٰ کی محبت اور اجتنابِ معصیت کے ساتھ ادا کیا جائے وہ مبرور ومقبول ہے۔پھر جو حج وعمرہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوتا ہے تو اس کی علامت یہ ہے کہ جب حج وعمرہ کرنے والا اپنے وطن آتا ہے تو تقویٰ اور پرہیزگاری (دینداری) کے اعتبار سے اس کا حال پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ پہلے بے نمازی تھا، اب نمازی بن گیا، پہلے دیندار وامانت دار نہ تھا، اب بن گیا، پہلے متبع سنت وشریعت نہ تھا، اب بن گیا، تو یہ علامت ہے کہ حج وعمرہ مقبول ہوگیا، اور حج وعمرہ اگر مقبول ہوجائے تو اس سے بہتر وافضل عمل اور کونسا ہوسکتا ہے؟، اس سے گناہوں کی معافی اور دارین کی خوشگوار زندگی نصیب ہوگی۔

حج کی تینوں اقسام اور عمرہ کی ترتیب مع احکام:

جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے:

(۲) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "تَابِعُوْا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوْبَ، كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُوْرَةِ ثَوَابٌ إِلَّا الْجَنَّةُ". (رواه الترمذی: ۱/ ۱۶۷، مشکوٰة/ص: ۲۲۲/کتاب المناسك/ الفصل الثانی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "حج اور عمرہ کے درمیان متابعت کرو، یعنی حج وعمرہ ایک ساتھ کرو، اس لیے

کہ یہ دونوں فقر اور گناہ کو اس طرح دور کرتے ہیں جیسا کہ بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل کو دور کرتی ہے، اور حج مقبول کا ثواب جنت کے سوا کچھ نہیں۔"

علماءِ محدثین نے اس کے مختلف مطالب بیان فرمائے ہیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ حج قران کرو جو حج کی تین قسموں میں سے ایک قسم ہے، اور احناف کے یہاں وہی افضل ہے؛ کیوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری سال سن دس ہجری میں جو پہلا اور آخری حجۃ الوداع فرمایا وہ علماءِ محققین کے نزدیک حج قران ہی تھا، جس میں حج وعمرہ کا احرام میقات سے ایک ساتھ باندھ کر حج وعمرہ کے افعال وارکان ادا کیے جاتے ہیں۔ جس کی ترتیب مع احکام حسب ذیل ہے:

حجِ قران کی ترتیب مع احکام:

میقات سے عمرہ وحج کی نیت سے احرام باندھیں، (یہ شرط ہے) پھر مکہ مکرمہ پہنچ کر بیت اللہ کا طوافِ عمرہ کریں (جس میں رمل مع اضطباع سنت ہے، اور یہ طواف عمرہ و حج کا رکن ہے) اس کے بعد عمرہ کے لیے صفا مروہ کی سعی کریں، (یہ واجب ہے) سعی کے بعد ابھی حلق یا قصر نہ کرائیں، بلکہ بیت اللہ کا طواف مع رمل کریں، جسے طوافِ قدوم کہتے ہیں (یہ سنت ہے) اس کے بعد اگر موقع ہو تو افضل یہ ہے کہ حج کی سعی کریں، (یہ واجب ہے) مگر حلق یا قصر اب بھی نہ کرائیں؛ کیوں کہ افعالِ حج ابھی باقی ہیں۔ پھر حج کے ایام شروع ہونے تک مکہ مکرمہ میں احرام کی پابندی کے ساتھ رہتے ہوئے نفل طواف اور دیگر اعمالِ صالحہ کرتے رہیں، لیکن حج سے قبل نفل عمرہ نہ کریں، وہ حج کے بعد ہی ہو سکے گا۔ پھر آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ میں دن رات گذارے (یہ سنت ہے) نو ذی الحجہ کو عرفات جا کر زوال کے بعد سے غروبِ آفتاب تک وقوف کریں، (یہ رکن اعظم ہے) غروب کے بعد مزدلفہ آکر ساری رات قیام کریں، (یہ سنت ہے) اور دس ذی الحجہ کی صبح صادق سے طلوعِ آفتاب کے درمیان مزدلفہ ہی میں وقوف کریں، (یہ واجب ہے) پھر منیٰ جا کر جمرۂ عقبہ کی رمی کریں، (یہ واجب

ہے) اور حج کی قربانی کریں، (یہ واجب ہے) اور حلق یا قصر (یہ بھی واجب ہے) کر کے احرام سے حلال ہو جائیں ۔ پھر مکہ مکرمہ جا کر بیت اللہ کا طوافِ زیارت کریں، (یہ رکن ہے) اگر آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ آنے سے قبل حج کے احرام میں سعی نہ کی ہوتو اب طوافِ زیارت کے بعد سعی کرلیں، (یہ واجب ہے) اور مکہ مکرمہ سے منیٰ آ کر گیارہ اور بارہ کو دونوں دن زوال کے بعد سے صبح صادق تک رمی جمار کریں، (یہ واجب ہے) مگر زوال سے غروب تک وقت مسنون ہے، اور غروب سے صبح صادق تک وقت مکروہ ہے۔ ان افعال سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ جا کر اپنے قیام کے دوان طواف، عمرہ اور دیگر اعمالِ خیر میں مشغول رہے۔ پھر جب مکہ مکرمہ سے رخصت ہونے کا وقت ہو تو طوافِ وداع کریں، (یہ بھی آفاقی یعنی غیر ملکی کے لیے واجب ہے) احناف کے یہاں حج قران کی ترتیب یہی ہے۔

حج تمتع کی ترتیب مع احکام:

یا پھر متابعت کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ دونوں کو جمع کر کے تمتع کرو جو حج کی آسان قسم ہے۔ جس کی ترتیب مع احکام حسب ذیل ہے:

میقات سے عمرہ کا احرام باندھیں، (یہ شرط ہے) پھر مکہ مکرمہ جا کر طوافِ عمرہ مع اضطباع و رمل (جو سنت ہے) ادا کریں، (یہ طوافِ عمرہ حج تمع کا رکن ہے) اور عمرہ کے لیے صفا مروہ کی سعی کریں، (یہ واجب ہے) پھر حلق یا قصر کرائیں، (یہ واجب ہے) اور احرام سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ میں اپنے قیام کے دوران نفل طواف اور دیگر اعمالِ صالحہ میں مشغول رہیں۔ (جس میں عمرہ کی بھی گنجائش ہے، ایسی صورت میں تمتع آخری عمرہ سے شمار ہوگا) اس کے بعد ایامِ حج شروع ہونے پر آٹھ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ ہی میں (اور بہتر ہے کہ مسجد حرام میں جا کر) حج کا احرام باندھ کر نیت کریں، (یہ آٹھ ذی الحجہ کو احرام باندھنا شرط ہے) اگر موقع ہو تو ایک نفل طواف کریں اور حج کے لیے صفا و مروہ کی سعی کریں، (یہ واجب ہے) اور منیٰ میں ایک دن رات قیام کریں، (یہ سنت ہے) نو ذی الحجہ کو عرفات جا کر زوال سے غروب

تک وقوف کریں، (یہ رکن اعظم ہے) غروب کے بعد مزدلفہ آ کر ساری رات قیام کریں، (یہ سنت ہے) اور دس ذی الحجہ کو صبح صادق سے طلوعِ آفتاب کے درمیان مزدلفہ میں وقوف کریں، (یہ واجب ہے) پھر طلوعِ آفتاب کے بعد منیٰ جا کر جمرۂ عقبہ کی رمی کریں، (یہ واجب ہے) اور حج کی قربانی کریں، (یہ واجب ہے) پھر حلق یا قصر کرائیں (یہ بھی واجب ہے) اور احرام سے حلال ہو جائیں اور مکہ مکرمہ جا کر بیت اللہ کا طوافِ زیارت کریں، (یہ رکن ہے) اگر حج کے احرام میں آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ آنے سے قبل حج کے لیے سعی نہ کی ہو تو اب صفا مروہ کی سعی کریں، (یہ واجب ہے) پھر منیٰ جا کر گیارہ اور بارہ دونوں دنوں میں زوال کے بعد سے صبح صادق سے پہلے تک تینوں جمرات کی رمی کریں، (یہ بھی واجب ہے) ان افعال سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ میں اپنے قیام کے دوران طواف، عمرہ اور دیگر اعمالِ خیر میں مصروف رہیں۔ پھر جب مکہ مکرمہ سے رخصت ہوں تو طوافِ وداع کریں، (یہ آفاقی یعنی غیر مکی کے لیے واجب ہے) یہ ہے حج تمتع کی ترتیب (عندالاحناف)

حجِ افراد کی ترتیب مع احکام:

حدیث پاک میں متابعت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے عمرہ کیا ہے تو بعد میں حج افراد بھی کر لو، جس کی ترتیب مع احکام حسب ذیل ہے:

میقات سے صرف حج کی نیت سے احرام باندھیں، (یہ شرط ہے) اور مکہ مکرمہ آ کر طوافِ قدوم مع اضطباع و رمل کریں، (یہ سنت ہے) پھر اگر موقع ہو تو حج کے لیے صفا مروہ کی سعی کر لیں، (یہ واجب ہے) اس کے بعد مکہ مکرمہ میں ایامِ حج تک احرام کی پابندیوں میں رہتے ہوئے طواف اور دیگر اعمالِ صالحہ میں (سوائے عمرہ کے) منہمک رہیں، اور آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ جا کر ایک دن رات وہیں قیام کریں، (یہ سنت ہے) نو ذی الحجہ کو عرفات جا کر زوال سے غروب تک وقوف کریں، (یہ رکن اعظم ہے) غروب کے بعد مزدلفہ آ کر ساری رات وہاں قیام کریں، (یہ سنت ہے) اور دس ذی الحجہ کی صبح صادق سے طلوعِ آفتاب کے درمیان

مزدلفہ میں وقوف کریں، (یہ واجب ہے) پھر طلوعِ آفتاب کے بعد منیٰ جاکر جمرۂ عقبہ کی رمی کریں، (یہ واجب ہے) اور آسانی ہو تو حج کی قربانی بھی کرلیں، (یہ اختیاری ہے، واجب نہیں) اور حلق یا قصر کرائیں، (یہ واجب ہے) پھر مکہ مکرمہ جاکر طوافِ زیارت کریں، (یہ رکن ہے) اگر منیٰ جانے سے قبل حج کے لیے صفا مروہ کی سعی نہ کی ہو تو اب کرلیں، (یہ واجب ہے) پھر منیٰ جاکر گیارہ اور بارہ دونوں دنوں میں قیام کے دوران تینوں جمرات کی زوال کے بعد سے صبح صادق سے پہلے تک رمی کریں، (یہ بھی واجب ہے) حج افراد کے ان افعال سے فارغ ہوکر پھر مکہ مکرمہ سے رخصت ہوتے وقت طوافِ وداع کریں، یہ بھی آفاقی یعنی غیر مکی کے لیے واجب ہے) یہ ہے حج افراد کی ترتیب (احناف کے نزدیک)

عمرہ کی ترتیب مع احکام:

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جب حج کرلیا تو اب عمرہ بھی کرلو، جس کی ترتیب مع احکام یہ ہے کہ میقات سے احرام باندھ کر عمرہ کی نیت کریں، (یہ شرط ہے) اور مکہ مکرمہ آکر طوافِ عمرہ ادا کریں، (یہ رکن ہے) پھر عمرہ کے لیے صفا مروہ کی سعی کریں، (یہ واجب ہے) اس کے بعد حلق یا قصر کرالیں، (یہ واجب ہے) اور احرام سے حلال ہوکر اپنے مکہ مکرمہ کے قیام میں طواف، عمرہ اور دیگر اعمالِ صالحہ میں مشغول رہتے ہوئے جب رخصت ہونے کا وقت آئے تو طوافِ وداع کریں، (یہ واجب اور سنت تو نہیں، البتہ آفاقی کے لیے مستحب ہے)

الغرض! خلوصِ نیت واتباعِ سنت اور اجتنابِ معصیت کے ساتھ حج وعمرہ کی ادائیگی سے اللہ تعالیٰ تنگدستی وجملہ معاصی (مراد حج سے کبیرہ اور عمرہ سے صغیرہ گناہ) کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے اور سونے چاندی کے میل کچیل کو دور کر کے صاف کر دیتی ہے؛ کیوں کہ خلوصِ نیت اور اتباعِ سنت کے ساتھ حج وعمرہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت میں غوطہ لگاتا ہے، جس کی وجہ سے سارے گناہوں کے میل کچیل سے

پاک صاف ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے اثر سے رزق (وعمر) میں برکت نصیب ہوتی ہے، جس سے اس کی اولاً دنیوی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے، پھر اخروی زندگی میں تو مقبول حج (وعمرہ) کا ثواب جنت ہی ہے، تو اس سے وہاں کی زندگی بھی خوشگوار ہو جاتی ہے، اور اس طرح جس خوش نصیب کو دنیا میں مقبول حج وعمرہ کی سعادت نصیب ہوتی ہے وہ آیت کریمہ:

﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَةً وَفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ (البقرة: ۲۰۱)

کا مصداق بن جاتا ہے اور دارین میں خیر وخوبی وکامیابی حاصل کر لیتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت ہوتی ہے۔

حج وعمرہ کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت:

چناں چہ حدیث میں ہے:

(۳) عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "إِنَّ هٰذَا الْبَيْتَ دِعَامَةٌ مِنْ دَعَائِمِ الإِسْلَامِ، فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ، أَوِاعْتَمَرَ فَهُوَ ضَامِنٌ عَلَى اللّٰهِ، فَإِنْ مَاتَ أَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ، وَإِنْ رَدَّهُ إِلٰى أَهْلِهِ رَدَّهُ بِأَجْرٍ وَغَنِيْمَةٍ". (رواه الطبرانی فی الأوسط، الترغیب: ۲/۱۷۸)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "بے شک یہ (اللہ جل شانہ کا) گھر اسلام کے ستونوں میں سے ایک ستون ہے، پس جو بھی حج اور عمرہ کرتا ہے تو اللہ جل شانہ اس کا ضامن ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ (حج وعمرہ کرنے والا اس کی ادائیگی سے قبل یا اس کے دوران) مر گیا تو حق تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا اور اگر وہ (حج وعمرہ سے) واپس اہل وعیال کی طرف لوٹا تو اجر وغنیمت کے ساتھ لوٹے گا۔" (مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بھی اس خرچ کا بدلہ ملتا ہے) معلوم ہوا کہ حج وعمرہ ایسا مبارک عمل ہے جو کسی حالت میں بھی نفع سے خالی نہیں ہے؛ کیوں کہ حاجی اور معتمر اللہ تعالیٰ کی ضمانت اور ذمہ داری میں آجاتا ہے، لہٰذا ایسا شخص خیر سے کیسے محروم رہ سکتا ہے؟ اس کا مرنا اور جینا سعادت اور کامیابی کا ذریعہ ہے، وہ جیے گا تو اجر وغنیمت اور عافیت کے ساتھ جیے گا، اور

مرے گا تو مغفرت کے ساتھ مرے گا۔ یاد رکھو! آدمی کے مرنے کی بہترین حالت یہ ہے کہ وہ ارکانِ حج یا صیامِ رمضان سے فراغت پر مرے؛ کیوں کہ یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں کہ انسان رمضان کے روزوں اور حج کی بدولت گناہوں سے پاک ہوکر مرتا ہے۔ چناں چہ ایک روایت میں ہے:

(٤) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ ﷺ: "مَنْ خَرَجَ حَاجًّا أَوْ مُعْتَمِرًا أَوْ غَازِيًا، ثُمَّ مَاتَ فِيْ طَرِيْقِهٖ، كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ أَجْرَ الْغَازِيْ وَالْحَاجِّ وَالْمُعْتَمِرِ". (رواه البيهقى فى شعب الإيمان، مشكوٰة ص: ٢٢٣/ الفصل الثالث)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص حج یا عمرہ یا جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے، پھر راستہ میں وقت اجل آجائے (اس کی موت واقع ہوجائے تو اگرچہ اسے حج وعمرہ اور جہاد کی ادائیگی کا موقع نہ مل سکا، مگر) حق تعالیٰ اس کے لیے حاجی، معتمر اور غازی کا اجر وثواب تحریر کردیتا ہے۔''

محقق اسلام حضرت اقدس مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس کریمانہ دستور وقانون کا اعلان خود قرآنِ کریم میں بھی موجود ہے:

﴿وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَحِيْمًا﴾ (النساء: ١٠٠)

یعنی جو بندہ اپنا گھر بار چھوڑ کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی نیت سے نکل پڑے، پھر آجائے اس کو موت (راستہ ہی میں) تو مقرر ہوگیا اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کہ اگر کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا کوئی کام کرنے کے لیے گھر سے نکلے اور اس کے عمل میں آنے سے پہلے راستہ ہی میں اس کی زندگی ختم ہوجائے، تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس عمل کا پورا اجر اس بندہ کے لیے مقرر ہوجاتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ

رحمت کا تقاضا ہے۔ (معارف الحدیث: ۴/ ۱۹۷)

اور ایک حدیث میں ہے:

(٥) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ خَرَجَ فِي هٰذَا الْوَجْهِ لِحَجٍّ أَوْ عُمْرَةٍ، فَمَاتَ فِيْهِ، لَمْ يُعْرَضْ وَلَمْ يُحَاسَبْ، وَقِيْلَ لَهٗ: "اُدْخُلِ الْجَنَّةَ" قَالَتْ: وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ اللّٰهَ يُبَاهِيْ بِالطَّائِفِيْنَ". (رواه الطبراني وأبو يعلى والدار قطني والبيهقي، الترغيب والترهيب: ۲/ ۱۷۸)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص اس طرح (یعنی میرے طریقہ کے مطابق احرام باندھ کر) حج اور عمرہ کے لیے نکلے، پھر اس سفر سعادت میں اس کی موت واقع ہو جائے، تو (قیامت کے دن) نہ اس کی پیشی ہوگی، نہ حساب و کتاب ہوگا، اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ "بلاشبہ حق تعالیٰ طواف کرنے والوں پر فخر کرتے ہیں، بعض روایتوں میں ہے کہ احرام کی حالت میں مرنے والا حشر میں لبیک کہتا ہوا اٹھے گا۔ (کنز)

حج عمرہ کرنے والوں کی فضیلت:

بہرکیف بیت اللہ اللہ جل شانہ کی خصوصی رحمت کی جگہ ہے، اس لیے جو بندے خلوصِ نیت کے ساتھ اس کی زیارت کے لیے حج و عمرہ کرنے کے لیے جاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے:

(٦) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهٗ قَالَ: "اَلْحُجَّاجُ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللّٰهِ، إِنْ دَعَوْهُ أَجَابَهُمْ، وَإِنِ اسْتَغْفَرُوْهُ غَفَرَ لَهُمْ". (ابن ماجه: ۱/ ۲۰۸، مشکوٰة/ص: ۲۲۳/ الفصل الثالث)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

فرمایا کہ ”حج وعمرہ کرنے والے اللہ کا وفد اور قاصد ہیں، یعنی وی. آئی. پی لوگ اور اللہ جل شانہ کے خاص مہمان ہیں، پھر دستورِ زمانہ ہے کہ لوگ کسی بڑے کے دربار میں وفد کی شکل میں جاتے ہیں تو ہر آنے والے وفد کا اکرام واعزاز کیا ہی جاتا ہے، اسی طرح کعبۃ اللہ اللہ کا خاص دربار ہے، تو حج وعمرہ کے ذریعہ اس کی زیارت کے لیے جانے والے ”وفد اللہ“ یعنی اللہ کے مہمان ہیں، اور جس طرح ایک شریف اور کریم میزبان اپنے مہمان کا اکرام کرتا ہے، اس کی ہر جائز خواہش کا احترام کرتا ہے، تو ربِ کعبہ جو کریموں کا کریم ہے وہ بھی اپنے خاص گھر پر آنے والے مہمانوں کا اکرام کرتا ہے، ان کی جائز مرادوں اور دعاؤں کو قبول کرتا ہے، بلکہ ان کی رعایت میں دوسروں کے ساتھ بھی (جس کے لیے وہ مغفرت طلب کریں) عنایت کا معاملہ فرماتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی بیت اللہ شریف کے پردے سے چمٹ کر یہ عجیب وغریب دعا مانگ رہا تھا کہ ”اے اللہ! ایک منگتا تیرے در پر کھڑا ہے، جس کی عمر گذر گئی، لیکن اس کے گناہ باقی ہیں، جس کے شہوانی جذبات ختم ہو چکے، لیکن ان کے قدیم اثرات باقی ہیں، اے اللہ! ہر مہمان کی مہمان نوازی کی جاتی ہے (میں بھی تو تیرا مہمان ہوں، لہٰذا) تو میری مہمان نوازی جنت سے کر دے۔“ (از تاریخ مکہ مکرمہ/ص:۳۲، ڈاکٹر محمد الیاس)

ہمیں یہ معلوم نہیں کہ حج وعمرہ کرنے والوں کا اللہ رب العزت کے یہاں کتنا اونچا مرتبہ اور مقام ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ حج وعمرہ کرنے والے خاصانِ خدا ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے فضائل حج (ص:۹۲/ ساتویں فصل عمرہ کے بیان میں/ حدیث نمبر چار کے تحت) ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ ”مکہ مکرمہ کے رہنے والے اگر اس کو جان لیں کہ حج وعمرہ کرنے والوں کا ان پر کتنا حق ہے، تو ان کی آمد پر یہ لوگ جا کر ان کی سواریوں کو بوسہ دیں، اس لیے کہ وہ لوگ اللہ کا وفد ہیں۔ (در) صاحبو! ربِ کریم کی اس عنایت ورحمت کا تقاضا یہ ہے کہ حج وعمرہ کرنے والے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر کے ایسا بنالیں جیسا کہ وہ چاہتا ہے اور خود کو آیت قرآنیہ:

﴿ قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الأنعام : ١٦٢)

کا مصداق بنا لیں، اور یہی حج وعمرہ کا اصل مقصد بھی ہے۔ اب جس نے اس حقیقت ومقصد کو سمجھ لیا اس کے لیے حج عمرہ کے خرچ بلکہ حرج کو بھی بخوشی برداشت کرنا آسان ہو جائے گا۔

حج وعمرہ میں مالِ حلال سے خرچ کرنے کی فضیلت:

حدیث پاک میں ہے:

(۷) عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَهَا فِيْ عُمْرَتِهَا: "إِنَّ لَكِ مِنَ الْأَجْرِ عَلٰى قَدْرِ نَصَبِكِ وَنَفَقَتِكِ". (رواه الحاكم، وقال: صحيح على شرطهما، الترغيب:۲/۱۷۹)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں (جس وقت انہوں نے عمرہ کرنے کا ارادہ کیا اس موقع پر) ان سے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "تیرے عمرہ کا اجر تیرے حرج اور خرچ کے اعتبار سے ہوگا"۔

سفر میں چوں کہ انسان اپنی مامون اور مانوس جگہ واشیاء کو چھوڑ کر جاتا ہے، اس لیے سفر خواہ کتنا ہی عمدہ واعلیٰ کیوں نہ ہو، بہر حال دورانِ سفر خطرات وخدشات پیش آتے رہتے ہیں، سفر حج وعمرہ میں بھی یہی بات ہے، لیکن اس سفر سعادت کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اس میں جتنا خرچ وحرج اور محنت ومشقت ہوگی اتنا ہی اجر وثواب میں اضافہ ہوگا۔ "اَلْأَجْرُ بِقَدْرِ الْمَشَقَّةِ"

پھر مال سے انسان کو طبعاً محبت ہوتی ہے، لہٰذا اس کے خرچ سے بھی گرانی ہوتی ہے، اس لیے اسے بھی اجر وثواب کی زیادتی کا سبب قرار دیا۔ ایک حدیث میں ہے:

(۸) عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلنَّفَقَةُ فِي الْحَجِّ كَالنَّفَقَةِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِسَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ". (مسند أحمد بن حنبل:۵/۳۵۵،

حديث نمبر: ٨٨-٢٣٣)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی الثقلین، امام القبلتین، سید الکونین، وسیلتنا فی الدارین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ سفر حج میں (مالِ حلال سے) خرچ جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کی طرح ہے، کہ ایک روپیہ خرچ کرنے کا اجر سات سو روپئے خرچ کرنے کے برابر ملتا ہے۔

ایک دوسری روایت ہے:

(٩) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلْحُجَّاجُ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، يُعْطِيهِمْ مَا سَأَلُوا، وَيَسْتَجِيبُ لَهُمْ مَا دَعَوْا، وَيُخْلِفُ عَلَيْهِمْ مَا أَنْفَقُوا، الدِّرْهَمُ أَلْفُ أَلْفٍ". (شعب الإيمان:٣/٤٧٦، حديث نمبر: ٤١٠٥)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "حج وعمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کا وفد ہیں، انہیں وہ تمام (جائز چیزیں) دی جاتی ہیں جو وہ مانگتے ہیں، اور وہ جو دعا کرتے ہیں وہ قبول ہوتی ہے، جو خرچ کرتے ہیں اس کا بدلہ دیا جاتا ہے، ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب ایک لاکھ درہم کے برابر دیا جاتا ہے۔"

گویا "دونوں ہاتھ میں لڈّو" یا "پانچوں انگلیاں گھی میں"۔ لہٰذا حج وعمرہ کرنے والوں کو چاہیے کہ حرمین شریفین کے زمانۂ قیام میں کھانے پینے نیز منیٰ، عرفات، مزدلفہ، مدینہ منوّرہ اور مقاماتِ مقدسہ کی آمد ورفت وغیرہ میں فراخدلی سے خرچ کریں۔ بعض لوگ وہاں کے قیام میں ضروری خرچ سے تو گریز کرتے ہیں، جب کہ وطن لانے کے لیے غیر ضروری اشیاء خوب فضول خرچی سے خریدتے ہیں، بلکہ بہت سا وقت اس میں صرف کرتے ہیں جو لائق افسوس ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حج وعمرہ کی تعداد:

ان فضائل کے حصول کے لیے ہمارے صاحب استطاعت لوگوں کو حجِ فرض وعمرۂ سنت کے علاوہ بار بار حج وعمرہ کے لیے جانا چاہیے، لیکن اپنے شوقِ عبادت کو پورا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ صبغۃ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے رنگ میں مکمل طور پر اپنے آپ کو رنگنے کے لیے اوراس عظیم مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے کے عزم کے ساتھ جس کی خاطر حق تعالیٰ نے ان عبادتوں کا حکم دیا ہے، ورنہ اس مقصد کے بغیر حج وعمرہ کو جانا ایک مذہبی پکنک کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہمارے آقا ﷺ کو اپنی حیاتِ طیبہ کے اخیری دور میں حج وعمرہ کی مشروعیت کے سبب حج تو ایک ہی مرتبہ ادا کرنے کا موقع ملا، لیکن عمرے چار ادا فرمائے۔ جن میں پہلا عمرہ صلح حدیبیہ کا ہے جو سن ہجری چھ (٦) میں واقع ہوا، جس میں کفارِ مکہ نے آپ ﷺ کو مع چودہ سو (۱۴۰۰) اصحاب کے روک دیا؛ چوں کہ اس میں احرام باندھ کر آپ ﷺ عمرہ کی ابتداء کر چکے تھے، اگرچہ افعالِ عمرہ ادا نہ کر سکے، اس لیے بعض علماء نے اسے بھی آپ ﷺ کے عمروں میں شمار کیا ہے۔ دوسرا عمرہ اگلے سال یعنی سن ہجری سات میں ذی القعدہ میں عمرۂ حدیبیہ کی قضا کے لیے آپ ﷺ نے دو ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرۃ القضاء کے طور پر ادا فرمایا۔ اور تین دن مکہ مکرمہ میں قیام فرما کر واپس مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ تیسرا عمرہ سن ہجری آٹھ میں جس سال مکہ مکرمہ فتح ہوا (اس وقت تو آپ ﷺ نے عمرہ ادا نہیں فرمایا، البتہ اسی سال شوال میں حنین وطائف کی طرف رُخ فرمایا، پھر وہاں سے واپسی پر جعرانہ سے ذی القعدہ میں عمرہ کا احرام باندھ کر رات میں عمرہ ادا فرمایا، اور تقریباً ڈھائی ماہ مکہ مکرمہ میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد چوتھا عمرہ سن ہجری دس میں حجۃ الوداع کے ساتھ آپ ﷺ نے ادا فرمایا۔ (ترمذی: ۱/ ۱۶۸، مشکوۃ ص: ۲۲۱، مستفاد از: سیرتِ مصطفیٰ ص: ۲/ ۲۲۸)

اس طرح احرام باندھنے کے اعتبار سے چار عمرے ہوتے ہیں، لیکن افعالِ عمرہ کے ادائیگی کے لحاظ سے حضور ﷺ کے عمرے تین ہوتے ہیں، غرض خود آپ ﷺ نے بھی

حج کے علاوہ موقع بموقع عمرے ادا فرمائے اور اس کی ترغیب بھی دی ہے۔

کثرت سے حج وعمرہ کرنے کی فضیلت:

اسی لیے حضرات صحابہ، تابعین اور بزرگانِ دین اس کا خوب اہتمام فرماتے تھے، ایک حدیث میں ہے:

(۱۰) عَنْ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قُلْتُ:" يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَلَا نَغْزُوْا أَوْ نُجَاهِدُ مَعَكُمْ؟" فَقَالَ:" لٰكِنَّ أَحْسَنُ الْجِهَادِ وَ أَجْمَلُهُ الْحَجُّ حَجٌّ مَّبْرُوْرٌ" فَقَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا:" فَلَا أَدَعُ الْحَجَّ بَعْدَ إِذْ سَمِعْتُ هٰذَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ." (بخاری: ۱/ ۲۵۰)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''حضور! کیا ہم عورتیں آپ کے ساتھ غزوہ یا جہاد میں شرکت نہ کریں؟'' تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تمہارے لیے افضل و بہترین جہاد وہ حج بیت اللہ ہے جو بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو، پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمان سنا ہے تو اب میں کبھی حج نہ چھوڑوں گی۔'' (چناں چہ آپ ہر سال حج کرتی رہیں)۔

اور مذکور حدیث قدسی میں رحمت عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱۱) "إِنَّ عَبْدًا صَحَّحْتُ لَهٗ جِسْمَهٗ، وَ وَسَّعْتُ عَلَيْهِ فِيْ الْمَعِيْشَةِ، تَمْضِيْ عَلَيْهِ خَمْسَةُ أَعْوَامٍ لَا يَفِدُ إِلَيَّ لَمَحْرُوْمٌ". (صحیح ابن حبان: ٤/ ٢٠٤)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس بندہ کو میں نے صحت کی نعمت دی اور ساتھ ہی معیشت میں وسعت بھی دی، اس کے باوجود اس پر پانچ سال اس طرح گذر جائیں کہ وہ ان میں ایک بار بھی میرے گھر کی حاضری (بغیر کسی جائز عذر کے) نہ دے تو یقیناً وہ خیر و برکت سے محروم رہے گا۔ (اعاذنا اللہ منہ) اس حدیث قدسی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہر صاحب

ثروت پر اگر اس میں حج کی استطاعت ہو تو ہر پانچ سال میں ایک مرتبہ سفرِ حج فرض ہوتا، لیکن چوں کہ دوسری احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صاف لفظوں میں یہ ثابت ہو گیا کہ حج عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ فرض ہے، اس کے بعد نفل ہے، اس لیے علماء نے فرمایا کہ ہر صاحب ثروت کے لیے بغرضِ حصولِ خیر و برکت ضروری ہے کہ بکثرت حج و عمرہ کرے، البتہ کوئی دینی ضرورت یا فقراء کی کثرت ہو تو اس موقع پر اپنا مال ان دینی ضروریات اور صدقۂ نافلہ میں لگانا حج نفل سے مقدم بلکہ افضل ہے۔ یاد رکھو! رحمت عالم ﷺ نے ایسے کئی اعمال کی تلقین فرمائی ہے جن کی ادائیگی نفلی حج و عمرہ ہی کے برابر ہے، جیسے قیدیوں کو آزاد کرانا، مصیبت زدہ کی مدد کرنا وغیرہ۔

ایک واقعہ:

کہتے ہیں کہ حضرت بشر بن عبدالحارثؒ کی خدمت میں ایک مرید حاضر ہوا اور اس نے حج (نفل) کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا: ”تمہاری نیت کیا ہے؟“ رضائے الٰہی یا دیدارِ کعبہ و مدینہ، یا اظہارِ زہد و تقویٰ؟“ مرید نے کچھ لمحے سوچنے کے بعد کہا: ”حضور! رضائے الٰہی، اور کچھ نہیں“ فرمایا: ”کیا میں تمہیں ایک ایسی بات بتاؤں جس پر عمل کر کے حج (نفل) کے بغیر تمہیں حج مقبول کا ثواب بھی مل جائے اور تمہیں دلی خوشی بھی نصیب ہو جائے؟“ مرید نے پوری فرماں برداری سے کہا: ”ضرور بتائیے“ فرمایا: ”اگر تم حج (نفل) پر خرچ ہونے والی رقم اس شخص کو دے دو جو صاحب نصاب نہیں، لیکن تمہاری امداد سے تجارت کر کے وہ صاحب نصاب بن سکتا ہے اور دوسرے لوگوں کے روزگار کا ذریعہ بن سکتا ہے، تو اس عمل سے تمہیں ایک مقبول حج کا ثواب مل جائے گا، اب بتاؤ! کیا چاہتے ہو؟“ مرید سوچ میں پڑ گیا، پھر کچھ دیر کے بعد بولا: ”حضرت! بات دراصل یہ ہے کہ طبیعت حج نفل کرنے پر مائل ہو چکی ہے اور میرا موڈ بن چکا ہے“ اس پر آپ نے فرمایا: ”بعض اوقات شیطان انسان کے نفس پر نیکیوں کے بہانے قابو پا کر اس سے وہی اعمال کرواتا ہے جو اس

کے نفس کو مرغوب ہوں۔'' الغرض مواقع ضرور دیکھنے چاہیے، ضرورت کے موقعوں میں خرچ کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ کسی خوش نصیب کو تندرستی کے ساتھ فراخی نصیب فرمائے تو اس نعمت کا ایک شکر یہ بھی ہے کہ وہ موقع بموقع حج وعمرہ کرے اور کم از کم چار پانچ سال میں ایک دفعہ تو ضرور ہی کرلیا کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ لگاتار حج وعمرہ برے خاتمہ سے بھی حفاظت کا سبب ہے اور فقر کو بھی روکتے ہیں۔ (کنز از فضائل حج ص:۲۳)

رمضان المبارک کے عمرہ کی فضیلت:

بالخصوص رمضان میں عمرہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور کرلیں؛ کیوں کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان المبارک میں اعمالِ صالحہ کا اجر وثواب ستر گنا زائد ہوجاتا ہے، پھر رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کی بڑی زبردست فضیلت حدیث میں وارد ہوئی ہے:

(۱۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''إِنَّ عُمْرَةً فِيْ رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً''. (مشکوٰۃ/ص: ۲۲۱/ کتاب المناسك/ الفصل الأول)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''رمضان میں عمرہ کرنے کا ثواب حج کے برابر ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ عمرہ کے ساتھ رمضان المبارک کی فضیلت مل جانے کی وجہ سے حج کے برابر ثواب ہوجاتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس سے حج فرض ادا نہیں ہوتا۔ روایت سے واضح ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں رمضان گذارنے کا اجر وثواب دوسرے شہروں کے ہزار رمضان کے اجر وثواب سے بہتر ہے''۔ (ترغیب:۲/ ۲۱۶، ابن ماجہ:۱/ ۲۲۵)

اور مسلم شریف کی روایت میں ہے:

''فَعُمْرَةٌ فِيْ رَمَضَانَ تَقْضِيْ حَجَّةً أَوْ حَجَّةً مَعِيْ''. (مسلم:۱/ ۴۰۹/ باب فضل العمرۃ فی رمضان)

یعنی رمضان کا عمرہ حج کے برابر ہے، یا اس حج کے برابر ہے جو میرے ساتھ ادا کیا

جائے، ایک حدیث میں ہے کہ جب رحمت عالم ﷺ حج کو تشریف لے جانے لگے تو ایک صحابیہؓ نے اپنے خاوند سے کہا کہ مجھے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرا دو، انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں، بیوی نے کہا کہ تمہارا فلاں اونٹ ہے نا! خاوند نے فرمایا کہ وہ تو میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں وقف کر چکا ہوں، مجبوراً وہ بیچاری رہ گئیں، جب حضور اکرم ﷺ حج سے فارغ ہو کر تشریف لائے تو خاوند نے یہ قصہ حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا، اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ حج بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کا راستہ تھا، اگر اونٹ پر حج کرا دیتے تو کچھ مضائقہ نہ تھا، پھر خاوند نے عرض کیا: حضور! میری اہلیہ نے سلام عرض کیا ہے اور یہ دریافت کیا ہے کہ آپ کے ساتھ حج نہ کرنے کی تلافی اب کیسے ہو سکتی ہے؟ تب حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری طرف سے بھی ان کو سلام کہہ دینا اور ساتھ ہی یہ پیغام کہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کا قصہ حضرت ام سنان، ام معقل، ام طلیق اور ام ہشیم رضی اللہ عنہن کے ساتھ بھی پیش آیا کہ یہ سب حج کا ارادہ فرماتی رہیں، لیکن کسی نہ کسی عذر سے نہ جا سکیں، تو حضور ﷺ نے ہر ایک سے یہی ارشاد فرمایا کہ ماہِ مبارک کا عمرہ حج کے برابر ہے۔ (فضائل حج/ص:۹۲)

تو بسا اوقات زمان اور مکان کی فضیلت کی وجہ سے عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے، چوں کہ رمضان کا وقت بڑا مبارک ہے، لہٰذا اس کے ہر عمل کا اجر زیادہ ہے۔

مسجد اقصیٰ سے حج وعمرہ کرنے کی فضیلت:

اور پھر جیسے وقت کی فضیلت سے عمل کا اجر بڑھ جاتا ہے ایسے ہی جگہ کی فضیلت سے بھی عمل کا اجر بڑھ جاتا ہے، چناں چہ مثلاً فلسطین کا مشہور شہر بیت المقدس (یروشلم) کی مسجد اقصیٰ جو ہمارا قبلۂ اوّل اور حرمِ ثالث ہے (اس کی بنیاد حضرت داود علیہ السلام نے رکھی اور تکمیل حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس کی از

سر نو تعمیر ہوئی، موجودہ تعمیر کا آغاز اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں ہوا اور اس کے بیٹے ولید کے عہد میں چھ سال بعد ۹۲ھ میں تکمیل ہوئی، تب سے لے کر اب تک یہ چھ ستونوں پر قائم پوری مسجد (حرمِ ثالث کی حدود میں قبلہ کی جانب سب سے بڑی مسجد ہے، وہی دراصل مسجد اقصیٰ ہے، اپنی اسی حالت میں ہے، ۲۶۲ فٹ لمبائی اور ۱۸۰ فٹ چوڑائی پر مشتمل ہے، اندازاً چار ہزار افراد بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں) وہاں سے حج وعمرہ کا احرام باندھنے کی بڑی زبردست فضیلت احادیث طیبہ میں وارد ہوئی ہے، ایک حدیث میں ہے:

(۱۳) عَنْ أُمِّ حَكِيمٍ بِنْتِ أَبِي أُمَيَّةَ بْنِ الْأَخْنَسِ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: "مَنْ أَهَلَّ بِحَجَّةٍ أَوْ عُمْرَةٍ مِنَ الْمَسْجِدِ الْأَقْصٰى إِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ، أَوْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ". (ابن ماجه/ ص: ۲۱۵ بإسناد صحيح، كذا في الترغيب:۲/ ۱۹۰، مشكوٰة/ص: ۲۲۲)

حضرت ام حکیم (جو تابعیہ ہیں انہوں) نے یہ حدیث سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے سنی، وہ حضور ﷺ کا ارشاد نقل فرماتی ہیں کہ "جو شخص بیت المقدس (کی مسجد اقصیٰ) سے حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر آئے (اور حج وعمرہ کرے) تو اس کے سارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے، یا فرمایا کہ اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے"۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ام حکیم نے اس حدیث کو سن کر صرف احرام باندھنے کی نیت سے بیت المقدس کا سفر کیا اور وہاں (مسجد اقصیٰ) سے احرام باندھ کر واپس آئیں۔ (الترغیب)

یہ وقعت تھی ان حضرات کے یہاں حضور ﷺ کے پاک ارشادات کی، کہ جو شخص کوئی حدیث سن لیتا تھا اپنی وسعت کے موافق اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا تھا، خواہ اس میں کتنی ہی مشقت اٹھانی پڑے"۔ (از: فضائل حج/ص:۹۴)

خلاصہ:

ان حقائق کی روشنی میں عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حج وعمرہ وہ عظیم عبادت ہے جس کے صحیح فضائل وفوائد اگر پچاس فیصد بھی ظاہر ہو جائیں تو اندھے دیکھنے لگیں اور بہرے سننے لگیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے حج وعمرہ کرنے والا جملہ معاصی سے توبہ کے بعد اور مالِ حلال سے اپنے اور اہل وعیال کے نفقہ کا بند و بست کرنے کے بعد خلوصِ نیت واتباعِ سنت کے ساتھ حج وعمرہ کرے، ایسا شخص واقعی بڑا خوش قسمت ہے اور کتاب وسنت میں حج وعمرہ کے جتنے فضائل ہیں ان کا صحیح معنیٰ میں حقدار ہے، اور یہی وہ حاجی اور معتمر ہے جس کے متعلق حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک حاجی وہ ہوتا ہے جو احرام باندھ کر ابھی سواری پر پاؤں ہی رکھتا ہے کہ اس کی لبیک کی صدا کے ساتھ ہی فرشتے پکار اٹھتے ہیں کہ مبارک ہو تجھے، تیرا حج (وعمرہ) قبول کرلیا گیا، لیکن ایک حاجی ومعتمر وہ بھی ہوتا ہے جو پورا حج وعمرہ کر لیتا ہے، اپنے آپ کو تھکاتا بھی ہے اور مال بھی خرچ کرتا ہے، لیکن فرشتے اس پر افسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہ تیرا حج وعمرہ قبول، نہ لبیک منظور؛ کیوں کہ تیری آمدنی حرام تھی اور تو حرام سے آلودہ تھا۔ (الترغیب: ۲/۱۱۳)

ایسے لوگ جب حج پر حج اور عمرے پر عمرہ کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ ان سے بیت اللہ اور روضۂ رسول اللہ کا تقدس پامال ہوتا ہے، بلکہ اسلام کی یہ عظیم عبادتیں ان کی وجہ سے دنیا والوں کے لیے باعث تمسخر بن جاتی ہیں۔ العیاذ باللہ۔

حق تعالیٰ ہم سب کو زندگی میں بار بار حج وعمرہ کی توفیق اپنی رضائے کامل کے ساتھ مع اہل وعیال عطا فرمائے۔ آمین۔

”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

☆......☆......☆

(۳۲)

مکہ مکرمہ اور اس کے مقدس مقامات کے فضائل قرآن وحدیث کی روشنی میں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ عَبۡدِ اللّٰهِ بۡنِ عَدِيِّ بۡنِ حَمۡرَاءَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ:" رَأَيۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ وَاقِفًا عَلَى الۡحَزۡوَرَةِ، فَقَالَ: "وَاللّٰهِ إِنَّكِ لَخَيۡرُ أَرۡضِ اللّٰهِ وَأَحَبُّ أَرۡضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ، وَلَوۡلَا أَنِّيۡ أُخۡرِجۡتُ مِنۡكِ مَا خَرَجۡتُ". (رواه الترمذی وابن ماجه، مشکوٰة ۲۳۸/ باب حرم مکة حرسها اللّٰه تعالیٰ/ الفصل الثانی)

حضرت عبداللہ بن عدی بن حمراء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم حزورہ (یہ ایک اونچا ٹیلہ تھا جہاں بازار لگتا تھا، یہ جگہ ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر کے سامنے خیاطین کے نزدیک تھی، پھر کسی زمانہ میں یہاں ایک دروازہ کا نام حزورہ ہوا کرتا تھا، اب یہ جگہ مسجد حرام کی توسیع میں آچکی ہے)۔ (از: تاریخ مکہ مکرمہ ص/۸ ڈاکٹر محمد الیاس عبدالغنی) کے مقام پر کھڑے ہوکر (مکہ مکرمہ کو خطاب کرتے ہوئے) فرما رہے تھے: ''اللہ کی قسم! تو اللہ تعالیٰ کی ساری زمین کا سب سے افضل قطعہ اور حصہ ہے اور تو اللہ تعالیٰ کی سب سے محبوب زمین ہے، اگر مجھے یہاں سے نہ نکالا جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا۔''

مکہ مکرمہ کو ''اُمّ القریٰ'' کہنے کی وجہ:

یہ دنیا جو آج اپنی موجودہ شکل میں ہے، ابتداء میں اس کی یہ حالت نہ تھی، بلکہ شروع میں یہ ساری دنیا جل تھل تھی، ہر طرف پانی ہی پانی تھا، جس وقت خالق کائنات نے خشکی کا مفید ترین حصہ پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو جس سرزمین کو پانی کے بلبلہ کی شکل میں ظاہر فرما کر زمین کی ابتداء کی وہ مکہ مکرمہ ہے، اس لیے مکہ مکرمہ ساری دنیا کی سرزمینوں کا مبدا اور ساری آبادیوں کی اصل اور ماں ہے، اسی مناسبت سے مکہ مکرمہ کو ''اُمّ القریٰ'' کہا جاتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَهٰذَا كِتٰبٌ أَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُصَدِّقُ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (الأنعام: ۹۲)

''اور یہ قرآن بھی ایک کتاب ہے جس کو ہم نے نازل کیا ہے جو بڑی برکت والی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، اور اس لیے نازل کی تاکہ آپ اس کے ذریعہ بستیوں کے مرکز یعنی مکہ کے رہنے والوں کو اور اس کے چاروں طرف بسنے والوں کو خبردار کریں۔''

آیت کریمہ میں ''اُمّ القریٰ'' سے مراد مکہ مکرمہ ہے، اس مقدس اور مبارک شہر کو ''اُمّ القریٰ'' کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مکہ روئے زمین کا مرکز ہے، اسی مرکزی حصہ سے بقیہ زمین کو پھیلایا گیا، جدید وقدیم تحقیقات کی رو سے یہ حصہ زمین کے بالکل وسط اور بیچ میں واقع ہے۔

حدیث پاک میں اسی کو فرمایا گیا:

''دُحِيَتِ الْأَرْضُ مِنْ مَكَّةَ، مَدَّ اللّٰهُ تَعالٰى تَحْتَهَا، فَسُمِّيَتْ '' أُمَّ الْقُرٰى''.

(فضائل مكة والسكن فيها ص: ۱۹، للحسن البصریؒ)

یعنی زمین مکہ مکرمہ سے پھیلائی گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے نیچے نیچے پھیلا دیا، اسی

وجہ سے مکہ مکرمہ کا نام ''اُمّ القریٰ'' رکھا گیا۔

دوسری وجہ اسے ''اُمّ القریٰ'' کہنے کی یہ بھی ہے کہ ''ام'' کے معنیٰ ہیں ماں، تو اسے ''اُمّ القریٰ'' اس مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ اس مقدس اور مبارک بستی کا مرتبہ و مقام ساری دنیا کی بستیوں کے مقابلہ میں ایسا ہی بلند ہے جس طرح ماں کا مرتبہ اور مقام تمام رشتوں میں بلند ہوتا ہے۔ اور جو سکون ایک بچہ کو ماں کی گود میں ملتا ہے وہ سکون دنیا والوں کو بالخصوص اہل ایمان کو مکہ مکرمہ میں ملتا ہے۔

مکہ مکرّمہ امن کا گہوارہ:

اور یہی وہ پرسکون اور باعظمت شہر ہے جس کی عظمت وحرمت کی قسم خود رب العالمین نے قرآنِ کریم میں دو مرتبہ کھائی ہے: ﴿لَا أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ﴾ (البلد: ۱) ''میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔'' دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَهٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِيْنِ﴾ (التین: ۳) ''اور قسم ہے اس امن وامان والے شہر کی۔''

علامہ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت ہو یا زمانۂ اسلام، خوف وہراس میں مبتلا ہر شخص یہاں امن پاتا ہے، اور اہل عرب آمن کو امین سے تعبیر کرتے ہیں۔ (تاریخ مکہ مکرمہ/ص: ۱۲)

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ مقدس ومبارک شہر دنیا کی تاریخ کے ہر دور میں امن وامان کا گہوارہ رہا ہے، اس کی عظمت وحرمت دورِ قدیم سے مسلم چلی آرہی ہے، یہ محض رسم ورواج یا کسی گروہ یا پنچایت کی تجویز کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ازلی حکم سے ہے، اور قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اس کی حرمت کا خاص لحاظ کیا جائے، حتیٰ کہ جہاد فی سبیل اللہ جو ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت اور بڑے درجہ کی سعادت ہے یہاں حرمت کی وجہ سے اس کی بھی اجازت نہیں۔ باوجودیکہ اس شہر پر مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی اجارہ داری رہی ہے، مگر اس کے امن وسلامتی کی ہر فرقہ نے پاسداری کی ہے، اور جب کبھی دنیا

والے خوف سے دوچار ہوئے تو امن وسلامتی کی فضا انہیں اسی شہر محترم میں میسر ہوئی، نیز اس کی یہ حرمت نہ صرف بنی نوعِ انسان کے لیے ہے، بلکہ حیوانات ونباتات بھی اس حرمت میں انسان کے شانہ بشانہ ہیں، جیسا کہ رحمت عالم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا:

”إِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللّٰهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّماوَاتِ وَ الْأَرْضَ فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللّٰهِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ“.

اس مقدس شہر کو اللہ رب العزت نے اسی وقت سے حرمت والا قرار دیا ہے جب سے آسمان وزمین کو تخلیق بخشی اور یہ حرمت قیامت تک کے لیے ہے۔ حدیث کے اخیر میں ہے:

”لَا يُعْضَدُ شَوْكُهٗ، وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهٗ، وَلَا يُلْتَقَطُ لُقَطَتُهٗ إِلَّا مَنْ عَرَّفَهَا، وَلَا يُخْتَلٰى خَلَاهَا“. (متفق عليه، مشكوة/ص:۲۳۷/ عن ابن عباسؓ)

اس علاقہ کے خاردار جھاڑ بھی نہ کانٹے چھانٹے جائیں اور نہ کسی قابل شکار جانور کو پریشان کیا جائے، یہاں کی گری پڑی چیز پر نظر پڑے تو اس کو وہی اٹھائے جو قاعدے کے مطابق مالک تک پہنچانے کی غرض سے اس کا اعلان اور تشہیر کرتا رہے، (اب چوں کہ مکہ مکرمہ میں اور خصوصاً مسجد حرام میں گم شدہ اشیاء کے لیے مستقل دفتر قائم ہے، لہٰذا اگر کسی کو کوئی ایسی چیز ملے جس کو نہ اٹھایا گیا تو اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو یا کسی غلط آدمی کے ہاتھ لگنے کا اندیشہ ہو، تو اسے اٹھا کر دفتر میں جمع کرا دینا چاہیے، تاکہ اس کا مالک جب وہاں رجوع کرے تو اسے مل جائے) اور یہاں کی سبز گھاس بھی نہ کاٹی اکھاڑی جائے۔

غرض! اس حرمت والے علاقہ میں ان سب چیزوں سے تعرض کو ادب واحترام کے خلاف مجرمانہ جسارت قرار دے کر امن وامان کی فضا قائم رکھنے کا حکم دیا گیا، یہ اسی حکم کی تعمیل کا نتیجہ ہے کہ

نہ کوئی اضطراب ہے، نہ کوئی انتشار ہے
سکون ہی سکون ہے، قرار ہی قرار ہے

نظر کے سامنے زہے نصیب! وہ دیار ہے
لطافتوں پر جس کی جانِ عاشقاں نثار ہے
اگر نگاہ تیز، تو دل سرور خیز ہے
ہوا بھی عطر بیز ہے فضا بھی خوشگوار ہے
بگولے راہِ عشق کے بلند ہو کے بول اٹھے
خزاں نہیں خزاں نہیں، بہار ہے بہار ہے

صاحبو! یہ ربِ کعبہ کا کرم اور مکہ کی کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟

مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ آدابِ حرم کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ جب تم حرم میں داخل ہو تو نہ کسی کو دھکا دو، نہ کسی کو تکلیف پہنچاؤ، نہ بھیڑ بھاڑ کرو۔ (یہ بھی اس کی حرمت کے خلاف ہے)۔ (از تاریخ مکہ/ص:۱۵)

حدودِ حرم:

پھر مکہ مکرمہ کی یہ حرمت صرف اس کی بستی وآبادی تک ہی محدود نہیں، بلکہ کعبۃ اللہ کی عظمت وحرمت کے پیش نظر اس کی ہر سمت میں کئی کئی میل کے علاقہ کو حق تعالیٰ نے حرم یعنی واجب الاحترام قرار دیا ہے؛ کیوں کہ یہ پورا علاقہ کعبۃ اللہ المعظم اور بلد اللہ المحترم کا گویا صحن ہے جس کو حدودِ حرم کہا جاتا ہے، اس عاجز نے مؤرخہ ۶/مئی ۲۰۱۱ء جمعہ کو بذاتِ خود شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم سے یہ سوال کیا کہ مکہ مکرمہ میں ایک نماز کی فضیلت ایک لاکھ کے برابر ہے تو وہ مسجد حرام کے ساتھ خاص ہے یا حدودِ حرم میں کہیں بھی ادا کرنے سے یہ فضیلت حاصل ہو جاتی ہے؟ فرمایا: ''زیادہ تر علماء اور ہمارے بزرگوں کا کہنا یہی ہے کہ یہ فضیلت پورے حدودِ حرم میں کسی بھی جگہ نماز ادا کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔'' حرم کے رقبہ کا دائرہ ۱۲۷/کلومیٹر ہے اور کل رقبہ ساڑھے پانچ سو کلومیٹر مربع ہے۔ (از تاریخ مکہ مکرمہ/ص:۱۵)

ان میں سب سے قریب ترین حد:

(۱) ''مقام تنعیم'' ہے، مسجد حرام سے یہ مقام صرف ۶ یا ۷/ کلومیٹر کے فاصلہ پر مکہ مکرمہ سے مدینہ منوّرہ کے راستہ پر واقع ہے، یہیں پر مسجد عائشہ ہے، مکہ والے یہاں آکر عمرہ کا احرام باندھتے ہیں۔ اور احناف کے نزدیک یہیں سے عمرہ کا احرام باندھنا افضل ہے؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بہن عائشہ کے ساتھ تنعیم جائیں تاکہ وہ وہاں سے احرام باندھ لیں۔ (عندالاحناف) یہ قولی دلیل فعلی دلیل پر مقدم ہے۔ (اس وقت مسجد عائشہ میں پندرہ ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے)۔

(۲) ''وادیٔ نخلہ'': یہ مقام جبل نور اور غارِ حرا سے آگے واقع ہے، یہ مسجد حرام سے ۱۴/ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، یہ دونوں مقامات فی الحال مکہ مکرمہ کی آبادی میں داخل ہوگئے ہیں۔

(۳) ''عرفات ومزدلفہ کے مابین راستہ میں ہے، یہ مقام مسجد حرام سے تقریباً سترہ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، یہاں پر حدودِ حرم کا گیٹ نمایاں نظر آتا ہے۔

(۴) ''حدیبیہ'': جو مسجد حرام سے ۲۲/ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، آج کل یہ جگہ شمیسی کے نام سے معروف ہے، یہ جدہ اور مکہ کی قدیم شاہراہ پر ہے، یہیں پر دوطرفہ وسیع ترین سڑک کے اوپر رحل نما گیٹ بنا ہوا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس کے اوپر بڑا قرآن رکھا ہے، یہاں سے دو کلومیٹر دور ''حدیبیہ'' نام کا کنواں تھا، جس کی نسبت سے اس جگہ کا نام بھی ''حدیبیہ'' پڑ گیا، یہیں بیعت رضوان اور صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا تھا، یہاں اب مسجد بیعت الرضوان ہے جو مسجد حرام سے ۲۴/ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔

(۵) ''جعرانہ'': یہ مقام مسجد حرام سے شمال مشرقی سمت میں ۲۴/ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، یہاں کا پانی اپنی شیرینی میں ضرب المثل ہے، یہاں ایک مسجد ہے جہاں سے

عمرہ کی نیت کی جاتی ہے۔شوافع اور مالکیہ کے نزدیک عمرہ کی نیت یہیں سے کرنا افضل ہے؛ کیوں کہ ان کے یہاں فعلی دلیل قولی دلیل سے قوی ہے۔(اس میں فی الحال ایک ہزار نمازی کی گنجائش ہے) غزوۂ حنین سے واپسی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں قیام فرما کر مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تھا، پھر عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ ادا فرمایا اور رات ہی فراغت کے بعد مدینہ کی طرف کوچ کا حکم فرمایا۔

(۶) ”اِضاۃِ لبن“: یہ ایک جھیل نما مقام ہے، ”لَبَنٌ“ دودھ کو کہتے ہیں؛ چوں کہ اس کے نزدیک جو پہاڑ ہے وہ سفیدی مائل ہے اس مناسبت سے اس جگہ کو اس نام سے موسوم کرتے ہیں، یہ جگہ مسجد حرام سے تقریباً ۲۳/کلومیٹر کے فاصلہ پر طریق یمن میں واقع ہے، اس راستہ سے آگے جا کر یلملم نامی میقات پڑتی ہے، آج کل اس جگہ کو عُقَیْشِیَہ بھی کہا جاتا ہے۔

(۷) ”طائف کا راستہ“: جو اس وقت عرفات اور جامعہ ام القری جدید سے ہوکر جا رہا ہے، اس میں مسجد حرام سے ۱۶/کلومیٹر کے فاصلہ پر حدودِ حرم کا کھمبا نصب ہے۔ (از انوار مناسک/ص:۱۴۹)

روایات میں ہے کہ حرم کے یہ حدود سب سے پہلے سیدنا آدم علیہ السلام نے قائم کیے، اور جب طوفانِ نوح نے ان حدود کو برابر کر دیا تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان نشانات کو قائم فرمایا، اس کے بعد رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد ان نشانات پر حد بندی کی تجدید حضرت تمیم ابن اسید خزاعی رضی اللہ عنہ سے کروائی، پھر خلفاءِ راشدین وسلاطین مسلمین اپنے اپنے زمانوں میں ان نشانات کی تجدید ونگرانی کرتے رہے اور جب تک مسجد حرام عالم وجود میں رہے گی ان شاء اللہ یہ حدودِ حرم بھی باقی رہیں گی۔

حدودِ حرم کی خصوصیت:

حدودِ حرم کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے بعض علماء نے فرمایا کہ حدودِ حرم کا یہ

مخصوص حصہ محترم اس طرح مقرر ہوا کہ

(۱) جب سیدنا آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر اتارے گئے تو انہیں جنات وشیاطین سے خوف محسوس ہوا، آپ نے بارگاہِ الٰہی میں اپنی حفاظت کے لیے درخواست پیش کی تو حق تعالیٰ نے ان کی حفاظت ونگہبانی کے لیے فرشتوں کو بھیجا، جو مکہ مکرمہ کے ارد گرد چاروں طرف اپنے فریضہ کی تکمیل کے لیے کھڑے ہو گئے، جن مقامات پر کھڑے ہو کر فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کی نگرانی و پاسبانی کر رہے تھے آج وہی مقامات حدودِ حرم کہلاتے ہیں اور اس کے درمیان کا پورا حصہ حرم کہلاتا ہے۔

(۲) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سیدنا آدم علیہ السلام نے جب تعمیر کعبہ کے وقت جنتی پتھر ''حجراسود'' رکھا تو اس کی روشنی سے ہر چہار طرف کی زمین میں (مشرق و مغرب شمال وجنوب کی جانب) روشنی پھیل گئی، اس وقت وہ نورانی روشنی جہاں تک پھیلی وہیں حرم کی حد مقرر ہو گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (از مدنی مظاہر حق جدید: ۲/۸۵۰)

مکہ مکرمہ اور اس کی حدود کی حرمت بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک مومن کی حرمت ہے، حرم محترم کی حرمت وخصوصیت کے پیش نظر یہاں ہر وہ عمل ممنوع ہے جو اس کی تکریم وتعظیم کے خلاف ہو اور جس سے اس رشکِ جنت مقام کی بے حرمتی و بے عزتی ہوتی ہو، حتیٰ کہ بعض مباحات بھی یہاں کی حرمت وخصوصیت کی بنا پر ممنوع قرار دیے گئے ہیں، مثلاً (۱) حدودِ حرم میں غیر مسلم کا داخلہ ممنوع ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ﴾

(البراءۃ: ۲۸)

جو شرک کی باطنی وروحانی گندگی میں ملوث ہیں وہ (اب فتح مکہ کے بعد سے قیامت تک) اس مسجد حرام اور حرمِ محترم کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ اس کے دو مطلب ہیں:

(۱) مسجد حرام کے قریب نہ آنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ حج نہ کریں۔ یہ ایسا ہی

ہے جیسے مردوں سے کہا گیا کہ وہ حالت حیض میں عورتوں کے قریب بھی نہ جائیں، تو مراد یہ ہے کہ جماع نہ کریں، لیکن ان کے قریب جانا منع نہیں۔اسی طرح کفار حج تو نہیں کرسکتے، لیکن کسی ضرورت سے حدودِ حرم میں جانا چاہیں تو بالکل ہی ممنوع نہیں، بلکہ گنجائش ہے۔امام صاحبؒ نے یہی مطلب مراد لیا ہے، البتہ امام شافعی، امام احمدؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس آیت کی رو سے مسجد حرام بلکہ پورے حدودِ حرم میں کفار کا داخلہ ممنوع ہے۔(آسان ترجمۂ قرآن: ۱/۵۷۱)

مبلغ اسلام علامہ سید عبدالمجید ندیمؔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح ہم اپنے گھر میں غلاظت پسند نہیں کرتے اللہ تعالیٰ بھی اپنے حرم اور گھر میں شرک کی غلاظت والوں کو پسند نہیں کرتے، یہاں سے مشرک ومنافق بھگائے جاتے ہیں اور مخلص بلائے جاتے ہیں، چناں چہ حدودِ حرم کے شروع ہونے سے کچھ پہلے ہی بڑے سائن بورڈ پر یہ ہدایت لکھی ہوئی ہے کہ "لِلْمُسْلِمِيْنَ فقَطْ" جن کے پاس ایمان کا روحانی ویزا ہے بس یہ محترم جگہ ان ہی کے لیے ہے، جو اس ایمانی ویزا سے محروم ہیں ان غیر مسلمین کے لیے علاحدہ ایک سڑک ہے جو حدودِ حرم سے باہر مکہ مکرمہ پار کرکے آگے کو ملتی ہے۔(۲) پھر مسلمان بھی حدودِ حرم میں بغیر احرام کے داخل نہیں ہوسکتے، احناف کے یہاں تو حدودِ حرم میں داخل ہونے والے پر بہر صورت احرام واجب ہے اگرچہ حج وعمرہ کا ارادہ نہ ہو۔

(۲) وہ سرسبز وشاداب درخت اور گھاس پودے وغیرہ جو خود اگتے ہوں اور لوگ ان کی کاشت نہ کرتے ہوں ان کا کاٹنا، نیز حدودِ حرم میں کسی شکاری جانور کا شکار کرنا، خواہ شکاری وہاں کا باشندہ ہو یا نہ ہو اور محرم ہو یا نہ ہو بہر حال ممنوع ہے، نیز وہاں قتل وقتال کرنا اور کسی پر ظلم وزیادتی کرنا خصوصیت کے ساتھ منع ہے، اور جب مباحات کی ممانعت ہے، تو محرمات ومنہیات کی تو بدرجۂ اولیٰ ممانعت ہوگی، علماء نے فرمایا کہ حدودِ حرم میں کسی بھی قسم کے گناہ کا ارتکاب حدودِ حرم کی حرمت کی وجہ سے بدترین جرم ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "حرم میں ایک گناہ کا صدور بیرونِ حرم کے گناہوں سے ستر گنا زیادہ

سخت ہے‘‘۔(از ذکر حرمین/ص:۳۱)

حدودِ حرم کے آداب:

حدودِ حرم کی حرمت ہی کی وجہ سے خود حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام جس وقت یہاں داخل ہوتے تھے تو سواری سے اتر جاتے اور پیر سے جوتے نکال کر پیدل چلتے تھے، صاحبو! حق یہ ہے کہ اگر انسان اس مقدس سرزمین پر سر کے بل بھی چلے تب بھی اس کا حق ادب ادا نہیں ہوسکتا، لہٰذا جب حق تعالیٰ کسی خوش نصیب کو اس مقدس دیار میں داخل ہونے کا موقع دیں تو اس پر لازم ہے کہ لبیک پڑھتے ہوئے اور اس کی عظمت وحرمت کا پورا خیال رکھتے ہوئے گناہوں پر احساسِ ندامت کے ساتھ معافی طلب کرتے ہوئے حدودِ حرم میں داخل ہو، یاد ہو تو یہ دعا بھی پڑھے:

”اَللّٰھُمَّ إِنَّ ھٰذَا حَرَمُكَ وَحَرَمُ رَسُوْلِكَ، فَحَرِّمْ لَحْمِيْ وَدَمِيْ وَعَظْمِيْ وَبَشَرِيْ عَلَى النَّارِ، اَللّٰھُمَّ اٰمِنِّيْ مِنْ عَذَابِكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ“. (بالمعنی تبيين الحقائق:۲/۱٤، قاضی خان:۱/۳۱۵، از: انوار مناسك/ص:٦۲۳)

”الٰہ العالمین! یہ تیرا اور تیرے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حرم محترم ہے، اب تو اس کی برکت سے میرا گوشت، خون، ہڈی، چمڑی (اور پورے ہی جسم کو) نارِ جہنم پر حرام فرما دے، اور پروردگار عالم! اس دن کے عذاب سے خصوصاً میری حفاظت فرما دے جس دن تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا۔“

حدودِ حرم میں داخل ہونے کے بعد کوئی کام یا کلام اس کی عظمت وحرمت کے خلاف ہرگز ہرگز نہ ہونے پائے اس کا خاص خیال رکھیں، حدیث شریف میں ہے:

”عَنْ عَيَّاشِ بْنِ أَبِيْ رَبِيْعَةَ الْمَخْزُوْمِيِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:” لَا تَزَالُ هٰذِهِ الْأُمَّةُ بِخَيْرٍ مَا عَظَّمُوْا هٰذِهِ الْحُرْمَةَ حَقَّ تَعْظِيْمِهَا، فَإِذَا ضَيَّعُوْا ذٰلِكَ هَلَكُوْا“. (رواه ابن ماجه، مشكوٰة/ص:۲۳۸)

جب تک میری امت اس حرمِ مقدس کا ادب واحترام کرتی رہے گی اور اس کی عظمت وحرمت کا حق ادا کرے گی تو عزت وخیریت سے رہے گی، اور جب اجتماعی حیثیت سے یہ بات نہ رہے گی تو امت برباد ہو جائے گی۔ محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں: ''ہمارے اس زمانہ میں سفر کی سہولتوں اور بعض دوسری وجوہ سے بھی اگرچہ حج وعمرہ کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، لیکن یہاں ساری دنیا سے جو مسلمان آتے ہیں ان کا طرزِ عمل بتاتا ہے کہ بیت اللہ اور حدودِ حرمِ مقدس کے ادب واحترام کے لحاظ سے امت میں بحیثیت مجموعی بہت بڑی تقصیر آ گئی ہے، اور بلاشبہ یہ بھی ان اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے جن کی وجہ سے امت مشرق ومغرب، شمال وجنوب اور ساری دنیا میں حق تعالیٰ کی نصرت اور نگہبانی سے محروم کر دی گئی ہے۔ (معارف الحدیث: ۲۷۲/۴)

یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ ''جس شخص کو مکہ مکرمہ اور حدودِ حرم میں رہ کر کسی گناہِ عظیم میں مبتلا ہو جانے کا ظن غالب ہو اس کے لیے مکہ مکرمہ میں مستقل قیام کی نیت سے رہنا مکروہ ہے، البتہ جو یہاں رہ کر پوری طرح ادب واحترام بجا لاتا ہو تو اس کے لیے بلاشبہ مکہ مکرمہ میں مستقل قیام افضل ہے۔'' اس لیے اللہ پاک اگر کسی کو موقع دے تو مکہ کا قیام اس وقت تک ترک نہ کرے جب تک وہ حقیقۃً یا حکماً مجبور نہ ہو۔ کہتے ہیں نا کہ مکہ میں داخل ہونا سعادت اور نکلنا شقاوت ہے۔ (عمدہ الفقہ: ۴۸۴/۴)

اس لیے حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کے نزدیک مکہ مکرمہ سے رخصت ہوتے وقت ایسی کیفیت پیدا کرنا جیسے اس کو یہاں سے رخصت ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور وہ وہاں سے بادلِ ناخواستہ بلکہ بادلِ شکستہ رخصت ہو رہا ہے یہ مستحب ہے۔

مکہ مکرمہ کے فضائل:

غرض مکہ مکرمہ نہایت عظمت والا مقدس شہر ہے، اس لیے بھی کہ یہ حضور اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کے جدامجد سیدنا اسماعیل علیہ السلام کا مسکن اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد ہے، یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ کے ترپن (۵۳) سال گذارے، اس شہر مقدس کے دیدار کا شوق جنت کی طرح ہر مومن کے دل میں رہتا ہے، یہی وہ مقدس شہر ہے جسے مہبط وحی اور منبع رسالت ہونے کا شرف حاصل ہے، یہی وہ مقدس شہر ہے جہاں قیامت تک کے لیے سارے جہاں کے جملہ اہل ایمان کا قبلہ وکعبہ اور رحمت الٰہی کا سرچشمہ موجود ہے، جہاں دنیا بھر سے لوگ حج وعمرہ کے لیے پروانہ وار عشق ووارفتگی سے کھینچے چلے آتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ ایسا پرکشش شہر ہے جو دلوں کو مقناطیس کی طرح کھینچتا ہے، یہ ایسا چشمۂ شیریں ہے جس سے اگر ظاہری سیرابی ہوتی بھی ہے تو دل ہرگز نہیں بھرتا، جتنی اس کی زیارت کی جائے اتنا ہی شوق بڑھتا جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ مقدس شہر سارے عالم کے مسلمانوں کے دل کی دھڑکن اور ان کی عقیدت ومحبت کا محور ہے اور رہے گا، روئے زمین پر اس سے افضل اور کوئی شہر نہیں، اس کی عظمت وفضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے فتح مکہ کے موقع پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا تھا: ”وَاللّٰہِ إِنَّكِ لَخَیْرُ أَرْضِ اللّٰہِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰہِ إِلیٰ اللّٰہِ“ رب العالمین کی جلالت کی قسم ہے! تو اللہ تعالیٰ کی زمین میں سب سے بہتر بھی ہے اور اللہ رب العزت کی نگاہ میں سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ حدیث مذکور کی اس صراحت کی وجہ سے جمہور علماءِ امت (حضرت امام مالکؒ کے علاوہ تمام) کے نزدیک مکہ مکرمہ مدینۃ الرسول ﷺ سے بھی افضل وبہتر ہے۔ البتہ مدینہ طیبہ میں روضۂ رسول ﷺ والا حصہ (جو آپ ﷺ کے جسد اطہر اور اعضاء شریفہ سے ملا ہوا ہے) بالا جماع تمام روئے زمین حتیٰ کہ خانۂ کعبہ اور عرشِ معلیٰ سے بھی افضل ہے۔ فافہم۔

مکہ مکرمہ وہ مبارک شہر ہے جہاں کعبۃ اللہ کی وجہ سے دن رات ربِ کریم کی عنایتوں اور رحمتوں کی موسلا دھار بارش برستی رہتی ہے اور جنت کے آٹھوں دروازے اس کی طرف ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور قیامت تک کھلے رہیں گے۔

اس دیس میں ہے اللہ کا گھر ☆ وہ پیارے نبی کا پیارا نگر
ہر شئے ہے جہاں فردوسِ نظر ☆ انوار کی بارش آٹھ پہر

چناں چہ مسند امام احمد بن حنبلؒ کی ایک روایت میں ہے:

"مَا عَلىٰ وَجْهِ الْأَرْضِ بَلْدَةٌ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ كُلُّهَا مَفْتُوحَةٌ إِلَيْهَا إِلَّا مَكَّةَ"۔(فضائل مكه والسكن فيها/ص:٢٤ للحسن البصریؒ)

"کائنات میں مکہ مکرمہ کے سوا کوئی شہر ایسا نہیں جس کی طرف جنت کے سارے دروازے کھلے رہتے ہوں۔" لہٰذا عاجز کا خیالِ ناقص تو یہی ہے کہ جس خوش نصیب کو دنیا میں ادب واحترام کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخلہ کا موقع مل گیا وہ عقبیٰ میں دخولِ جنت سے قطعاً محروم نہیں رہ سکتا۔

ہمارے علماء نے مکہ مکرمہ میں داخلہ کے آداب میں یہ بھی فرمایا کہ جس وقت مکہ مکرمہ دور سے نظر آئے تو یہ دعا پڑھ لیں:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِيْ بِهَا قَرَارًا وَارْزُقْنِيْ فِيْهَا رِزْقًا حَلَالًا، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْهَا، اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا جَنَاهَا، وَحَبِّبْنَا إِلٰى أَهْلِهَا، وَحَبِّبْ صَالِحِيْ أَهْلِهَا إِلَيْنَا".
(از: حج وعمرہ فلاحؔی کے ہمراہ/ص:۹۱)

الٰہ العالمین! میرے لیے مکہ مکرمہ ٹھکانہ بنا دے اور اس میں مجھے حلال روزی عطا فرمادے، اے ہمارے رب! ہمیں مکہ مکرمہ میں برکت عطا فرما، پروردگارِ عالم! اس شہر مقدس کے میوے ہمیں نصیب فرما، بارِ الٰہا! ہمیں اہل مکہ کی نظروں میں اور اہل مکہ کو ہماری نظروں میں محبوب بنا دے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق منقول ہے کہ آپ جب بھی مکہ مکرمہ میں آتے تو دن میں داخل ہوتے اور فرماتے:

”إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ“. (متفق عليه، مشكوٰة /ص: ٢٢٦/ باب دخول مكة والطواف / الفصل الأول)

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس طرح کرتے تھے۔ اسی سے علماء نے فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں رات کو داخل ہونا بھی جائز تو ہے، مگر دن میں داخل ہونا افضل ہے، تاکہ شہر میں داخل ہوتے ہی بیت اللہ یا شہر مکہ صاف نظر آئے۔

مسجد حرام کی فضیلت:

مکہ مکرمہ کو حق تعالیٰ نے کعبۂ معظّمہ اور مسجد حرام کی نسبت سے جو خاص شرف بخشا ہے اس کا لازمی تقاضا یہی ہے کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے بعد (ضروری امور اور ضروریات سے فارغ ہوکر فوراً ہی) مسجد حرام نہایت ہی خشوع خضوع کے ساتھ دربارِ الٰہی کی عظمت وجلالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور نیچی نظر رکھ کر تلبیہ پڑھتے ہوئے باب السلام (گیٹ نمبر: ۲۴/ جو صفا مروہ کے مابین ہے) سے اور اگر عمرہ کا احرام ہو تو باب العمرہ سے (عمرۃ القضاء کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ اس گیٹ سے داخل ہوئے تھے اس لیے اس کا نام باب العمرۃ ہے، جس کا گیٹ نمبر: ۶۱/ ہے) یا بھیڑ زیادہ ہو اور سہولت نہ ہو تو جس دروازے سے چاہے مسنون طریقہ سے مسجد حرام میں حاضری کا فوری طور پر اہتمام کریں، یاد رکھیے! جب مسجد حرام کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد بیت اللہ شریف کی مسجد ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ کعبۃ اللہ کے اردگرد مطاف کی جگہ اور وہ ساری توسیعات مراد ہوتی ہیں جو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد سے شاہ فہد مرحوم کے زمانہ تک مختلف تاریخی ادوار میں ہوئیں اور ہوں گی، نیز مسجد حرام کا وہ صحن جو مسجد کے اردگرد نماز کے لیے تیار کیا گیا وہ بھی شامل ہے، یہ مسجد حرام دنیا کی تمام مساجد میں سب سے افضل ہے، قرآنِ کریم میں اس کا تذکرہ ہے:

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ (بنی إسرائیل : ۱)

اور حدیث شریف میں ہے کہ ''مسجد حرام کی ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہے''۔(ابن ماجہ/ص:۱۰۲)

اور جماعت سے نماز ادا کرنے پر ستائیس گنا اجر بڑھ جاتا ہے، اس لحاظ سے مسجد حرام میں جماعت سے ادا کی ہوئی ایک نماز ستائیس لاکھ نمازوں کے برابر اور پانچ نمازیں ایک کروڑ پینتیس لاکھ نمازوں کے برابر ہو جاتی ہیں، سال کے اگر تین سو ساٹھ دن بھی مانے جائیں تو سال بھر کی ایک ہزار آٹھ سو اور سو برس کی ایک لاکھ اسی ہزار اور ہزار برس کی اٹھارہ لاکھ نمازیں ہوتی ہیں، اب اگر کسی کو حضرت نوح علیہ السلام کے برابر بھی عمر ملے تو مسجد حرام کی ایک نمازِ با جماعت اس کی تمام عمر کی نمازوں سے افضل ہوگی۔(حج و عمرہ فلاحی کے ہمراہ/ص: ۱۴۴)

لیکن ہمارے علماءِ محققین نے اس حدیث کے تحت فرمایا کہ ''اجر و ثواب کی زیادتی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسجد حرام میں ایک نماز کی ادائیگی ایک سے زائد نمازوں کے قائم مقام بن سکتی ہے، نہیں، بلکہ اس سے مراد اجر و ثواب کی زیادتی ہے، تعداد کی نہیں، لہٰذا اب اگر کسی کے ذمہ دو نمازوں کی قضا تھی اور اس نے ایک نماز کی قضا مسجد حرام میں کی، تو یہ ایک ہی نماز کی ادائیگی ہوئی، دوسری کی قضا باقی رہے گی۔ (ایضا) نیز اجر و ثواب کی یہ زیادتی فرائض کے ساتھ مخصوص ہے، نوافل گھر ہی پر افضل ہیں، البتہ شوافع کے نزدیک یہ افضلیت نوافل کو بھی شامل ہے، اگرچہ نوافل کا گھر میں ادا کرنا ان کے نزدیک بھی اتباعِ سنت کی وجہ سے افضل ہے۔ اسی طرح یہ فضیلت مردوں کے لیے ہے، عورتوں کے لیے گھر اور ہوٹل وغیرہ میں نماز پڑھنا افضل ہے؛ کیوں کہ جب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جماعت میں شرکت کی ایک خاتون نے اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اسے گھر میں نماز پڑھنے کو فرمایا۔'' فتح القدیر میں اس کی تحقیق و تفصیل ہے۔(از: عمدۃ الفقہ: ۲۸۱/۵)

علاوہ ازیں مسجد حرام کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ اس میں کعبۃ اللہ ہے، جو

فیوض وبرکات اور اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا منبع اور ہمارا قبلہ وکعبہ اور سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔

کعبۃ اللہ کی تعمیر:

''کعبہ'' کے اصل معنیٰ بلندی کے ہیں، چوں کہ کعبۃ اللہ (ظاہری طور پر) زمین سے بھی (۱۴/ میٹر) بلند ہے اور حرمت وفضیلت کے اعتبار سے (معنوی طور پر) بھی بہت ہی بلند ہے اس لیے اسے کعبہ کہتے ہیں۔ رب العالمین نے فرمایا:

﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِلنَّاسِ﴾ (المائدۃ : ۹۷)

''حق تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ حرمت والا گھر ہے لوگوں کے لیے قیام کا ذریعہ بنایا۔''

اس کی حرمت وعظمت کا اندازہ اس کی تعمیر کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ چناں چہ تاریخی روایات ومراجع سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف ادوار میں کعبۃ اللہ کی تعمیر وترمیم بارہ مرتبہ ہوئی، اگر چہ اس سلسلہ میں بعض روایات پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا، تاہم اہل تاریخ نے تعمیر کنندگان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) پہلی تعمیر: (تو حق تعالیٰ نے اپنے امر کن سے فرمائی۔ البتہ اس کی مخلوق میں سب سے پہلے یعنی) تخلیق آدم سے بھی دو ہزار سال پہلے حضرات ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کعبۃ اللہ کی تعمیر فرمائی۔

(۲) پھر انسانوں میں بیت اللہ کے معمارِ اوّل سیدنا آدم علیہ السلام ہیں، ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ﴾ (آل عمران : ۹۶)

یقیناً سب سے پہلا مکان جو لوگوں کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا وہ یہی مکان ہے جو مکہ میں ہے۔ اس آیت کے تحت علامہ قرطبیؒ نے فرمایا کہ ''بیت اللہ کی تعمیر نوعِ انسانی

کے پہلے فرد حضرت آدم علیہ السلام نے کی‘‘۔(ذکر حرمین/ص:۱۶)

(۳) اس کے بعد حضرت شیث علیہ السلام کی تعمیر بتلائی جاتی ہے۔

(۴) پھر چوں کہ طوفانِ نوح کی طغیانی نے کعبۃ اللہ کو بھی متاثر کیا تھا اس لیے حق تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو کعبۃ اللہ کے بنیادی آثار ونشانات بتلا کراز سرنو اس کی تعمیر کا حکم فرمایا، جس کی وجہ سے آپ نے اپنے جوان بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر بیت اللہ کی تعمیر فرمائی، جس کا ذکر قرآنِ کریم میں بہت شاندار انداز میں کیا گیا۔

﴿ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْـرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ إِسْمٰعِيْلُ ط رَبَّـنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ (البقرة : ۱۲۷)

اور جب ابراہیم واسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، اس وقت ان کے ہاتھ بیت اللہ کی تعمیر میں مشغول تھے تو دل ذکر اللہ میں، عرض کیا: ’’رَبَّـنَـا تَـقَبَّلْ مِنَّا‘‘......الخ اے ہمارے رب! ہماری یہ خدمت قبول فرما، بے شک تو ہی ہے سب کچھ سننے اور جاننے والا۔ کہتے ہیں کہ آپ نے بیت اللہ کے دو دروازے رکھے جو زمین سے ملے ہوئے تھے اور چھت تعمیر نہیں کی تھی۔(از: مکہ مکرمہ ماضی وحال کے آئینہ میں/ص:۴۷)

(۵) جب تعمیر ابراہیمی قدامت (یا آگ لگنے یا سیلاب آنے) کی وجہ سے منہدم ہوگئی تو حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے عرب کے دو مشہور قبیلے جن میں ایک عمالقہ ہے، اس نے تعمیر کیا۔

(۶) پھر قبیلۂ جرہم نے تعمیر کیا، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان: ۳/ ۴۳۷ میں اس بارے میں ایک لمبی حدیث نقل فرمائی ہے۔(انوار مناسک/ص:۱۱۰)

(۷) ساتویں دفعہ اس کی تعمیر کا شرف حضور اکرم ﷺ کے جد اعلیٰ قصي بن کلاب کو حاصل ہوا۔

(۸) رحمت عالم ﷺ کی نبوت سے تقریباً پانچ سال قبل قریش مکہ نے اپنی خالص حلال کمائی سے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی، جس میں رحمت عالم ﷺ بھی بنفس نفیس شریک تھے، اور حجر اسود کو اپنی جگہ رکھنے کا شرف بھی درحقیقت آپ ﷺ ہی کو حاصل ہوا تھا۔ (صحیح بخاری/ کتاب الحج/ حدیث نمبر :۱۵۸۲/ میں مذکور ہے) اس تعمیر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں رحمت عالم ﷺ بذاتِ خود شریک رہے اور پتھر اٹھا اٹھا کر لائے، علاوہ ازیں قریش نے اپنی اس تعمیر میں تعمیر ابراہیمی کے مقابلہ میں متعدد تبدیلیاں بھی کیں۔ مثلاً:

☆ حطیم کا حصہ جو کعبۃ اللہ میں شامل تھا اس کو حلال مال ختم ہو جانے کی وجہ سے ویسے ہی چھوڑ دیا، گویا یہ کعبۃ اللہ کی تعمیر کو ناجائز اور مالِ حرام سے محفوظ رکھنے کا ایک خدائی نظام تھا۔

☆ اس تعمیر سے قبل بیت اللہ شریف کی چھت نہیں تھی، قریش نے چھت کا اضافہ کر دیا؛ کیوں کہ بعض لوگوں نے اس پاکیزہ اور مقدس گھر میں رکھے ہوئے خزانے چرا لیے تھے۔

☆ اس چھت میں ایک لکڑی کا پرنالہ بھی لگایا جو حطیم کی جانب گرتا ہے، تاکہ بارش (یا کعبۃ اللہ کی دھلائی کا) پانی نکل جائے، اسے عرفِ عام میں ''میزابِ رحمت'' کہتے ہیں۔ اس وقت (۱۴۱۷ھ) سے شاہ فہد مرحوم نے جو پرنالہ لگوایا وہ خالص سونے کا ہے، جس کی لمبائی تقریباً دو میٹر ہے، اس پرنالہ کی دونوں جانب منڈیر پر نوکدار میخیں گاڑ دی گئی ہیں، تاکہ پرندے اس پر بیٹھ نہ سکیں، بعض لوگوں سے منقول ہے کہ اس کے نیچے دعا قبول ہوتی ہے۔ بقولِ شاعر:

نگاہیں شوق کی پڑنے لگیں میزابِ رحمت پر
بدوش برق اٹھا ابر کرم تابیدہ تابیدہ

☆ بیت اللہ شریف کے مغربی دروازے کو بند کرکے اس کے مشرقی دروازے کو زمین سے کافی بلند کردیا گیا، تاکہ ہرکس وناکس داخل نہ ہوسکے، اور داخلہ کے لیے زینہ استعمال کرنا پڑے، اور جس کو ہماری طرف سے اجازت ہو وہی دخول کا مجاز ہوسکے، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق رحمت عالم ﷺ کی خواہش یہ تھی کہ بیت اللہ شریف کو از سرِ نو بناءِ ابراہیمی پر تعمیر کیا جائے، مگر آپ ﷺ کے زمانہ میں اس کی نوبت نہ آسکی۔

(۹) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما جب ۶۴ھ مطابق ۶۸۳ء میں خلیفہ بنے تو یزید بن معاویہ (علیہ ما علیہ) نے ان کے خلاف فوج کشی کی، شامی فوجیوں نے جبل ابوقبیس پر منجنیق نصب کرکے شب وروز بیت اللہ شریف پر سنگباری شروع کردی، آگ کے دہکتے ہوئے شعلے برسائے، جس کی تباہ کاریوں کی زد میں اللہ تعالیٰ کا مقدس گھر بھی آگیا، دیواریں کمزور ہوگئیں، اور بیت اللہ شریف کا پردہ بھی جل کر خاکستر ہوگیا، اسی اثنا میں محاصرہ کے سترہ دن بعد یزید کا انتقال ہوگیا تو لڑائی ختم ہوگئی، اور یزیدی لشکر ناکام واپس ہوگیا، دوبارہ مکہ مکرمہ کی امارت سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ بدستور باقی رہی، تب آپ نے ۶۵ھ میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے تعمیر ابراہیمی کے مطابق از سرِنو بیت اللہ شریف کی تعمیر فرمائی، جس میں حطیم کے حصہ کو بیت اللہ شریف میں شامل کیا اور بسہولت داخلہ ہوسکے اس کے لیے بابِ کعبہ کو نیچا کردیا، نیز اس کے مقابل میں ایک اور دروازہ بھی بنادیا گیا تاکہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوکر دوسرے سے باہر نکل سکیں، اس تعمیر کی تکمیل پر آپ نے ایک شاندار دعوت کا اہتمام فرمایا جس میں سو اونٹ ذبح کیے گئے۔

(۱۰) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد ۷۲ھ میں جو عبدالملک بن مروان کا دورِ حکومت تھا، حجاج بن یوسف ثقفی نے اموی حکمران عبدالملک بن

مروان کو ورغلایا کہ ابن زبیر نے کعبہ کی تعمیر میں ترمیم وتغیر کیا ہے، اب کعبہ کی وہ تعمیر نہیں رہی جو عہد نبوی میں تھی، اس پر عبدالملک بن مروان نے حکم دیا کہ اس کی موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے سابقہ حالت پر بیت اللہ شریف کی تعمیر کر دی جائے، حکم پاتے ہی حجاج نے تعمیر قریش کے مطابق ۷۴ھ میں بیت اللہ شریف کو تعمیر کیا، بعد میں جب عبدالملک بن مروان کو معلوم ہوا کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے جو تعمیر فرمائی تھی وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش پر تھی تو سخت نادم ہوا، کہنے لگا: اگر مجھے یہ بات پہلے سے معلوم ہوتی تو میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی تعمیر کے انہدام کا ہرگز حکم نہ دیتا۔ (مسلم/کتاب الحج) حجاج کے بعد عباسی خلفاء میں سے کسی نے امام مالکؒ سے پوچھا بھی کہ ’’اگر کعبہ کو گرا کر پھر اسی طرح تعمیر کر دیا جائے جس طرح حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے کیا تھا تو کیا حرج ہے؟‘‘ امام مالکؒ نے فرمایا: ’’امیر المؤمنین! آپ کو اللہ کا واسطہ! بیت اللہ شریف کو بادشاہوں کا کھلونا نہ بنائیں کہ ایک آئے تو وہ اپنی مرضی کے مطابق بنائے، پھر دوسرا آئے تو پہلی تعمیر منہدم کر کے اپنے طور پر بنائے، اس طرح اس گھر کی عظمت وہیبت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہے گی‘‘۔ (تاریخ مکہ/ص:۵۱)

الغرض! حجاج کی تعمیر ایک طویل عرصہ (تقریباً نوسو اڑسٹھ (۹۶۸) سال) تک برقرار رہی، البتہ بقدرِ ضرورت مرمت ہوتی رہی۔

(۱۱) اس کے بعد ۱۹/ شعبان ۱۰۳۹ھ مطابق: ۱۶۳۰ء کو مکہ مکرمہ میں موسلا دھار بارش ہوئی، جس سے بیت اللہ شریف کی کچھ دیواریں منہدم ہوگئیں، یہ زمانہ خلافت عثمانیہ ترکی کا تھا، اور سلطان مراد عثمانی ترکی خلیفۃ المسلمین ہوتے تھے، موصوف نے منہدم شدہ حصوں کی تجدید کرائی، جو ۲/ ذی الحجہ/ ۱۰۴۰ھ کو مکمل ہوئی۔

(۱۲) سلطان مراد عثمانی ترکی نے بیت اللہ شریف کی ترمیم کا جو کام کرایا تھا اس کو ۳۷۵/ سال کی طویل مدت گذر چکی تھی، جس کی تجدید ضروری سمجھی گئی، اس لیے خادم حرمین

شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز مرحوم نے ۱۴۱۷ھ میں پھر بیت اللہ شریف کی ترمیم کا کام شروع فرمایا، جو چھ ماہ میں مکمل ہوا، جس میں بنیادوں کو مضبوط کیا گیا، شاذروان (کعبہ شریف کی دیوار کے نچلے حصہ میں ابھرا ہوا منڈیر نما حصہ) کی تجدید کی گئی، دیواروں کی بیرونی جانب کو ہموار کیا گیا، پتھروں کے درمیان سے پرانا مسالہ نکال کر نیا سمنٹ مسالہ لگایا گیا، دونوں چھتوں کو از سر نو تعمیر کیا گیا، اندر کے تینوں ستونوں کو نئی لکڑی سے بنایا گیا، اس کام کا شرف بن لادن کمپنی کو حاصل ہوا۔ (از تاریخ مکہ مکرمہ/ص:۴۳)

اللہ اللہ! تعمیر کعبہ کی اس طویل ترین تاریخ میں کیسے کیسے انقلابات خالق کائنات نے دکھلائے اور دنیا والوں نے دیکھے، کتنی کتنی بلندیاں پست ہوئیں اور پستیاں بلند ہوئیں، خدا معلوم کون کونسی بستیاں ابھر کر مٹیں اور کتنے ہی شہر بڑھے اور بڑھ کر گھٹے مٹے، پر عرب کے ریگستان میں خاک اور ریت کے سمندر میں چٹانوں اور پہاڑوں کے بیچ میں وادیوں اور گھاٹیوں کے درمیان یہ سیاہ چوکور عمارت جسے کعبۃ اللہ کہا جاتا ہے آج بھی جوں کا توں اپنی پوری شان کے ساتھ کھڑا ہے، یہ دین حنیف اور توحید خالص کا زندہ و جاوید معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے بعد بیت اللہ شریف کے اندر بھی نظر بصیرت ڈال کر اس کی ظاہری و باطنی عظمتوں کا اندازہ لگائیے۔

جلالت خانۂ کعبہ کی اور یہ نور کا عالم
نگاہیں پڑ رہی ہیں دم بدم ترسیدہ ترسیدہ

بیت اللہ شریف کے اندر:

(۱) بیت اللہ شریف کے اندر کا فرش اس وقت سنگ مرمر سے بنا ہے، جس کے اردگرد کالے پتھر کی دھاریاں ہیں۔

(۲) بیت اللہ شریف کے اندر وسط میں لکڑی کے تین ستون ہیں، جن پر چھت کا سہارا ہے، ہر ستون کا درمیانی فاصلہ ۲/۳۵ میٹر ہے۔

(۳) بیت اللہ شریف کے اندر دروازے کے بالکل سامنے کی دیوار پر گہرے رنگ کا ٹائیٹل ہے، جو اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پر نماز ادا فرمائی تھی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کے اندر تشریف لے جاتے تو دروازہ سے سیدھے آگے کی جانب اتنا چلتے کہ سامنے والی دیوار تقریباً تین ہاتھ (ڈیڑھ میٹر) رہ جاتی، پھر دروازہ کی طرف پشت اور سامنے والی دیوار کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرماتے، تاکہ اسی جگہ پر نماز پڑھیں جہاں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی، جیسا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان کو بتایا تھا، ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ ''اگر کسی خوش نصیب کو بیت اللہ کے اندر داخلہ کا پرمسرت موقع مل جائے تو مستحب یہ ہے کہ پہلے غسل کرے، پھر اگر محرم نہ ہو تو عمدہ خوشبو لگائے، اس کے بعد درِ کعبہ پر پہنچ کر اس کے آستانہ کو بوسہ دے، ننگے پیر داخل ہو، پہلے دایاں پاؤں داخل کرے، نگاہیں نیچی رکھے اور جس جگہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی تھی وہاں نماز ادا کرے، ویسے بیت اللہ شریف کے اندر کسی بھی جگہ نماز ادا کی جاسکتی ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے نماز پر ادا کرنا افضل ہے، نیز فقہاءِ احناف وشوافع کے یہاں بیت اللہ شریف کے اندر مطلقاً نماز افضل ہے، خواہ فرض ہو یا نفل، اور تنہا ہو یا جماعت کے ساتھ۔ (عمدۃ ص:۲۸۴ ومعلم الحجاج/ص:۱۲۲) نماز کے بعد خوب گڑگڑا کر دعا کرے۔

(۴) بیت اللہ شریف کے اندر ایک بڑا صندوق بھی ہے، جس میں بیت اللہ شریف سے متعلق بعض اہم چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ (مکہ مکرمہ ماضی وحال کے آئینہ میں/ص:۶۱)

(۵) بیت اللہ شریف کے اندر داخل ہونے والے کی داہنی سمت میں ایلومنیم کی گول سیڑھیاں بنادی گئی ہیں جن کی تعداد پچاس ہے۔ (تاریخ مکہ مکرمہ/ص:۵۸)

(۶) بیت اللہ شریف کے اوپر والے حصہ میں اب دو چھتیں ہیں، ایک اوپر اور دوسری اس کے نیچے، چھت میں ایک سوراخ ہے، اس پر شیشہ کا ایک مضبوط ڈھکنا ہے، جہاں

سے بیت اللہ شریف کے اندر طبعی روشنی آتی ہے، جب سال میں دو مرتبہ بیت اللہ شریف غسل کے لیے کھولا جاتا ہے یا غلافِ کعبہ بدلا جاتا ہے تو یہ ڈھکنا اٹھا دیا جاتا ہے، اور بیت اللہ شریف کی اندرونی سیڑھیوں سے چڑھ کر اس سوراخ سے گذر کر چھت پر آمد ورفت ہوتی ہے۔ (تاریخ مکہ مکرمہ/ص:۵۸)

بیت اللہ شریف کی چھت پر نماز پڑھنا احناف کے نزدیک خلافِ ادب ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔ (قاموس الفقہ :۴/ ۵۵۹)

بابِ کعبہ:

(۷) بابِ کعبہ کا بنیادی ڈھانچہ تو لکڑی کا ہے، مگر اس وقت اس پر خالص سونے کی تختیاں جڑ دی گئی ہیں اور عمدہ قسم کے نقش ونگار کے ساتھ اس مقام کی عظمت کے پیش نظر مختلف آیاتِ قرآنیہ لکھی گئی ہیں، چناں چہ دروازے کے دونوں طرف اوپر کی جانب ''اللہ جل جلالہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' اور درج ذیل آیاتِ مبارکہ لکھی گئی ہیں:

(۱) بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم ﴿اُدۡخُلُوۡھَا بِسَلَامٍ اٰمِنِیۡنَ﴾ شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن ورحیم ہے، امن وسلامتی کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ۔

(۲) ﴿جَعَلَ اللّٰہُ الۡکَعۡبَةَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ قِیٰمًا لِلنَّاسِ وَالشَّھۡرَ الۡحَرَامَ﴾ (المائدة : ۹۷) اللہ جل شانہ نے عزت والے گھر کعبہ کو اور حرمت والے مہینے کو لوگوں کے لیے موجب امن قرار دیا۔

(۳) ﴿وَقُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا﴾ (إسرائيل: ۸۰) اور آپ کہیے کہ اے پروردگار! مجھے اچھی طرح داخل کیجئے اور اچھی طرح نکالیے اور اپنے پاس سے مجھے زور وقوت عطا فرمائیے۔

(۴) ﴿کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ﴾ (الأنعام : ۴۳) تمہارے

رب نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔

(۵) ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المؤمن: ٦٠) اور تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھ ہی سے دعا مانگو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا، اس کے نیچے ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ“ لکھا ہے۔

(٦) ﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (الزمر:٥٣)

اے پیغمبر! (لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ علاوہ ازیں دونوں دروازوں کے کنڈوں پر ”اللّٰه أكبر“ لکھا ہے اور تالے کے نیچے سورۂ فاتحہ درج ہے، اس کے نیچے لکھی ہوئی عبارت کا ترجمہ یہ ہے: ”سابقہ دروازہ خادم حرمین شریفین شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعودؒ نے ۱۳۶۳ھ میں بنوایا، اس کے نیچے لکھی ہوئی عبارت کا ترجمہ یہ ہے: ”یہ دروازہ خادمِ حرمین شریفین شاہ خالد بن عبدالعزیزؒ آل سعودؒ نے ۱۳۹۹ھ میں بنوایا، دروازہ کے کناروں پر اللہ تعالیٰ کے پندرہ مبارک نام تحریر ہیں، جو بالترتیب یہ ہیں: (۱) یا واسع (۲) یا مانع (۳) یا نافع دائیں کنارے پر (۴) یا عالم (۵) یا علیم (٦) یا حلیم (۷) یا عظیم (۸) یا حکیم (۹) یا رحیم بائیں کنارے پر (۱۰) یا غنی (۱۱) یا مغنی (۱۲) یا حمید (۱۳) یا مجید (۱۴) یا سبحان (۱۵) یا مستعان۔ (تاریخ مکہ مکرمہ/ص:٦۰)

کلید کعبہ:

”سدانة“ اور ”حجابة“ کعبہ شریف کی خدمت کے دو عنوان ہیں، اس کے ضمن میں دروازہ کا کھولنا، بند کرنا، کلید کعبہ کی حفاظت اور غلافِ کعبہ وغیرہ آتے ہیں، کعبۃ اللہ کی چابی اولاً سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے پاس رہی، پھر آپ کے بیٹے ثابت اور ان کی اولاد کے قبضہ میں رہی، اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سسرالی رشتہ دار قبیلۂ جرہم کے

پاس منتقل ہوگئی، پھر قبیلۂ خزاعہ سے ہوتے ہوئے یہ عظیم شرف قصی بن کلاب کو نصیب ہوا، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چوتھے دادا تھے، ان سے منتقل ہوکر یہ چابی حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئی، پھر ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الٰہی کلید کعبہ حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرما کر سپرد کی کہ ''یہ چابی لو! اے طلحہ کی اولاد! اب یہ تمہاری نسل میں ہمیشہ رہے گی، اس کو تم سے کوئی نہ لے سکے گا سوائے کسی ظالم کے۔'' (مجمع الزوائد: ۳/ ۲۸۵)

حدیث مذکور سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ خاندان نہ صرف یہ کہ قیامت تک باقی رہے گا بلکہ کلید کعبہ برداری کا یہ عظیم شرف بھی نسل در نسل اسی خاندان میں منتقل ہوتا رہے گا، حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کلید کعبہ ان کے چچازاد بھائی شیبہ کو ملی، اور پھر شیبہ کی نسل میں ہی یہ مبارک وراثت منتقل ہوتی رہی، شیبہ کی اولاد آج تک شیبی نسبت سے متعارف ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ دیکھئے کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود آج بھی کلید کعبہ اس خاندان کے پاس ہے، آج کل اس چابی کی لمبائی چالیس سینٹی میٹر ہے، جو ایک ریشم کے تھیلے میں محفوظ ہے، جس پر خالص سونے کا کام کیا ہوا ہے، اور آیت کریمہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا﴾ (النسآء: ۵۸) مرقوم ہے، یہ مقدس چابی جس تھیلے میں رکھی جاتی ہے وہ تھیلہ بھی اسی کارخانہ میں تیار ہوتا ہے جس میں غلافِ کعبہ تیار ہوتا ہے اور اس تھیلہ کو ہر سال بدلا جاتا ہے۔ (تاریخ مکہ مکرمہ/ص: ۶۱)

غلافِ کعبہ:

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے سب سے پہلے کعبۃ اللہ کو غلاف پہنایا، جب کہ بعض تاریخی روایات میں ہے کہ یمن کے حکمران اسعد حمیری تبع سے اس کا آغاز ہوا، اسلامی دور میں خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یمنی کپڑے سے تیار شدہ غلاف سے کعبہ کو مزین فرمایا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء وامراء نے بھی اس کا برابر اہتمام کیا، معمول یہ تھا کہ نیا غلاف

پرانے کے اوپر ہی چڑھا دیا جاتا تھا، خلیفہ مہدی عباسی نے جب ۱۶۰ھ میں حج کیا تو کعبہ کے محافظوں کو اس امر سے آگاہ کیا کہ آئندہ سے کعبہ شریف پر صرف ایک ہی غلاف رہنا چاہیے، اس کے بعد سے آج تک یہی عادت چلی آرہی ہے، ہر سال ذی الحجہ کی نو تاریخ کو غلافِ کعبہ تبدیل کیا جاتا ہے۔ (از مکہ مکرمہ ماضی وحال کے آئینہ میں/ص:۵۹)

عصر حاضر میں جس غلاف سے خانۂ کعبہ کو مزین کیا جاتا ہے وہ عمدہ قسم کے خالص ریشم سے تیار کیا جاتا ہے، گہرا سیاہ رنگ دے کر اس کو مزید پرکشش کیا جاتا ہے، اس غلاف پر نہایت عمدہ خط سے مختلف عبارتیں اور قرآنی آیات کی کشیدہ کاری کی گئی ہے، جن میں اس دربارِ عالی پر آنے والے ہر فرد بشر کے لیے پیغامِ رحمت ہے، گویا بزبانِ حال زائرین حرمِ کعبہ کو یہ یاد دہانی کرائی جارہی ہے کہ وہ جس کے در پر نیاز مندی کے جذبات لے کر حاضر ہوئے ہیں وہ بڑا ہی رحیم وکریم ہے، اس کے در پر آنے والا محروم نہیں رہ سکتا، خصوصاً جب کوئی اسی سے وابستہ ہوکر توحید ربانی پر مستقیم ہو جاتا ہے تو پھر خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ اس موحد کے دامن کو اپنی رحمتوں، عنایتوں، بخششوں اور نوازشوں سے بھر دیتا ہے۔

زیارتِ بیت اللہ کی دعا:

اسی لیے حکم ہے کہ جب زیارتِ بیت اللہ کا موقع نصیب ہو تو پہلی نظر میں ہی نعرۂ توحید بلند کرتے ہوئے کہیں: ”اللّٰہُ أکبر لا إلٰہ إلَّا اللّٰہُ“ یا تکبیر تشریق کہیں: ”اللّٰہُ أکبرُ اللّٰہُ أکبر، لا إلٰہَ إلَّا اللّٰہُ واللّٰہُ أکبر، اللّٰہُ أکبرُ وللّٰہِ الحمدُ“. اور یاد ہو تو یہ دعا بھی پڑھیں:

”اَللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ، فَحَيِّنَا ربَّنا بِالسَّلَامِ، اَللّٰهُمَّ زِدْ بَيْتَكَ هٰذَا تَعْظِيْمًا وَّتَشْرِيْفًا وَّتَكْرِيْمًا وَّمَهَابَةً، وَزِدْ مَنْ حَجَّهٗ أَوِ اعْتَمَرَهٗ تَشْرِيْفًا وَتَكْرِيْمًا وَّتَعْظِيْمًا وَّ بِرًّا“. (قاضی خان: ۱/ ۳۱۵، از: انوار مناسك/ص: ٦٢٤)

اے اللہ! آپ سلام ہیں اور آپ ہی کی طرف سے سلامتی ہے، اے ہمارے رب!

سلامتی کے ساتھ ہمیں زندہ رکھئے، اے اللہ! اس گھر کی تعظیم وتکریم اور شرف وہیبت زیادہ کیجئے، اور جو شخص بھی اس کا حج وعمرہ کرے اس کی شرافت کرامت اور عظمت واجر میں اضافہ فرمادیجئے۔

حضور ﷺ سے زیارتِ بیت اللہ کے موقع پر ایک اور بھی دعا منقول ہے:

”أَعُوْذُ بِرَبِّ الْبَيْتِ مِنَ الدَّيْنِ وَالْفَقْرِ وَمِنْ ضِيْقِ الصَّدْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ“.

یعنی اے رب البیت! آپ مجھے قرض، فقر اور تنگدلی وعذابِ قبر سے محفوظ فرما لیجئے! یہ دعا بھی مستحب ہے۔ (حج وعمرہ فلاحؔی کے ہمراہ/ص:۹۸)

اس کے بعد بیت اللہ شریف پر نظریں جما کر دل کھول کر دامن پھیلا کر اور سراپا عجز ونیاز بن کر اس یقین کے ساتھ دین، دنیا وعقبیٰ کی ساری خیر وخوبیوں کی دعا کریں کہ سمیع الدعاء حاجت روا ومشکل کشا اور داتا رب البیت کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، یہ دعا کی قبولیت کا موقع ہے، اس وقت اگر سہولت ہو تو کھڑے ہو کر دعا کرنا مستحب ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۵/۴۱)

اس عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس موقع پر یہ دعا ضرور کریں کہ ربِ کعبہ! آپ ہمیں اپنے کرم سے مستجاب الدعوات بنا دیجئے، پھر دارین میں اپنی رضائے کامل عطا فرما کر بلا حساب وکتاب جنت میں داخل فرما دیجئے، اور اس دعا کو ہمارے اہل وعیال، والدین، اقربا، محسنین اور جمیع مرحومین کے حق میں ہمارے استحقاق کے بغیر محض اپنے فضل سے قبول فرمالیجئے۔

حجر اسود کی حقیقت وفضیلت:

دعا سے فارغ ہو کر اگر موقع ہو (مطلب یہ ہے کہ فرض نماز کے قضا ہو جانے یا مستحب وقت کے نکل جانے یا جماعت کے فوت ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو) تو طواف کریں، جو کعبۃ اللہ کی سب سے اہم عبادت اور مسجد حرام کا تحیہ وحق ہے۔ چوں کہ طواف کی ابتداء حجر

اسود کے استلام سے ہوکر اسی پر اس کی انتہاء ہوتی ہے، اس لیے ''حجر اسود'' سے متعلق مفید معلومات حاصل کرلیں، ''حجر اسود'' درحقیقت جنتی پتھر ہے، جس کو سیدالملائکہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے بحکم الٰہی جنت سے لاکر سیدنا ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو پیش فرمایا، تاکہ وہ کعبۃ اللہ کے کونہ میں اسے لگا دیں، آپ علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کے مشرقی رکن (بابِ کعبہ کی بائیں جانب کے کنارے) پر اسے نصب فرمایا، اس کی بلندی مطاف (فرش) سے ۱٫۱۰ میٹر ہے۔ (تقریباً چار فٹ) حدیث میں ہے:

''عَنِ ابنِ عباسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: '' نَزَلَ الْحَجَرُ الْأَسْوَدُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهُوَ أَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ، فَسَوَّدَتْهُ خَطَايَا بَنِيْ آدَمَ''. (ترمذی، مشکوۃ/ص: ۲۲۷/ باب دخول مكة والطواف/ الفصل الثانی)

''حجر اسود جس وقت جنت سے نازل ہوا تو دودھ سے زیادہ سفید تھا، مگر بنو آدم کے گناہوں والے ہاتھوں نے اسے کالا کردیا۔'' اب غور کیجئے گا! جب پتھر پر انسان کے گناہوں کا یہ اثر ہوسکتا ہے تو خود گنہگار کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔ نیز ابتداء میں یہ پتھر ایک ہی ٹکڑا تھا، مگر کچھ ایسے حادثے پیش آئے کہ اس کا ظاہری حصہ ٹوٹ گیا، اب اس کے مختلف سائز کے آٹھ ٹکڑے ہیں جن میں بڑا ٹکڑا کھجور کے برابر ہے، ان ٹکڑوں کو ایک پتھر کے بڑے ٹکڑے میں جوڑ کر اس پر چاندی کا فریم لگا دیا گیا ہے، حجر اسود کی تاریخ میں سب سے افسوس ناک واقعہ جو پیش آیا وہ شیعہ کے اسماعیلی فرقہ کی ایک شاخ ''قرامطہ'' کا ہے، یہ ابوطاہر قرمطی کے متبعین ہیں، اس فرقے کے لوگوں نے حجر اسود کو ۳۱۹ھ میں یہاں سے لے جاکر غائب کر دیا، پھر تقریباً بیس سال کے بعد ۳۳۹ھ میں یہ پتھر وہاں سے لاکر واپس اس کی موجودہ جگہ پر نصب کیا گیا۔ (دیکھئے الملل والنحل: ۲/ ۲۹، شفاء الغرام ۱/ ۱۹۳، از: تاریخ مکہ/ص: ۴۳، ومکہ مکرمہ ماضی وحال کے آئینہ میں/ص: ۵۲)

یہی وہ آٹھ ٹکڑے ہیں جن کو طواف کے دوران بوسہ دینا اتباعِ سنت کی نیت سے مسنون ہے، اس مقدس پتھر کا حضرات انبیاء علیہم السلام اور خود امام الانبیاء ﷺ نے بھی بوسہ

لیا ہے، حدیث پاک میں اس کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ الْحَجَرِ: ”وَاللّٰهِ لَيَبْعَثَنَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، لَهُ عَيْنَانِ يُبْصِرُ بِهِمَا، وَلِسَانٌ يَنْطِقُ بِهٖ، يَشْهَدُ عَلٰى مَنِ اسْتَلَمَهٗ بِحَقٍّ“. (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۲۲۷/ باب دخول مکۃ والطواف/ الفصل الثانی)

حجر اسود دیکھنے میں تو پتھر کا ایک ٹکڑا ہے، لیکن اس میں ایک طرح کی روحانیت ہے، جس کی وجہ سے وہ ہر اس شخص کو جو اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ادب و محبت کے ساتھ اس کا بلا واسطہ یا بالواسطہ استلام کرتا ہے قیامت میں پہچان کر اس کے حق میں مومن ہونے کی گواہی دے گا، حضور ﷺ نے اس مضمون کو قسم کھا کر بیان فرمایا کہ ”حجر اسود کو قیامت کے دن حق تعالیٰ اس طرح اٹھائیں گے کہ اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے وہ دیکھے گا، اور زبان ہوگی جس سے وہ بولے گا، چناں چہ وہ ہر اس شخص کے حق میں گواہی دے گا جس نے (ایمان اور صدق و یقین اور محض طلب ثواب کے خاطر) حق کے ساتھ اس کا استلام کیا (حجر اسود کو چوما، یا اس پر اپنا ہاتھ وغیرہ رکھ کر یا اس کی طرف ہاتھ کر کے اسی کو چوم لیا) ہوگا۔ اس موقع پر یاد رہے کہ حجر اسود کا استلام سنت ہے، جب کہ لوگوں کو دھکے مکے دے کر ایذا دینا حرام ہے، لہٰذا سنت پر عمل کے لیے ممنوع کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ بالخصوص جب کہ اس کا بدل بھی موجود ہے اور خود حضورِ اکرم ﷺ نے ازدحام کے وقت اشارہ پر اکتفا کیا ہے۔

طواف کا طریقہ:

الغرض طواف کی ابتداء حجر اسود سے ہو کر اسی پر اس کی انتہاء ہوتی ہے، اس لیے طواف کے لیے حجر اسود کے سامنے آ کر بیت اللہ کی طرف منہ کر کے اس طرح کھڑا ہو کہ پورا حجر اسود دائیں طرف ہو، اس کے بعد طواف کی نیت (دل میں) کرے، اور افضل یہ ہے کہ زبان سے بھی اس طرح نیت کر لے:

”اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أُرِيْدُ طَوَافَ بَيْتِكَ الْحَرَامِ، فَيَسِّرْهُ لِيْ وَتَقَبَّلْهُ مِنِّيْ سَبْعَةَ أَشْوَاطٍ

لِلّٰہِ تَعَالٰی“.

(اے اللہ! میں آپ کی رضا کے خاطر آپ کے محترم گھر کے طواف کے سات چکر لگانے کا ارادہ کرتا ہوں، آپ اسے میرے لیے آسان فرمائیے اور قبول کیجئے) نیت کرنے کے بعد دائیں طرف ذرا سا چلیں اور حجر اسود کے بالکل سامنے آکر اس کا استقبال کریں، جس کا طریقہ یہ ہے کہ نماز کی تکبیر تحریمہ کی طرح دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھا کر چھوڑ دیں اور ”بسم اللہ اللہ اکبر“ پڑھیں، پھر حجر اسود کا استلام کریں، جس کا طریقہ یہ ہے کہ (اگر احرام کی حالت نہ ہو اور خود تکلیف اٹھائے بغیر اور لوگوں کو تکلیف پہنچائے بغیر بسہولت ممکن ہو تو) اپنی دونوں ہتھیلیاں حجر اسود پر اس طرح رکھیں جس طرح سجدہ کے وقت رکھتے ہیں، اور بغیر آواز کے نرمی و آہستہ سے بوسہ دیں، یعنی صرف ہونٹ رکھیں چٹاخے نہ بھریں، پھر حجر اسود پر سر رکھیں، تین مرتبہ یہ عمل کرنا مستحب ہے، لیکن اگر ہجوم کی وجہ سے بغیر تکلیف کے ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو صرف دونوں ہاتھ حجر اسود پر رکھ کر ہاتھوں کو بوسہ دیں، حتیٰ کہ اگر دونوں ہاتھ حجر اسود تک بسہولت نہ پہنچ سکیں تو کسی بھی ایک ہاتھ سے حجر اسود کو چھو کر اسے بوسہ دیں، (البتہ داہنا ہاتھ افضل ہے) اور اگر ہاتھ سے بھی نہ چھو سکیں تو کسی لکڑی وغیرہ سے حجر اسود کو چھو کر اسے بوسہ دیں، اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر دور ہی سے حجر اسود کے بالکل سامنے پہنچ کر دونوں ہتھیلیاں حجر اسود کی طرف اس تصور و خیال کے ساتھ کندھوں تک اونچی کریں گویا وہ حجر اسود ہی پر ہیں، پھر ”بسم اللہ اللہ اکبر“ پڑھ کر دونوں ہاتھوں کا آہستہ سے بوسہ لیں، یہ بھی حجر اسود کو بوسہ دینے ہی کے حکم میں ہے، اس سے بھی وہی اجر و ثواب حاصل ہوگا جو بوسہ دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد بیت اللہ شریف کے دروازے کی طرف چلتے ہوئے طواف شروع کریں، (یہ طواف اگر طوافِ عمرہ یا طوافِ زیارت ہو یعنی جس طواف کے بعد سعی ہو تو اس میں طواف کے تمام چکروں میں مرد اضطباع اور پہلے تین چکر میں رمل کریں) بیت اللہ شریف کو اپنی بائیں جانب کریں، نگاہیں سجدہ کی جانب رکھیں۔

دعا، درود، تسبیح، تلاوت یا اور کوئی ذکر (خواہ لسانی ہو یا قلبی) کرتے ہوئے خوب خلوص واطمینان سے مخلوق سے اپنا دھیان ہٹا کر خالق کی طرف دھیان لگا کر اس تصور کے ساتھ طواف کریں کہ ربِ کعبہ کی بارانِ رحمت کعبۃ اللہ شریف پر برس رہی ہے اور وہاں سے ہمیں پہنچ رہی ہے، غافل دل کے ساتھ طواف نہ کریں، دل میں اس ذاتِ عالی کا استحضار رکھیں جس کے گھر کا طواف کر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو جیسا کہ عربی شاعر کہتا ہے:

یَا مَنْ یَطُوْفُ بِبَیْتِ اللّٰہِ بِالْجَسَدِ
وَالْجِسْمُ فِی بَلَدٍ وَالرُّوْحُ فِی بَلَدٍ

اے وہ شخص! جو جسم سے بیت اللہ کا طواف کرتا ہے، مگر دل ودماغ حاضر نہیں۔

مَاذَا فَعَلْتَ؟ وَمَا ذَا أَنْتَ فَاعِلُہٗ؟
مُھْمِلٌ فِی اللِّقَا لِلْوَاحِدِ الصَّمَدِ

ایسی غفلت تو نے کیوں کی؟ اور کیوں تو لا پرواہ ہے ایسی ذات سے ملاقات میں جو ایک ہے اور بے نیاز ہے۔

إِنَّ الطَّوَافَ بِلاَ قَلْبٍ وَلَا بَصَرٍ
عَلَی الْحَقِیْقَۃِ لَا یَشْفِیْ مِنَ الْکَمَدِ

ایسا طواف جس میں دل ودماغ حاضر نہ ہوں درحقیقت کسی غم اور پریشانی کو دور نہیں کرتا۔ (تاریخ مکہ/ص: ۷۵)

طواف حطیم کے باہر سے کریں (حطیم سے مراد بیت اللہ سے ملحق وہ جگہ ہے جو شمال میں گول دائرہ کی نصف شکل کے مانند ہے، اس کو حجر اسماعیل بھی کہا جاتا ہے؛ کیوں کہ اسی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کے پاس حضرت اسماعیل وہاجر علیہما السلام کے لیے ایک جھونپڑی کا سائبان بنا دیا تھا، یہ حصہ بیت اللہ شریف سے باہر تھا، البتہ تین میٹر کا حصہ جو قریش نے تعمیر کے دوران کعبہ سے علاحدہ کیا تھا وہ یقیناً کعبہ کا جز ہے، کہ وہ اس وقت

حجر اسماعیل کے ساتھ ملا ہوا ہے اور اس نصف دائرے کے ضمن میں ہے، لیکن واضح رہے کہ طواف پورے حطیم کے باہر سے ہی کیا جائے گا۔ (تاریخ مکہ مکرمہ/ص:۴۸)

جس کسی کو خانۂ کعبہ میں نماز پڑھنے کی خواہش ہو تو وہ حطیم کے اس حصہ میں نماز پڑھ لے جو کعبۃ اللہ کی دیوار کے قریب ہے تو گویا اس نے خانۂ کعبہ کے اندر نماز پڑھی، جب رکن یمانی آئے (جو کعبۃ اللہ شریف کے اس کونے میں واقع ہے جو ملک یمن کے بالمقابل ہے، یہ حجر اسود کے برابر والا کونہ ہے اور ان بنیادوں پر قائم ہے جن پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کی تھی) تو یہ دعا پڑھے:

”اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِیْ الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ“. (ابن ماجة/ص: ۲۱۸، مشكوٰة/ ص: ۲۲۸/ باب دخول مكة والطواف / الفصل الثانی)

اے اللہ! میں تجھ سے دارین میں معافی اور عافیت کا سوال کرتا ہوں، اور اے ہمارے رب! ہمیں دارین میں بھلائی عطا فرما کر دوزخ کے عذاب سے محفوظ فرما، حدیث میں ہے کہ رکن یمانی پر ستر فرشتے مقرر ہیں جو ہر اس بندے کی دعا پر آمین کہتے ہیں جو یہ دعا رکن یمانی پر کرتا ہے۔ (مشکوٰۃ/ص:۲۲۸)

نیز رکن یمانی کا استلام بھی سنت ہے، حدیث میں ہے کہ رکن یمانی کا استلام گناہوں کا کفارہ ہے۔ (ترمذی، مشکوٰۃ/ص:۲۲۷)

لیکن اگر ازدحام وغیرہ کی وجہ سے ہاتھ لگا کر استلام نہ کر سکے تو کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد جب حجر اسود کے برابر آئے تو اس کا استلام کرے، یہ طواف کا ایک چکر ہوا، ہر چکر میں ایسا ہی کرے، تین چکر پورے ہونے کے بعد مرد رمل نہ کرے، بلکہ اپنی چال چلے، پھر ساتویں چکر کے ختم پر حجر اسود کا استلام کرے اور اضطباع نکال دے، اس طرح سات چکر ہو کر ایک طواف ہوتا ہے، جس میں کل آٹھ دفعہ حجر اسود کا استلام ہوگا، طواف کے بعد دو

رکعات پڑھے (جب کہ مکروہ وقت نہ ہو، احناف کے یہاں مکروہ وقت اوقاتِ ثلاثہ: طلوع، زوال، اورغروب کے علاوہ بعد عصر تا مغرب اور فجر کی نماز کے بعد سے سورج نکلنے تک کا وقت ہے) جو واجب ہے، یہ دو رکعات مقامِ ابراہیم کے پاس اگر ممکن ہو تو بہتر ہے، ورنہ جہاں سہولت ہو پڑھ سکتے ہیں۔

مقامِ ابراہیم:

یہ ایک جنتی پتھر ہے جسے حضرت جبرئیل علیہ السلام تعمیر ابراہیمی کے موقع پر جنت سے لائے، تاکہ آپ علیہ السلام اس پر کھڑے ہوسکیں، اللہ کی قدرت دیکھئے! جس وقت آپ علیہ السلام اس پر کھڑے ہوئے تو آپ کے قدم مبارک کے نشانات اس پر پڑ گئے، جو بالکل عیاں ہیں، اور یہ قدرتِ الٰہی کی نشانی اور معجزۂ ابراہیمی تھا کہ وہ پتھر جس پر کھڑے ہوکر سیدنا ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر فرمارہے تھے حسب ضرورت آپ کو لے کر اونچا نیچا ہوتا تھا، اِس زمانہ میں الیکٹرک لفٹ سسٹم سے اس کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے، تاریخ انسانی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی نبی کے آثار ونشانات باقی نہ رہ سکے، لیکن یہ حق تعالیٰ کی واضح اور کھلی نشانی اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا زندہ وجاوید معجزہ ہے کہ صدیوں سے یہ پتھر باقی ہے، (جب کہ زمانۂ ماضی میں اس کی حفاظت کا کوئی ظاہری انتظام بھی نہ تھا) اور اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروں کے نشانات نہیں مٹے، اسی کو فرمایا:

﴿ فِيهِ اٰيٰاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرٰهِيمَ ﴾ (اٰل عمران:۹۷)

میرے عزیز دوستو! حضرت خلیل علیہ السلام کے مبارک قدموں کے نشانات کا پتھر جیسی سخت چیز پر باقی رہنا اس بات کی کھلی علامت اور دلیل ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مخلص ومومن بندہ کے لیے ہر چیز مسخر فرماسکتے ہیں، اس پتھر کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب پتھروں کو پوجتے تھے، لیکن کسی نے بھی حجر اسود اور مقام ابراہیم کی پرستش نہیں کی، باوجودیکہ کفار ومشرکین کے دلوں میں بھی ان دونوں پتھروں کی عظمت تھی، گویا حق تعالیٰ نے

حجر اسود اور مقام ابراہیم کو ہر قسم کی پرستش و پوجا سے محفوظ رکھا۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر آج تک اپنی سابقہ جگہ پر ہے، سوائے اس کے کہ ۱۷ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک زبردست سیلاب سے بہہ کر مسفلہ تک گیا، بعد میں اسے آپ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی اصل جگہ پر (نہایت اہتمام سے پیمائش کی باریکیوں تک کا خیال رکھ کر) رکھا۔ (الجامع اللطیف/ص:۲۱، از: تاریخ مکہ/ص:۷۸)

واضح ہو کہ اس میں موجود ہر قدم کی لمبائی ۲۲ر سینٹی میٹر اور چوڑائی ۱۱ر سینٹی میٹر ہے، جب کہ ایک قدم کی گہرائی دس سینٹی میٹر تو دوسرے قدم کے نشان کی گہرائی نو سینٹی میٹر ہے، البتہ انگلیوں کے نشانات نہیں ہیں، اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قدم مبارک اتنا ہی لمبا تھا جتنا آج کل کسی دراز قد شخص کا ہوتا ہے، نیز رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک آپ ﷺ کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت زیادہ مشابہ تھے، صحیح بخاری کی ایک روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں ابراہیم ﷺ کی اولاد میں ابراہیم علیہ السلام سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتا ہوں۔'' (بخاری/ احادیث الانبیاء/ حدیث نمبر: ۳۴۳۷)

مقام ابرہیم کو سب سے بڑی فضیلت ایک یہ حاصل ہے کہ خود حق تعالیٰ نے اس کے قریب (خانۂ کعبہ کی طرف رُخ کر کے) نماز پڑھنے کا حکم فرمایا، ارشاد ہے:

﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَقَامِ إِبْرٰهِيمَ مُصَلًّى﴾ (البقرة : ١٢٥)

معلوم ہوا کہ لوگوں کو مقام ابراہیم کے پاس نماز کا حکم دیا گیا، نہ کہ اس کے چھونے اور بوسہ دینے کا۔ اس مبارک پتھر کی دوسری فضیلت یہ ہے کہ یہ جنت کے یاقوتوں میں سے ایک ہے، جیسا کہ خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:" إِنَّ

الرُّکْنَ وَالْمَقَامَ یَاقُوْتَتَانِ مِنْ یَّاقُوْتِ الْجَنَّةِ، طَمَسَ اللّٰهُ نُوْرَهُمَا، وَلَوْ لَمْ یَطْمِسْ نُوْرَهُمَا لَأَضَاءَ تَا مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ". (رواہ الترمذی، مشکوۃ/ص: ۲۲۷/ باب دخول مکة والطواف/ الفصل الثانی)

''حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم جنت کے یاقوتوں (قیمتی پتھروں) میں سے ہیں، (اللہ تعالیٰ نے ان کا نور اٹھالیا ہے، تاکہ ایمان بالغیب باقی رہے) اگر حق تعالیٰ ان کی نورانیت ختم نہ فرماتے تو (اس میں کوئی شبہ نہیں کہ) مشرق سے مغرب کے درمیان سب کچھ روشن ہوجاتا۔'' حضرت حسن بصریؒ اور دیگر علماءِ امت سے منقول ہے کہ مقامِ ابراہیم کے پیچھے دعا قبول ہوتی ہے، اس لیے کہتے ہیں:

حریم قدس میں دے حاضری بہ قلبِ صمیم
دعائیں مانگ بروئے مقامِ ابراہیم

مقامِ ابراہیم اس وقت بابِ کعبہ کے سامنے شاندار کریسٹل میں نصب کردیا گیا ہے، جس کے گرد لوہے اور شیشے کی مضبوط جالی لگادی گئی ہے، جس میں پاؤں کے نشانات صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔

طواف کی دعائیں:

یاد رکھیے! طواف کے دوران کوئی مخصوص دعا یا ذکر ضروری نہیں ہے، لہٰذا گروپ بناکر چلّا کر دعائیں نہ کی جائیں، اس سے دوسرے طواف کرنے والوں کو بے حد خلل ہوتا ہے، اگر کوئی شخص بالکل خاموش طواف کرے تب بھی جائز ہے، بہتر دعائیں تو وہی ہیں جو دل سے نکلیں اور دل میں رقت پیدا کریں، اس لیے جس دعا میں دل لگے اور جس کی ضرورت محسوس ہو وہ دعا (خواہ اپنی مادری زبان میں کیوں نہ ہو) خضوع وخشوع اور خلوص کے ساتھ کرتے رہیں، ورنہ جو دعا رکن یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان کرنے کی ہے اگر وہ یاد ہو تو اسے پڑھنا مستحب ہے، اس کے علاوہ طواف کے ہر چکر کی الگ الگ دعائیں بعض بزرگوں سے

منقول ہیں: (جوحضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لاعلی التعیین ثابت تو ہیں،لیکن اس ترتیب سے منقول نہیں ہیں، یادہوں تو) ان کی بھی گنجائش ہے۔

چناں چہ پہلے چکر کی دعا یہ ہے:

”سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ إِيْمَانًا بِكَ وَتَصْدِيْقًا بِكَلِمَاتِكَ وَوَفَآءً بِعَهْدِكَ وَاتِّبَاعًا لِّسُنَّةِ نَبِيِّكَ وَحَبِيْبِكَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ ﷺ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ الدَّائِمَةَ فِي الدِّيْنِ وَالدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ“. (حصن حصین/ص:۲۲۲، منتخب از: انوارِ مناسك/ص:٦٢٦)

اللہ تعالیٰ کی ذات تمام عیوب سے پاک ہے اور ہر تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے، اس کی مدد کے بغیر گناہوں سے بچانہیں جاسکتا، اور اللہ تعالیٰ ہی کی مدد سے اطاعت پر قدرت ملتی ہے، اللہ تعالیٰ بہت بڑا اور بہت عظمت والا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام نازل ہو، اے اللہ! ہم تجھ پر ایمان لانے کی حالت میں اور تیرے کلمات کی تصدیق کرتے ہوئے اور تیرے عہد کا ایفاء اور تیرے نبی کی سنت کا اتباع کرتے ہوئے طواف کرتے ہیں، اے اللہ! بلاشبہ میں تجھ سے عفو، سلامتی اور دارین میں دائمی درگذر کا سوال کرتا ہوں، اور حصولِ جنت اور جہنم سے نجات کے ساتھ کامیابی کی التجا کرتا ہوں۔

دوسرے چکر کی دعا:

”اَللّٰهُمَّ إِنَّ هٰذَا الْبَيْتَ بَيْتُكَ وَالْحَرَمَ حَرَمُكَ وَ الْأَمْنَ أَمْنُكَ وَالْعَبْدَ عَبْدُكَ، وَأَنَا عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ، وَهٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ النَّارِ، فَحَرِّمْ لُحُوْمَنَا وَبَشَرَتَنَا عَلَى النَّارِ“. (بالمعنى قاضى خان:۱/۳۱۵)

"اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الإِيْمَانَ وَزَيِّنْهُ فِي قُلُوْبِنَا، وَكَرِّهْ إِلَيْنَا الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِيْنَ". (حصن حصين مترجم/ص:۱۹۳)

"اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ". (حصن حصين /ص:۸۷)

"اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ". (انوار مناسك/ص:٦٢٨)

اے اللہ! یہ تیرا ہی گھر ہے، یہ حرم تیرا ہی حرم ہے اور یہاں کا امن وامان تیرا ہی قائم کیا ہوا ہے، اور ہر بندہ تیرا ہی بندہ ہے اور میں بھی تو تیرا ہی بندہ ہوں اور تیرا ہی بندہ زادہ ہوں، اور یہ مقام تیری مدد سے جہنم کی آگ سے پناہ اور حفاظت کا ہے، پس ہمارے گوشت اور چمڑے کو جہنم پر حرام فرما دے، اور اے اللہ! ہمیں ایمان کی محبت عطا فرما، ہمارے دلوں کو ایمان کے نور سے منوّر فرما دے، کفر وفسق اور معصیت سے نفرت عطا فرما، ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں میں شامل فرما دے، اے اللہ! مجھ کو قیامت کے دن کے عذاب سے بچا، جس دن تو اپنے بندوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور ہمیں بلا حساب جنت میں داخل فرما۔

تیسرے چکر کی دعا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَكِّ وَالشِّرْكِ وَالشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْأَخْلَاقِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ وَالْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ وَالْوَلَدِ". (تبيين الحقائق:۲ /۱۷)

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخِزْيِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ". (تبيين الحقائق:۲/۱۷، از: انوار مناسك/ص:٦٢٩)

اے اللہ! میں تیرے دین اور احکام میں شک کرنے سے پناہ مانگتا ہوں اور کسی کو تیرا ہمسر بنانے اور تیرے احکام کی مخالفت کرنے اور نفاق اور سوءِ اخلاق اور بری چیز کے دیکھنے اور مال واہل وعیال کی تبدیلی سے، اے اللہ! میں قبر کے فتنے سے تیرے دربار میں پناہ مانگتا ہوں اور زندگی وموت کی سختی سے اور دنیا وآخرت کی رسوائی سے۔

چوتھے چکر کی دعا:

”اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا (أَوْ عُمْرَةً أَوْ طَوَافًا) مَبْرُوْرًا وَّ سَعْيًا مَشْكُوْرًا وَّذَنْبًا مَّغْفُوْرًا وَّعَمَلاً صَالِحًا مَّقْبُوْلاً وَّتِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ“. (قاضی خان: ۱/۳۱٦)

”يَا عَالِمَ مَا فِي الصُّدُوْرِ، أَخْرِجْنِيْ يَا اللّٰهُ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ، اَللّٰهُمَّ أَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ“. (ترمذی: ۱/۱۰۹) ”وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ“. (حصن حصین مترجم/ص: ۳۲۱)

”رَبِّ قَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا أَعْطَيْتَنِيْ وَاخْلُفْ عَلٰى كُلِّ غَائِبَةٍ لِيْ مِنْكَ بِخَيْرٍ“. (كتاب المناسك/ص: ۳۹، از انوار مناسك/ص: ٦۳۰)

اے اللہ! میرے اس حج (وعمرہ اور طواف) کو مقبول بنا اور میری کوشش کو ٹھکانہ پر لگا اور میرے گناہوں کو معاف فرما اور میرے اس عمل کو مقبول ترین عمل صالح بنا اور اس کو ایسی تجارت بنا جس میں کوئی گھاٹا نہ ہو، اے دلوں کے راز کو جاننے والے اللہ! مجھے تاریکی سے نکال کر اجالے میں داخل فرما، اے اللہ! بے شک میں تیری رحمت کے حصول کے ذرائع اور تیری بخشش کے راستے اور ہر گناہ سے سلامتی کی التماس کرتا ہوں اور ہر نیکی پر قائم رہنے اور جنت کی کامیابی و دوزخ سے خلاصی کی التماس کرتا ہوں، اے اللہ! مجھے اس روزی پر قناعت عطا فرما جو تو نے دی ہے اور برکت عطا فرما ان نعمتوں میں جو تو نے دی ہیں اور تو خیر کے ساتھ میری ہر اس چیز کا نگہبان بن جا جو مجھ سے غائب ہے۔

پانچویں چکر کی دعا:

”اَللّٰهُمَّ أَظِلَّنِيْ تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِكَ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّ عَرْشِكَ“. (زیلعی: ۲/۱۷) وَلَا بَاقِيَ إِلَّا وَجْهُكَ، فَاسْقِنِيْ مِنْ حَوْضِ نَبِيِّكَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ ﷺ شَرْبَةً هَنِيْئَةً مَّرِيْئَةً لَا أَظْمَأُ بَعْدَهَا أَبَدًا“. (زیلعی: ۲/۱۷)

”اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ سَيِّدُنَا مُحَمَّدٌ ﷺ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ سَيِّدُنَا مُحَمَّدٌ ﷺ، وَأَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْكَ الْبَلَاغُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ“. (ترمذی:۲/۱۹۲)

”اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَنَعِيْمَهَا وَمَا يُقَرِّبُنِیْ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ فِعْلٍ أَوْ عَمَلٍ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ وَمَا يُقَرِّبُنِیْ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ فِعْلٍ أَوْ عَمَلٍ“. (بعضه فی الحزب الأعظم/ص:۶۰، حصن حصين/ص:۳۲۰)

اے اللہ! جس دن تیرے عرش کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا، مجھے اس دن عرش کے سائے میں جگہ عطا فرما اور تیری ذات کے علاوہ کوئی باقی رہنے والا نہیں ہے اور مجھے اپنے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوضِ کوثر سے سیراب کرا دینا، ایسا خوش ذائقہ پانی پلا دینا جس کے بعد پھر ابدالآباد پیاس نہ لگے، اے اللہ! میں تجھ سے ہر اس خیر کا سوال کرتا ہوں جس کا تیرے نبی نے کیا ہے اور ہر اس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جس سے تیرے نبی نے پناہ مانگی اور تو ہی مددگار اور کافی ہے، اللہ تعالیٰ کی نصرت کے بغیر معصیت سے حفاظت اور طاعت پر قدرت نہیں ہوسکتی۔ اے اللہ! بے شک میں تجھ سے جنت اور اس کی نعمتوں کا سوال کرتا ہوں، اور اس قول وفعل اور عمل کا سوال کرتا ہوں جو مجھ کو جنت سے قریب کردے اور میں دوزخ سے پناہ مانگتا ہوں اور ہر اس قول وفعل وعمل سے بھی پناہ مانگتا ہوں جو دوزخ سے قریب کردے۔

چھٹے چکر کی دعا:

”اَللّٰهُمَّ إِنَّ لَكَ عَلَيَّ حُقُوْقًا كَثِيْرَةً فِيْمَا بَيْنِیْ وَبَيْنَكَ، وَحُقُوْقًا كَثِيْرَةً فِيْمَا بَيْنِیْ وَبَيْنَ خَلْقِكَ، اَللّٰهُمَّ مَا كَانَ لَكَ مِنْهَا فَاغْفِرْهُ لِیْ وَمَا كَانَ لِخَلْقِكَ فَتَحَمَّلْهُ عَنِّیْ وَ أَغْنِنِیْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَبِطَاعَتِكَ عَنْ مَّعْصِيَتِكَ وَبِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ، يَا وَاسِعَ الْمَغْفِرَةِ، اَللّٰهُمَّ إِنَّ بَيْتَكَ عَظِيْمٌ وَوَجْهَكَ كَرِيْمٌ وَ أَنْتَ اللّٰهُ حَلِيْمٌ

کَرِيُمٌ عَظِيُمٌ تُحِبُّ الُعَفُوَ فَاعُفُ عَنِّيُ". (کتاب المناسك /ص:٤٥، از: انوار مناسك/ص:٦٣٣)

اے اللہ! بے شک تیرے مجھ پر بے شمار حقوق ہیں جو تیرے اور میرے درمیان ہیں اور بے شمار حقوق میرے اور تیری مخلوق کے درمیان ہیں، اے اللہ! ان میں سے جو حقوق تیرے ہیں اور مجھ سے ادا ہونے سے رہ گئے تو انہیں معاف فرمادے اور جو تیری مخلوق کے حقوق ہیں ان کو اپنی مخلوق سے بخشوانے کی ذمہ داری لے لے، اور مجھ کو حلال کمائی کی توفیق عطا فرما کر حرام سے حفاظت فرما، اے اللہ! تیری طاعت کے ذریعہ معصیت سے حفاظت فرما اور تیرے فضل کے ذریعہ غیروں کا دست نگر بننے اور احسان مند ہونے سے میری حفاظت فرما اے وسیع مغفرت والے اے اللہ! بے شک تیرا گھر بڑی عظمت والا ہے، تیری ذات کرم والی ہے، اے اللہ! تو بردبار، کرم وعظمت والا اور معافی کو پسند کرنے والا ہے، پس مجھے معاف فرما۔

ساتویں چکر کی دعا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيُ أَسُئَلُكَ إِيُمَانًا كَامِلاً وَّيَقِيُنًا صَادِقًا وَّرِزُقًا وَّاسِعًا وَّقَلُبًا خَاشِعًا وَّلِسَانًا ذَاكِرًا وَّحَلَالاً طَيِّبًا وَتَوُبَةً نَصُوُحًا وَتَوُبَةً قَبُلَ الُمَوُتِ وَرَاحَةً عِنُدَ الُمَوُتِ وَمَغُفِرَةً وَّرَحُمَةً بَعُدَ الُمَوُتِ وَالُعَفُوَ عِنُدَ الُحِسَابِ وَالُفَوُزَ بِالُجَنَّةِ وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ بِرَحُمَتِكَ يَا عَزِيُزُ يَا غَفَّارُ، رَبِّ زِدُنِيُ عِلُمًا وَأَلُحِقُنِيُ بِالصَّالِحِيُنَ". (کتاب المناسك/ص:٤٩، از: انوار مناسك/ص: ٦٣٥)

اے اللہ! بے شک میں آپ سے ایمانِ کامل، سچا یقین، وسیع رزق، خشوع والا دل، ذکر والی زبان، حلال روزی، سچی توبہ، موت سے قبل توبہ، موت کے وقت راحت، موت کے بعد مغفرت، حساب کے وقت معافی، جنت کی کامیابی اور دوزخ سے خلاصی کا سوال کرتا ہوں، اے بڑے غالب اور بڑی بخشش کرنے والے! اے میرے رب! مجھ کو علم نافع

کی زیادتی عطا فرما اور مجھ کو آخرت میں نیک لوگوں کے زمرے میں شامل فرمانا۔"

طواف کے فضائل:

قرآن وحدیث میں طوافِ بیت اللہ شریف کے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں، چناں چہ حق تعالیٰ نے اپنے خلیل سیدنا ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کو خاص طور پر حکم فرمایا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف واعتکاف اور عبادت کرنے والوں کے لیے پاک رکھو:

﴿أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ (البقرة:١٢٥)

ایک حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ:" الطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلٰوةِ، إِلَّا أَنَّكُمْ تَتَكَلَّمُوْنَ فِيْهِ، فَمَنْ تَكَلَّمَ فِيْهِ فَلَا يَتَكَلَّمَنَّ إِلَّا بِخَيْرٍ". (رواه الترمذی والنسائی والدارمی، مشكوٰة/ص:٢٢٧/ باب دخول مكة والطواف)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بیت اللہ کے گرد طواف کرنا نماز کے مانند (عبادت) ہے، بس فرق اتنا ہے کہ طواف کے دوران ضروری اور جائز کلام (یا جو کلام کے حکم میں ہو جیسے کھانا پینا اور افعالِ کثیرہ وغیرہ طواف کے لیے مفسد نہیں، بوقت ضرورت اس) کی اجازت ہے، لہٰذا جو کوئی طواف کی حالت میں کسی سے بات کرے تو نیکی اور بھلائی ہی کی بات کرے۔" (لغو اور فضول باتوں سے اپنے طواف کو مکدر نہ کرے)

مطلب یہ ہے کہ اگر چہ طواف بعینہٖ نماز کے درجہ کا عمل نہیں ہے، لیکن جیسے نماز عبادت اور اجر عظیم کا سبب ہے ایسے ہی طواف بھی عبادت اور اجر عظیم کا ذریعہ ہے۔

چناں چہ دوسری حدیث میں ہے:

قَالَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ:" مَنْ طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ أُسْبُوْعًا فَأَحْصَاهُ، كَانَ كَعِتْقِ رَقَبَةٍ". وَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ:" لَا يَضَعُ قَدَمًا وَلَا يَرْفَعُ أُخْرٰى إِلَّا حَطَّ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً، وَكَتَبَ لَهٗ بِهَا حَسَنَةً". (رواه الترمذی، مشكوٰة/ص:٢٢٧)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص بیت اللہ شریف کا سات بار طواف کرے اور اس کی محافظت کرے (یعنی سنن وآداب کی رعایت کرے) تو اس کا یہ طواف والا عمل ایک غلام آزاد کرنے کے برابر فضیلت رکھتا ہے۔ راوی فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی سنا کہ ''بندہ (طواف کرتے وقت جب بھی) کوئی قدم رکھتا ہے اور پھر اسے اٹھاتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے ہر قدم کے عوض ایک گناہ معاف فرمائیں گے اور ایک ایک قدم پر ایک ایک نیکی (حرم کی) لکھتے ہیں، اس طرح پورے طواف میں اس کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں اور نیکیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور حدیث میں جو سات بار طواف کا تذکرہ آیا تو اس میں تین احتمال ہیں: اول یہ کہ خانۂ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے؛ کیوں کہ ایک طواف میں بیت اللہ کے گرد سات چکر ہی لگائے جاتے ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ پورے سات طواف کرے (جس میں کل انچاس چکر ہوں گے)۔ اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ بلا ناغہ سات دن تک طواف کرے۔ لیکن بظاہر پہلا مطلب راجح ہے۔ واللہ اعلم۔ (مظاہر حق جدید: ۲/۳۱۴ ومعارف الحدیث: ۴/۲۵۰) بہرحال طوافِ بیت اللہ گناہوں کی معافی اور نیکیوں میں زیادتی کا ذریعہ ہے۔

ایک اور حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بیت اللہ شریف پر روزانہ ایک سو بیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں، (جن میں سے) ساٹھ رحمتیں طواف کرنے والوں کے لیے، چالیس وہاں نماز پڑھنے والوں کے لیے اور بیس رحمتیں ان کے لیے ہیں جو بیت اللہ کو محض (محبت وعظمت بھری نظر سے) دیکھتے ہیں۔ (طبرانی) سبحان اللہ۔

بیت اللہ شریف کو دیکھنے کی فضیلت:

طوافِ بیت اللہ تو عبادت اور باعث فضیلت ہے ہی، لیکن اس حدیث شریف سے

ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ بیت اللہ شریف صرف نگاہوں کا مرکز اور نظروں کا محور ہی بنا رہے تو یہ بھی ایک بڑی عبادت ہے، حق تعالیٰ کی بیس رحمتیں محض بیت اللہ کے دیکھنے والوں پر نازل ہوتی ہیں، حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ ''جو شخص بیت اللہ شریف کو ایمان وتصدیق (یقین) کے جذبہ سے دیکھتا ہے وہ خطاؤں اور (صغیرہ) گناہوں سے ایسے پاک وصاف ہوجاتا ہے جیسے آج ہی اس نے کائناتِ انسانی پر نظر ڈالی ہو۔ حضرت عطاءؒ کا فرمان ہے کہ ''بیت اللہ کا دیکھنے والا ایسا ہے جیسے رات کو عبادت کرنے والا اور دن کو روزہ رکھنے والا۔'' نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ''ایک بار بیت اللہ کا دیکھنا سال بھر کی نفلی عبادتوں کے برابر ہے۔'' (ذکر حرمین/ص: ۳۲) اس لیے مسجد حرام میں طواف اور معمولاتِ ذکر واذکار سے فارغ ہوکر بیٹھے بیٹھے بیت اللہ کو ایمان ویقین اور عظمت ومحبت سے دیکھتے رہنا چاہیے؛ کیوں کہ بیت اللہ کی زیارت جہاں عبادت اور فضیلت کا سبب ہے وہاں اس سے روحانی لذت بھی نصیب ہوتی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں کہ بیت اللہ کی زیارت سے بصارت اور بصیرت دونوں میں اضافہ ہوتا ہے، جیسا کہ اہل نظر کو اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔
(رزقنا اللّٰہ تعالیٰ زیارته بمنه و کرمه مرارًا...... آمین)

ملتزَم:

زیارتِ بیت اللہ اور طواف ونماز وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اگر ممکن ہو تو ملتزم پر آئیں، حجر اسود والے کونے اور خانۂ کعبہ کے دروازہ کی درمیانی جگہ کو ملتزم کہتے ہیں، جس کا عرض تقریباً دو میٹر ہے، ملتزم کے معنیٰ ہیں چمٹنے کی جگہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے اس طرح چمٹ جاتے تھے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں سے چمٹ جاتا ہے، یہ دعا کی قبولیت کا خاص مقام ہے، اس لیے خود تکلیف اٹھائے اور کسی کو تکلیف دیے بغیر اگر موقع ہو تو ملتزم پر اس طرح چمٹے کہ دونوں ہاتھ سر سے اوپر سیدھے اٹھا کر دیوار پر بچھا دے، پیٹ اور سینہ بھی چمٹا دے، پھر کبھی داہنا رخسار تو کبھی بایاں رخسار چمٹا کر خوب الحاح وزاری

سے دعا کرے، کہے کہ ''اے رب کریم! تیرے کرم سے ہم تیرے آستانہ پر پہنچے ہیں، تیری چوکھٹ سے چمٹے ہیں، اب دارین میں اپنی کامل رضا عطا فرما کر اپنے غضب وغصہ سے محفوظ فرمالیجئے۔''

یاد ہو تو اس موقع پر یہ دعا بھی کر سکتے ہیں:

''اَللّٰهُمَّ إِنَّ هٰذَا بَيْتُكَ الَّذِيْ جَعَلْتَهٗ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِلْعَالَمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ كَمَا هَدَيْتَنِيْ لَهٗ فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ، وَلَا تَجْعَلْ هٰذَا اٰخِرَ الْعَهْدِ مِنْ بَيْتِكَ، وَارْزُقْنِي الْعَوْدَ إِلَيْهِ حَتّٰى تَرْضٰى عَنِّيْ، بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ''. (مراقی الفلاح/ص:۴۰۱، تبیین الحقائق:۲/۳۷، از: انوار مناسك/ص:۶۳۷)

الٰہ العالمین! یہ تیرا وہی گھر ہے جس کو تو نے تمام عالم کے لیے مبارک اور ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے، پروردگار عالم! جس طرح تو نے مجھے اس (کی زیارت) کے لیے ہدایت دی ہے اسی طرح میری طرف سے قبول بھی فرمالے، اور میرے اس سفر سعادت کو اپنے محترم گھر کا آخری سفر نہ بنا، اور دوبارہ (بلکہ بار بار) لوٹ کر آنا مقدر فرما، یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے، یا ارحم الراحمین! اپنی رحمت سے میری دعا (اور حاضری) قبول فرما۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اللہ کے دیوانوں کو ملتزم پر جو لذت و روحانیت اور کیفیت نصیب ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔

ملتزم سے چمٹ کر سکوں پا گیا
اللہ اللہ زندگی کا مزا آ گیا

زمزم کی تاریخ اور اس کے خصائص وفضائل:

ملتزم سے فارغ ہو کر بئر زمزم کے پاس آئے، یہ مبارک کنواں بیت اللہ شریف سے مشرق میں حجر اسود سے تقریباً ۲۱/ میٹر کے فاصلہ پر کنارۂ مطاف کے متصل ہے، اس کی مستقل تاریخ اور خصائص وفضائل ہیں: جس وقت حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے بحکم

الٰہی ملک شام سے اپنی بیوی سیدہ ہاجرا اور بیٹے سیدنا اسماعیل علیہما السلام کو بیت اللہ کے قریب اس وقت کے بے آب وگیاہ بیابان میں چھوڑا تو ایک مشکیزہ پانی اور کچھ کھجوروں کا توشہ بھی ان کے حوالہ کیا، جس سے آپ کھاتی رہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت یہ تھی کہ جب سیدہ ہاجر کھجور کھا کر مشکیزہ سے پانی پی لیتیں تو ان کے پستان میں خوب دودھ اتر آتا تھا جس سے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو پیٹ بھر کر دودھ مل جاتا، مگر چند روز کے بعد یہ توشہ ختم ہوگیا تو بھوک اور پیاس کی وجہ سے ماں بیٹے دونوں بے تاب ہوگئے، خصوصاً نومولود بچہ کے بلبلانے کو دیکھ کر ماں اور بھی بے چین ہوگئیں، جس جگہ آج بئر زمزم ہے وہاں اپنے دودھ پیتے بچے کو تنہا چھوڑ کر پانی کی تلاش میں نکلیں، قریب میں صفا ومروہ دو پہاڑیاں تھیں، بے قرار ہوکر ان پر چڑھ کر نظریں دوڑائیں کہ شاید پانی یا کوئی قافلہ نظر آجائے جس سے پانی مل جائے، مگر کچھ نظر نہ آیا، اسی پریشانی کے عالم میں مائی ہاجر نے صفا مروہ کے درمیان سات چکر لگائے، اس دوران وہ حق تعالیٰ سے پانی کی دعا بھی کرتی جاتی تھیں، ساتویں بار جب مروہ پہ جا کر کھڑی ہوگئیں تو ایک آواز سی سنائی دی، آکر دیکھا تو جس جگہ معصوم بچہ تڑپ تڑپ کر پیر پٹخ رہا تھا جبرئیل امین علیہ السلام نے وہاں اپنے پر مارے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑیوں کے نیچے والی زمین سے میٹھے پانی کا ایک چشمہ بڑی تیزی کے ساتھ جاری ہوگیا، سیدہ ہاجر یہ ماجرا دیکھ کر باغ باغ ہوگئیں اور مٹی سے گھیر کر چاروں طرف سے پانی کے لیے ایک کنویں کی سی شکل یہ کہتے ہوئے بنادی کہ ''زم زم'' یعنی ٹھہر ٹھہر، پس اسی وقت سے اس ''آبِ حیات'' کا نام زم زم پڑ گیا۔

حدیث میں ہے کہ اگر سیدہ ہاجر نے اس طریقے سے پانی کو نہ روکا ہوتا تو وہ پانی ایک بڑی نہر کی شکل اختیار کر لیتا، پھر آپ نے خود پیا، بچہ کو دودھ پلایا اور وہاں آرام سے رہنے لگیں، ریگستانِ عرب میں پانی کے چشمۂ شیریں کا وجود بہت بڑی نعمت تھی، اس لیے جب یمن کے قبیلۂ بنو جرہم کے قافلہ نے اپنے سفر کے دوران گذرتے ہوئے وہاں پانی دیکھا تو سیدہ ہاجر سے اجازت لے کر یہ قافلہ وہیں مقیم ہوگیا، بعد میں جب سیدنا اسماعیل علیہ

السلام جوان ہوئے تو اسی قبیلہ کی ایک لڑکی سے آپ کی شادی ہوگئی، بیت اللہ کی پاسداری کا شرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد بنوبکر کو حاصل رہا، ایک عرصہ کے بعد بنوبکر اور بنو جرہم میں اختلاف ہوگیا تو بنوبکر نے بنو جرہم کو مکہ سے نکال دیا، انہوں نے جاتے جاتے یہ شرارت کی کہ بئر زمزم کو پاٹ دیا اور کچھ عرصہ کے بعد اس مبارک کنویں کے نشانات تک مٹ گئے، بعد میں صدیوں تک کسی کو یہ بھی معلوم نہ رہا کہ بئر زمزم کہاں ہے؟ مگر چوں کہ کاتب تقدیر نے اس مقدس چشمہ کی آبادکاری اور تجدید کا شرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد خواجہ عبدالمطلب کی قسمت میں لکھا تھا اس لیے آپ کو بذریعۂ خواب زم زم کے کنویں کی کھدائی کا حکم دیا گیا اور خواب ہی میں اس کی نشاندہی بھی کی گئی، مسلسل یہی خواب دیکھنے کے بعد جب آپ نے اپنے بیٹے حارث کو لے کر اس جگہ کھدائی کی تو واقعی کنویں کے آثار نظر آگئے اور پھر مزید کھدائی کرنے پر پانی بھی نکل آیا اور اس کا فیض پھر سے جاری ہوگیا۔

اب یہ کنواں مطاف کے نیچے تہہ خانہ میں کردیا گیا ہے، تاکہ طواف میں سہولت ہو جائے، البتہ پانی نلوں اور کولروں کے ذریعہ ہر جگہ دستیاب ہے، علماء نے اس چشمۂ شیریں کے خصائص وفضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ’’یہ جنت کے چشموں میں سے ایک چشمہ ہے۔‘‘ آبِ زم زم کے خصائص وفضائل کے پیش نظر اس کے تقریباً ۵۴ نام ذکر کیے گئے ہیں، جو کسی نہ کسی خوبی کی بنیاد پر ہی رکھے گئے ہیں، آبِ زم زم اللہ تعالیٰ کا وہ عظیم عطیہ ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعاءِ مستجاب اور ان کی زوجۂ مطہرہ کے اضطراب اور صبر واستقامت کے نتیجہ میں بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی تشنگی بجھانے اور ان کی برکت سے ساری انسانیت کو فیض یاب کرنے کے لیے دیا گیا، آبِ زم زم بیت اللہ شریف کے قریب اللہ رب العزت کی زندہ وجاویدان نشانیوں میں سے ایک ہے جو مکہ مکرمہ کے آباد ہونے کا بظاہر سبب بنا، آبِ زم زم روئے زمین کے سب سے مقدس حصہ میں واقع اور سارے پانیوں میں سب سے زیادہ مقدس، مبارک محترم، صاف اور افضل پانی ہے، یہی وہ مبارک پانی ہے جس سے

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اطہر ایک سے زیادہ مرتبہ دھویا گیا، نیز آپ ﷺ نے اپنا لعابِ دہن مبارک اس میں ڈال کر اس کی برکت اور فضیلت میں مزید چار چاند لگا دیے، اس مقدس پانی میں بیک وقت کم از کم تین ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو دنیا کے کسی اور پانی میں نہیں پائی جاتیں: (۱) پیاس بجھاتا ہے۔ (۲) غذا کا کام دیتا ہے۔ (۳) سوائے موت کے ہر بیماری سے شفا کا کام دیتا ہے، بشرطیکہ اخلاص اور اعتقاد (یقین کامل) کے ساتھ اسے پیا جائے، حدیث میں ہے:

"خَيْرُ مَاءٍ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ مَاءُ زَمْزَمَ، فِيْهِ طَعَامُ طُعْمٍ وَشِفَاءُ سَقْمٍ".

(المعجم الكبير للطبراني، الترغيب: ۲/۲۰۹)

ایک حدیث میں ہے کہ "مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهٗ" ماءِ زمزم جس دینی و دنیوی مقصد کے حصول کے لیے پیا جائے اس میں مفید ثابت ہوگا۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ماءِ زمزم پیتے وقت یہ دعا کرتے: "اَللّٰهُمَّ أَشْرَبُهٗ لِظَمَإٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ". یا اللہ! میں قیامت کے دن کی پیاس بجھانے کے لیے زمزم پیتا ہوں۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما ماءِ زمزم پیتے وقت یہ دعا کرتے: "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ عِلْمًا نَّافِعًا وَرِزْقًا وَّاسِعًا وَّشِفَاءً مِّنْ كُلِّ دَاءٍ" یا اللہ! میں تجھ سے علم نافع، رزقِ واسع اور ہر مرض سے شفایابی کا سوال کرتا ہوں۔ بیت اللہ شریف دیکھتے ہوئے خوب شکم سیر ہو کر زمزم پیئے، ان شاء اللہ نارِ جہنم اور زمزم (پینے والا) ایک جگہ جمع نہیں ہوں گے، یہ زمزم کا پینا بھی مغفرت کا سبب ہوگا۔

صفا مروہ:

طواف وغیرہ سے فارغ ہو کر حجر اسود کا استلام کر کے (حج و عمرہ کے اہم رکن سعی بین الصفا والمروہ کے لیے) صفا مروہ پر آئے (اور مخصوص طریقے پر سعی کے سات چکر لگائے) صفا جبل ابوقبیس سے نیچے کی جانب اسی کا ایک حصہ اور چھوٹی سی پہاڑی ہے جس سے سعی کا

آغاز کیا جاتا ہے، یہ خانۂ کعبہ کے جنوب مشرق میں ۱۳۰/ میٹر کے فاصلہ پر ہے، جب کہ مروہ جبل قعیقعان سے متصل چھوٹی سی پہاڑی ہے جس پر سعی کی انتہا ہوتی ہے، اس کا پتھر مائل بہ سفیدی اور سخت ہوتا ہے، خانۂ کعبہ کے رکنِ شامی سے شمال مشرق میں ۳۰۰/ میٹر کے فاصلہ پر ہے، اور مسعیٰ صفا مروہ کے درمیان کی جگہ ہے جس کی لمبائی ۳۹۵/ میٹر ہے۔ (مکہ مکرمہ ماضی وحال کے آئینہ میں/ص: ۷۰) مسجد حرام کی جدید تعمیر کے بعد اب وہاں کا نقشہ بدل گیا ہے، یہ سب مسجد حرام میں گویا شامل ہوگیا ہے، سعودی حکومت نے صفا مروہ اور مسعیٰ کو سنگ مرمر بچھا کر ایرکنڈیشنڈ کر دیا، نیز بھیڑ سے بچنے کے لیے شاہ عبداللہؒ نے ۱۴۲۷ھ میں اس کی توسیع کر کے اسے کئی منزلہ بنا دیا ہے، تا کہ کسی بھی منزل سے باطمینان سعی کی جا سکے۔

آج سے ہزاروں سال پہلے اسی مقدس مقام کے درمیان اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ بندی سیدہ ہاجر نے اپنے بیقرار بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیاس بجھانے کے لیے پانی کی تلاش میں سات چکر لگائے تھے، حق تعالیٰ کو ان کی یہ ادا اِس قدر پسند آئی کہ حج وعمرہ کرنے والوں کے لیے سعی کے نام سے اس کو لازم اور واجب قرار دے کر اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ ہماری راہ کے سچے طالب خود مطلوب بن جاتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ صفا مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ (البقرة: ۱۵۸)

نیز قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے بعض اہم واقعات ان سے وابستہ ہیں، چناں چہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اہل کتاب کا یہ عقیدہ تھا کہ اساف نامی مرد اور نائلہ نامی عورت نے خانۂ کعبہ میں زنا کیا، جس کی سزا میں ان کی شکل مسخ کر کے ان کو پتھر بنا دیا گیا، لوگوں کی عبرت کے لیے اساف کو صفا اور نائلہ کو مروہ پر لا کر رکھ دیا گیا، پھر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کو مقدس سمجھا جانے لگا، حتیٰ کہ ان کی عبادت شروع ہوگئی، ادھر زمانۂ جاہلیت میں بھی صفا مروہ کی سعی کی جاتی تھی، لہٰذا جب اسلام کی صبح طلوع ہوئی تو بعض

حضرات کو خیال ہوا کہ صفا مروہ کی سعی ان مذکورہ بتوں کی وجہ سے کی جاتی تھی، لہٰذا اب زمانۂ اسلام میں اس سے بچنا چاہیے، اس اشکال کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ (البقرة:١٥٨) (صحيح مسلم، كتاب الحج/حديث نمبر: ١٢١٨، از: تاريخ مكه مكرمه/ص: ٩٤)

علاوہ ازیں ابتداءِ اسلام میں جب آیت کریمہ: ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (الشعراء: ٢١٤) نازل ہوئی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر مکہ والوں کو پکارا کہ اے قبیلہ فہر کے لوگو! اے قبیلہ عدی کے لوگو! (یہ دونوں قریش کی شاخیں ہیں) یہ سن کر سب لوگ جمع ہو گئے، جو کسی وجہ سے خود نہ آ سکا اس نے اپنا نمائندہ بھیجا، ابولہب بھی آ پہنچا، آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''لوگو! اگر میں کہوں کہ اس وادی میں (پہاڑ کے پیچھے) ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو تم میری بات کی تصدیق کرو گے؟'' سب نے بیک زبان کہا: ''ہاں! کیوں کہ ہم نے تمہیں ہمیشہ سچا ہی پایا ہے'' تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مکہ والو! بات دراصل یہ ہے کہ میں تمہیں ایک شدید عذاب سے ڈراتا ہوں جو بہت قریب ہے'' ابولہب نے کہا: '' تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ'' تیرا برا ہو، (العیاذ باللہ العظیم) ''أَ لِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟'' کیا تو نے اسی لیے ہمیں جمع کیا تھا؟ اس واقعہ کے پس منظر میں سورۂ لہب نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری/کتاب التفسیر/حدیث نمبر: ۴۷۷۰)

اس کے علاوہ بھی ایک واقعہ اس مقام کے ساتھ وابستہ ہے، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر قریش مکہ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ''اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لیے صفا (پہاڑی) کو سونا بنا دے، (اگر ایسا ہو گیا) تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ''کیا واقعی تم اس پر تیار ہو؟'' قریش نے کہا: بالکل! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، فوراً جبرئیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! حق تعالیٰ نے آپ کو سلام کہا اور ارشاد

فرمایا ہے کہ اگر آپ چاہتے ہوں کہ قریش کے لیے صفا پہاڑی کو سونے سے بدل دیا جائے تو ہمارے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے؟ ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَّقُوْلَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (یٰس: ۸۲) ابھی ہو جائے گا، مگر اس کے بعد بھی اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو پھر ان کو ایسا سخت عذاب دیا جائے گا جو کسی کو نہ دیا گیا ہوگا، اور اگر آپ چاہیں تو یہ معاملہ ایسا ہی رہنے دیں اور ان کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا جائے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''الٰہی! میں چاہتا ہوں کہ ان کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔'' (مسند احمد/ حدیث نمبر: ۲۱۶۶)

اس سلسلہ میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ إِلَّا أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُوْنَ﴾ (إسرائيل: ۵۹)

(از: تاریخ مکه مکرمه/ص: ۸۸)

اور ہم کو نشانیاں (یعنی کفار کے مانگے ہوئے معجزات) بھیجنے سے کسی اور چیز نے نہیں روکا، بلکہ اس بات نے روکا کہ پچھلے لوگ ایسی نشانیاں جھٹلا چکے ہیں۔

اسی طرح ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِآيَاتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (النمل: ۸۲)

جس کا مطلب یہ ہے کہ جب ان کے بارے میں عذاب کا وعدہ پورا ہوگا تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے بات کرے گا کہ لوگ ہماری آیتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''نیک اعمال میں جلدی کرو، اس سے پہلے کہ سورج مغرب سے طلوع ہو اور دجال کا ظہور ہو اور بولنے والا جانور نکل آئے، یہ بولنے والا جانور کہاں سے نکل کر ظاہر ہوگا؟ اس بارے میں تین اقوال مشہور ہیں: ایک یہ کہ صفا سے ظاہر ہوگا، دوسرا یہ کہ جبل ابوقبیس سے نکلے گا اور تیسرا قول یہ ہے کہ سب سے بڑی اور افضل مسجد سے نکلے گا۔ (تفسیر طبری: ۲۰/ ۱۴ تا ۱۵، تفسیر فتح القدیر: ۴/ ۱۵۱، از تاریخ مکہ/ص: ۹۰)

غور کیا جائے تو تینوں اقوال ایک ساتھ جمع ہو سکتے ہیں؛ اس لیے کہ صفا جبل ابو قبیس ہی کا تو حصہ ہے، اور اب یہ سب سے بڑی اور افضل مسجد مسجد حرام میں واقع ہے۔

الغرض صفا کے قریب پہنچیں تو مستحب یہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہوئے یہ پڑھیں:

"بِسْمِ اللّٰهِ أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ﴾
(مسلم شریف بالمعنیٰ: ۱/۳۹۵)

میں اللہ کا نام لے کر وہاں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے اللہ تعالیٰ نے شروع فرمایا، بلاشبہ صفا مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

اس کے بعد جب صفا پر تکبیر پڑھتے ہوئے اتنا اوپر چڑھیں کہ بیت اللہ شریف نظر آنے لگے تو بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے تین مرتبہ یہ دعا پڑھیں:

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ أَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهٗ". (مسلم: ۱/۳۹۵)

"اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کے لیے ملک ہے اور اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں، وہ زندہ ہے، مرتا نہیں، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اور اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اکیلے ہی اس نے ہجوم کے ساتھ آنے والے دشمن کو شکست دی ہے۔" یہی دعا مروہ پر بھی اسی طرح پڑھیں جس طرح صفا پر پڑھی گئی تھی، نیز سعی کے دوران بھی یہ دعا پڑھتے رہیں۔

البتہ سعی کرتے ہوئے جب میلین اخضرین پر پہنچیں تو (مرد اپنی چال ذرا تیز کرے دوڑنے کے قریب، اور عورتیں عام رفتار ہی سے چلیں اور اس دوران) یہ دعا پڑھیں:

”رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ، إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ“. (قاضی خان: ۱/۳۱۷، زیلعی: ۲/۲۰، از انوار مناسك/ص: ٦٤٠)

اے میرے رب! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما اور میرے ان گناہوں سے درگذر فرما جو تیرے علم میں ہیں، بے شک تو ہی سب پر غالب اور زیادہ کرم والا ہے۔

اس ترتیب سے دعا وغیرہ کا اہتمام کرتے ہوئے سات چکر لگائیں۔ صفا سے مروہ (احناف کے یہاں ایک چکر ہوتا ہے) پھر مروہ سے صفا (دوسرا چکر ہوتا ہے) اس طرح صفا سے شروع کر کے مروہ پر سعی کا عمل پورا کر کے مطاف کے کنارے یا مسجد حرام میں کہیں بھی دو رکعات شکرانہ کی (جو نفل ہیں جب کہ مکروہ وقت نہ ہو) پڑھ کر سنت کے مطابق مسجد حرام سے باہر نکلیں اور حلق یا قصر کرالیں۔

منیٰ اور اس کے مقدس مقامات:

اس کے بعد حج کے موقع پر آٹھ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ سے منیٰ جا کر آٹھویں کا پورا دن اور نویں کی رات گذار کر پھر نویں کا دن عرفات اور رات مزدلفہ میں گذار کر واپس دس، گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کے دن رات منیٰ میں گذار کر حج کے ارکان و افعال ادا کرنے ہیں۔

”منیٰ“ کے معنی بہنا ہیں، چوں کہ یہاں ایامِ عید الاضحیٰ میں قربانیاں کی جاتی ہیں اور ان کا خون بہتا ہے، اس لیے اس جگہ کو منیٰ کہا جاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اہل عرب ایسی جگہ کو منیٰ کہتے ہیں جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں، تو یہاں بھی حجاجِ کرام ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲، اور بعض لوگ ۱۳ ذی الحجہ کو جمع ہوتے ہیں، اس مناسبت سے بھی اسے منیٰ کہتے ہیں۔ منیٰ مشعر ہے اور حدود حرم ہی میں مسجد حرام سے مشرقی جانب ۷ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، جب کہ سرنگ کے راستہ سے پیدل صرف چار کلومیٹر کا فاصلہ ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ أَيَّامٍ مَعْدُوْدٰتٍ ط فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ج

وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۗ﴾ (البقرة:۲۰۳)

''اور گنتی کے چند دنوں میں (خصوصی طور پر) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو، پھر جو کوئی (منیٰ سے) جلدی کر کے دو ہی دن میں چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور جس نے دو دن سے تاخیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، یہ سب باتیں اس شخص کے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔''

منیٰ کے مغربی حصہ میں جمرات واقع ہیں، ''جمرات'' یہ جمرۃ کی جمع ہے، اور ''جمرۃ'' چھوٹی کنکری کو کہتے ہیں، یہاں تین جمرات ہیں، پہلے کو جمرۂ صغریٰ کہتے ہیں جو مسجد خیف سے قریب ہے، دوسرے جمرے کو جمرۂ وسطیٰ اور تیسرے کو جمرۂ کبریٰ کہتے ہیں جو مکہ مکرمہ کی سمت منیٰ کی حدود کے آخر میں ہے، اسے جمرۂ عقبہ بھی کہا جاتا ہے، تینوں جمرات پر گول دائروں میں پتھر کے ستون بنے ہوئے ہیں، جنہیں عام طور پر لوگ شیطان کہتے ہیں، حالاں کہ ان کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ وہ مقامات ہیں جہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو شیطان نظر آیا تھا، جس کا واقعہ یہ ہے کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام خواب میں اللہ تعالیٰ کا اشارہ) پا کر بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے لیے منیٰ تشریف لائے تو ان جمرات والی جگہوں پر ان کے راستہ میں رکاوٹ بننے کے لیے شیطان ظاہر ہوا تھا، اس وقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں ماریں جن سے وہ زمین میں دھنس گیا، آج جو رمیِ جمرات حج کے واجبات میں سے ہے یہ درحقیقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، جن کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ إِبْرٰهِيْمَ﴾ (الممتحنة : ٤)

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں تمہارے لیے اچھا نمونہ ہے۔'' نیز یہ حضور ﷺ کے حکم کی اتباع بھی ہے، آپ ﷺ نے دورانِ حج رمی کی اور فرمایا: ''خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ'' تم مجھ سے اپنے حج کے احکام سیکھ لو! حدیث میں ہے کہ دس ذی الحجہ کو

چاشت کے وقت حضور ﷺ نے جمرۂ عقبہ کی رمی فرمائی اور ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ کو زوال کے بعد تینوں جمرات کی رمی فرمائی۔ (ترمذی/ کتاب الحج/ حدیث نمبر: ۸۹۴) اس لیے دس ذی الحجہ کو صرف جمرۂ عقبہ کی رمی، اس کے بعد قارن یا متمتع ہوں تو قربانی، پھر حلق اور بعد میں مکہ مکرمہ جا کر طوافِ زیارت کریں، اس سے فارغ ہو کر پھر ایامِ رمی گیارہ، بارہ اور تیرہ ذی الحجہ کو بھی منیٰ میں قیام کریں، ان دنوں کی اہم عبادت رمی ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ منیٰ میں بکثرت تلبیہ اور ذکر واستغفار کرتے رہیں اور یاد ہو تو یہ دعا بھی پڑھیں:

"اَللّٰهُمَّ هٰذِهٖ مِنٰى قَدْ أَتَيْتُهَا وَأَنَا عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ، أَسْأَلُكَ أَنْ تَمُنَّ عَلَيَّ بِمَا مَنَنْتَ بِهٖ عَلٰى أَوْلِيَآءِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ" . (قاضی خان: ۳۱۷/۱، انوار مناسك/ص: ٦٤٨)

"اے اللہ! یہ مقامِ منیٰ ہے جس میں میں حاضر ہوا ہوں، میں تیرا بندہ ہوں اور تیرا بندہ زادہ ہوں، میں تجھ سے اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ تو مجھ پر ایسا احسان فرما جیسا کہ تو نے اپنے اولیاء اور نیک بندوں پر فرمایا ہے، اے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے!"

جب رمیِ جمرات کا موقع آئے تو کنکری (جو باقلا یعنی بڑے چنے کے دانے کے برابر یا اس سے بڑی ہو، لیکن کھجور کی گٹھلی سے چھوٹی ہو اس) کو داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پکڑ کر تکبیر کہتے ہوئے مرد کنکری پھینکتے وقت ہاتھ اتنا اونچا اٹھائیں کہ بغل کھل جائے اور ہر کنکری کے ساتھ یہ دعا پڑھتے جائیں: "بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ أَكْبَرُ رَغْمًا لِلشَّيْطَانِ وَرِضًى لِلرَّحْمٰنِ". (معلم الحجاج/ص: ٧٠) میں اللہ کے نام سے شیطان کو کنکری مارتا ہوں، اللہ بہت بڑا ہے، یہ کنکریاں میں شیطان کو ذلیل کرنے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے مارتا ہوں۔ ان پتھروں کے ستون کو کنکریاں مارنے سے شیطان ذلیل اور خوار ہوتا ہے۔

جمرات کے ان ستونوں کے ارد گرد ۱۲۹۲ھ کے بعد حوض نما دائرے بنا دیے گئے

ہیں، تاکہ رمی کی جگہ وسیع ہو جائے (اگر کنکری حوض میں گری تب بھی کافی ہے، البتہ حوض سے باہر گرے تو اس کے بدلے دوسری کنکری مارنا ضروری ہے) نیز تاکہ کنکریاں ایک جگہ جمع ہوکر پھیل کر لوگوں کی تکلیف کا باعث نہ بنیں، ان جمرات کی تنگیٔ رقبہ اور حجاجِ کرام کی بڑھتی ہوئی تعداد و بھیڑ کی وجہ سے یہاں متعدد بار ایسے واقعات پیش آئے جن سے بہت سی جانیں گئیں، جس کے حل کے لیے ۱۳۸۳ھ میں جمرات پر ایک پل بنا دیا گیا، تاکہ بھیڑ کم ہو اور رمی کرنے والے اوپر نیچے سے رمی کر سکیں، حجاجِ کرام کی مزید سہولت کے خاطر ۱۴۱۶ھ میں شاہ عبداللہؒ نے اس تعمیر شدہ پل اور جمرات کی توسیع کا حکم جاری کیا، جس کے بعد اس کا تعمیری پلان اس طرح سامنے آیا کہ اس علاقہ کے زیر زمین دو سرنگیں بنائی جائیں، اور جمرات کو چار منزلہ بنا دیا جائے، ہر منزل میں ایمرجنسی کی سہولیات فراہم ہوں، ہر منزل پر نگرانی ہو، ہر منزل پر ہیلی کو پٹر اترنے کی جگہ بھی ہو، اس پلان کے مطابق ایک منزل پر بیک وقت سوا لاکھ حاجی رمی کر سکتے ہیں اور چاروں منزلوں پر بیک وقت پانچ لاکھ حاجی رمی پر قادر ہو سکتے ہیں۔ (مکہ مکرمہ ماضی وحال کے آئینہ میں/ص:۸۴)

منیٰ میں دو مسجدیں ہیں: ان میں سے ایک مسجد خیف ہے جو منیٰ کے جنوبی پہاڑ کے دامن میں جمرۂ صغریٰ کے نزدیک بڑی مربع شکل میں واقع ہے، اس مبارک مسجد میں خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ ﷺ سے پہلے بہت سے حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام نے نمازیں پڑھی ہیں، آج اس کے صحن میں ایک قبہ ہے جو حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کا مقام ہے، قبۂ مذکورہ میں حضور اکرم ﷺ کی نماز پڑھنے کی جگہ وہ محراب ہے جو قبہ میں ہے۔ (کہا جاتا ہے کہ اسی مسجد خیف میں ستر انبیاء علیہم السلام مدفون ہیں۔ واللہ اعلم۔)

یہ مسجد بھی ہر زمانہ میں مسلم خلفاء وحکمرانوں کی توجہ کا مرکز رہی ہے، ماضی قریب میں ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۷ء میں شاہ فہد مرحوم کے دور میں اس کی تعمیر وتوسیع عمل میں آئی، اس میں ۳۵ ہزار نمازیوں کی گنجائش پیدا کی گئی، (تاریخ مکہ/ص:۸۷)

مسجد خیف کے پیچھے پہاڑ کے اس حصہ پر جو یمن کی سمت میں ہے غارِ مرسلات ہے، اس مقام پر رحمت عالم ﷺ پر سورۂ مرسلات نازل ہوئی تھی، جیسا کہ صحیح بخاری (جزاء الصید) میں ہے، اس وجہ سے اسے غارِ مرسلات کہتے ہیں۔

دوسری مسجد ہے ''مسجد بیعت''، جسے مسجد عقبہ بھی کہتے ہیں، جبل ثبیر نامی پہاڑی کی گھاٹی میں جمرات کے پل اور اس کے ارد گرد ہونے والی توسیع میں یہ مسجد ظاہر ہوئی، پہاڑ سے الگ ہو کر رہ گئی، اس وقت یہ مسجد منیٰ کے قریب جمرات کے پل سے اتر کر اگر کوئی شخص مسجد حرام کی طرف جائے تو اس کے داہنے ہاتھ پر پڑتی ہے، اس کا محل وقوع اس جگہ ہے جہاں نبوت کے بارہویں سال ۶۲۱ء میں انصارِ مدینہ کے دو قبیلے اوس اور خزرج کے بارہ برگزیدہ افراد نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی، دوسری بیعت اگلے سال اسی مقام پر منعقد ہوئی جس میں ۷۳ مرد اور دو عورتیں تھیں۔

اس دفعہ انصارِ مدینہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے یہاں آنے کی دعوت بھی پیش فرمائی، پہلی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور دوسری کو بیعت کبریٰ کہا جاتا ہے، عباسی خلیفہ ابو جعفر منصورؒ نے ۱۴۴ھ مطابق: ۷۶۱ء میں اس جگہ ایک مسجد تعمیر کرائی، اس کے بعد اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کی تجدید و ترمیم ہوتی رہی، اس کی موجودہ تعمیر سلطان عبد الحمید عثمانی ترکی کے دورِ حکومت ۱۲۵۰ھ میں ہوئی، مسجد لمبی شکل میں ہے، اس کی مضبوط چہار دیواری کا اگلا حصہ چھت اور پچھلا حصہ صحن پر مشتمل ہے، سعودی حکومت نے اس مسجد کو اس کی قدیم شکل میں بطورِ یادگار باقی رکھا ہے۔

وادیٔ محسر:

نیز منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان وہ جگہ ہے جو حدودِ حرم میں شامل تو ہے البتہ مشعر نہیں کہ اس کی تعظیم کی جائے، بلکہ یہ وہ نشیبی علاقہ اور وادی ہے جہاں حق تعالیٰ نے ابرہہ کے ہاتھیوں والے لشکر کو تباہ فرمایا تھا جس کا تذکرہ سورۂ فیل میں ہے، نیز اسی مقام پر جہلاءِ عرب

جمع ہوکر اپنے آباء واجداد کے کارنامے بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے (جو اسلام میں پسندیدہ نہیں) یہاں سے توبہ استغفار کرتے ہوئے تیزی سے چلیں، اسے وادئ محسَّر کہتے ہیں؛ کیوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ جب کسی ایسی جگہ سے گزرتے جہاں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ہوتو تیزی کے ساتھ گذر جاتے، اس موقع پر یاد ہوتو یہ دعا پڑھ لیں:

"اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ". (كتاب المناسك/ص:٢٦، از انوار مناسك/ص:٦٤٨)

"اے اللہ! ہم کو اپنے غضب کے ذریعہ ہلاک نہ فرما اور نہ اپنے عذاب کے ذریعہ ہلاک فرما اور اس سے قبل ہمیں معاف فرما۔"

آج کل اس وادئ محسَّر کو "وادی النار" بھی کہتے ہیں، سعودی حکومت نے اس کے چاروں طرف خاردار تار لگا دیے ہیں اور پیدل چلنے والے حاجیوں کو روکنے کے لیے ایک سنتری بھی کھڑا رہتا ہے۔ (حج وعمرہ فلاحی کے ہمراہ/ص:۱۸۳)

مزدلفہ اور اس کی دعائیں:

منیٰ اور عرفات کے درمیان حدودِ حرم ہی میں ایک مقام ہے جسے "مزدلفہ" کہتے ہیں، جس کی حدود وادئ محسَّر سے لے کر مأزمین (دو پہاڑ جو آمنے سامنے ہیں) تک ہے، یہ مسجد حرام سے بجانب مشرق جنوب آٹھ کلومیٹر پر ہے۔ "زُلْفٰی" کے معنی قربت کے آتے ہیں، چوں کہ یہ مقام عرفات سے قریب ہے اس لیے اس کو مزدلفہ کہتے ہیں، دوسری وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ "أَزْلَفَ" کے معنی جمع کرنے کے ہیں، یہاں (حج کے موقع پر) لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اس مناسبت سے اس کو مزدلفہ کہتے ہیں۔

یہ وہ مقدس مشعر ہے جہاں حج کے موقع پر حجاجِ کرام کے لیے ۹/ ذی الحجہ کو میدانِ عرفات سے غروب کے بعد (نمازِ مغرب پڑھے بغیر) واپسی پر پوری رات گذارنا سنت

مؤکدہ اور طلوعِ صبح صادق سے طلوعِ شمس کے درمیان کا وقت وقوف کرنا واجب ہے، جس کو بلا عذر ترک کر دینے سے دم واجب ہوگا۔ (انوار مناسک/ص: ۴۳۷ تا ۴۴۶) مزدلفہ کا ذکر قرآنِ کریم میں وارد ہے:

﴿ فَإِذَآ أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ (البقرة:۱۹۸)

''جب تم عرفات سے واپس ہو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے نزدیک اللہ کا ذکر کرو۔''

البتہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق مشعر حرام سے مراد سارا مزدلفہ ہے۔ (ابن کثیر)

بہتر یہ ہے کہ عرفات سے واپسی (خواہ پیدل ہو یا سوار ہو کر، البتہ پیدل میں سہولت زیادہ ہے) میں مزدلفہ کے راستہ میں بکثرت تلبیہ اور ذکر و استغفار کا اہتمام کریں اور یاد ہو تو یہ دعا پڑھیں:

''اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ أَفَضْتُ وَمِنْ عَذَابِكَ أَشْفَقْتُ وَ إِلَيْكَ رَغِبْتُ وَمِنْ سَخَطِكَ رَهِبْتُ، فَاقْبَلْ نُسُكِيْ وَأَعْظِمْ أَجْرِيْ وَتَقَبَّلْ تَوْبَتِيْ وَارْحَمْ تَضَرُّعِيْ وَاسْتَجِبْ دُعَائِيْ وَاعْطِنِيْ سُؤْلِيْ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ''. (زيلعي:۲/ ۳۰، انوار مناسك ص: ٦٤٦)

''اے اللہ! میں تیرے دربار میں حاضر ہوتا ہوں اور تیری طرف چلتا ہوں اور تیرے عذاب سے خوف زدہ ہوں، تیری ہی طرف رجوع کرتا ہوں اور تیرے غضب سے ڈرتا ہوں، اے اللہ! تو میرے مناسک حج قبول فرما اور اجر عظیم عطا فرما اور میری توبہ قبول فرما اور میری مراد و طلب عطا فرما، اے ارحم الراحمین!''

حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نماز ایک ساتھ ادا فرمائی۔ (بخاری/ کتاب الحج) اس لیے حکم یہی ہے کہ حجاجِ کرام مزدلفہ پہنچنے کے بعد عشاء کا وقت ہونے پر ہی ایک اذان اور ایک اقامت سے پہلے مغرب کی تین رکعات پھر (اگر مسافر ہوں تو دو رکعات ورنہ چار رکعات) عشاء کی نماز

ایک ساتھ ادا کریں، خواہ جماعت سے ہو یا تنہا، لیکن جماعت سے افضل ہے۔ ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی سنت نفل نہ پڑھیں، بلکہ عشاء کی نماز کے بعد پہلے مغرب اور پھر عشاء کی سنتیں اور وتر پڑھیں، اس کے بعد ذکر واذکار میں مشغول رہ کر آرام کا تقاضا ہو تو رات کا کچھ حصہ سو جائیں، پھر آخری حصہ میں اٹھ کر توبہ اور استغفار میں لگے رہنا بڑی خوش قسمتی کی بات ہے، لیٹنا اور سونا منع تو نہیں، مگر اس کے لیے تو ساری زندگی اور مرنے کے بعد قیامِ قیامت تک کا وقت ہے، ایسی رات زندگی میں بار بار کب آتی ہے؟ اس لیے اس رات کو بتوفیق الٰہی خوب وصول کریں۔

جاگنا ہو جاگ لے افلاک کے سایہ تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سایہ تلے

مزدلفہ کی رات میں یاد ہو تو یہ بھی دعا پڑھتے رہیں:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ اَسأَلُكَ أَنْ تَرْزُقَنِیْ فِیْ هٰذَا الْمَكَانِ جَوَامِعَ الْخَیْرِ كُلِّهٖ، وَأَنْ تَصْرِفَ عَنِّیْ السُّوْءَ كُلَّهٗ، فَإِنَّهٗ لَا یَفْعَلُ ذٰلِكَ غَیْرُكَ وَلَا یَجُوْدُ بِهٖ إِلَّا أَنْتَ". (زيلعي اختصاراً: ۲/ ۲۷، انوار مناسك/ص: ٦٤٦)

"اے اللہ! میں تجھ ہی سے اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس مقدس مکان میں تمام بھلائیوں کا مجموعہ عطا فرما اور مجھ سے ہر قسم کی برائیوں کو دور فرما، بلاشبہ تیرے علاوہ یہ کام اور کوئی بھی نہیں کرسکتا اور نہ تیرے سوا اور کوئی اس بھلائی کی بخشش کرسکتا ہے۔"

وقوفِ مزدلفہ جو حج کے واجبات میں سے ہے اس کا اصل وقت طلوعِ صبح صادق سے طلوعِ شمس سے قبل تک ہے، لہٰذا مزدلفہ میں رات گذارنے کے بعد نمازِ فجر اوّل وقت میں پڑھ کر وقوف کیا جائے اور دورانِ وقوف یہ دعا پڑھنا بہت بڑے اجر کا باعث ہے:

"اَللّٰهُمَّ بِحَقِّ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَالْبَیْتِ الْحَرَامِ وَالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالرُّكْنِ وَالْمَقَامِ بَلِّغْ رُوْحَ مُحَمَّدٍ ﷺ مِنَّا التَّحِیَّةَ وَالسَّلَامَ وَأَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ یَا ذَاالْجَلَالِ

وَالإِكْرَامِ". (زيلعي اختصاراً:۲/۲۷، انوار مناسك/ص:٦٤٧)

اے اللہ! مشعر حرام کے طفیل اور تیرے بیت حرام کے طفیل اور رکن اسود اور مقام ابراہیم کے طفیل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ انور کو ہماری طرف سے درود وسلام کا تحفہ پہنچا دیجئے اور ہم کو سلامتی کے گھر (جنت میں) داخل فرما لیجئے، اے عظمت والے کرم والے! ہماری مرادیں پوری فرما۔

مزدلفہ میں روڈ نمبر پانچ پر مسجد مشعر حرام ہے، یہ بالکل اسی جگہ واقع ہے جہاں (اس کے قبلہ کی سمت میں) رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر وقوف فرمایا تھا، اس جگہ پر بعد میں مسجد بنی، جس کی تعمیر وتوسیع وقتاً فوقتاً ہوتی رہی، آخری توسیع سعودی دور ۱۳۹۹ھ میں عمل میں آئی، اس میں بارہ ہزار سے زیادہ افراد نماز ادا کر سکتے ہیں، اس کے پچھلے حصہ میں دو مینار ہیں، جن کی اونچائی ۳۲ میٹر ہے، سمت قبلہ کے علاوہ بقیہ تینوں طرف دروازے ہیں، اس مسجد کے قریب وقوف افضل ہے، مگر سارا مزدلفہ قیام گاہ ہے۔ (از تاریخ مکہ/ص:۱۲۵)

بہتر ہے کہ مزدلفہ سے واپسی پر ستر کنکریاں احتیاطاً ورنہ کم از کم ۴۹ کنکریاں ساتھ لے کر چلیں جو منیٰ میں رمیِ جمرات کے وقت کام آئیں گی۔

میدانِ عرفات:

عرفات ایک ہموار میدان ہے، بڑی کمان کے مانند پہاڑ اس کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے، یہ حدودِ حرم سے باہر حل میں مکہ مکرمہ سے بجانب جنوب مشرق ہے، اور مسجد حرام سے اس کا فاصلہ ۲۲ کلومیٹر ہے، اس کا کل رقبہ ۱۰۴ کلومیٹر مربع زمین پر محیط ہے، اس کی تعیین کے لیے رہنما بورڈ لگے ہیں جن سے حدودِ عرفات کا علم ہوتا ہے، یہ بھی مشعر ہے۔ (یعنی عظمت والی جگہوں میں سے ایک ہے) (تاریخ مکہ مکرمہ/ص:۱۲۷)

عرفہ کے معنی پہچاننے کے ہیں، حضرت آدم وحواء علیہما السلام جب جنت سے زمین پر اتارے گئے تو دونوں ایک دوسرے سے دور اور ایک دوسرے کی تلاش میں تھے، بالآخر اسی میدان میں پہنچ کر دونوں کی ملاقات اور تعارف ہوا، اس مناسبت سے اس جگہ کو عرفات کہا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو احکامِ حج سکھائے اور یہاں آکر پوچھا کہ "ھَلْ عَرَفْتَ؟" کیا آپ نے متعلقہ احکام ومقامات کو پہچان لیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اثبات میں جواب دیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے اس جگہ کا نام عرفات ہوگیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں پر لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کرکے توبہ کرتے ہیں اس لیے اس کو عرفات کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ (از تاریخ مکہ مکرمہ/ص:۱۲۶)

واضح رہے کہ حج کا رکن اعظم اور مرکزی عبادت ۹/ ذی الحجہ کو زوال سے غروب تک عرفات کی حاضری ہے، سارے افعالِ حج کی جان اور حج کا نچوڑ یہی وقوفِ عرفہ ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "اَلْحَجُّ عَرَفَةُ" عرفہ (کا وقوف) ہی حج ہے، عرفات کا سارا میدان موقِف (ٹھہرنے کی جگہ) ہے، میدانِ عرفات کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے:

﴿فَإِذَا أَفَضْتُم مِنْ عَرَفَاتٍ﴾ (البقرة:۱۹۸)

اسی میدان میں تکمیل دین اور اتمامِ نعمت کی آیت کریمہ: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدة: ۳) نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری/کتاب المغازی)

اس مبارک میدان کا سب سے اہم عمل دعائیں کرنا ہے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حق تعالیٰ عرفات والے دن (۹/ ذی الحجہ کو) آسمان دنیا پر (اپنی خاص تجلیات کا) نزول فرما کر فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ پراگندہ حال آئے ہیں اور میری

رضا کے متلاشی ہیں، اے عرفات والو! میں نے تمہاری مغفرت کر دی۔ (تاریخ مکہ مکرمہ/ ص: ۱۲۷)

قبول سب ہوگئیں دعائیں، معاف سب ہوگئیں خطائیں
سحابِ رحمت برس رہا ہے، کرم بآغوش ہو رہے ہیں

آج کل سعودی حکومت نے اس وسیع میدان میں ایسے انتظامات کیے ہیں جو حجاجِ کرام کے لیے راحت بخش وآرام دہ ہیں، نو کشادہ سڑکیں عرفات اور مزدلفہ کے درمیان منظّم طریقے پر تیار کی گئی ہیں، جن پر روشنی کا معقول انتظام ہے، جگہ جگہ پینے اور وضو کے لیے پانی کا انتظام کیا گیا ہے، بیت الخلاء اور ڈسپنسریاں قائم کی گئی ہیں، ۱۴۱۴ھ میں مسجد نمرہ اور جبل رحمت کے اردگرد کی فضا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایسے پائپ فٹ کیے گئے جن سے پانی انتہائی باریک ذرات کی شکل میں نکل کر فضا میں پھیل کر موسم کو خوشگوار بناتا ہے، جس سے گرمی کی شدت میں کمی محسوس ہوتی ہے، نیز میدانِ عرفات میں تقریباً ایک لاکھ نیم کے درخت لگائے گئے ہیں تاکہ ماحول خوشگوار ہو اور ان کے سایہ سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ (تاریخ مکہ/ص: ۱۲۸)

حکم ہے کہ ۹/ ذی الحجہ کو نمازِ فجر منیٰ میں پڑھ کر (تکبیر تشریق، تلبیہ، تسبیح اور ضروریات سے فارغ ہوکر) جب سورج طلوع ہو جائے تو حجاجِ کرام منیٰ سے عرفات کے لیے روانہ ہو جائیں، راستہ میں تلبیہ، تکبیر اور درود واستغفار میں مشغول رہیں، اگر تکان کا اندیشہ نہ ہو اور نشاط وخوش دلی ہو تو منیٰ سے عرفات جو ۶/ میل کے فاصلہ پر ہے پیدل جانا بہتر ہے، جب میدانِ عرفات کے قریب ہوں اور جبل رحمت پر نظر پڑ جائے تو یہ دعا پڑھنا مستحب ہے:

”اَللّٰهُمَّ إِلَيْكَ تَوَجَّهْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ، وَوَجْهَكَ أَرَدْتُّ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَتُبْ عَلَيَّ وَاعْطِنِيْ سُؤْلِيْ، وَوَجِّهْ لِيَ الْخَيْرَ أَيْنَمَا تَوَجَّهْتُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ“. (زیلعی: ۲/۲۳، انوار مناسك/ص: ٦٤٢)

’’اے اللہ! میں تیری ہی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور تجھ ہی پر توکل کرتا ہوں اور تیری ہی ذات کا ارادہ کرتا ہوں، اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما اور میری توبہ قبول فرما اور میری طلب ومراد مجھے عطا فرما، ہر قسم کی خیر کو میرے لیے اس طرف متوجہ فرما جدھر میں متوجہ ہوتا ہوں، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔‘‘

عرفات پہنچ کر اپنے خیمہ میں قیام کریں اور زوال سے قبل کھانا پینا اور دیگر بشری ضروریات سے فارغ ہو جائیں، ممکن ہو تو زوال سے قبل غسل فرمالیں، تاکہ نشاط پیدا ہو جائے۔ (لیکن اس غسل میں صابون استعمال کرنا اور بدن سے میل کچیل دور کرنا حالت احرام میں ہونے کی وجہ سے منع ہے) زوال ہوتے ہی فوراً ظہر کی اذان ہوتی ہے، اذان کے بعد میدانِ عرفات کی مسجد نمرہ کی طرف چلیں جو میدان کی مغربی حدود میں وادیٔ ’’عرنہ‘‘ کے بطن میں واقع ہے، عرفہ کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں پر ایک خیمہ میں قیام فرمایا تھا اور زوال کے بعد قریب ہی وادیٔ عرنہ میں خطبہ دیا اور نماز کی امامت فرمائی، جس جگہ کھڑے ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تھا یہ وادیٔ عرفات سے باہر ہے، نتیجۃً اس جگہ جو مسجد نمرہ بنی وہ بھی عرفات سے باہر تھی، بعد میں اس مسجد کی توسیع ہوتی رہی، آخری توسیع سعودی دور میں ہوئی، جس میں مسجد نمرہ دو حصوں میں منقسم ہے، اگلا حصہ قبلہ کی سمت والا عرفات سے باہر ہے اور یہ مسجد کا قدیمی حصہ ہے، اور پچھلا حصہ دو منزلہ عرفات کے اندر ہے، اور یہ بھی بعد کی توسیعات سے ہے، مسجد کے اندر عرفات کی حد واضح کرنے کے لیے بورڈ آویزاں ہیں تاکہ حجاج کرام نماز ظہر وعصر سے فارغ ہو کر مسجد کے پچھلے حصہ میں آجائیں یا پھر مسجد سے نکل کر عرفات کی حدود میں مغرب تک وقوف کریں، اس مسجد میں تین لاکھ پچاس ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے۔ (تاریخ مکہ/ص: ۱۳۰)

کہتے ہیں پورے حجازِ مقدس میں تین مسجدیں بہت بڑی ہیں: (۱) مسجد حرام

(۲) مسجد نبوی (۳) مسجد نمرہ۔ (انوار مناسک/ص:۱۳۵)

الغرض مسجد نمرہ میں امام خطبۂ جمعہ کی طرح نماز سے قبل دو خطبے دے گا، اور خطبہ سے فراغت پر ظہر وعصر کو ظہر کے وقت میں الگ الگ دو اقامتوں کے ساتھ قصر کرتے ہوئے دو رکعات پڑھی جائے گی۔

حضرت مفتی شبیر احمد قاسمی مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں تحقیق سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں نماز پڑھانے والے امام نجد سے آتے ہیں اور مسافر ہی ہوتے ہیں، اس لیے ہمارے وہ مسافر حجاج جن کو مسجد نمرہ میں نماز کا موقع ملے تو وہ امام کے ساتھ سلام پھیر دیں، لیکن مقیم حجاج امام کے سلام کے بعد سلام پھیرے بغیر فوراً کھڑے ہو کر دو رکعات سورۂ فاتحہ اور سورت پڑھے بغیر قیام اور رکوع سجدہ کر کے اپنی نماز مکمل کریں، اور جو مسجد نمرہ سے دور ہوں وہ اپنے اپنے خیموں میں روزانہ کی طرح اپنے اپنے وقتوں میں نماز پڑھیں، (مسجد نمرہ میں ظہر وعصر پڑھنے والے اور اپنے خیموں میں ظہر پڑھنے والے) نماز سے فارغ ہو کر نیت کر کے وقوف شروع کر دیں، ہو سکے تو سایہ کے بجائے دھوپ میں قبلہ رُخ کھڑے ہو کر وقوف کریں جب کہ کسی ضرر یا بیماری کا اندیشہ نہ ہو، ورنہ اپنے خیمہ میں بھی وقوف کیا جا سکتا ہے اور وقوف کے وقت بیٹھنا اور لیٹنا بھی جائز ہے۔ یاد ہو تو وقوف کی ابتدا میں یہ دعاء پڑھیں:

”لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ، إِنَّ الْخَیْرَ خَیْرُ الْآخِرَةِ، اَللّٰهُمَّ لَا عَیْشَ إِلَّا عَیْشُ الْآخِرَةِ، اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ بِالْهُدٰی وَنَقِّنِیْ بِالتَّقْوٰی وَاغْفِرْلِیْ فِی الْآخِرَةِ وَالْأُوْلٰی“.

(حصن حصین/ص:١٨٤، انوار مناسك/ص:٦٤٤)

”اے اللہ! میں حاضر ہوتا ہوں، بلاشبہ اصلی بھلائی آخرت ہی کی ہے اور حقیقی زندگی بھی آخرت ہی کی ہے، اے اللہ! تو اپنی ہدایت وعنایت سے مجھے ہدایت عطا فرما اور پرہیزگاری سے مجھے پاک وصاف فرما اور دنیا وآخرت میں میری مغفرت فرما۔

اس دوران ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر پورے خلوص اور دلجمعی کے ساتھ تلبیہ، تسبیحات، ذکر واذکار اور دعا واستغفار کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہیں، کہتے ہیں کہ وقوفِ عرفات کے دوران سب سے افضل دعا دعاءِ توحید ہے، جس کے متعلق حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے میدانِ عرفات میں جو دعائیں کیں ان میں سب سے بہترین دعا یہ ہے:

”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ“. (ترمذی:۲/۱۹۹، زیلعی:۲/۲۵، انوار مناسک/ص: ٦٤٣)

”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کے لیے ملک ہے اور اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں، اسی کے ہاتھ میں تمام بھلائیاں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

علاوہ ازیں میدانِ عرفات میں حسب ذیل دعا کرنا بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے:

”اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَّفِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَّفِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا، اَللّٰهُمَّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْلِيْ أَمْرِيْ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَّسَاوِسِ الصَّدْرِ وَشَتَاتِ الْأَمْرِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا يَلِجُ فِي اللَّيْلِ وَشَرِّ مَا يَلِجُ فِي النَّهَارِ وَشَرِّ مَا تَهُبُّ بِهِ الرِّيْحُ وَشَرِّ بَوَائِقِ الدَّهْرِ“. (غنية الناسك/ص:٨٣، حصن حصين ص:١٨٣، انوار مناسك/ص:٦٤٣)

”اے اللہ! میرے دل کو نور سے بھر دے اور میرے کانوں کو نور سے بھر دے اور میری آنکھوں کو نور سے بھر دے اور میرا سینہ کھول دے اور میرے ہر دنیوی واخروی کام کو آسان فرما، اے اللہ! میں تجھ سے دل کے وسوسوں سے پناہ مانگتا ہوں اور کام کی پراگندگی اور پریشانی سے پناہ مانگتا ہوں اور قبر کی آزمائش سے پناہ مانگتا ہوں، اے اللہ! میں تیرے دربار

میں ہراس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو رات میں داخل ہو اور ہراس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو دن میں داخل ہو اور ہراس چیز کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جس کو ہوا اپنے ساتھ لے آتی ہو اور زمانہ کی مصیبتوں کے شر سے پناہ چاہتا ہوں۔“

وقوفِ عرفات کے دوران جب دھوپ ہلکی پڑ جائے اور آسانی ہو تو تلبیہ پڑھتے ہوئے جبل رحمت کے قریب جائیں (جبل رحمت میدانِ عرفات کی مشرقی سمت میں سڑک نمبر ۷ اور ۸ کے درمیان سخت پتھر والی چھوٹی سی پہاڑی ہے، اس کے نشیب میں بڑی بڑی چٹانیں ہیں، جن کے قریب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی شام میں اپنی قصواء نامی اونٹنی پر وقوف فرمایا اور چہرۂ انور قبلہ کی طرف کر کے غروبِ شمس تک دعا میں مشغول رہے، مسجد نمرہ سے اس کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر ہے، جبل رحمت کے نیچے دائیں طرف کی چڑھائی پر سطح زمین سے تھوڑی بلندی پر مسجد صخرۃ ہے، اس کے گرد چھوٹی سی چہار دیواری ہے، جس کے اندر وہ چٹانیں ہیں جن کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عرفات کے دن قصواء اونٹنی پر تشریف فرما کر دعا میں مشغول تھے، لہٰذا اگر ممکن ہو تو اس جگہ کے قریب آئیں) اور ایسی جگہ پر وقوف کی کوشش کریں جہاں سے قبلہ کی طرف رُخ کرنے میں جبل رحمت سامنے اور اپنی دائیں جانب ہو، پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر تکبیر، تہلیل، تسبیح، تحمید، تلبیہ اور استغفار کرتے ہوئے حضورِ قلبی کے ساتھ اپنے لیے اور پوری امت کے لیے جم کر دل کھول کر دعائیں کریں، ہر دعا کا تین بار تکرار کریں، روایتوں میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کی شام کو کثرت کے ساتھ جو دعا کی وہ حسب ذیل ہے:

”اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَالَّذِىْ تَقُوْلُ وَخَيْرًا مِّمَّا نَقُوْلُ، اَللّٰهُمَّ لَكَ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِىْ، وَ إِلَيْكَ مَآبِىْ، وَلَكَ رَبِّ تُرَاثِىْ، اَللّٰهُمَّ إِنِّىْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَوَسْوَسَةِ الصَّدْرِ وَشَتَاتِ الْأَمْرِ“. (غنية/ص:۸۳، انوار مناسك ص:٦٤٤)

’’اے اللہ! تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں ایسی جیسی تونے کی ہیں اور ایسی تعریف جو بہتر ہے اس تعریف سے جو ہم کریں، اے اللہ! میری نمازیں، میری قربانی ومناسک اور میری زندگی وموت تیرے ہی لیے ہے اور تیرے ہی پاس میرا ٹھکانہ ہے اور تیرے ہی لیے اے میرے رب! میری میراث ہے، اے اللہ! میں قبر کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور دل کے وسوسوں سے پناہ چاہتا ہوں اور کام کے انتشار اور پراگندگی سے پناہ چاہتا ہوں۔‘‘

صاحبو! میدانِ عرفات کے اس لکھوکھا کے مجمع میں اللہ تعالیٰ کے بے شمار بندے ایسے ہوں گے جو اس وقت کی قدر وقیمت اور مقام کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہوئے اس دوپہر کی ایک ایک گھڑی اور اس سہ پہر کا ایک ایک لمحہ اپنے رب کے آگے ہاتھ پھیلانے اور پیشانی رگڑنے، رونے، گڑگڑانے اور توبہ، استغفار ومناجات میں مصروف ہوں گے، ان میں کیسے کیسے مخلص ومتقی، قطب وابدال اور اولیاءِ کاملین بھی ہوں گے، کیا ان کی دعائیں تنہا اپنے لیے ہی ہوں گی؟ اور کیا ربِ کریم کی رحمتوں کا نزول صرف ان ہی کے لیے ہوگا؟ ہرگز نہیں، قطعاً نہیں، بالکل بھی نہیں؛ کیوں کہ آج تو وہ دن ہے جس میں ربِ کعبہ کا کرمِ بے حساب اور رحمت بے پایاں اپنے سایۂ دامن میں لینے کے لیے بہانہ ڈھونڈتی ہے نا، اللہ والوں کی سفارش سے بڑھ کر کیا بہانہ ہوگا؟ ان مقبولین کے طفیل بھی خدا معلوم آج میدانِ عرفات میں کتنے غیر مقبول مقبول بن جائیں گے، کریم جب دینے پر آئے اور کریم کے در کے بھکاری مانگنے میں کمی نہ کریں تو داد ودہش میں کیا کمی ہوگی؟ ہر کس وناکس، اہل وناہل، کھرے اور کھوٹے سب ہی اپنی اپنی قسمتوں کے حصہ کے مطابق نعمتوں سے مالا مال ہوں گے۔

حق تعالیٰ ہمارا بھی ان مخلص ومقبول بندوں میں شمار فرمالیں، محروم نہ فرمائیں۔ آمین۔

یوم الجمعہ/ ۱۹/ شعبان المعظم/۱۴۳۲ھ مطابق: ۲۲/ جولائی/ ۲۰۱۱ء

’’اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ‘‘.

(۳۳)

مدینہ طیبہ کے فضائل قرآن وحدیث کی روشنی میں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَـنۡ جَـابِرِ بۡنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهَا قَالَ: سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوۡلُ: "إِنَّ الـلّٰهَ سَمَّى الۡمَدِيۡنَةَ طَابَةَ". (رواه مسلم، كذا في المشكوٰة/ص: ۲۳۹/ باب حرم المدينة حَرَسَهَا اللّٰهُ تعالىٰ/ الفصل الأول) (حديث قدسي نمبر:٦)

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ''حق تعالیٰ نے مدینہ کا نام ''طابہ'' رکھا ہے۔''

مدینہ طیبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن ومدفن ہے۔

مدینہ طیبہ وہ مقدس اور مبارک شہر ہے جس کو رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کی ہجرت کی جگہ اور آخری آرام گاہ کے لیے تجویز فرمایا، اس کی عظمت وفضیلت کے لیے یہی کافی ہے کہ مدینہ طیبہ نے ہمیشہ کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آغوش

میں لے لیا اور آج بھی حضور اکرم ﷺ کا جسد اطہر اس میں موجود ہے، یہاں آج بھی ہزاروں جانثار اور وفادار خوابِ راحت کے مزے لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کا چپہ چپہ آپ ﷺ کے انوار کی برکات سے معمور اور ذرّہ ذرّہ پرنور ہے اور تا قیامت رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عرب کے چاند کا یہ بھی عجب اک معجزہ دیکھا
کہ خود غائب ہے لیکن چاندنی معلوم ہوتی ہے

مدینہ طیبہ کے نام:

مدینہ کی فضیلت وعظمت کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے کہ اس مقدس شہر کے کئی نام ہیں، چناں چہ ابن حجر مکیؒ نے فرمایا کہ ''مدینہ طیبہ کے تقریباً ایک ہزار نام ہیں۔'' (فضائل حج /ص:۱۴۴) اور ہمارے استاذِ مکرم حضرت مفتی سید مصلح الدین احمد صاحب قاسمی بڑودوی مدظلہ نے فرمایا کہ ''وفاء الوفاء'' میں مدینہ طیبہ کے چورانوے (۹۴) نام ذکر کیے گئے ہیں۔'' (انمول حج /ص:۲۲۴)

ظاہر ہے کہ ناموں کی اتنی کثرت بھی مسمّٰی کے شرف وفضل پر دلالت کرتی ہے، البتہ اس کے مشہور ومعروف ناموں میں سے ایک نام تو وہ ہے جس کو خود رب العالمین نے تجویز فرمایا اور دوسرا نام وہ ہے جس کو رحمۃ للعالمین نے تجویز فرمایا، عجیب بات یہ ہے کہ ناموں میں بھی اس کے بے شمار فضائل پوشیدہ ہیں۔ مثلاً پروردگار عالم نے اس مقدس شہر کا نام ''طابۃ'' رکھا اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام مدینہ رکھا۔

چناں چہ مذکورہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوا کہ حق تعالیٰ نے مدینہ سکینہ کا نام طابۃ رکھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ رب العزت نے نبیٔ رحمت ﷺ کی لسانِ مقدس کے ذریعہ مدینہ کا نام طابہ ظاہر فرمایا ہے۔ اور ایک روایت میں ''طَیْبَۃ'' اور ''طَیِّبَۃٌ'' بھی ہے۔

اس سلسلہ میں محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ ''طابہ، طیبہ

اور طیّبہ ان تینوں کے معنیٰ پاکیزہ اور خوشگوار کے ہیں، حق تعالیٰ نے اس کا یہ نام رکھا اور اس کو ایسا ہی بنا دیا کہ اس میں روحوں کے لیے جو خوشگواری اور سکون اور اطمینان و پاکیزگی ہے وہ بس اسی کا حصہ ہے۔ (معارف الحدیث:۴/۲۸۰)

واقعی یہ شہر اسم بامسمّٰی ہے، یہ شرک کی گندگی سے پاک اور اس کی آب و ہوا نہایت ہی خوشگوار، عمدہ وصاف اور معتدل مزاج والوں کے عین موافق ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کے رہنے والے بھی عموماً نہایت ہی خوش وخرم ہوتے ہیں، اور جو بھی وہاں جاتا ہے اسے زندگی کی بہار نصیب ہوتی ہے، وہاں کا ہر زائر گویا بزبانِ حال کہتا ہے:

نظر کے سامنے جنت بھی اور کوثر بھی کیا کہنا
مدینہ جاکے قدر زندگی معلوم ہوتی ہے

مدینہ کا دورِ جاہلیت والا نام:

اس کا دوسرا نام جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا وہ ''مدینہ'' ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ''مدینہ'' دین سے مشتق ہے، جس کے معنیٰ طاعت کے بھی ہیں، اس لیے یہ نام تجویز کیا کہ اس شہر میں اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی اطاعت کی جائے؛ کیوں کہ مدینہ دین کا، دینی احکام کا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا اصل مرکز ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی برکت سے ساری دنیا میں یہیں سے دین پھیلا اور انسانیت پروان چڑھ کر اوجِ رفعت تک پہنچی۔ ورنہ حضور اکرم ﷺ کی ہجرت سے پہلے یہاں بھی بے دینی اور بت پرستی کا غلبہ تھا، دورِ جاہلیت میں اس کا نام ہی ''یثرب'' تھا، اور جہلاءِ عرب بھی اس کو اسی نام سے موسوم کرتے تھے، جیسا کہ خود قرآن نے جہلاءِ عرب کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا﴾ (الأحزاب:۱۲)

جاہلیت کے اس نام ہی سے اس کی قباحت و مذمت معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''یثرب'' کہنے کو پسند نہیں فرمایا؛ کیوں کہ یہ ایک بت یا بڑے

ظالم شخص کا نام تھا، نیز زمانۂ اسلام سے پہلے کا نام تھا جس سے دورِ جاہلیت کی بو آتی تھی، پھر معنوی طور پر بھی یہ نام بالکل مناسب نہ تھا، کہ ''یثرب'' کے معنی ہلاکت اور فساد کے آتے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی برے نام بدل کر اچھا نام رکھنے کی، چناں چہ آپ ﷺ نے بھی ہجرت کے بعد اس کا نام ''یثرب'' سے بدل کر مدینہ رکھا، جس کے معنی شہر کے ہیں، مراد حضور اکرم ﷺ کا شہر ہے۔

صاحبو! اسے مدینۃ الرسول اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ مکہ المکرّمہ میں تو اپنی ولادت کے بعد سے ترپن (۵۳) سال تک رہے، جب کہ مدینہ طیبہ میں آپ ﷺ کا قیام صرف دس سالہ نہیں، بلکہ ہجرت سے قیامت تک کا ہے، اور یہی وہ مقدس شہر ہے جو قرآن اور صاحب قرآن کی برکت سے فتح ہوا، باقی دوسرے شہر عموماً تلوار اور طاقت سے فتح ہوئے، جب اللہ رب العزت کے حکم سے رحمت عالم ﷺ یہاں آ کر بسے تو نہ صرف یہ کہ یہاں ایک دینی شہر بس گیا، بلکہ دینی اعتبار سے یہ بستی ساری بستیوں پر غالب آ گئی۔

دینی اعتبار سے مدینہ کا غلبہ:

حدیث شریف میں ہے:

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''أُمِرْتُ بِقَرْیَةٍ تَأْکُلُ الْقُرٰی، یَقُوْلُوْنَ ''یَثْرِبُ'' وَ هِيَ الْمَدِیْنَةُ تَنْفِی النَّاسَ کَمَا یَنْفِی الْکِیْرُ خَبَثَ الْحَدِیْدِ''. (متفق علیه، مشکوٰۃ/ص: ۲۳۷)

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے ایک ایسی بستی کی طرف ہجرت کا حکم دیا گیا جو تمام بستیوں کو کھا لے، یعنی تمام بستیوں پر غالب رہے، لوگ اس بستی کو یثرب کہتے ہیں اور اب وہ مدینہ ہے، اور وہ برے آدمیوں کو اس طرح نکال دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکال دیتی ہے۔''

اس حدیث پاک سے بھی مدینہ طیبہ کی عظمت و خصوصیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس

میں ایک بات تو یہ فرمائی کہ مدینہ کی بستی تمام بستیوں پر (دینی اعتبار سے) غالب رہے گی، اب اگر اس کو ظاہر پر محمول کریں تو بھی یہ حقیقت ہے؛ کیوں کہ جو لوگ بھی مدینہ طیبہ میں رہتے ہیں وہ دوسری بستی والوں پر غالب رہتے ہیں، یعنی دوسرے شہروں کو فتح کر لیتے ہیں، دیکھئے تاریخی طور پر بھی اس عظیم الشان شہر کی یہ خصوصیت ثابت ہے کہ مدینہ طیبہ میں آکر بسنے والے دوسرے شہروں پر غالب اور اکثر شہروں کے فاتح رہے ہیں، مثلاً سب سے پہلے قوم عمالقہ آکر اس شہر میں آباد ہوئی، اس نے غلبہ حاصل کیا اور کتنے ہی شہروں اور علاقوں کو فتح کیا، پھر یہود آئے تو وہ عمالقہ پر غالب ہوئے، اس کے بعد نصاریٰ پہنچے تو انہوں نے یہودیوں پر اپنا اقتدار قائم کیا، یہاں تک کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شہر کو اپنا مسکن اور وطن بنایا تو ان کو جس طرح غلبہ حاصل ہوا اور جس طرح انہوں نے مشرق ومغرب، شمال وجنوب اور عرب وعجم بلکہ پورے عالم کو اپنے زیر اثر کیا وہ سامنے کی بات ہے۔ (مظاہر حق جدید: ۲/ ۸۷۷)

مدینہ کی خصوصیت:

علاوہ ازیں حدیث میں مدینہ کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ ”مدینہ طیبہ برے آدمیوں کو اس طرح نکال دیتا ہے جس طرح آگ کی بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکال دیتی ہے۔ علماء نے اس کے دو مطلب بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ اس کا تعلق ابتداءِ اسلام سے ہے، اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ خاص ہے، جس کی دلیل میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں رہنے کی آپ ﷺ سے بیعت کی، کچھ ہی دنوں کے بعد جب وہ شدید بخار میں مبتلا ہوا، جس کی وجہ سے اس نے مدینہ طیبہ میں رہنا گوارا نہ کیا، وہاں سے چلے جانے کا ارادہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: ”یَا مُحَمَّدُ! أَقِلْنِي بَيْعَتِي“ اے محمد! میری بیعت توڑ دیجئے! میں یہاں رہنا نہیں چاہتا، آپ ﷺ نے ازراہِ

شفقت انکار فرما دیا، یا اس وجہ سے انکار فرمایا کہ جس طرح اسلام کی بیعت کو فسخ کر دینا جائز نہ تھا اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کی بیعت کو بھی فسخ کر دینے کی اجازت نہ تھی، مگر وہ دیہاتی دوبارہ اور پھر سہ بارہ آ کر اصرار کرنے لگا، اور آپ ﷺ ہر بار انکار فرماتے رہے تو وہ آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر ہی مدینہ طیبہ سے بھاگ گیا، جب آپ ﷺ کو اس کا علم ہوا تب یہ ارشاد فرمایا:

"إِنَّمَا الْمَدِيْنَةُ كَالْكِيرِ تَنْفِيْ خَبَثَهَا وَتَنْصَعُ طِيْبَهَا". (متفق عليه، كذا في المشكوٰة/ص: ٢٣٧)

"مدینہ تو بھٹی کے مانند ہے، جو اپنے میل کو دور کر دیتا ہے اور اپنے اچھے آدمی کو نکھار دیتا ہے اور برے کو نکال دیتا ہے۔" یا مطلب یہ ہے کہ برے آدمی کو نکال باہر کرتا ہے اور پاک باطن و مخلص آدمی کو پلید ذہن اور بدطینت آدمی سے الگ کر دیتا ہے، ہرجائیوں کو یکجائیوں سے اور مجاوروں کو مجاہدوں سے جدا کر دیتا ہے۔ بہرحال بعض علماءِ محققین کی تشریح کے مطابق اس کا تعلق یا تو حضور ﷺ کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا۔ یا پھر دوسرا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے قریب جب دجال نمودار ہوگا اس وقت اس مقدس شہر کی یہ خاصیت ظاہر ہوگی کہ مدینہ اپنے اندر سے ہر برے آدمی کو نکال دے گا۔

مدینہ کی حفاظت:

جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَنْفِيَ الْمَدِيْنَةُ شِرَارَهَا، كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ". (رواه مسلم، مشكوٰة/ص: ٢٤٠)

"قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک مدینہ اپنے فاسد اور خراب عناصر (مراد برے آدمیوں کو) اس طرح باہر نہ نکال دے جس طرح لوہار کی بھٹی لوہے کے میل

کچیل کو دور کر دیتی ہے۔“

نیز بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ”ہر شہر میں دجال کا گذر ہوگا، مگر مکہ معظّمہ اور مدینہ طیبہ میں اس کا داخلہ نہ ہوگا؛ کیوں کہ فرشتے ان دونوں مقدس شہروں کی حفاظت کریں گے، اس وقت مدینہ طیبہ میں تین زلزلے آئیں گے جن کی وجہ سے گھبرا کر ہر وہ شخص جو اپنے ایمان میں مخلص نہ ہوگا مدینہ سے نکل پڑے گا۔“

بعض علماء نے ستر ہزار کی تعداد بیان کی۔ (والعیاذ باللہ العظیم)

اس وقت خالص دیندار مدینہ طیبہ میں رہ جائیں گے اور اس طرح دین ساری دنیا سے سمٹ کر مدینہ میں آجائے گا، جس کی پیشین گوئی حضور ﷺ نے اس طرح فرمائی:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:”إِنَّ الإِیْمَانَ لَیَأْرِزُ إِلٰی الْمَدِیْنَةِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَیَّةُ اِلٰی جُحْرِهَا“. (بخاری، حدیث نمبر: ۱۸۷۶، مشکوٰۃ: ۲۹)

”بلاشبہ ایمان مدینہ طیبہ کی طرف اس طرح کھینچ کر آجائے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف آجاتا ہے۔“ یہاں ایمان سے مراد اہل ایمان ہیں اور مدینہ سے مراد مکمل حجازِ مقدس ہے جس میں مدینہ اور اس کے اطراف کا بہت سا حصہ آ گیا، جس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا:

”إِنَّ الدِّیْنَ لَیَأْرِزُ إِلٰی الحِجَازِ......الخ (مشکوٰۃ، ترمذی/ص: ۳۰)

سانپ سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ دوسرے جانوروں کے مقابلہ میں بڑی سرعت سے اپنی حفاظت کے لیے بل میں گھس جاتا ہے اور پھر بمشکل نکلتا ہے، اہل ایمان کی بھی یہی کیفیت ہوگی۔

محدثین کا ایک قول یہی ہے کہ اس کا ظہور قربِ قیامت کے وقت ہوگا۔ (واللہ اعلم)

لیکن صحیح یہ ہے کہ مدینہ طیبہ کی یہ خصوصیت ہر زمانہ میں رہی ہے کہ وہ اپنے اندر سے برے لوگوں کو نکال ہی دیتا ہے، بس قدرتی طور پر انہیں مستقل قیام کا موقع ہی نہیں ملتا۔

مدینہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت:

مدینہ پاکباز اور پاک باطن لوگوں کا مرکز ہے، اور پاکوں کے پاک صاحب لولاک کا مسکن ومدفن ہے، اور وطن ومسکن سے محبت انسانی فطرت ہے نا! تو حضور اکرم ﷺ کو بھی اس سے بہت محبت تھی، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَنَظَرَ إِلٰى جُدُرَانِ الْمَدِيْنَةِ أَوْضَعَ رَاحِلَتَهٗ، وَ إِنْ كَانَ عَلٰى دَابَّةٍ حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا". (بخاری، مشکوٰۃ/ص: ۲٤٠)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تو مدینہ طیبہ کی دیواریں (یعنی اس کی عمارتیں) دیکھ کر (فرطِ محبت میں) اپنے اونٹ کو دوڑانے لگتے اور اگر کسی سواری پر سوار ہوتے تو اس کو تیز کر دیتے، اور یہ اس وجہ سے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے محبت تھی۔

بہرکیف مدینہ طیبہ کی حرمت، فضیلت، عظمت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے دلوں میں بھی اس کی بے پناہ محبت اور عظمت ہو۔

مدینہ طیبہ کی عظمت:

جس طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور صلحاء کے دل میں مدینہ طیبہ کی بے پناہ محبت وعظمت تھی جس کی وجہ سے وہ ایسا کوئی کام یا کلام کرنا بھی پسند نہ فرماتے جو عظمت مدینہ کے خلاف ہو۔ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے مکان کے کواڑ بنوانے کی ضرورت پیش آئی تو آپ ﷺ نے بنانے والے کو فرمایا شہر سے باہر بقیع کی طرف جائے اور وہاں سے بنا کر لائے، اس لیے کہ ان کے بنانے کی آواز کا شور ہوگا۔ (جو عظمت مدینہ کے خلاف ہے۔) (فضائل حج/ص:۱۱۳)

حضرت امامنا العلام امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ کے بارے میں منقول ہے کہ مدینہ طیبہ کے سفر کے دوران عموماً ایک دن یا تین دن سے زیادہ قیام نہ فرماتے اور اس قیام کے دوران عموماً روزہ رکھتے تھے، پیشاب پاخانہ نہ کرتے، فرماتے تھے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ جس زمین پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک لگے ہوں میں اس جگہ کو ملوث کروں، یہ میرے نزدیک مدینہ طیبہ کی عظمت کے خلاف ہے۔

امام دار الہجرۃ والسنۃ امام مالکؒ مدینہ طیبہ میں سترہ سال کی عمر سے مسجد نبوی میں درسِ حدیث میں مشغول ہو گئے اور پوری زندگی مدینہ طیبہ میں گذاری، مدینۃ الرسول ﷺ سے باہر کہیں جانا پسند نہ تھا، تین دن میں ایک مرتبہ قضاءِ حاجت کے لیے تشریف لے جاتے اور وہ بھی مدینہ سے باہر، مدینہ طیبہ کی زمین پر کبھی جوتے پہن کر نہ چلتے، اور نہ سوار ہو کر کبھی نکلتے، مدینۃ الرسول سے اس محبت وعظمت کا انہیں جو نقد صلہ ملا اسے خود ہی بیان فرماتے ہیں:

"مَابِتُّ لَيْلَةً إِلَّا رَأَيْتُ فِيْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ". (مقدمۂ او جز/ص: ۱۴)

میری کوئی رات ایسی نہیں گذری جس میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب نہ ہوئی ہو۔ (از: مبادیاتِ فقہ/ص:۵۲)

روضۂ اقدس کی زیارت کی فضیلت:

یاد رکھو! اتباعِ سنت کی حالت میں جس طرح خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بڑی سعادت ہے اسی طرح جس خوش قسمت کو مدینہ طیبہ اور رسول اللہ ﷺ کے روضہ کی زیارت وحاضری آداب کی رعایت کے ساتھ نصیب ہو جائے تو یہ اس کے لیے بہت بڑی خیر اور سعادت کی بات ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا مَرْفُوْعًا "مَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِيْ بَعْدَ مَوْتِيْ كَانَ كَمَنْ زَارَنِيْ فِيْ حَيَاتِيْ". (رواه البيهقى فى شعب الإيمان، مشكوٰة/ص: ۲۴۱)

"جس نے حج کیا، پھر میری قبر کی زیارت کی میری وفات کے بعد تو اس کی

فضیلت ایسی ہے جیسے میری زندگی میں میری زیارت کی۔‘‘

حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قبر اطہر میں بلکہ تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام کا اپنی قبور میں زندہ ہونا اس پر جمہور امت کا اتفاق ہے (اگر چہ حیات کی تعبیر اور نوعیت میں اختلاف ہے، ہمارے یہاں راجح یہی ہے کہ آپ ﷺ زندہ ہیں حیاتِ جسمانی کے ساتھ) ایسی صورت میں کسی امتی کا قبر شریف پر حاضر ہوکر سلام عرض کرنا ایک طرح آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا اور بالمشافہہ سلام کا شرف حاصل کرنے ہی کی ایک صورت ہے، اور بلاشبہ یہ وہ سعادت ونعمت ہے جس کو اہل محبت ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ روضۂ اقدس کی زیارت اگر چہ حج وعمرہ کا کوئی رکن اور جز نہیں؛ لیکن ایک صاحب ایمان کے لیے زیارتِ بیت اللہ کے بعد اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوسکتی ہے کہ اسے روضۂ رسول اللہ ﷺ کی بھی زیارت نصیب ہوجائے، یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے فضائل کے حصول کے لیے حضرات صحابہ وصلحاء نے مستقل اسفار بھی فرمائے ہیں۔

چناں چہ سید المؤذنین حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو بہت ہی مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال اور بیت المقدس کی فتح کے بعد آپ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اجازت سے شام تشریف لے گئے تھے اور وہیں نکاح بھی کرلیا تھا، ایک دن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی تو آپ ﷺ نے ناز ومحبت کے انداز میں فرمایا: ارے بلال! یہ کیا ظلم ہے، ہماری زیارت کے لیے بھی وقت نہیں ملتا؟ بیدار ہوتے ہی سفر کے لیے اونٹنی تیار کی اور زیارت کے لیے حاضر ہوئے، آپ کی آمد کی خبر سن کر حضرات حسنین کریمین تشریف لائے، سلام کے بعد مصافحہ ومعانقہ کیا اور اذان کی درخواست کی، اس پر آپ نے اذان دی تو مدینہ طیبہ میں اس اذانِ بلالی کو سنتے ہی لوگوں میں حضورا کرم ﷺ کے زمانہ کی یاد تازہ ہوگئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی جس وقت شام کے دورے پر تھے تو وہاں سے مستقل

ایک سوار کو صرف اس لیے مدینہ طیبہ بھیجتے تھے کہ وہ روضۂ طیبہ پر حاضر ہو کر ان کی طرف سے سلام پیش کرے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب ''جذب القلوب'' میں رقم طراز ہیں:

''خوب سمجھ لو! حضور اکرم ﷺ کی (قبر شریف کی) زیارت کا ارادہ کرنا اور مسجد نبوی کی زیارت سے مشرف ہونا مقبول حج کے برابر ہے، ارے زیارتِ مدینہ (وزیارتِ روضۂ طیبہ) اس حج کے بھی قبول ہونے کا ذریعہ ہے جس سے فارغ ہو کر آپ یہاں آئے ہیں''۔ (حج وعمرہ فلاحی کے ہمراہ/ص:۲۵۸)

آدابِ زیارتِ مدینہ:

لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آداب ومستحبات کی مکمل رعایت کے ساتھ حاضری دی جائے۔ حضرات علماء نے لکھا ہے کہ جب مدینہ طیبہ جانے کا ارادہ ہو تو سب سے پہلا ادب ہے حسن نیت، جس کا مطلب یہ ہے کہ

(۱) ''خالص اللہ کی رضا کے واسطے یعنی ریا اور نام ونمود سے بچتے ہوئے روضۂ پاک اور مسجد نبوی دونوں کی زیارت کی نیت کرے''۔

بعض علماء نے صرف روضۂ اقدس کی زیارت کی نیت سے جانے کو راجح قرار دیا ہے، اور افضل تو یہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی نیت کی جائے، شاید اسی کی برکت اور اتباعِ سنت و سچی طلب سے حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہو جائے۔ پھر چوں کہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہونا نصیب ہو رہا ہے، لہٰذا بغیر تحفہ وہدیہ کے خالی ہاتھ جانا محبت ومروت کے خلاف ہے، اور آپ ﷺ کی خدمت میں درود شریف سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں ہے۔ اس لیے دوسرا ادب ہے درود شریف کی کثرت، مطلب یہ ہے کہ

(۲) ''مدینہ طیبہ جاتے ہوئے پورے راستہ حب رسول ﷺ میں بکثرت مستغرق ہو کر درود شریف کا ورد رکھے''۔

اس سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں بھی اضافہ ہوگا، علاوہ ازیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا تصور کرے، اس کے لیے کوئی مناسب کتاب پڑھے، سنے، تاکہ مدینۃ الرسول اور روضۃ الرسول کی زیارت کا شوق اور بڑھے، اس کے بعد جب حدودِ مدینہ طیبہ میں داخل ہونے کا وقت آئے تو یہ دعا پڑھے:

”اَللّٰھُمَّ ھٰذَا حَرَمُ رَسُوْلِكَ، فَاجْعَلْ دُخُوْلِیْ وِقَایَةً مِنَ النَّارِ، وَ أَمَاناً مِّنَ الْعَذَابِ وَسُوْءِ الْحِسَابِ“. (قاضی خان: ۱/۳۱۹، انوار مناسك/ص: ٦٥٦)

”اے اللہ! یہ تیرے رسول ﷺ کا حرم پاک ہے، اس کو میرے لیے جہنم سے خلاصی کا ذریعہ بنادے اور اس کو میرے لیے عذابِ جہنم و حساب سے حفاظت کا ذریعہ بنادے۔“

حدودِ مدینہ طیبہ بڑے بڑے دو پہاڑوں کے درمیان وسیع وعریض ہموار علاقہ ہے، جس کے ایک طرف جبل اُحد اور دوسری طرف جبل عیر ہے، اور بعض روایات میں جبل اُحد کی جگہ جبلِ ثور آیا ہے:

”المدینةُ حَرَمٌ مَا بَیْنَ عَیْرٍ إِلیٰ ثَوْرٍ“...... الخ (مسلم: ۲/۴۴۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”مدینہ طیبہ میں جبل عیر سے جبل ثور تک کے درمیان کا حصہ حدودِ حرم میں داخل ہے۔ (جبل عیر اور جبل ثور کا درمیانی علاقہ تقریباً پندرہ کلومیٹر کا ہے، یہ دونوں پہاڑ جنوب وشمال میں مدینہ طیبہ کی حد ہیں)۔ واضح رہے کہ اب سعودی وزارت کی ایک کمیٹی نے حرمِ مدینہ طیبہ کی حدود کی نشاندہی کا کام مکمل کرلیا ہے اور مختلف مقامات پر ۱۶۱ برج نصب کیے گئے ہیں، جس کے بعد فضائی اور بری راستوں سے حدودِ حرمِ مدینہ کا تعین آسان ہوگیا ہے۔ (تاریخ مدینہ منورہ/ص:۸) لہٰذا جو شخص اس میں بدعت پیدا کرے گا یا کسی بدعتی کو پناہ دے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ اور ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے، قیامت کے دن اس کی طرف سے نہ کوئی نفل عبادت

قبول ہوگی اور نہ ہی کوئی فرض عبادت اس کی طرف سے قبول ہوگی۔‘‘ حدیث مذکور میں مدینہ طیبہ کی حرمت وعظمت کی خلاف ورزی پر لعنت کی وعید آئی ہے، اس لیے حدودِ مدینہ طیبہ میں داخل ہوکر اس بات کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی کام یا کلام اس ارضِ مقدس کی حرمت وعظمت کے خلاف نہ ہونے پائے۔

آگیا حاصل انتظار آگیا ☆ زائرو! لو نبی کا دیار آگیا
دیکھو، دیکھو! کھجوروں کی جھرمٹ میں وہ ☆ سامنے شہر رشک بہار آگیا

اور جب مدینہ طیبہ پہنچ جائے تو بوقت دخول یہ دعا پڑھے:

بِسْمِ اللّٰهِ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، رَبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ، وَارْزُقْنِيْ مِنْ زِيَارَةِ رَسُوْلِكَ ﷺ مَا رَزَقْتَ أَوْلِيَاءَ كَ وَ أَهْلَ طَاعَتِكَ، وَأَنْقِذْنِيْ مِنَ النَّارِ وَاغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ يَا خَيْرَ مَسْؤُوْلٍ“. (غنية/ص: ٢٠٣، غنية جديد: ٢٧٦)

”اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لَّنَا فِيْهَا قَرَارًا وَرِزْقًا حَسَنًا“. (غنية جديد/ص: ٣٧٦، از انوار مناسك/ص: ٦٥٦)

’’اللہ تعالیٰ کے نام سے داخل ہوتا ہوں، جو اللہ تعالیٰ چاہیں گے وہی ہوتا ہے، اس کی مدد کے بغیر معصیت سے حفاظت نہیں اور اطاعت پر قدرت نہیں، اے میرے رب! مجھے سچائی کے ساتھ داخل فرمایئے اور سچائی کے ساتھ نکالئے اور اپنی طرف سے ایک طاقتور مددگار بنادیجئے، اے میرے رب! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیجئے اور مجھے اپنے رسول ﷺ کی زیارت سے وہ فائدہ عطا فرمایئے جو آپ اپنے اولیاء اور فرماں برداروں کو عطا فرماتے ہیں، اور مجھے جہنم کی آگ سے بچایئے، اور میری مغفرت فرمایئے اور مجھ پر رحم فرمایئے، اور آپ مانگے جانے والوں میں سب سے بہتر ہیں، اے اللہ! ہمیں اس شہر میں بہترین ٹھکانہ اور بہترین رزق عطا فرمایئے۔‘‘

مدینہ طیبہ میں داخل ہونے کے بعد یہاں کے ذرّہ ذرّہ کو عقیدت ومحبت کی نگاہ سے دیکھیں، اس شہر رسول ﷺ کی عظمت کا دھیان رکھتے ہوئے جس قدر ادب واحترام ممکن ہو بجا لائیں، ہر قسم کے چھوٹے بڑے گناہ کے خیال تک سے باز رہیں، اور پہلی فرصت میں ضروریات سے فارغ ہوکر دربارِ رسالت میں حاضر ہونے کی فکر کریں، جس کے لیے تیسرا ادب جملہ آداب کی رعایت کرنا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ

(۳) ''اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر موقع ہو تو اچھی طرح سنت کی نیت سے غسل کریں، ورنہ کم از کم (مسواک کے اہتمام کے ساتھ اگر ہو سکے تو) وضو کریں، پھر اپنے کپڑوں میں سے اچھے اور صاف ستھرے شرعی کپڑے پہنیں، (سفید ہو تو افضل ہے) اچھی خوشبو اور سرمہ لگائیں، پھر اپنی وسعت کے مطابق خلوصِ نیت کے ساتھ صدقہ دیتے ہوئے مسجد نبوی میں داخل ہونے اور روضۂ طیبہ پر حاضری دینے کے ارادے سے تواضع کی چال چلتے ہوئے نظریں جھکائے ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مست ہوکر درود پڑھتے ہوئے مسجد نبوی کی طرف آئیں۔''

مسجد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام:

مسجد نبوی اس وقت جہاں ہے وہ دراصل سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان کے سامنے ایک ناہموار زمین تھی، جہاں لوگ خرما خشک کر کے تمر بناتے تھے، یہ زمین دو یتیم بچوں سہل اور سہیل کی ملکیت تھی، جو حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی پرورش میں تھے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو مدینہ طیبہ کے ان دونوں یتیم بچوں نے دینی جذبہ سے اپنی مملوکہ زمین خالصاً لوجہ اللہ (بلا معاوضہ) آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کرنا چاہا، مگر آپ ﷺ نے ان کے جذبۂ صادقہ کی قدر کرتے ہوئے اس قطعۂ مقدسہ کو دس دینار میں خریدا جس کی قیمت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ادا کی، جگہ خریدنے کے بعد کھجور کے درخت کٹوائے، ٹیلے برابر کرائے اور تعمیر کا کام

شروع کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس اس میں شریک ہوئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کے ہاتھ تو کام میں تھے، مگر دل اپنے رب کی یاد میں تھا، فرماتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ إِلَّا عَیْشُ الْآخِرَۃِ

فَاغْفِرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ

یہ ہے ''دست بکار، دل بیار'' امت کو تعلیم دی کہ تم بھی اپنے مولیٰ کی یاد کے ساتھ کام کر سکتے ہو، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تعمیر شدہ مسجد نبوی سادگی کی ایک دل آویز تصویر تھی، کہ فرش تو ریت کا تھا جس میں صفوں کی جگہ کنکر تھے، اور چھت کھجور کے پتوں کی تھی جس میں ستونوں کی جگہ کھجور کے درخت کے تنے تھے، اور اس کی دیواریں بھی کچی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں، مبلغ اسلام علامہ سید عبدالمجید ندیم شاہ صاحب ؒ فرمایا کرتے تھے: ''مسجد تو نہایت کچی تھی، مگر نمازی اور مصلی بڑے پکے تھے''۔ مسجد کا طول ۱۰۵/ فٹ (۷۰ ہاتھ) عرض ۹۰/ فٹ (۶۰ ہاتھ) اور بلندی تقریباً ۱۰/ فٹ، دیواریں ڈیڑھ اینٹ کی بنائی گئیں، مسجد کے مشرقی گوشہ میں ایک چبوترا بنا دیا گیا، جہاں تقریباً ڈیڑھ سو ایسے اصحاب مقیم تھے جن کے پاس نہ رہنے کے لیے کوئی مکان تھا نہ کوئی روزگار، صرف علم دین کا حصول ان کا مقصد تھا، یہ اسلام کی تاریخ میں قائم ہونے والا پہلا مدرسہ تھا جس کا فیض تا حشر جاری وساری رہے گا، ان حضرات نے اپنی آنکھوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کے لیے، کانوں کو حضور ﷺ کے کلمات سننے کے لیے اور جسم و جان کو حضور ﷺ کی محبت کے لیے وقف کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے یہ دین کی دولت سے مالا مال تھے، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ان ہی اصحابِ صفہ میں سے ایک تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس مسجد کو تعلیم و تبلیغ اور دین کی دعوت واشاعت بلکہ دین ودنیا کے فلاحی کاموں کا مرکز بنانا چاہتے تھے، جس کے تحت آپ نے یہ اہتمام فرمایا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد اطہر میں یہ تمام امور تقریباً اسی مسجد نبوی سے انجام دیے

جاتے تھے، اس طرح آپ ﷺ نے اس مسجد کو دنیا کی مساجد کے لیے نمونہ بنادیا۔

مسجد نبوی میں نماز کی فضیلت:

الغرض مسجد پاک کے کن کن حصوں کی پاکیاں اور کن کن گوشوں کی خوبیاں گنائی جائیں، مسجد حرام کے بعد مسجد نبوی کا خوبی اور محبوبی کے لحاظ سے کوئی جواب نہیں ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق مسجد نبوی میں ایک نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ (ابن ماجہ/ص:۱۰۳، مشکوٰۃ/ص:۷۲)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جو مسجد نبوی میں بلا ناغہ چالیس نمازیں پڑھے گا اسے نفاق اور جہنم سے برأت نصیب ہوگی۔ (مسند احمد)

یادرکھو! یہ فضائل مسجد کے اسی حصہ تک محدود نہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجد کا حصہ تھا، بلکہ پوری مسجد کے لیے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے سعودی حکومت کو، اس نے دنیا کے جدید ترین آلات کے ذریعہ مسجد کو وسیع، حسین وجمیل اور بہترین بنانے کی جو بے مثال خدمت انجام دی ہے اس کی مثال بھی تاریخ میں نہیں ملتی۔

۱۴۱۴ھ میں شاہ فہد مرحوم نے اپنے دور میں ۸۲۰۰۰ مربع میٹر توسیع کی، جس سے مسجد نبوی میں نمازیوں کی گنجائش ۹ گنا بڑھ گئی، یہ نویں توسیع مسجد نبوی کی تاریخ میں سب سے بڑی توسیع ہے۔ جس میں پانچ لاکھ پینتیس ہزار (۵۳۵۰۰۰) نمازیوں کی گنجائش ہے۔

حسن نیت کے ساتھ مساجد کی توسیع اور تحسین وتزئین بھی اعمالِ حسنہ میں داخل ہے، خیر! بابِ جبرئیل یا کسی بھی دروازہ سے سنت کے مطابق داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھے:

”بِسْمِ اللّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ“.

”اللہ کے نام سے داخل ہوتا ہوں اور صلوٰۃ وسلام اللہ کے رسول ﷺ پر نازل ہو،

اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما اور میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔"

اعتکاف کی نیت کرے، پھر پہلے منبر کی طرف جائے (لیکن لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے) اور ریاض الجنۃ میں اگر مکروہ وقت نہ ہو اور موقع ہو تو دو رکعات نماز پڑھے۔ (نماز کے لیے کسی کو تکلیف نہ دے)۔

روضۂ اقدس:

آپ ﷺ کی عظمت وجلالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے دل کو تمام دنیوی خیالات سے فارغ کر کے روضۂ اقدس کی تین جالیوں میں سے بیچ والی جالی کے سامنے آئیں اور قبلہ کی طرف پشت اور قبر اطہر کی طرف چہرہ کر کے اس یقین اور تصور کے ساتھ کھڑے رہیں کہ آپ ﷺ اپنی قبر مبارک میں حیات ہیں، میری حاضری سے من جانب اللہ واقف ہیں اور میری معروضات وسلام بذاتِ خود سنتے ہیں، پھر کمالِ ادب کے ساتھ آب دیدہ ہو کر اس طرح صلوٰۃ وسلام پیش کریں:

" اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَيْرَ خَلْقِ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَيْرَةَ اللّٰهِ مِنْ جَمِيْعِ خَلْقِهٖ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَبِيْبَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا سَيِّدَ وُلْدِ اٰدَمَ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّيْ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنَّكَ عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَأَشْهَدُ أَنَّكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَأَدَّيْتَ الْأَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْأُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ، فَجَزَاكَ اللّٰهُ عَنَّا خَيْرًا، جَزَاكَ اللّٰهُ عَنَّا أَفْضَلَ مَا جَزٰى نَبِيًّا عَنْ أُمَّتِهٖ. اَللّٰهُمَّ أَعْطِ سَيِّدَنَا عَبْدَكَ وَرَسُوْلَكَ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَالدَّرَجَةَ الْعَالِيَةَ الرَّفِيْعَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَنِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ، وَأَنْزِلْهُ الْمَنْزِلَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ، إِنَّكَ سُبْحَانَكَ ذُوْ الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ. (فتح القدير:٣/١٦٩، از انوار مناسك ص: ٦٦١)

"اے اللہ کے رسول! آپ پر سلام ہو، اے اللہ کی مخلوق میں سب سے برگزیدہ

بندے! آپ پر سلام ہو، اے اللہ کے بندوں میں سب سے بہتر! آپ پر سلام ہو، اے اللہ کے حبیب! آپ پر سلام ہو، اے اولادِ آدم کے سردار! آپ پر سلام ہو، اور اللہ کی رحمت و برکت آپ پر نازل ہو۔ یارسول اللہ! میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے رسالت کو پہنچا دیا اور امانت کو ادا کر دیا اور آپ نے امت کی خیر خواہی فرمادی اور بے چینی کو دور کر دیا، اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے جزاؤں میں سب سے بہترین جزا عطا فرمائے جو کسی نبی کو اس کی امت کی طرف سے دی جاتی ہے، اے اللہ! تو اپنے بندے اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وسیلہ، فضیلت اور بلند و بالا درجہ عطا فرما اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ محمود پر پہنچا دے جس کا وعدہ تو نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نزدیک مقرب درجہ عطا فرما، بلاشبہ تو پاک ہے اور عظیم احسان والا ہے۔"

جس کو ان الفاظ کے ساتھ سلام پیش کرنا نہ آتا ہو وہ غلط سلط الفاظ میں سلام ہرگز پیش نہ کرے جن سے معنیٰ بھی بدل جائیں، یاد رکھو! سلام وہی بہتر ہے جو دل کی حضوری اور عقیدت و محبت کے ساتھ سمجھ کر پیش کیا جائے، خواہ وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو، اس کے لیے اس قدر سلام پیش کرنا بھی کافی ہے کہ

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ". (نسائی/ص: ۳۴۱)

یہ حدیث شریف سے بھی ثابت ہے اور بعض حضرات اسی طرح سلام پیش کرتے ہیں، بزرگانِ دین کا اس سلسلہ میں اختصار ہی کا معمول رہا اور اسی کو مستحسن سمجھا گیا ہے۔

پھر ایک ہاتھ کے بقدر دائیں جانب کو ہٹ کر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ کے ساتھ سلام پیش کریں:

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَلِيفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَثَانِيَهٗ فِي الْغَارِ وَرَفِيْقَهٗ فِي الْأَسْفَارِ

وَأَمِيْنَهٗ عَلَى الْأَسْرَارِ أَبَابَكْرِ نِ الصِّدِّيْقَ! جَزَاكَ اللّٰهُ عَنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ خَيْرًا". (فتح القدير:٣/ ٨١، از انوار مناسك ص: ٦٦٣)

''اے اللہ کے رسول ﷺ کے خلیفہ اور غار ثور میں ان کے ساتھی اور سفروں میں ان کے رفیق اور ان کے رازوں کے امین ابوبکر صدیق! آپ پر سلام ہو، اللہ تعالیٰ آپ کو امت محمدیہ کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے۔''

اس کے بعد ایک ہاتھ اور دائیں جانب ہٹ کر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ کے ساتھ سلام پیش کریں:

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عُمَرَ الْفَارُوْقَ! الَّذِيْ أَعَزَّ اللّٰهُ بِهِ الإِسْلَامَ، إِمَامَ الْمُسْلِمِيْنَ مَرْضِيًّا حَيًّا وَمَيِّتًا! جَزَاكَ اللّٰهُ عَنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ خَيْرًا". (حواله سابقه)

''اے امیر المؤمنین عمر فاروق! جن کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت و شوکت عطا فرمائی، آپ پر سلام ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں کا امام بنایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندگی اور موت کے بعد پسند فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو امت محمدیہ کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے۔''

حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی خدمت میں سلام پیش کرنے کے بعد دوبارہ حضور ﷺ کے چہرۂ انور کے سامنے آ کر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کریں اور حضور ﷺ پر درود شریف پڑھ کر آپ ﷺ سے ان الفاظ میں شفاعت کی درخواست کریں:

"يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَسْأَلُكَ الشَّفَاعَةَ وَ أَتَوَسَّلُ بِكَ إِلَى اللّٰهِ فِي أَنْ أَمُوْتَ مُسْلِمًا عَلٰى مِلَّتِكَ وَسُنَّتِكَ". (فتح القدير:٣/ ١٨١، از انوار مناسك ص: ٦٦١)

یا رسول اللہ! میں آپ سے شفاعت کا سوال کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف آپ کا وسیلہ چاہتا ہوں اس بات کے لیے کہ میں اسلام اور آپ کی سنت پر مروں۔

اور کہیں کہ حضور! حق تعالیٰ نے آپ کی شان میں فرمایا ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَحِيمًا﴾ (النساء: ٦٤)

''اگر یہ لوگ جب انہوں نے اپنے نفس پر ظلم کرلیا تھا آپ کی بارگاہ میں آتے اور آکر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اور اللہ کے رسول بھی ان کے لیے دعاءِ مغفرت کرتے تو ضرور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔''

لہٰذا یا رسول اللہ! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے لیے آپ کی چوکھٹ پر حاضر ہوئے ہیں، آپ بارگاہِ الٰہی میں ہمارے لیے شفاعت فرما دیجئے، اور یہ درخواست کیجیے کہ وہ اپنی مرضیات پر استقامت بخشے اور آپ کے دین وملت وسنت پر ہمیں موت عطا فرما کر قیامت کے دن ہمارا شمار آپ کے زمرہ اور گروہ میں فرمادے۔ آمین۔

صاحب طرز ادیب علامہ عبدالماجد دریا آبادیؒ اس موقع پر فرماتے ہیں: (آیت کریمہ میں)

''گویا گناہگاروں اور تباہ کاروں کو یہ حکم ملا ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے معافی طلب کریں، لیکن تنہا اپنے گھروں پر بیٹھے ہوئے نہیں، بلکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اور ان سے بھی اپنے حق میں دعا کرا کر، ظاہر ہے کہ حکم براہِ راست کسی ایسے گروہ سے ہے جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھا، خوش نصیب تھے وہ افراد جنہیں اس حکم پر عمل کی توفیق نصیب ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، جنہوں نے گڑگڑا کر اللہ سے معافی مانگی اور رسول اللہ ﷺ نے جن کے حق میں سفارش فرمائی، لیکن آج اس چودھویں صدی میں امت کا کوئی فاسق وفاجر، بدعمل ونامہ سیاہ اگر حکم ''جَآءُوكَ'' کی تعمیل کرنا چاہے تو کیا اس کے لیے اس سعادت وہدایت کا دروازہ خدا نخواستہ قیامت تک کے لیے بند ہو چکا ہے؟ اور اس کی قسمت میں بجز مایوسی ومحرومی کے اور

کچھ نہیں؟ موسم گل جب چمن سے رخصت ہو چکتا ہے اور کوئی بوئے گل کا متوالا آنکلتا ہے تو عرقِ گلاب کے شیشوں اور قرابوں کو غنیمت سمجھتا ہے، پھر اگر آج کوئی بوئے حبیب کا متوالا حکم "جَـاءُ وْكَ" کی تعمیل میں خود کو ہزاروں میل کے فاصلہ پر دیارِ حبیب تک پہنچاتا ہے اور اپنے مظالم نفس کی تلافی و معافی کے لیے اپنے ایمان اور اپنی بیعت کی تجدید کے لیے اپنی تباہ کاریوں پر پشیمانی اور اشک افشانی کے لیے حبیب تک نہ سہی آستانۂ حبیب تک گرتا پڑتا پہنچتا ہے تو کیا اس پر بدعت وشرک کا فتویٰ لگایا جائے گا؟" (ادبی شہ پارے/ص:۱۷۰)

غرض! حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام وشفاعت کی درخواست پیش کرنے کے بعد قبلہ رُخ ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے بہت ہی تضرع وعاجزی کے ساتھ دعا کریں، پھر ان ساری باتوں سے فارغ ہوکر اگر موقع ہو تو ریاض الجنۃ میں آکر نماز پڑھیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

ریاض الجنۃ:

یاد رکھئے! روضۂ اقدس کے بعد یوں تو مسجد نبوی کا چپہ چپہ نور افشاں ہے اور خیر وبرکت کا خزانہ ہے، مگر "ریاض الجنۃ" اس خزانہ کا ایک انمول حصہ ہے، یعنی منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان والے حصے کے خاص فضائل ہیں جو احادیث صحیحہ میں وارد ہوئے ہیں۔ "زمین کا یہ ٹکڑا (جس کی لمبائی تقریباً ۷۳/ فٹ اور چوڑائی ۴۹/ فٹ ہے، اور جس میں ڈھائی تین سو نمازیوں کی گنجائش ہے) درحقیقت یہ جگہ باغِ جنت کے عین نیچے ہے یا پھر جنت کا حقیقی باغیچہ ہے جو قیامت آنے پر جنت ہی میں منتقل کر دیا جائے گا۔ شاید اسی لیے کہا گیا:

یوں تو جنت میں سب ہے، مدینہ نہیں
اور جنت مدینہ میں موجود ہے

حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”مَا بَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَةٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ، وَمِنْبَرِیْ عَلٰی حَوْضِیْ“. (صحیحین، مشکوٰۃ ص: ٦٨)

”میرے گھر (مراد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ ہے جہاں آپ ﷺ کی قبر) اور منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔“

علماء نے فرمایا کہ روضۂ جنت ہونے کا ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی رضا ورحمت کا خاص محل اور مورد ہونے میں یہ حصہ ایسا ہی ہے جیسا کہ جنت اور اس کا باغ، جس طرح جنت اللہ تعالیٰ کا مقامِ رضا ورحمت ہونے کے سبب ہر وقت وہاں اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت کی موسلا دھار بارش برستی رہتی ہے اسی طرح یہاں بھی۔

دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس ریاض الجنۃ میں عبادت کرنے کا صلہ آبِ کوثر اور باغِ جنت ہے۔ اس لیے اس عاجز کا تو یہی خیال ہے کہ جو بندۂ مومن مخلص اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت کی طلب میں یہاں آیا گویا وہ جنت میں آ گیا، اور جسے دنیا کی جنت کا دخول نصیب ہوگیا وہ آبِ کوثر اور آخرت کی جنت سے کیوں کر محروم رہ سکتا ہے؟ رَزَقَنَا اللّٰهُ تَعَالیٰ زِیَارَتَهٗ بِفَضْلِهٖ وَ کَرَمِهٖ مِرَارًا. آمین

اگر یہ دعا یاد ہو تو ریاض الجنہ میں اس کا اہتمام کریں۔

”اَللّٰهُمَّ إِنَّ هٰذِهٖ رَوْضَةٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ، شَرَّفْتَهَا وَ کَرَّمْتَهَا وَمَجَّدْتَهَا وَعَظَّمْتَهَا وَنَوَّرْتَهَا بِنُوْرِ نَبِیِّكَ وَحَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ ﷺ، اَللّٰهُمَّ کَمَا بَلَّغْتَنَا فِی الدُّنْیَا زِیَارَتَهٗ وَمَاٰثِرَهُ الشَّرِیْفَةَ فَلَا تُحْرِمْنَا یَا اللّٰهُ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ فَضْلِ شَفَاعَةِ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَاحْشُرْنَا فِیْ زُمْرَتِهٖ وَتَحْتَ لِوَاءِهٖ وَأَمِتْنَا عَلٰی مَحَبَّتِهٖ وَسُنَّتِهٖ، وَاسْقِنَا مِنْ حَوْضِهِ الْمَوْرُوْدِ بِیَدِهِ الشَّرِیْفَةِ شَرْبَةً هَنِیْئَةً لَا نَظْمَأُ بَعْدَهَا أَبَدًا، إِنَّكَ عَلٰی کُلِّ شَيْءٍ قَدِیْرٌ“.

(حج وعمرہ فلاحی کے ہمراہ/ص: ٢٧٦)

''اے اللہ! بلاشبہ یہ جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، جسے آپ نے شرافت، عزت اور عظمت عطا فرمائی ہے، اور اسے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے منور فرمایا ہے، اے اللہ! جس طرح آپ نے ہمیں دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس یادگاروں کی زیارت نصیب فرمائی ہے اس طرح اے اللہ! ہمیں آخرت میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شفاعت سے محروم نہ فرمانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے گروہ میں آپ کے جھنڈے تلے ہمیں جمع فرمانا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دینا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوضِ کوثر سے جو مومنین کے وارد ہونے کی جگہ ہے، آپ کے دست مبارک سے ہمیں ایسا خوشگوار مشروب پلانا جسے پی کر ہم کبھی پیاسے نہ ہوں، بے شک تو ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔

ستونہائے رحمت:

قدیم مسجد نبوی میں روضۃ الجنۃ کے اندر آٹھ ستون ہیں، ان کو ''اسطوانہائے رحمت'' کہتے ہیں، یہ مبارک ستون اسی جگہ ہیں جہاں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کھجور کے تنوں کے ستون تھے:

(۱) **اسطوانۂ حنانہ:** یہ ستون محراب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب اس کھجور کے تنے کی جگہ ہے جس کے پاس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرماتے تھے اور منبر بنائے جانے سے پہلے خطبہ کے دوران اس کا سہارا لیتے تھے، منبر بن جانے کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر خطبہ شروع فرمایا تو کھجور کا یہ تنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں زور زور سے رونے لگا، جس کے رونے کی آواز ان تمام لوگوں نے سنی جو اس وقت وہاں موجود تھے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

استن حنانہ از ہجر رسول ۔۔۔ نالہ می زد ہم چو اربابِ عقول

یعنی ستونِ حنانہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی سے انسانوں کی طرح روتا تھا۔ جب منبر سے اتر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس پر پھیرا تو وہ بچہ کی طرح ہچکیاں لیتا ہوا

چپ ہوگیا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اگر حضور ﷺ اس طرح ہاتھ پھیر کر تسلی نہ دیتے تو وہ قیامت تک روتا رہتا، یہ جگہ مسجد نبوی میں بہت ہی برکت والی ہے، یہاں نوافل، استغفار، ذکرواذکار اور درود وغیرہ کی کثرت کرنی چاہیے۔

(۲) اسطوانۂ عائشہؓ: یہ استوانۂ ابولبابہ کے بازو میں ہے۔ حدیث (طبرانی) میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری مسجد میں ایک جگہ ایسی ہے کہ اگر لوگوں کو وہاں نماز پڑھنے کی فضیلت کا علم ہوجائے تو وہاں نماز پڑھنے کے لیے ہر شخص بے تاب و بے قرار ہوجائے، جس کے نتیجہ میں لازمی طور پر قرعہ اندازی کرنی پڑے۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد سے صحابہ رضی اللہ عنہم مسلسل اس جگہ کی جستجو اور تلاش میں تھے، آپ ﷺ کے وصال کے بعد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو یہ جگہ بتلائی جہاں ستون ہے، اس مناسبت سے اس ستون کو ستونِ عائشہ کہا جاتا ہے۔ (مجمع الزوائد: ۴/۱۰)

بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف تحویل قبلہ کے بعد شروع میں دس دن حضور اکرم ﷺ نے اس جگہ نماز پڑھی تھی، اس کے بعد محراب النبی والی جگہ آپ ﷺ کا مصلیٰ (امامت ونماز کی جگہ) متعین ہوا۔ (حج وعمرہ فلاحیؔ کے ہمراہ/ص: ۲۸۹)

حضرات شیخین سیدنا صدیق اکبر وفاروق اعظم رضی اللہ عنہما اکثر اس کے قریب نماز پڑھا کرتے تھے، ہمیں بھی چاہیے کہ موقع ہو تو یہاں بکثرت نمازیں پڑھیں۔

(۳) اسطوانۂ ابی لبابۃ: یہ منبر سے چوتھا ستون ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ ایک عظیم المرتبت اور رفیع المنزلت انصاری صحابی ہیں، غزوۂ بنو قریظہ کے وقت ان سے ایک معمولی چوک ہوگئی تھی، جس کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمان بنوقریظہ کے یہود کا ان کی غداری کی وجہ سے محاصرہ کیے ہوئے تھے، ان لوگوں سے سیدنا ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ جاہلیت سے بڑے اچھے تعلقات تھے، اس تعلق کی وجہ سے یہودیوں نے

آپ سے دریافت کیا کہ حضور ﷺ ہمارے ساتھ کیا برتاؤ فرمائیں گے؟ جواب میں آپ نے اپنی زبان سے تو کچھ بھی نہیں کہا، مگر گلے پر ہاتھ پھیر کر اشارہ کیا تھا کہ کم بختو! اب تمہیں اپنی بداعمالیوں کی سزا ضرور بھگتنی ہوگی، تمہاری خیر نہیں، تیار ہو جاؤ! تمہیں زندہ نہیں چھوڑا جائے گا، بعد میں آپ کو اپنی اس حرکت کی سنگینی کا فوراً احساس ہوا کہ ہائے! میں نے سرکار دو عالم ﷺ کے راز کو فاش کر دیا، اس خیال کے آتے ہی آپ کو بے حد ندامت ہوئی، حیرانی و پریشانی کے عالم میں سیدھے مسجد نبوی میں پہنچے اور کھجور کے اسی تنے کے ساتھ اپنے آپ کو بندھوا کر یہ عہد کر لیا کہ جب تک اللہ تعالیٰ میرا یہ گناہ معاف نہیں فرما دیں گے میں اسی طرح اپنے آپ کو باندھے رکھوں گا، خواہ مجھے اس حالت میں موت ہی کی آغوش میں کیوں نہ جانا پڑے، حضور اکرم ﷺ کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو ارشاد فرمایا:

”عجیب آدمی ہیں! اگر وہ میرے پاس آتے اور اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتے اور میں بھی ان کے لیے دعا کرتا تو امید تھی کہ حق تعالیٰ ان کو معاف فرما دیتے، مگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور خود ہی اپنے لیے سزا تجویز کر لی، لہٰذا اب جب تک حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم یا فیصلہ نہیں آجاتا میں انہیں نہیں کھول سکتا۔“

اس حالت میں نو دن گذر گئے، صرف نماز اور دیگر ضروریات کی تکمیل کے لیے ان کی بیوی یا بیٹی انہیں کھول جاتی، فراغت کے بعد پھر باندھ دیتی، ایک مرتبہ تہجد کے وقت جب حضور اکرم ﷺ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں جلوہ افروز تھے اس وقت آپ ﷺ پر ان کی توبہ قبول ہونے کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿ وَآخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ ﴾ (التوبة: ۱۰۲)

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے جکڑے ہوئے اس رفیق کو فرطِ مسرت میں یہ مژدۂ جانفزا سنانے کے لیے دوڑ پڑے اور یہ مسرت خیز نشاط انگیز پیام سنانے کے بعد انہیں رسیوں

سے آزاد کرنا چاہا تو حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے کوئی نہ کھولے، جب تک میرے آقا ﷺ خود اپنے مقدس ہاتھوں سے کھول کر رہائی کی اجازت نہ مرحمت فرمائیں میں آزاد ہونا پسند نہیں کروں گا، یہ سن کر آپ ﷺ فوراً تشریف لائے اور کمالِ محبت وشفقت سے کھول کر آپ کو آزاد فرمایا۔

حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! میں نے توبہ قبول ہونے پر اپنا سارا مال صدقہ کردینے کی نذر مانی ہے، آپ نے فرمایا: تیسرا حصہ صدقہ کرو۔

اس ستونِ لبابہ کو ستونِ توبہ بھی کہا جاتا ہے، اس لیے کہ یہاں اس مخلص، وفادار اور تابعدار و جانثار کی توبہ قبول ہوئی تھی۔

دلاتا ہے ستون اک یاد توبہ کرنے والے کی
قبولِ توبہ کی اور اس کے استغفار کی

ہمیں بھی چاہیے کہ یہاں حسب موقع دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھ کر کامل اور مکمل سچی توبہ کریں، صرف امید ہی نہیں، بلکہ یقین ہے کہ اس مبارک جگہ کی برکت اور مناسبت سے ہمیں بھی آخرت میں معافی کا پروانہ مل ہی جائے گا۔

(۴) اسطوانۂ سریر: یہ ستون ستونِ ابولبابہ کے مشرق میں روضۂ اقدس کی جالی سے ملا ہوا ہے، مسجد نبوی کے اعتکاف میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست گاہ یہاں ہوتی تھی، اور یہیں آپ ﷺ کا بستر بچھایا جاتا تھا، اس مناسبت سے اس ستون کو اسطوانۂ سریر کہا جاتا ہے، جو خوش نصیب اسطوانۂ سریر کے قریب ہو تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کے بالکل برابر ہوتا ہے۔

(۵) اسطوانۂ حرس: یہ ستون بھی اسطوانۂ سریر کے پیچھے شمال کی طرف جالی کے ساتھ ملا ہوا ہے، ہجرت کے بعد ابتدا میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارکہ کی حفاظت و پاسبانی کی جاتی تھی، جانثار وفادار حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم پوری رات

نگہبانی فرماتے تھے، مگر جب آیت کریمہ: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ:٦٧)
نازل ہوئی، جس میں رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس
کے بعد آپ ﷺ کی پہرہ داری ختم ہوگئی۔ آج جہاں یہ ستون ہے وہیں سے حضرات صحابہ
رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کی پاسبانی و پہرہ داری کے فرائض انجام دیتے تھے، اس لیے اسے
اسطوانۂ حرس کہتے ہیں۔ اور زیادہ تر یہ فرائض مولیٰ علی کرم اللہ وجہہٗ انجام دیتے تھے، اس لیے
اسے اسطوانۂ علی بھی کہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ
سے تشریف لاتے تو اسی جگہ سے گذرتے تھے، حسب موقع یہاں بھی دو رکعات نماز پڑھ کر
اپنے ایمان کی حفاظت کا پختہ عزم و ارادہ کریں۔

(٦) اسطوانۂ وفود: یہ اسطوانۂ حارس یا علی کے پیچھے شمال کی طرف
واقع ہے، یہ ستون اس جگہ کی یادگار ہے جہاں باہر سے آنے والے مختلف وفود کو ٹھہرایا جاتا تھا،
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم یہاں تشریف لاکر ان سے ملاقات
فرماتے، ان کی حاجت پوری فرماتے، دین کی تعلیم دیتے اور ایمان کی دولت سے مشرف
فرماتے، اس لیے اس ستون کو اسطوانۂ وفود کہا جاتا ہے، یہاں بھی حسب موقع نماز اور دینی
تعلیم و تبلیغ کا اہتمام کریں۔

(٧) اسطوانۂ جبرئیل: اس کو مقام جبرئیل بھی کہتے ہیں؛ کیوں کہ حضرت
جبرئیل علیہ السلام سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں وحی لے کر تشریف لاتے تو اکثر و بیشتر
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی جگہ ملاقات ہوتی، یہی وجہ ہے کہ اس جگہ پر جو ستون ہے
اسے ستونِ جبرئیل کہا جاتا ہے، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کا دروازہ اسی کے پاس تھا،
یہاں بھی حسب توفیق نماز اور تسبیحات کا اہتمام کریں۔

(٨) اسطوانۂ تہجد: اس جگہ اکثر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ تہجد ادا
فرماتے تھے، یہ ستون اب نظر نہیں آتا، اس لیے کہ وہ صفہ کے سامنے حجرۂ مبارکہ کے اندر کی

جانب واقع ہے، اب اس جگہ ستون کی جگہ ایک محراب ہے جس کو محرابِ تہجد کہتے ہیں، جب نمازی اس کی طرف منھ کرے تو اس کی بائیں جانب بابِ جبرئیل ہوگا۔ حق تعالیٰ کی عنایت شاملِ حال ہو تو یہاں ہم بھی تہجد کا اہتمام کریں۔

غرض! ان خاص ستونوں کے خصائص وفضائل کو پیشِ نظر رکھا جائے، حسبِ توفیق ان جگہوں میں عبادات کریں، ورنہ پوری مسجد میں جب جہاں موقع مل جائے غنیمت سمجھیں، ظاہر ہے کہ مسجد نبوی کا کونسا حصہ ایسا ہوگا جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک نہ پڑے ہوں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے نمازیں نہ پڑھی ہوں، اور نہ صرف مسجد نبوی، بلکہ سارے مدینہ کا کونسا حصہ ایسا ہوگا جہاں ان بابرکت ہستیوں کے مبارک قدم بار بار نہ پڑے ہوں، اس لیے وہاں کی ہر جگہ برکت والی ہے، لہٰذا وہاں کے قیام کو غنیمت جانیں، اکثر اوقات مسجد نبوی میں گذاریں، روزانہ جس قدر بھی ہوسکے روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر سلام پیش کریں، اگر کسی وجہ سے روضۂ اقدس تک نہ پہنچ سکیں تو مسجد نبوی کے کسی بھی حصہ میں کھڑے ہوکر سلام عرض کریں، مگر اس کی وہ فضیلت نہیں جو مواجہہ شریف کے سامنے کی ہے، نیز مسجد نبوی کے باہر سے بھی اگر روضۂ اقدس کے سامنے سے گذرنا ہو تو تھوڑی دیر ٹھہر کر سلام عرض کریں، ادب واحترام اور ذوق وشوق ہر وقت ملحوظ رکھیں، بکثرت درود شریف پڑھیں، بدنی عبادات کے علاوہ نفلی صدقات کا بھی خوب اہتمام کریں، مدینہ طیبہ کے باشندوں اور تاجروں وغیرہ کے ساتھ خوش اخلاقی ومحبت کا برتاؤ کریں، ان سے خرید وفروخت میں بھی اعانت کی نیت رکھیں، موقع بموقع جنت البقیع جو مدینہ منورہ کا قبرستان ہے جسے بقیع الغرقد بھی کہا جاتا ہے؛ کیوں کہ یہاں غرقد (ببول) کے لمبے لمبے درخت تھے جنہیں کاٹ کر اس سرزمین کو قبرستان میں تبدیل کیا گیا، اس میں دس ہزار کے قریب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم مدفون ہیں، جن میں آپ ﷺ کی ازواج (سیدہ خدیجہ اور سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ) اور اولاد بھی ہیں، نیز بے شمار تابعین وصالحین بھی یہیں مدفون ہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں خاک کے ہر ڈھیر کے نیچے اسلام کا انمول خزانہ ہے، مدینہ طیبہ میں روضۂ اقدس اور مسجد نبوی کے بعد سب

سے اہم مقام یہی ہے، حضور ﷺ یہاں بار بار تشریف لاتے اور بقیع والوں کو سلام ودعا سے نوازتے تھے، اس قبرستان کی آخری توسیع شاہ فہد مرحوم کے زمانہ میں ہوئی۔اسی طرح دیگر مقاماتِ متبرکہ کی زیارت کے لیے جائیں، نیز اگر کوئی خلافِ مزاج بات پیش آجائے تو وہاں کی تکلیف پر صبر کریں۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''ایک بار مدینہ طیبہ میں مہنگائی ہوگئی جس سے لوگ پریشان ہوگئے، تب رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: ''صبر وتحمل سے کام لو، میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ میں نے تمہارے لیے صاع ومد (پیمانوں) میں برکت کی دعا مانگی ہے، تم مل جل کر کھایا کرو، ایک آدمی کا کھانا دو کو کفایت کرجائے گا اور دو کا چار کو اور چار کا کھانا پانچ چھ آدمیوں کے لیے کافی ہے، اکٹھے رہنے میں برکت ہے، جو مدینہ کی مشکل اور سختی پر صبر کرے گا میں قیامت کے دن اس کے لیے گواہی دوں گا اور شفاعت کروں گا، اور جو اس سے اعراض کرکے چلا جائے گا حق تعالیٰ اس کو پانی میں نمک کی طرح پگھلا دے گا''۔
(مجمع الزوائد: ۳/ ۳۰۶، از: تاریخ مدینہ منورہ/ص: ۱۲)

ایک بات خاص طور سے یاد رکھیں کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے مابین تقابل ہرگز نہ کریں، جیسا کہ بعض جہلاء کرتے ہیں، مکہ مکرمہ میں کعبۃ اللہ معبود کا گھر ہے تو مدینہ منوّرہ اللہ کے محبوب ﷺ کا گھر ہے۔

مدینہ طیبہ سے واپسی کے آداب:

پھر جب مدینہ طیبہ سے واپسی کا ارادہ ہو تو مسجد نبوی میں محراب النبی ﷺ کے قریب یا ریاض الجنۃ میں ورنہ مسجد نبوی کے جس حصہ میں جگہ میسر ہو اور مکروہ وقت نہ ہو تو دو رکعات نماز پڑھ کر خوب دعا کریں، پھر روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ پہلے کی طرح صلوٰۃ وسلام پیش کریں، اس وقت آنکھوں سے آنسو کا نکلنا اور دل پر غم کا غلبہ ہونا قبولیت کی علامت ہے، جس قدر آپ ﷺ کی جدائی کا غم اور آنکھوں میں اشک

ندامت ہوں گے اسی قدر آپ ﷺ کی رحمت وشفقت متوجہ ہوگی، پھر قبلہ رُخ ہوکر آپ ﷺ کے وسیلہ سے دعا کی جائے، دین ودنیا کی جائز حاجتیں حق تعالیٰ سے طلب کریں، سفر کی بلکہ سفر دنیا وآخرت کی آسانی وکامیابی کی دعا کریں، اگر یاد ہوتو یہ دعا پڑھیں:

"اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ هٰذَا اٰخِرَ الْعَهْدِ بِنَبِيِّكَ وَمَسْجِدِهٖ وَحَرَمِهٖ، وَيَسِّرْ لِي الْعَوْدَ إِلَيْهِ وَالْعُكُوْفَ لَدَيْهِ، وَارْزُقْنِيْ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا والآخِرَةِ، وَرُدَّنَا إِلٰى أَهْلِنَا سَالِمِيْنَ غَانِمِيْنَ، آمين بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ". (غنية جديد ص: ٣٨٨، قاضي خان ص: ٣١٩/١، از انوار مناسك ص: ٦٧٧)

"اے اللہ! آپ اپنے نبی ﷺ، مسجدِ نبوی اور حرم نبوی کی زیارت کو آخری زیارت نہ بنائیں، بلکہ میرے لیے دوبارہ آنا اور قیام کرنا آسان فرمایئے، اور مجھے دنیا و آخرت میں سلامتی وعافیت نصیب فرمایئے، اور مجھے اپنے گھر عافیت وسلامتی اور اجر وثواب کے ساتھ پہنچادیجیے، اے ارحم الراحمین! اپنی رحمت سے مالامال فرمادیجیے۔"

اس کے بعد پوری زندگی آپ ﷺ کے طریقوں پر مکمل عمل کرنے کا عہد وعزم کرکے نہایت حسرت وندامت کے ساتھ رخصت ہوں اور جو کچھ میسر ہو صدقہ کریں، اور سفر سے واپسی کی جو دعائیں احادیث میں ہیں وہ پڑھتے ہوئے روانہ ہوں، سواری میں جہاں تک گنبدِ خضراء اور مسجد نبوی کے مینار اور مدینہ طیبہ کے مکانات، باغیچے اور درخت دکھائی دیں حسرت سے دیکھیں اور درود شریف پڑھتے رہیں۔

یاد آئے تو اس واقعہ کو تصور میں لائیں جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو رحمت عالم ﷺ نے یمن کا حاکم بنا کر مدینہ طیبہ سے رخصت فرمایا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر خود آپ ﷺ مجھے الوداع کہنے کے لیے باہر تشریف لائے آپ ﷺ پیدل چل رہے تھے اور مجھے سوار ہونے کا حکم دیا، پھر فرمایا:

"يَا مُعَاذُ! إِنَّكَ عَسٰى أَن لَّا تَلْقَانِيْ بَعْدَ عَامِيْ هٰذَا، وَلَعَلَّكَ أَنْ تَمُرَّ

بِمَسْجِدِیْ هٰذَا وَقَبْرِیْ".

''اے معاذ! شاید اس سال کے بعد پھر تمہاری ملاقات مجھ سے نہ ہو سکے اور تمہارا گذر میری مسجد اور قبر ہی پر ہو پائے۔'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ اور شہر رسول ﷺ کی جدائی کا غم تو پہلے سے ہی نڈھال کیے ہوئے تھا، اب جب رحمت عالم ﷺ سے یہ بات سنی تو ضبط نہ کر سکے، آنکھیں بہہ پڑیں، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا:

"إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِیْ الْمُتَّقُوْنَ مَنْ کَانُوْا وَحَیْثُ کَانُوْا". (مسند أحمد ص:۲۵، مشکوٰة ص:۴۴۵ / کتاب الرقائق/الفصل الثالث)

یعنی یقیناً لوگوں میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب پرہیزگار لوگ ہی ہیں، خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں کے رہنے والے ہوں، لہٰذا تم ہماری جدائی کا زیادہ غم نہ کرو، اور تقویٰ اختیار کروگے تو صورۃً جدائی کے باوجود تم ہمارے ساتھ ہو۔

حق تعالیٰ ہمیں زندگی میں بار بار نہایت ادب واحترام کے ساتھ مع اہل وعیال حرمین شریفین کی منظور ومقبول حاضری نصیب فرمائیں اور حسن خاتمہ کی دولت سے مالا مال فرما کر مدینہ منوّرہ کو ہمارا مدفن بنائیں۔ آمین۔

" اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ".

☆......☆......☆
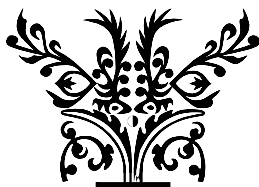
(۳۴)

فضائل درود شریف

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ طَلۡحَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ جَاءَ ذَاتَ يَوۡمٍ وَالۡبِشۡرُ فِیۡ وَجۡهِهٖ، فَقَالَ: إِنَّهٗ جَاءَنِیۡ جِبۡرَئِيۡلُ فَقَالَ: "إِنَّ رَبَّكَ يَقُوۡلُ: "أَمَا يُرۡضِيۡكَ يَا مُحَمَّدُ أَنۡ لَا يُصَلِّيَ عَلَيۡكَ أَحَدٌ مِنۡ أُمَّتِكَ إِلَّا صَلَّيۡتُ عَلَيۡهِ عَشۡرًا وَلَا يُسَلِّمَ عَلَيۡكَ أَحَدٌ مِنۡ أُمَّتِكَ إِلَّا سَلَّمۡتُ عَلَيۡهِ عَشۡرًا". (رواه النسائی والدارمی، مشکوة/ص:۸٦/ الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ ایک دن تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر خوشی اور بشاشت کے آثار نمایاں تھے، (اس کا سبب بیان کرتے ہوئے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "آج جبرئیل امین آئے اور انہوں نے بتایا کہ "تمہارا رب فرماتا ہے کہ "اے محمد! کیا یہ بات تمہیں راضی اور خوش نہیں کردے گی کہ تمہارا جو امتی تم پر درود بھیجے میں اس پر دس رحمتیں بھیجوں اور جو تم پر سلام بھیجے میں اس پر دس سلام بھیجوں۔" (حدیث قدسی نمبر:۷)

حضور ﷺ پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت اور درود وسلام کا خاص امتیاز:

خالق کائنات کی تمام مخلوقات میں سب سے اونچا مرتبہ ومقام حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کا ہے، جنہیں رب العالمین نے مختلف قسم کے انعامات واعزازات سے نوازا، مگر ان تمام میں جو مرتبہ ومقام امام الانبیاء والمرسلین، سید الاولین والآخرین، محبوبِ رب العالمین رحمۃ للعالمین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا وہ کسی اور کو نہیں ملا اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ ہر شخص کی تعظیم وتکریم اس کے مرتبہ کے مطابق ہوتی ہے، مثلاً کسی بادشاہ کے پاس اس کا کوئی ادنیٰ دوست آجائے تو بادشاہ اس کی تعظیم کے لیے اپنی رعایا کو حکم دیتا ہے اور اسی پر اکتفا کر لیتا ہے، پھر اگر دوست اس سے زیادہ تعلق رکھنے والا آوے تو اس کی تعظیم کے لیے رعایا اور خاص اراکین کو بھی حکم دیا جاتا ہے کہ تم سب بھی اس کی تعظیم کرو، لیکن اگر کوئی ایسا دوست آجائے جو اخص الخواص ہے تو رعایا اور اراکین سلطنت کے ساتھ خود بادشاہ بھی اس کی تعظیم وتکریم کا اہتمام کرتا ہے، یہ تعظیم کا انتہائی درجہ ہے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام میں سب سے اونچی ہے، اس لیے حق تعالیٰ آپ ﷺ کی عظمت شان وعلو مکان کے پیش نظر انسانوں اور فرشتوں کو صلوٰۃ وسلام کا حکم دیا اور خود بھی اس میں شریک ہوئے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کی خاص الخاص عنایت اور پیار ومحبت کی علامت ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَآئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (الأحزاب:٥٦)

اس آیت کریمہ میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے بڑے مؤکد انداز میں حکم دیا گیا کہ وہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجا کریں، پھر اس حکم میں خاص اہمیت اور وزن پیدا کرنے کے لیے پہلے بطورِ تمہید یہ فرمایا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَآئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴾

یعنی نبی پر صلوٰۃ (جس کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے، یہ) ربِ کریم اور اس کے پاک فرشتوں کا وظیفہ، معمول اور دستور ہے، حقیقت یہ ہے کہ حکم اور خطاب کا یہ انداز قرآنِ پاک میں صرف صلوٰۃ وسلام ہی کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اس کے علاوہ کسی دوسرے اعلیٰ سے اعلیٰ عمل کے لیے بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے یہ عمل کرتے ہیں لہٰذا تم بھی کرو، بلا شبہ صلوٰۃ وسلام کا یہ بہت بڑا امتیاز اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔ عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

يُصَلِّيْ عَلَيْهِ اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ
بِهٰذَا بَدَا لِلْعَالَمِيْنَ كَمَالُهٗ

درود وسلام کی حقیقت:

''درود'' فارسی کا لفظ ہے، جب کہ صلوٰۃ عربی کا لفظ ہے، جس کے معنیٰ میں بہت ہی وسعت ہے، تکریم وتشریف، مدح وثنا، رفع مراتب، محبت وعطوفت، برکت ورحمت، پیار ودلار، ارادۂ خیر ودعاءِ خیر، ان سب کو صلوٰۃ کا مفہوم حاوی ہے، اس لیے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور ایمان والوں کی طرف یکساں طور پر کی جا سکتی ہے، البتہ یہ فرق ہوگا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کا درود اس کی شانِ عالی کے مطابق ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرشتوں کے مجمع میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کرتے ہیں، اور فرشتوں کا حضور ﷺ پر درود ان کے مرتبہ کے مطابق ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے بھی آپ ﷺ کی تعظیم وتکریم اور مدح وثنا بیان کرتے ہیں اور آپ ﷺ کے لیے حق تعالیٰ سے لطف وعنایت اور رفع درجات کی دعائیں کرتے ہیں، لہٰذا اے ایمان والو! تم بھی ایسا ہی کرو اور اپنی حیثیت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص لطف وعنایت، محبت وعطوفت اور رفع درجات کی التجا کرو اور آپ ﷺ پر سلام بھیجا کرو، اس

حیثیت سے صلوٰۃ وسلام دراصل اللہ تعالیٰ کے حضور میں کی جانے والی بہت ہی اعلیٰ اوراشرف درجہ کی ایک دعا ہے۔

سَلَامٌ عَلٰی خَیْرِ الْأَنَامِ وَسَیِّدٖ حَبِیْبِ إِلٰـهِ الْعَالَمِیْنَ مُحَمَّدٖ
بَشِیْرٍ نَذِیْرٍ هَاشِمِيٍّ مُکَرَّمٖ عَطُوْفٍ رَؤُوْفٍ مَنْ یُّسَمّٰی بِأَحْمَدٖ

’’سلام ہومخلوقات میں سب سے بہتر ذات اوران کے سردار، رب العالمین کے محبوب محمد ﷺ پر جو بشارت دینے والے ہیں (جنت کی) اور شفقت ومحبت کے ساتھ ڈرانے والے ہیں(جہنم سے) ہاشمی النسل اور باعزت ہیں، مہربان اور شفیق ہیں، جن کا نام احمد ہے۔

درودوسلام کی خاص حکمت:

محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ’’انبیاء علیہم السلام اور خاص کرسیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عقیدت ومحبت اوروفاداری ونیازمندی کا ہدیہ اور ممنونیت وسپاس گزاری کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے درود وسلام کا طریقہ مقرر کرنے کی سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ اس سے شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے مقدس اور محترم ہستیاں انبیاء علیہم السلام ہی کی ہیں، اوران میں سب سے اکرم وافضل خاتم النبیین سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جب ان کے بارے میں بھی یہ حکم دے دیا گیا کہ ان پر درود وسلام بھیجا جائے، (یعنی اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے خاص الخاص عنایت ورحمت اور سلامتی کی دعا کی جائے) تو معلوم ہوا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت اور نظر کرم کے محتاج ہیں اوران کا حق اور مقام عالی یہی ہے کہ ان کے واسطے اللہ تعالیٰ سے اعلیٰ سے اعلیٰ دعائیں کی جائیں، اس کے بعد شرک کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی، کتنا بڑا اکرم ہے رب کریم کا کہ اس کے اس حکم نے ہم بندوں اور امتیوں کو نبیوں اور رسولوں کا بالخصوص سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دعا گو بنادیا، اب جو بندہ ان مقدس ہستیوں کا دعا گو ہو وہ کسی مخلوق کا پرستار

کیسے ہوسکتا ہے؟ (معارف الحدیث: ۵/ ۳۵۸)

اس موقع پر ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیم رحمۃ اللہ علیہ کا وہ ارشاد جو آپ نے اگست ۲۰۱۱ء ماہِ رمضان ۱۴۳۲ھ کے سفر عمرہ کے موقع پر حرم کی مجلس میں فرمایا تھا وہ قابل توجہ ہے کہ ''حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام کے متعلق قرآنی حقائق کو ملحوظ رکھے بغیر انصاف کے تقاضے پورے کرنا اور ایمان کو بچانا ممکن نہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''مجھ سے محبت میں غلو نہ کرنا جیسا کہ یہود ونصاریٰ نے سیدنا عیسیٰ وعزیر علیہما السلام کی محبت میں کیا، ایمان کی سرحد میں قدم رکھتے ہی اقرارِ الوہیت کے بعد اقرارِ عبدیت پہلے ہے اور اقرارِ رسالت بعد میں ہے: ''وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ نے رسالت کا نگینہ بشریت کی انگوٹھی میں سجایا ہے، اس تناظر میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی بشریت کا انکار نبوت ورسالت کے انکار کے مترادف ہے، اسی طرح حضراتِ انبیاء ورسل علیہم السلام کو عالم الغیب ماننا وحی کے انکار کے مترادف ہے، نیز نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرح ہر جگہ حاضر وناظر ماننا معراج وہجرت وغیرہ کے انکار کے مترادف ہے، اور مختار کل ماننا شفاعت کے انکار کے مترادف ہے۔

یاد رکھو! حضرات انبیاء ورسل علیہم السلام ہدایت وتنویر کا آسمان ہوتے ہوئے بنی نوعِ انسان ہی میں سے ہوتے ہیں اور علم وحکمت کا سمندر ہونے کے باوجود عالم وحی ہوتے ہیں، عالم الغیب اللہ تعالیٰ ہی ہے، نیز ان کے فیوض وبرکات عالمگیر ہونے کے باوجود وہ اپنی قبور میں تشریف فرما ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ بارگاہِ الوہیت میں امتیازی وانفرادی محبوبیت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے در کا فقیر ہونا اور دعائیں کرنا ان کے لیے مایۂ افتخار ہے اور مانگتا وہی ہے جو مختارِ کل نہ ہو۔''

درود وسلام کا اصلی مقصد:

مگر یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ صلوٰۃ وسلام اگرچہ بظاہر رحمت عالم صلی اللہ

علیہ وسلم کے حق میں اللہ تعالیٰ سے کی جانے والی ایک دعا ہے، لیکن جس طرح کسی دوسرے کے لیے دعا کرنے کا اصلی مقصد اس کو نفع پہنچانا ہوتا ہے، اسی طرح رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو نفع پہنچانا نہیں ہوتا، اور نہ ہی ہماری دعاؤں کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی ضرورت ہے، بادشاہوں کو مسکینوں کے تحفوں اور ہدیوں کی کیا ضرورت؟ بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ہم بندوں پر حق ہے کہ ہم اس کے حضور اپنی عبادت وعبدیت کا نذرانہ پیش کریں اور اس سے اللہ تعالیٰ کو تو کوئی نفع نہیں پہنچتا، بلکہ وہ خود ہماری ضرورت ہے اور اس کا نفع بھی ہم ہی کو پہنچتا ہے، ٹھیک اسی طرح رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن وکمالات، خصائص وفضائل، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ خدمات اور امت پر عظیم الشان احسانات کا یہ حق ہے کہ ہم امتی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں عقیدت ومحبت کا نذرانہ صلوٰۃ وسلام کی شکل میں پیش کریں، تو درود وسلام وہ دعا ہے جو اہل ایمان رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات اور قربانیوں کے سبب اپنی قلبی محبت کے اظہار کے لیے اپنے رب کے حضور کرتے ہیں، اور اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت، ثوابِ آخرت اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور قربت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، اور صلوٰۃ وسلام کا یہ اصلی مقصد اس خوش قسمت کو حاصل ہوتا ہے جو خلوصِ نیت کے ساتھ اس کا التزام واہتمام کرتا ہے۔

درود وسلام کی فضیلت:

چناں چہ حدیث مذکور سے صلوٰۃ وسلام کا اہتمام کرنے والے مخلص کے لیے بڑی زبردست فضیلت ثابت ہوتی ہے، حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے مابین تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر خوشی اور بشاشت کے آثار صاف نظر آرہے تھے، پھر خود ہی اس کا سبب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ''آج جبرئیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے بتایا کہ تمہارے رب

کا ارشاد ہے کہ ”اے محمد! کیا یہ بات تمہیں راضی کرنے کے لیے کافی نہیں کہ تمہارا جو امتی ایک بار تم پر صلوٰۃ ودرود بھیجے گا تو میں اس پر دس مرتبہ رحمتیں نازل کروں گا اور جو تم پر ایک سلام بھیجے گا میں اس پر دس مرتبہ سلام بھیجوں گا۔“ یہ وعدہ حق تعالیٰ کا اس شخص کے لیے ہے جو خلوصِ نیت اور حضورِ قلب کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے، قرآنِ کریم میں ارشادِ باری ہے:

﴿وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيكَ رَبُّكَ فَتَرۡضَىٰٓ﴾ (الضحیٰ:۵)

محبوبم! تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔ اس وعدۂ ربانی کا حقیقی ظہور تو قیامت کے دن ہوگا، لیکن یہ بھی اس کی ایک قسط ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کا اتنا اعزاز واکرام فرمایا اور محبوبیت کبریٰ کا وہ مقامِ عالی عطا فرمایا کہ جو بندہ آپ ﷺ کی محبت وعظمت میں ڈوب کر خالصاً للہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک بار صلوٰۃ وسلام بھیجے گا حق تعالیٰ نے اس پر دس رحمتیں اور عنایتیں بھیجنے کا فیصلہ فرمالیا، جس کی اطلاع خود آپ ﷺ کو جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ دی گئی۔

مرحبا صلِّ علیٰ کیا ہی مبارک کام ہے
ہاتھ میں جامِ محبت لب پہ ان کا نام ہے

دوسری روایتوں میں دس صلوٰۃ وسلام کے علاوہ اس کے درجے بلند کرنے اور دس گناہ مٹانے اور دس نیکیاں لکھنے جانے کا بھی ذکر آیا ہے۔ (نسائی، مشکوٰۃ/ص:۸۶) اب اگر صلوٰۃ وسلام کے فضائل کے حصول کے لیے جو خوش نصیب امتی خلوصِ قلب کے ساتھ روزانہ کم از کم سو دفعہ صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا اہتمام کر لے تو ان احادیث مبارکہ کی بشارت کے مطابق (جو ایک دو نہیں بلکہ بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے صحاح اور سنن ومسانید کی تقریباً ساری کتابوں میں قابل اعتماد سندوں کے ساتھ مروی ہیں) اس پر حق تعالیٰ ایک ہزار رحمتیں اور نوازشیں فرماتا ہے، اس کے ایک ہزار درجات بلند کیے جاتے ہیں، اس کے نامۂ اعمال

سے ایک ہزار گناہ معاف کیے جاتے ہیں اور ایک ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اللہ اکبر کبیرا! کتنا ارزاں و نفع بخش سودا ہے، اب کتنے خاسر اور بے نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس سعادت سے خود کو محروم کر رکھا ہے، حق تعالیٰ ہمیں یقین نصیب فرمائے اور توفیق عمل دے، آمین۔

ایک واقعہ:

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ درودِ پاک ہمارے پاس حق تعالیٰ کی جانب سے دیا ہوا ایک انمول عطیہ، رحمتوں و برکتوں کا خزینہ اور بلندئ درجات کا زینہ ہے، جس سے انسان کے ہموم وغموم دور، دل ودماغ پر نور، اعمال رشک طور اور ربِ کریم بے حد مسرور ہو جاتا ہے، بشرطیکہ حضور ﷺ کی محبت میں سرشار ہو کر حضورِ قلب اور خلوصِ نیت کے ساتھ پڑھا جائے۔

اس کی تائید ایک واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی کثیر العبادات اور مستجاب الدعوات صحابی تھے، حق تعالیٰ سے بہت ہی زیادہ دعا مانگا کرتے تھے، ایک مرتبہ ان کے دل میں خیال آیا کہ میں حق تعالیٰ سے جو دعائیں مانگتا ہوں اور جتنا وقت اس میں لگاتا ہوں اس میں سے کچھ وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے لیے مخصوص کر دوں، مگر خود اپنی طرف سے کوئی معمول مقرر کرنے کے بجائے حاضر خدمت ہو کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے دریافت کر لیا کہ میں کتنا وقت اس کے لیے مخصوص کروں؟ تو آپ ﷺ نے اپنی طرف سے کوئی تحدید و تعیین مناسب نہیں سمجھی، بلکہ ان ہی کی رائے پر چھوڑ دیا، مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرما دیا کہ تم اپنی بشاشت سے اس کے لیے جتنا بھی زیادہ وقت دوگے اور جتنی کثرت سے درود پڑھوگے وہ تمہارے ہی لیے بہتر ہوگا، بالآخر انھوں نے یہ طے کیا کہ میں وہ سارا وقت جس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتا ہوں وہ حضور ﷺ پر درود بھیجنے ہی میں صرف کروں گا، ان کے اس فیصلہ پر حضور ﷺ نے یہ بشارت سنائی:

”إِذًا يُكْفٰى هَمُّكَ وَيُكَفَّرُ لَكَ ذَنْبُكَ“. (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ/ص:۸۶

الفصل الثانی)

اگر تم ایسا کرو گے تو کثرتِ درود کی برکت سے تمہارے وہ سارے مسائل اور مشکلات جن کے لیے تم دعائیں کرتے ہو حق تعالیٰ ان تمام کو حل فرما دیں گے اور تمہارے گناہوں کو بھی معاف فرما دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی اپنے مقاصد کے لیے دعاؤں کی جگہ بھی درود ہی پڑھے تو ان شاء اللہ اس کے دین و دنیا کے سارے مسائل پردۂ غیب سے حل ہو جائیں گے۔

چناں چہ اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ مواہب لدنیہ میں تفسیر قشیری سے نقل کیا گیا ہے کہ قیامت میں کسی مومن کی نیکیاں کم وزن ہو جائیں گی تو رحمت عالم ﷺ ایک پرچہ سر انگشت کے برابر نکال کر (اللہ جل شانہ کی اجازت سے) میزان میں رکھ دیں گے، جس سے اس مومن کی نیکیوں کا پلہ وزنی ہو جائے گا، وہ مردِ مومن تعجب سے کہے گا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں آپ کون ہیں؟ آپ کی صورت وسیرت بڑی حسین ہے، تب آپ ﷺ فرمائیں گے کہ "میں تیرا نبی ہوں، اور پرچہ میں تیرا وہ اخلاص کے ساتھ مجھ پر پڑھا ہوا درود ہے۔" (جس کی برکت سے آج تیری نجات ہوئی) (از فضائل درود/ ص: ۲۴۵) سچ ہے:

ہر کہ باشد عامل صلوٰۃ مدام
آتش دوزخ شود بروے حرام

درود شریف دعا کی قبولیت کا وسیلہ:

علاوہ ازیں خود دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ اور وسیلہ بھی تو درود ہی ہے، جس طرح نماز کی کنجی وضو ہے، اسی طرح درود شریف دعا کی کنجی ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے:

"إِنَّ الدُّعَاءَ مَوْقُوْفٌ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا يَصْعَدُ مِنْهُ شَيْءٌ حَتّٰى تُصَلِّيَ

عَلٰی نَبِیِّكَ". (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۸۷/الفصل الثالث)

''دعا آسمان اور زمین کے درمیان ہی رکی رہتی ہے، اوپر نہیں جاتی، جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجا جائے۔'' (مندرجۂ بالا روایت میں اس کا ذکر اگر چہ نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات خود حضور ﷺ سے سنی تھی، لیکن چوں کہ یہ ایسی بات ہے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی تو کیا کوئی اور صحابی یا حدیث کا راوی بھی اپنی رائے اور فہم سے ایسا دعویٰ نہیں کرسکتا، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ سے سن کر ہی ایسی بات کہی جا سکتی ہے، اس لیے حضرات محدثین کے مسلمہ اصول کے مطابق یہ روایت حدیث مرفوع ہی کے حکم میں ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ دعا کے شروع میں اللہ جل شانہ کی حمد وثنا کے بعد جس طرح درود شریف کا اہتمام کیا جاتا ہے اسی طرح دعا کے ختم پر بھی درود کا اہتمام کرنا چاہیے، اس لیے کہ یہ دعا کی قبولیت کا خاص وسیلہ ہے، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ درود شریف خود ایک اعلیٰ درجہ کی دعا ہے، (جیسا کہ تفصیل گذر چکی ہے) اسے حق تعالیٰ ضرور ہی قبول فرماتے ہیں، پھر جب بندہ اپنی دعا سے پہلے اور اخیر میں درود پڑھ کر گویا حق تعالیٰ سے حضور ﷺ کے حق میں دعا کرے اور اس کے درمیان اپنی دعا کرے تو اس کے کرم سے یہ بہت ہی بعید ہے کہ وہ اوّل وآخر کی دعائیں (جو بشکل درود ہیں) قبول کرے اور درمیان کی دعا قبول نہ کرے، اس لیے جس جائز دعا کے اوّل وآخر میں درود پڑھا جائے وہ ان شاء اللہ ضرور ہی قبول ہوگی۔

چناں چہ ترمذی شریف میں منقول ہے کہ صحابیٔ رسول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ نماز کے بعد اپنے معمول کے مطابق دعا سے پہلے درود شریف پڑھا، حضور ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ "سَلْ تُعْطَهْ، سَلْ تُعْطَهْ" (مشکوٰۃ/ص: ۸۷ الفصل الثانی)

''اب مانگو جو (جائز) دعائیں (آداب کے ساتھ) مانگی جائیں گی وہ ضرور قبول ہوں گی۔''

کثرتِ درود پر قیامت میں حضور ﷺ کا قرب اور شفاعت:

غور کیجئے! درود شریف کے یہ کوئی معمولی فضائل ہیں؟ اور اس سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جو خوش نصیب امتی دنیا میں درود کی کثرت کرے گا اسے قیامت کے دن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا قربِ خاص نصیب ہوگا، حدیث پاک میں ہے:

”عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”أَوْلَى النَّاسِ بِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلوٰةً“. (رواہ الترمذی، مشکوۃ/ص:۸٦، الفصل الثانی)

مطلب یہ ہے کہ (ایمان اور ایمانی زندگی کی بنیادی شرط کے ساتھ) قیامت کے دن مجھ سے قریب ترین اور مجھ پر زیادہ حق رکھنے والا میرا وہ امتی ہوگا جو مجھ پر زیادہ درود بھیجنے والا ہوگا، اس کو میرا خصوصی قرب اور خاص تعلق نصیب ہوگا۔ معلوم ہوا کہ درود شریف حضور ﷺ سے عقیدت و محبت کے اظہار کے علاوہ قیامت میں آپ ﷺ کے قرب کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ ایک روایت میں ہے:

”عَنْ رُوَيْفِعِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:” مَنْ صَلّٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَقَالَ: ”اَللّٰهُمَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِيْ“. (رواہ أحمد، مشکوۃ/ص:٦٧، الفصل الثالث)

میرا جو امتی مجھ پر درود بھیجے اور ساتھ ہی یہ دعا کرے:

”اَللّٰهُمَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“

اے اللہ! ان (یعنی ہمارے آقا ﷺ) کو قیامت کے دن اپنے قریب کی نشست گاہ (کرسئ خاص) عطا فرما۔ تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگی۔ اس درود کو طبرانی نے بھی المعجم الکبیر اور المعجم الاوسط میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّأَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

اس میں درود اور دعا کے پورے الفاظ آگئے جو بہت ہی مختصر ہیں۔

یوں تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم شفیع المذنبین ہیں، اپنے سبھی گناہگار امتیوں کے لیے شفاعت فرمائیں گے، ان شاء اللہ، لیکن جو اہل ایمان آپ ﷺ پر خاص ان مذکورہ الفاظ میں درود بھیجیں گے اور اللہ تعالیٰ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ دعا کریں گے تو ان کی شفاعت کا آپ ﷺ اپنے اوپر خصوصی حق سمجھیں گے اور قوی اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی سفارش بڑے اہتمام سے فرمائیں گے۔

دنیا میں کہیں سے بھی درود بھیجا جائے حضور ﷺ تک پہنچتا ہے:

پھر عجیب بات یہ ہے کہ درود دنیا میں کہیں بھی پڑھا جائے اسے حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں فرشتوں کے ذریعہ رب العالمین پہنچا دیتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے:

"عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "لَاتَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا وَّلَا تَجْعَلُوْا قَبْرِيْ عِيْدًا، وَصَلُّوْا عَلَيَّ، فَإِنَّ صَلٰوتَكُمْ تُبَلِّغُنِيْ حَيْثُ كُنْتُمْ". (رواه النسائی، مشکوۃ/ص:۸۶/ الفصل الثانی)

اس میں تین ہدایتیں فرمائی گئیں: پہلی یہ ہے کہ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے تو اسے عام قبرستان میں دفن کرو، گھر میں نہیں، کیوں کہ یہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی خصوصیت ہے۔ اس کا دوسرا مطلب عام طور سے شارحین نے یہ بیان کیا ہے کہ جس طرح قبروں میں مردے ذکر وعبادت نہیں کرتے اور قبریں ذکر وعبادت سے خالی رہتی ہیں، تم اپنے گھروں کو ایسا نہ بنالو کہ وہ ذکر وعبادت سے خالی رہیں، اپنے گھروں کو ذکر وعبادت سے معمور رکھو! اس سے معلوم ہوا کہ جن گھروں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی عبادت نہ ہو وہ زندوں کے گھر نہیں، بلکہ مردوں کے قبرستان ہیں۔

دوسری ہدایت: یہ فرمائی گئی کہ میری قبر کو عید اور میلہ نہ بناؤ۔ یعنی جس طرح سال کے کسی معین دن میں میلوں میں لوگ جمع ہوتے ہیں اسی طرح میری قبر پر کوئی میلہ نہ لگایا جائے، اسی سے مزاراتِ اولیاء پر عرس وغیرہ کے نام سے میلہ کرنے کا عدمِ جواز ثابت

ہوگیا۔اس کے باوجوداب جولوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں وہ حضور ﷺ کے نافرمان ہیں۔

اور تیسری ہدایت: یہ فرمائی گئی کہ تم مشرق یا مغرب، شمال وجنوب حتیٰ کہ خشکی یا تری میں جہاں سے بھی مجھ پر درود بھیجو گے وہ مجھے ضرور پہنچے گا۔غور کیجئے! درود پڑھنے والوں کے لیے یہ کتنی بڑی بشارت اور تسلی کی بات ہے کہ وہ ہزاروں میل کی دوری سے بھی اگر درود بھیجتے ہیں تو ان کا درود آپ ﷺ تک پہنچتا ہے۔

قربِ جانی چو بود بُعد مکانی سہل است

ایک روایت میں ہے کہ جو شخص دور سے درود بھیجے فرشتہ اس پر متعین ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک وہ پہنچائے، اور جو روضۂ اقدس پر قریب سے پڑھتا ہے تو خود آپ ﷺ اسے سنتے ہیں۔

حق تعالیٰ ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت واطاعت اور درودِ پاک کی کثرت کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

۷/ رمضان المبارک/۱۴۳۲ھ (بعد الفجر)

مطابق: ۸/ اگست/ ۲۰۱۱ء

بعد الفجر/ بروز: پیر (بزم صدیقی)

”اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

☆......☆......☆

(۳۵)

ہجرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَنَسِ بۡنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ أَنَّ أَبَابَكۡرِ نِ الصِّدِّيۡقَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: "نَظَرۡتُ إِلٰى أَقۡدَامِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ عَلٰى رُؤُوۡسِنَا وَنَحۡنُ فِي الۡغَارِ، فَقُلۡتُ:" يَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ! لَوۡ أَنَّ أَحَدَهُمۡ نَظَرَ إِلٰى قَدَمِهٖ أَبۡصَرَنَا"، فَقَالَ:" يَاأَبَابَكۡرٍ! مَا ظَنُّكَ بِاثۡنَيۡنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا". (متفق عليه، مشكوة/ص: ۵۳۰/ باب في المعجزات/ الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ "جب ہم غار میں چھپے ہوئے تھے اور میں نے مشرکین کے پیروں کی طرف دیکھا جو گویا ہمارے سروں پر تھے، تو میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی نظر اپنے پیروں کی طرف چلی گئی تو وہ ہم کو دیکھ لے گا"، حضرت نے سن کر ارشاد فرمایا: "ان دو شخصوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، جن کا تیسرا ساتھی اللہ تعالیٰ ہے"۔

ہجرت کی حقیقت وفضیلت:

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں خیر کے مقابلہ میں اکثر شر غالب رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی روئے زمین پر کوئی اصلاحی واخلاقی تحریک اٹھی اور جہالت وضلالت میں مبتلا انسانیت کو دین حق کی دعوت دے کر خیر کی طرف بلایا گیا تو اکثر ایسا ہوا کہ جہالت کے

روحانی بیمار، رسم قدیم کے عشاق اور شر پسندوں نے دہشت گردی سے کام لیتے ہوئے اصلاح پسندوں اور دین کے داعیوں کے لیے زمین اس کی وسعت کے باوجود تنگ کردی، انہیں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائی گئیں، یہاں تک کہ انہیں اپنے دین وایمان کی حفاظت اور دعوت کے لیے وطن عزیز کو چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔

''ہجرت'' ایک اسلامی اصطلاح ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ دین پر عمل کرنے یا ایمان کی حفاظت اور دینِ حق کی دعوت واشاعت کی غرض سے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر کسی ایسے علاقہ میں جا بسنا اور نیا میدان تلاش کرنے کے لیے مرکز قائم کرنا جہاں شعائرِ اسلام پر عمل کرنے کی اور دین حق کی دعوت واشاعت کی مکمل آزادی ہو، شریعت میں اس عمل خیر کو ''ہجرت'' کہتے ہیں۔ ہجرت گوشۂ عافیت تلاش کرنے کا نہیں، بلکہ میدانِ دعوت تلاش کرنے کا نام ہے، یہ کوئی سفر تجارت نہیں کہ مال واسباب کے ساتھ بآسانی گھر سے نکل جائیں اور پھر واپس لوٹ آئیں، بلکہ یہ ایک پر مشقت سفر ہے جس میں آبائی وطن کو دین کے لیے چھوڑنا پڑتا ہے، جائیداد سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں، اعزہ واقرباء جدا ہو جاتے ہیں، اس لیے اس عمل خیر پر بہت سے وعدے قرآنِ کریم میں وارد ہوئے ہیں۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ط وَلَأَجْرُ الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ م لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (النحل: ٤١)

''جن لوگوں نے دوسروں کے ظلم سہنے کے بعد اپنا وطن چھوڑا یقین رکھو انہیں ہم دنیا میں بھی اچھی طرح بسائیں گے اور آخرت کا اجر تو یقیناً سب سے بڑا ہے، کاش کہ یہ لوگ جان لیتے۔'' اس میں ہجرت کرنے والوں کے لیے دنیا وآخرت کی بہتری کا وعدہ فرمایا گیا ہے، ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَأُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا

لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَ لَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ج ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

"سو جن لوگوں نے ہجرت کی اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا اور میرے راستے میں تکلیفیں دی گئیں اور جنہوں نے (دین کے خاطر) لڑائی لڑی اور قتل ہوئے، میں ان سب کی برائیوں کا ضرور کفارہ کردوں گا اور انہیں ضرور بالضرور ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے انعام ہوگا، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بہترین انعام ہے۔" اس جگہ مہاجرین اور مجاہدین کے لیے رب العالمین نے مغفرت اور جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ہجرت اور جہاد کی شریعت مطہرہ میں بڑی اہمیت و فضیلت ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کی برکت سے کایا ہی پلٹ جاتی ہے، اہل ایمان اس کی وجہ سے دارین کی خوشحالی وکامیابی سے سرفراز ہوتے ہیں، حضرات انبیاء علیہم السلام وصحابہ رضی اللہ عنہم کی تاریخ اور ہجرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بہترین مثال ہیں۔

یوں تو تقریباً ہر نبی اور رسول نے ہجرت فرمائی ہے، شاید ہی کوئی پیغمبر ہوں جن کو ہجرت نہ کرنی پڑی ہو، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور حضرت موسیٰ علیہم السلام وغیرہ کی ہجرت کے واقعات تو خود قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، لیکن ہجرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی نرالی شان ہے، اس کا ایک ایک واقعہ عبرت ونصیحت کا عنوان اور جواہرات ونوادرات سے بھرپور ہے، عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں عبرت اور موعظت کے نقوش تلاش کیے جائیں اور ان سے اپنی عملی زندگی میں رہنمائی حاصل کی جائے۔

ہجرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پس منظر:

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۱م میں پیدا ہوئے اور ٹھیک چالیس سال کی عمر مبارک یعنی ۶۱۱م میں آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا، نبوت ملنے کے بعد ۱۳/ سال تک

آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں دعوتِ دین کی اس طرح جدوجہد فرمائی کہ شب وروز آپ ﷺ بے قرار رہتے تھے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ کے بندے اللہ تعالیٰ کو پالیں اور راہِ ہدایت کی طرف لوٹ آئیں، پورا پورا دن آپ ﷺ گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں گھوم گھوم کر دعوت دینے میں گزارتے، ایک ایک کے دروازہ پر پہنچتے اور درِ دل کو دستک دیتے، لیکن بہت کم تھے وہ سعادت مند جنہوں نے آپ ﷺ کی دعوتِ خیر پر لبیک کہہ کر دین حق قبول کیا، اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کے سامنے دین حق کی روشنی دوپہر کی دھوپ کی طرح کھل کر آ گئی، مگر وہ اپنے آباء واجداد کے بت پرستی والے باطل طریقہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے، بلکہ ان شقاوت پسندوں نے آپ ﷺ کی مخالفت کی، آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے اصحاب کو طرح طرح کی شدید تکلیفیں پہنچائی گئیں، آپ ﷺ کا پورے خاندان سمیت بائیکاٹ کیا گیا، جسم اقدس پر اونٹ کی اوجھ اور غلاظت ڈالی گئی، راہوں میں کانٹے بچھائے گئے، جملے کسے گئے اور تالیاں پیٹی گئیں، آپ ﷺ کو فاتر العقل اور جادوگر مشہور کیا گیا وغیرہ، تب آپ ﷺ نے طائف کا رخ فرمایا کہ شاید ان کو قبولِ اسلام کی توفیق ہو، لیکن طائف کی زمین مکہ سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئی، انہوں نے نہ صرف آپ ﷺ کی دعوتِ حق کا انکار کیا بلکہ آپ ﷺ کو مارا اور جسم مبارک کو لہولہان کر دیا، اس دوران آپ ﷺ نے خوب دعا فرمائی تو دریائے رحمت کو جوش آیا، پھر یہ ہوا کہ ایمان واسلام کا جو تخم آپ ﷺ نے مکہ اور طائف کی زمین میں بویا تھا اللہ تعالیٰ اس سے اہل مدینہ کے دلوں کو بار آور فرما رہے تھے۔

فقیہ العصر علامہ خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہٗ (راہِ عمل/ ص: ۷۰ میں) فرماتے ہیں کہ ''بارش کہیں اور ہو رہی تھی اور ایمان کا آبِ حیات کہیں اور جمع ہو رہا تھا، حج کے موقع سے مدینہ طیبہ کے لوگ مکہ مکرمہ آئے تو ان کے کان آپ ﷺ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوئے، وہ مخلص اور حق کے متلاشی تھے، انہیں ضد اور اکڑ نہ تھی، اس لیے فوراً ہی کانوں سے دلوں تک کا فاصلہ طے ہو گیا، ایمان لائے اور اہل ایمان کو پناہ دینے کا عہد بھی کیا، اُدھر مکہ کی زمین اہل ایمان پر تنگ سے تنگ تر ہوتی جا رہی تھی، بعض مسلمانوں کو گلے میں پھندا

ڈال کر گرم ریت پر گھسیٹا جاتا، بعضوں کو سلگتے ہوئے شعلوں پر لٹایا جاتا اور ان کے جسم سے رسنے والے لہو سے آگ بجھائی جاتی، کسی کو دھوئیں کی دھونی دی جاتی، بعض تو بے رحمی سے شہید ہی کر دیے گئے۔'' حضرت حفیظ نے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے:

اُدھر مکے میں دنیا تنگ تھی ایمانداروں پر
کہ روندے جا رہے تھے پھول کے سے جسم خاروں پر
صحابہؓ پر اگرچہ قہر کے بادل برستے تھے
بیچارے سانس آزادی سے لینے کو ترستے تھے

ہجرتِ مدینہ کا حکم:

لیکن یہ کہاں ممکن تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے دامن صبر چھوٹ جائے اور حکم الٰہی کے بغیر خود سے فیصلہ کریں، بالآخر خود رب العالمین کی طرف سے مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا حکم نازل ہوا، تب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم خفیہ طور پر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے لگے، اِدھر قریش مکہ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی کہ مسلمان رفتہ رفتہ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ جا رہے ہیں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ طیبہ کو اپنا مرکز بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس سے مشرکین مکہ کو سخت فکر ہوئی کہ کہیں محمد اور ان کے رفقاء ہمارے لیے خطرہ نہ بن جائیں، لہٰذا قبل اس کے کہ محمد بھی ہجرت مدینہ کے لیے روانہ ہوں ہمیں کچھ ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ محمد اور اس کی تحریک ہی مٹ جائے، اس سلسلہ میں مکہ کے سرداروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دار الندوۃ (جو قصی بن کلاب کا بنایا ہوا بڑا مکان بلکہ ان کا میٹنگ ہال تھا) میں ایک میٹنگ بلائی، تاکہ محمد کے اثر اور رسوخ کو کم کرنے اور ان کے رفقاء کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی تدابیر کی جائیں جن سے ان کی تمام مساعی فیل ہو جائیں، حسب پروگرام جب تمام سردارانِ مکہ جمع ہو گئے تو ابلیس لعین بھی ایک بوڑھے مشرک کی شکل میں نمودار ہوا اور دروازہ پر کھڑا ہو گیا، اجلاس کے اراکین نے جب اس سے دریافت کیا کہ

آپ کون ہیں؟ تو بولا میں نجد کا ایک شیخ ہوں، تمہاری گفتگو سننا چاہتا ہوں، اگر ممکن ہو تو اپنی رائے اور مشورہ سے تمہاری امداد کروں گا، انہوں نے اندر آنے کی اجازت دے دی، جب گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں مختلف تجاویز زیر غور آئیں، ایک رائے اور تجویز یہ آئی کہ محمد کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر ایک بند کوٹھڑی میں قید کر دیا جائے اور انہیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیا جائے، اس طرح وہ نعوذ باللہ خود بخود ہلاک ہو جائیں گے، شیطان جو شیخ نجدی کی صورت میں بیٹھا تھا فوراً بول اٹھا کہ یہ رائے درست نہیں، اس لیے کہ محمد کے اصحاب ان پر دیوانہ وار اور پروانہ وار نثار ہوتے ہیں، ان کے وجود کی خوشبو ان کے عقیدت مندوں کو ان کی قید و بند کی خبر کر دے گی اور وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر تم پر حملہ کر کے تم سے ان کو چھڑا لیں گے، دوسری رائے یہ آئی کہ محمد کو جلاوطن کر دیا جائے، شیخ نجدی نے اس بات سے بھی اختلاف کیا اور کہا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ محمد جہاں بھی جائیں گے اپنی زبان کا جادو ضرور جگائیں گے اور بالآخر لوگ ان کا کلام سن کر ایمان لے آئیں گے، اور پھر تم اور تمہارا مذہب خطرہ میں پڑ جائے گا، اس لیے یہ رائے تو بالکل ہی غلط ہے، اب کی بار ابوجہل نے کہا کہ محمد کے بڑھتے ہوئے اثر اور ان کی مقبولیت کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ ہر ہر قبیلے سے ایک معتمد اور بہادر نوجوان منتخب کیا جائے، پھر یہ سارے مل کر اچانک محمد پر حملہ کر کے قتل کر دیں، اس طرح قتل کی ذمہ داری تمام قبائل پر ہو گی، بنو عبد مناف تمام قبائل سے لڑ نہیں سکیں گے، دیت کا مطالبہ کریں گے جو ہم سب مل کر بآسانی ادا کر دیں گے، اس طرح راستہ صاف ہو جائے گا، اس کے سوا اور کوئی حل نہیں، شیخ نجدی نے اس کی تائید کی اور کہا واقعی اس سے بہتر اور کوئی تجویز نہیں ہو سکتی، چراغِ مصطفوی کو گل کرنے کے لیے اسی رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا اور یہ بھی طے پایا کہ یہ کام اسی شب میں انجام کو پہنچایا جائے۔

صاحبو! اس سے معلوم ہوا کہ موحدین پر حملے کرنا اور اس کے لیے پلاننگ کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ مشرکین کا پرانا منشور اور طریقہ رہا ہے، جس پر ان کی معنوی اولاد قیامت

تک عمل پیرا رہے گی۔ ایک طرف مشرکوں کی یہ پر سازش مجلس برخاست ہوئی اور دوسری طرف رحمت عالم ﷺ پر وحی نازل ہوئی، جس میں آپ ﷺ کو مشرکین کی اس میٹنگ سے آگاہ کیا گیا اوران کا تمام تر منصوبہ اور راز رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ پر فاش کر دیا:

﴿ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ط وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِينَ﴾ (الأنفال: ۳۰)

”اور (اے پیغمبر) وہ وقت یاد کرو جب کافر لوگ منصوبے بنا رہے تھے کہ تمہیں گرفتار کر لیں یا تمہیں قتل کر دیں یا تمہیں (وطن سے) نکال دیں اور اللہ تعالیٰ اپنا منصوبہ بنا رہا تھا اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر منصوبہ بنانے والا ہے۔“

محبوبم! کفر و شرک کے سرغنوں نے اگر آپ کو ختم کرنے کی تدبیر کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو بچانے کی تدبیر کی، وہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ اس کی تقدیر کے مقابلہ ہر تدبیر مکڑی کا جالا ہے۔

اسی کے ساتھ آپ ﷺ کو ہجرت مدینہ کا حکم دے کر یہ دعا تلقین کی گئی:

﴿وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَ أَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِيْ مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيْرًا﴾ (بنی إسرائیل: ۸۰)

”اور یہ دعا کرو کہ یارب! مجھے جہاں داخل فرما اچھائی کے ساتھ داخل فرما اور جہاں سے نکال اچھائی کے ساتھ نکال اور مجھے خاص اپنے پاس سے ایسا اقتدار عطا فرما جس کے ساتھ (تیری) مدد ہو۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرتِ مدینہ کا حکم ملا تو آپ ﷺ نے جبرئیل امین علیہ السلام سے دریافت کیا کہ میرے ساتھ کون ہجرت کرے گا؟ عرض کیا: ”ابوبکر صدیق“۔

ہجرت کے لیے تیاری:

اس کے بعد رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، سیدہ عائشہ صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ ہمارے گھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر صبح یا شام کو تشریف لاتے، لیکن اس وقت عین دوپہر میں بے وقت نقاب ڈالے تشریف لائے، ہم نے سمجھ لیا کہ کوئی خاص بات پیش آئی ہے، آپ ﷺ نے آکر فرمایا: ''اگر گھر میں کوئی ہو تو ہٹا دو، کچھ خاص بات کرنی ہے'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''حضور! افرادِ خانہ کے علاوہ اور کوئی نہیں، تب آپ ﷺ اندر داخل ہوئے اور فرمایا: ''مجھے ہجرتِ مدینہ کا حکم ملا جس میں تم میرے رفیق ہو گے''۔

سنایا دوست کو فرمانِ حق مدینہ کی ہجرت کا
نوید زندگی بخشی، دیا مژدہ رفاقت کا

سن کر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور آنکھیں مسرت کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس سے پہلے مجھے گمان نہ تھا کہ فرطِ مسرت سے بھی کوئی رونے لگتا ہے، سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تیاری کے لیے پہلے ہی سے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی تھیں، جن کو چار مہینے سے ببول کے پتے کھلا رہے تھے، تاکہ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کے صبر آزما سفر پر خطر میں انہیں استعمال کیا جا سکے، عرض کیا: ''حضور! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، ان میں سے آپ جس ایک کو پسند فرمائیں وہ میری طرف سے ہدیہ ہے'' فرمایا: ''میں بغیر قیمت کے نہ لوں گا'' عرض کیا: ''اگر حضور اسی میں خوش ہیں تو قیمۃً لے لیں'' کہ میری ذاتی خواہش اور خوشی کچھ نہیں، سب کچھ آپ کے اشارہ کے تابع ہے۔

اس مقام پر بعض لوگوں کو یہ شبہ پیش آیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس اونٹنی سے کہیں زائد آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات پر خرچ کیا اور آپ ﷺ نے اس کو قبول فرمایا،

جیسا کہ بخاری شریف میں ہے کہ ''ابوبکر نے اپنی جان و مال سے جتنا مجھ پر احسان کیا اتنا کسی نے نہیں کیا'' اور ترمذی شریف میں ہے کہ ''جس کسی نے میرے ساتھ کوئی احسان کیا ہے تو میں نے اس کی مکافات کر دی ہے، سوائے ابوبکر کے، کہ اس کے احسانات کا بدلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی دے گا'' اس لیے شبہ ہوا کہ اس وقت آپ ﷺ نے اونٹنی کی قیمت دینے پر کیوں اصرار کیا؟ علماء نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہجرت ایک عظیم عبادت ہے، جس کو حق تعالیٰ نے ایمان کے بعد ذکر فرمایا ہے؛ اس لیے آپ ﷺ اس عبادتِ عظمیٰ میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے، آپ ﷺ چاہتے تھے کہ پہلی بار اور آخری بار ہجرت کا موقع مل رہا ہے، لہٰذا ہجرت صرف اپنی جان اور مال سے ہو، تا کہ زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب حاصل ہو سکے، اس لیے آپ ﷺ نے ان میں سے ایک اونٹنی جس کا نام علامہ واقدیؒ نے ''قصواء'' اور محمد بن اسحاقؒ نے ''جدعاء'' بتلایا ہے اس کی قیمت چار سو درہم ادا فرمائی اور ہجرت کے لیے تیاری کا پروگرام بنا کر تشریف لے گئے۔

ہجرت کے لیے روانگی:

جب رات کا وقت آیا اور تاریکی چھا گئی تو مشرکین مکہ کے سو مسلح نوجوان بہادروں نے پروگرام کے تحت آستانۂ نبوت کا چاروں طرف سے گھیراؤ کر لیا، ان کے دل میں عداوت، آنکھوں میں شرارت اور پوری فضا میں ابوجہل اور شیطان کی سیاست کی وجہ سے حرارت تھی، ایک طرف کفر کی قوت تھی تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی عظیم طاقت تھی، جس کا مقابلہ کرنا حماقت ہی حماقت تھی۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''صادق و امین'' کے لقب سے یاد کرتے تھے، اور آپ ﷺ کے جانی دشمن ہونے کے باوجود اپنی امانتیں آپ ﷺ ہی کے پاس رکھا کرتے تھے، اور آج حضور ﷺ کو بھی فکر تھی تو صرف ان ہی امانتوں کی جو مشرکین مکہ کی آپ ﷺ کے پاس موجود تھیں، اس رات آپ ﷺ کے

ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، آپ ﷺ اطمینان سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہے، جب فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جگایا اور فرمایا: ''علی! میری سبز چادر اوڑھ کر میرے بستر پر لیٹ جاؤ، مجھے ہجرتِ مدینہ کا حکم ملا ہے، تم میرے پاس اہل مکہ کی جو امانتیں ہیں ہر ایک کی امانت اس کے سپرد کر کے آنا، تا کہ دنیا کو پتہ چل جائے کہ محمد واقعی امین ہے''۔

خدا حافظ ہے، دیکھ! دل میں اندیشہ نہ کچھ لانا
یہ چیزیں ان کو پہنچا کر سوئے مدینہ چلے آنا

شبِ ہجرت:

اس موقع پر علامہ ضیاء القاسمیؒ نے اپنے مخصوص انداز میں خوب فرمایا کہ ''علی رضی اللہ عنہ کو سبز چادر میں سلایا، صدیق وعمر رضی اللہ عنہما کو سبز روضے میں سلایا، اے خدا! اے محمد ﷺ کے خدا! تو بتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت تو علی رضی اللہ عنہ کے حوالے، تیری امانت کس کے حوالے؟ آواز آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے، خدا کی امانت صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالے، مولائے کریم نے فرمایا: میرے محبوب! تیاری کرو، ہجرت کے لیے تیار ہو جاؤ، کیسے جاؤں مولی! زبانِ حال سے عرض کیا ہوگا: چاروں طرف محاصرہ ہے، حکم ہوا: جبرئیل! یا ربِ جلیل! میرے محبوب کو سلام کہو اور عرض کرو کہ مٹی کی مٹھی بھر کے ان کی طرف پھینکو، مولیٰ تو ہی بتا، کیسے پھینکوں؟ دروازے بند، روشن دان بند، کھڑکیاں بند، اور سامنے پھینکیں تو دائیں جانب والے بچ گئے، دائیں جانب پھینکیں تو بائیں بازو والے بچ گئے، تقدیر آواز دیتی ہے: میرے محبوب سے کہو! مٹی پھینکنا تیرا کام، اور اندھے کرنا میرا کام، اگر وہ چاروں طرف ہیں تو بچانے والا بھی تو چاروں طرف موجود ہے، ''لَا مَوْجُوْدَ فِي الْكَوْنَيْنِ وَلَا مَقْصُوْدَ إِلَّا هُوَ''(خطباتِ قاسمی:۱/۷۷ تا ۷۹)

روایات میں آتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو

شبِ ہجرت میں اپنے بستر پر سبز چادر دے کر لٹا دیا، اور گھر میں سے ایک مشت خاک لیے ہوئے برآمد ہوئے، آپ ﷺ نے اس مشت خاک پر سورۂ یٰس کی ابتدائی چند آیات: ﴿فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ (یٰس: ۹) تک پڑھ کر ایسی پھونک ماری کہ مشرکین کے چہرے سیاہ پڑ گئے، آنکھیں چندھیاں گئیں، اور دل کے اندھے آنکھوں سے بھی اس وقت اندھے ہو گئے، جو مشرک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کاشانۂ نبوت کو دیکھ رہے تھے ایک دم ان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے سے عاجز رہ گئے، آپ ﷺ ان کے سامنے سے گزر گئے اور کسی کو نظر نہ آئے، یہ دراصل ﴿فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ﴾ ہی کی ایک جھلک تھی، اس موقع پر عقل حیران ہوگئی کہ یہ کیسے اور کیوں کر ہوا؟ ایسے معاملوں میں ہمیشہ عقل حیران و پریشان رہی ہے، لیکن یاد رکھئے! جو اللہ تعالیٰ کے ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا ہو جاتا ہے، پھر انہیں راستوں کی ضرورت نہیں رہتی، وہ راستے تلاش نہیں کرتے، راستے ان کو تلاش کرتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے سے نکل کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، جہاں آپ پہلے ہی سے منتظر تھے، فوراً تیار ہو گئے، سیدہ عائشہ و اسماء رضی اللہ عنہما جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹیاں تھیں انہوں نے جلدی جلدی رخت سفر تیار کیا، عجلت میں جب توشہ دان باندھنے کے لیے رسی نہ ملی تو سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنا پٹکا (کمر بند جو عورتیں کام کے وقت اپنی کمر پر باندھتی ہیں) پھاڑ کر اس کے دو ٹکڑے کیے ایک سے ناشتہ دان کا منھ باندھا اور دوسرے سے مشکیزہ بند کیا، حضور اکرم ﷺ نے خوش ہو کر ہجرت کے لیے روانگی سے قبل انہیں "ذَاتُ النِّطَاقَيْنِ" (یعنی دو پٹکوں والی) کا تمغہ دیا، اس دن سے سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے ساری زندگی اسی لقب کو حرزِ جان بنائے رکھا، سبحان اللہ! باپ "ثَانِيَ اثْنَيْنِ" ہیں تو بیٹی "ذَاتُ النِّطَاقَيْنِ" ہے۔

اس کے بعد ہجرت کے لیے روانگی سے پہلے عبد اللہ بن اریقط دُئلی کو (جو تھا تو مشرک لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معتمد تھا) اجرت دے کر راستہ کی خدمت کے لیے مقرر کیا، اونٹنیاں اس کے سپرد کیں کہ دونوں کو تیسرے دن

جبل ثور پر لے کر حاضر ہو اور غیر معروف راستہ سے مدینہ طیبہ کی طرف لے کر روانہ ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافر و مشرک بھی اگر قابل اطمینان ہو تو اجرت دے کر اس سے خدمت لینا جائز ہے، مگر یہ بھی یاد رہے کہ یہ کافر حضور ﷺ کا اجیر اور مزدور تھا، معاذ اللہ! قائد اور امیر نہ تھا، نیز علامہ واقدیؒ نے بعد میں ان کا مسلمان ہونا بھی بیان کیا ہے۔ (زرقانی: ۱/ ۳۳۹، اصابہ: ۲/ ۲۷۴، از سیرۃ الصحابہ: ۱/ ۳۸۴، سیرۃ المصطفیٰ: ۱/ ۳۶۳)

الوداع اے مکہ!

بعد ازاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر کی پشت کی کھڑکی سے باہر نکلے، اور جبل ثور کا قصد فرمایا، مکہ مکرمہ سے روانگی کے وقت حزورہ نامی ایک اونچے ٹیلے پر سے مکہ کی سوئی ہوئی وادی اور آبادی کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھا تو آنکھیں برسنے لگیں؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی مکہ میں پیدا ہوئے تھے، جسے آج الوداع کہہ رہے تھے، یہی آپ ﷺ کا وطن تھا جہاں آپ ﷺ کا بچپن گذرا تھا، اسی دھرتی پر جوان ہوئے اور نبوت سے نوازے گئے تھے، آج اسی کو الوداع کہہ رہے تھے، آپ ﷺ نے مکہ سے رخصت ہوتے وقت بھرائی ہوئی آواز میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”وَاللّٰهِ إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلىٰ اللّٰهِ، وَلَوْ لَا أَنِّيْ أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ“. (رواه الترمذی و ابن ماجه، مشکوٰۃ/ص: ۲۳۸)

اے مکہ! تو رحمتوں، برکتوں اور تجلیاتِ الٰہی کا مرکز ہے، تجھے چھوڑنے کو میرا جی نہیں چاہتا، مجھے تجھ سے پیار ہے، لیکن کیا کروں؟ تیرے سینے پر بسنے والے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ مدینہ طیبہ سے افضل ہے اور یہی جمہور کا قول ہے، البتہ مدینہ طیبہ میں روضۂ اقدس کا وہ حصہ جو حضور ﷺ کے جسد اطہر سے ملا

ہوا ہے وہ سب سے افضل ہے، حتیٰ کہ کعبہ سے بھی۔

غارِ ثور کی طرف روانگی:

بہر کیف مکہ مکرمہ کو الوداع کہہ کر دونوں حضرات رات ہی کے وقت غارِ ثور کی طرف روانہ ہوئے جو مکہ مکرمہ سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر مدینہ طیبہ کے راستہ پر نہیں، بلکہ الٹی سمت پر واقع ہے، دلائل بیہقی میں محمد بن سیرینؒ سے مرسلاً مروی ہے کہ جب آپ ﷺ غار کی طرف روانہ ہوئے تو اس یارِ غار اور ہمدم و جاں نثار، محبّ بااخلاص اور صدیق بااختصاص کی بے تابی اور بے چینی کا عجب حال تھا، کبھی آپ ﷺ کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں، بالآخر آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اے ابوبکر! یہ کیا ہے؟ کبھی آگے چلتے ہو اور کبھی پیچھے؟ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! چاروں طرف اندھیرا ہے اور دشمن کا خطرہ ہے، اس لیے جب کبھی خیال آتا ہے کہ دشمن پیچھے سے آکر حملہ کرے گا تو دوڑ کر پیچھے ہو جاتا ہوں تاکہ دشمن کے حملہ کا شکار میں ہو جاؤں اور آپ محفوظ رہیں، جب آگے یا دائیں بائیں سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس طرف ہو جاتا ہوں، منشا یہی ہے کہ آپ ہر حال میں دشمن سے سلامت رہیں، میری جان آپ پر نثار اور قربان ہو جائے۔ (سیرۃ المصطفیٰ: ۱/۳۶۴)

جب غارِ ثور کے قریب پہنچے تو اس کی چڑھائی نہایت دشوار تھی، راستہ بھی بہت ہی سنگلاخ تھا، نوکیلے پتھروں سے بھرا ہوا تھا، جس کی وجہ سے پائے مبارک لڑکھڑانے لگے۔

لڑکھڑاتے تھے قدم راہ میں چلتے چلتے
لغزشِ پا کی دیتی تھی غضب کی سی تھکن

عاشقِ رسول ﷺ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غارِ ثور کی چڑھائی کی دشواری اور اپنے محبوب ﷺ کی تھکاوٹ و مشقت کو دیکھا تو برداشت نہ کر سکے، نہایت ہی ادب سے عرض کیا: ''یارسول اللہ! آپ تکلیف نہ اٹھائیے، آئیے اور سوار ہو جائیے'' دنیا جانتی ہے کہ اس

وقت وہاں کوئی سواری نہیں تھی، اس لیے صداقت نبوت کی سواری بن گئی، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضورِ انور ﷺ کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا، بیہقی میں ہے: ”حَمَلَهُ الصِّدِّيْقُ عَلٰى كَاهِلِهٖ“. (از: خطباتِ قاسمی: ۱/۸۲)

یہ عشق ومحبت کا روح پرور، ایمان افروز اور عدیم النظیر منظر تھا، اللہ کی قسم! اگر دنیا نے کبھی اپنے نبی ﷺ کو آمنہ وحلیمہ کے کندھوں پر دیکھا، کبھی اونٹنی، گھوڑے اور براق کے کندھوں پر دیکھا، تو آج آئیں اور اپنے نبی ﷺ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر بھی دیکھ لیں، سواری بھی اعلیٰ، سوار بھی اعلیٰ، نور علی نور۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ”لوگو! آج تک تم نے یہی سنا ہوگا کہ محبوب اکبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر نبوت کی مہر ہے، صحیح ہے، لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عظمت پر قربان جاؤں کہ اس کے کندھوں پر آج خود وجودِ نبوت ہے۔“ (جواہراتِ فاروقی: ۲/۲۰۶)

جب غارِ ثور پر پہنچے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کو کندھوں سے اتارا اور ادب سے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! ذرا ٹھہریئے، میں اندر جا کر آپ کے لیے غار کو صاف کرلوں، اچھی طرح ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھ لوں، تاکہ اگر کوئی موذی جانور ہو تو آپ اس کی تکلیف سے محفوظ رہیں، مجھے تکلیف ہو تو کوئی حرج نہیں۔“

آپ ٹھہریں تو ذرا صاف میں کرلوں جا کر
اور جھاڑو کے لیے کافی ہے بس میرا دامن

اندازہ لگائیے! رات کی تاریکی اور اندھیرے غار میں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر گھس جانا کوئی آسان کام تھا؟ لیکن عاشقِ صادق کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

گھس گئے غار میں بے خوف جنابِ صدیق
ان کو آسان تھے وہ کام جو ہوتے تھے کٹھن

روایتوں میں ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ غار میں داخل ہوگئے، خود جھاڑو دی،

صفائی کی اور جو سوراخ تھے اپنی چادر پھاڑ کر اسی سے انہیں بند کیا، مگر دو سوراخ باقی رہ گئے، اتنی گنجائش نہ تھی کہ انہیں بند کر سکیں، تو آپ نے اپنے دونوں پاؤں کی ایڑیاں ان پر رکھ دیں، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ادب کے ساتھ عرض کیا:

عرض کی حضرت صدیق نے یا شاہِ زمن!
جلوہ گر ہو کے سیاہ خانہ کو کیجئے روشن

سیاہ رات میں اندھیرے غار کو صاف کر کے جب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور انور ﷺ کو اندر بلایا تو آپ ﷺ کے تشریف لاتے ہی وہ غارِ ثور نور سے منور اور روشن ہو گیا، اس کے بعد سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ حضور! رات کا وقت ہے، تھکان کے اثرات بھی ہیں، لہٰذا آپ آرام فرمالیں اور اس کے لیے میری گود حاضر ہے، آپ ﷺ نے درخواست منظور فرمائی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی گود میں اپنا سر مبارک رکھ کر سو گئے۔

ذاتِ والا پہ ہوا نیند کا غلبہ طاری
زانوئے یار پہ وہ سو گئے رکھ کر گردن

﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾

سبحان اللہ! کیا خوب منظر تھا، نبوت صداقت کی گود میں، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے رحل پر قرآنِ کریم رکھا ہو اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اسے پڑھ رہے ہوں، اسی موقع کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ (التوبة : ٤٠)

"اگر تم رسول اللہ کی مدد نہ کرو گے تو کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ ان کا پہلے ہی سے مددگار ہے، اسی نے آپ کی مدد اس وقت بھی فرمائی جب کہ آپ کو کفار نے مکہ سے نکالا تھا، جب کہ

وہ دو میں دوسرے تھے، جس وقت کہ وہ دونوں غار میں تھے۔‘‘

یہاں اوّل تو حضور ﷺ تھے اور ثانی ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ ﴿ ثَانِيَ اثْنَيْنِ ﴾ کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی ﷺ کے بعد خلیفہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوں گے، اس لیے کہ خلیفہ بادشاہ کا ثانی ہوتا ہے۔ (سیرۃ المصطفی: ۱/ ۳۷۰)

جس وقت سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے یارِ غار کے زانو پر اپنا سر مبارک رکھ کر مشغولِ استراحت ہوئے تب ایک سوراخ میں سے سانپ نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاؤں میں ڈس لیا، مگر آپ نے ذرا حرکت نہ کی، تاکہ آپ ﷺ کے آرام میں خلل نہ ہو، لیکن زہر کے اثر سے جب آنکھیں متاثر ہوئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ نکل کر چہرۂ انور پر گرا، تب آپ ﷺ نے بیدار ہو کر فرمایا: ”مَا لَكَ يَا أَبَا بَكْرٍ؟“ ابوبکر تمہیں کیا ہوا؟ عرض کیا: ’’میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، مجھے سانپ نے کاٹ لیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جگہ سانپ نے کاٹا تھا اپنا لعابِ دہن لگا دیا، تو اس تریاق نے زہر کا اثر ختم کر دیا۔ (مشکوٰۃ/ص: ۵۵۶)

علامہ ضیاء الرحمٰن فاروقی فرماتے ہیں کہ ’’اسلام میں دو قطرے، دو راتیں اور دو رفیق بہت محبوب ہیں، دو قطروں میں ایک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آنکھ سے نکلنے والا وہ قطرہ جو رخسارِ نبوت پر گرا، اور دوسرا سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے شہادت کے موقع پر جسم سے نکلنے والا خون کا قطرہ جو کتابِ ہدایت پر گرا، ایک قطرہ کتاب اللہ پر تو دوسرا چہرۂ رسول اللہ پر گرا۔‘‘

اور دو راتوں میں ایک ہجرت والی رات اور دوسری معراج والی رات، ہجرت والی رات کے متعلق سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ’’اللہ کی قسم! ابوبکر کی حضور ﷺ کے ساتھ ہجرت والی رات عمر کے سارے خاندان کی زندگی سے بہتر و افضل ہے۔‘‘ (حیاۃ الصحابہ: ۱/ ۴۳۶)

اور دو رفیق میں سے ایک تو رفیق معراج ہے دوسرا رفیق ہجرت ہے، رفیق معراج روح الامین ہیں اور ہجرت کا رفیق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، رفیق معراج کی رفاقت تو عارضی تھی، لیکن رفیق ہجرت کی رفاقت دائمی ہے، زندگی اور موت کے بعد بھی تھی اور جنت میں بھی رہے گی۔ (جواہراتِ فاروقی: ۲/۲۱۰)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''جب شب ہجرت ختم ہوئی تو صبح میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ تمہاری چادر کہاں ہے؟ اس پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے محبوبِ ربِ اکبر کو وہ ساری کارروائی جو غار کی صفائی کے وقت ہوئی تھی سنائی، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی:

''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ أَبَابَكْرٍ مَعِي فِيْ دَرَجَتِيْ فِيْ الْجَنَّةِ، فَأَوْحَى اللّٰهُ إِلَيْهِ قَدِ اسْتَجَبْنَا لَكَ''.

الٰہ العالمین! ابوبکر کو جنت میں میرے درجہ میں شامل فرمالیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ ہم نے آپ کی دعا قبول فرمالی۔ (سیرتِ حلبیہ)

﴿إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾

اُدھر مکہ میں مشرکین نے تمام رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سعادت کدہ کا محاصرہ تو کیا، مگر بیت نبوت میں داخل نہ ہوئے، جس کی ایک ظاہری وجہ یہ بھی تھی کہ اہل عرب کسی کے زنانہ مکان میں گھسنے کو معیوب سمجھتے تھے، اسی دوران ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے پاس سے گزرا تو مشرکین مکہ سے دریافت کیا کہ تم کیوں کھڑے ہو اور کس کے منتظر ہو؟ کہا کہ ہم محمد کے منتظر ہیں کہ وہ برآمد ہوں تو ہم ان کو قتل کردیں، اس شخص نے کہا کہ ''اللہ تم کو ناکام کرے، محمد تمہارے سروں پر خاک ڈال کر گزر بھی گئے'' جب صبح ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر سے اٹھے تو یہ دیکھ کر دشمنوں کی حیرت کی انتہاء نہ

رہی، کہنے لگے کہ ''واللہ! اس شخص نے ہم سے سچ کہا تھا، اور نہایت ندامت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ محمد کہاں ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لاعلمی کا اظہار فرمایا، تو مشرکین اپنی ناکامی کا ماتم کرتے ہوئے سیدھے آستانۂ ابوبکر رضی اللہ عنہ پر آئے اور حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ ''أَیْنَ أَبُوْكِ؟'' کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ جہاں ابوبکر ہوں گے وہیں محمد بھی ہوں گے، جب سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تو ابوجہل نے جہالت کا ثبوت پیش کیا، طیش میں آکر منھ پر ایک طمانچہ اس زور سے مارا کہ کان کی بالی زمین پر جا گری، مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کوہِ استقلال بن گئیں، پائے استقامت میں ذرّہ برابر بھی لغزش پیدا نہ ہوئی، کفار کفِ افسوس ملتے ہوئے واپس ہوئے، پھر کھوجیوں کے ذریعہ سراغ لگانے کی کوشش کی تو سرکارِ دوعالم ﷺ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نقشِ پا دیکھتے ہوئے کھوجیوں کے ہمراہ مشرکین مکہ غارِ ثور کے دہانے تک جا پہنچے، کیوں کہ بقول

کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غار کے اندر سے جب دشمنوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو عرض کیا: ''یارسول اللہ! ان میں سے اگر کسی کی نظر اپنے قدموں پر پڑ جائے تو ضرور ہم کو دیکھ لے گا'' اس وقت آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''مَا ظَنُّكَ بِاثْنَیْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا''. (متفق علیه، مشکوٰة/ص: ۵۳۰)

''اے ابوبکر! ان دو کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے۔''

آپ ﷺ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ حزین اور غمگین ہونے کی ضرورت نہیں، ہم دونوں تنہا نہیں ہیں، ہمارے ساتھ اللہ ہے، جو ہم کو ان دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، قرآن نے اسے یوں بیان فرمایا:

﴿إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ: ۴۰)

''جب آپ اپنے یارِ غار سے فرما رہے تھے کہ آپ بالکل غم نہ کریں، یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔''

آیت کریمہ کے بکھرے موتی:

علماءِ محققین فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کا ایک ایک جملہ قیمتی موتیوں کا سمندر ہے، اس میں جس قدر غوطے لگائے جائیں گے اسی قدر موتیوں کے خزانے ملتے جائیں گے، مثلاً فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ ﴿لِصَاحِبِهٖ﴾ سے مراد سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں، اس سے بھی آپ کی صحابیت ثابت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ علماءِ مفسرین نے صراحت کی ہے کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر قرآنِ کریم کی اس آیت کریمہ ﴿إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ﴾ کا منکر ہے، اور قرآنِ کریم کا منکر کافر ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ صدیق اکبر کو حزن وغم تھا تو صرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ حزین اور غمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ ''لفظ ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عاشق صادق ہونے کو ثابت کرتا ہے؛ کیوں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حزن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا، اپنے لیے ہوتا تو لفظ حزن کے بجائے ''خوف'' استعمال ہوتا، اس لیے کہ عربی میں ''حزن'' اور ''خوف'' میں فرق ہے، ''حزن'' کا لفظ محبوب کی جدائی یا تمنا کے فوت ہونے پر استعمال کیا جاتا ہے، جب کہ ''خوف'' کا لفظ اپنی جان کا خطرہ اور ڈر ہو وہاں استعمال کیا جاتا ہے، چناں چہ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر پیغمبری ملی اور حکم ہوا کہ اپنا عصا زمین پر ڈالو، ڈالا تو اژدھا بن گیا، جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام خوف زدہ ہوگئے، اس وقت رب العزت نے اطمینان دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ يَا مُوسٰى لَا تَخَفْ إِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ﴾ (النمل: ۱۰)

''اے موسیٰ! خوف نہ کیجئے میرے رسول میرے پاس ڈرا نہیں کرتے۔''

اس سے بھی صاف ظاہر ہوا کہ اپنی جان کا اندیشہ ہو تو ''خوف'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ یہاں ہوا۔ ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ نہیں فرمایا، یہ اسی وقت کہا جاتا ہے جب محبوب کی جان کا خطرہ ہو، تو اس وقت بھی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دشمنوں سے اپنی جان کا تو کوئی خطرہ ہی نہ تھا، اس بات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اچھی طرح جانتے تھے، اسی لیے تسلی اس لفظ سے دی۔ ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ جس سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا عاشق صادق ہونا ثابت ہوا۔

اس کے بعد فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابو بکر! کیوں غم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کی معیت، حمایت، حفاظت اور نصرت ہمارے ساتھ ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت اور نصرت جیسے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہے، ورنہ سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام جس وقت اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کر بحکم الٰہی شہر سے نکلے اور فرعون نے تعاقب کیا تو صورتِ حال یہ تھی کہ آگے سمندر، پیچھے فرعون کا لشکر، تب اصحابِ موسیٰ نے کہا: ﴿إِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ﴾ (الشعراء: ۶۱) تب آپ نے کہا: ''ہرگز نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے۔'' غور کیجئے، یہاں اللہ تعالیٰ کی معیت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ خاص کیا، جب کہ رحمت عالم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی معیت کو ہجرت کے موقع پر بھی اپنے ساتھ خاص نہ فرمایا، بلکہ اپنے محبوبِ خاص کو بھی اس میں شامل فرمایا، نیز نحوی اعتبار سے دیکھا جائے تو لفظ ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ یہ جملہ اسمیہ ہے، جو دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ''اللہ کی معیت ونصرت ہمارے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ واللہ اعلم (از سیرۃ المصطفی: ۱/ ۳۷۵)

غارِ ثور میں نصرتِ الٰہی کا نزول:

اس کے بعد حسب وعدہ حق تعالیٰ نے اپنی نصرت کا نزول اس طرح فرمایا کہ سب سے پہلے حزین و غمگین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دل کو تسکین عطا فرمائی، ارشاد ہے: ﴿فَأَنزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ﴾ (التوبة: ٤٠) رب العالمین نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر تسکین نازل فرمائی، سکون سے آپ کا دل لبریز فرما دیا، یہاں رئیس المفسرین سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق "علیه" کی ضمیر "صاحبه" یعنی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف راجع ہے، امام رازیؒ نے بھی تفسیر کبیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور انور ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حدیث مذکور میں تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا". تو حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کی تسلی کے لیے اس جملہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر تسکین نازل فرمادی، جسے ﴿فَأَنزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ﴾ میں بیان فرمایا، یعنی محبوب کی تکلیف کے تصور سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دل میں جو آتش سوزاں تھی مولائے کریم نے اسے اپنی خاص عنایت سے ٹھنڈا فرما دیا اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ قرآن کہتا ہے: ﴿وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ (التوبة: ٤٠) حق تعالیٰ نے تائید فرمائی (قوت و نصرت عطا فرمائی) ایسے لشکروں کے ذریعہ جو تمہاری نظر کی رسائی سے باہر تھے۔ چناں چہ حق تعالیٰ نے غارِ ثور پر فرشتوں کا پہرہ لگا دیا، جس کی وجہ سے مشرکین کے دلوں پر ایک رعب طاری ہوگیا، اور وہ غار کے اندر آنے اور جھانکنے کی ہمت ہی نہ کرسکے، اس وقت غارِ ثور پر ایسا رعب طاری کر دیا گیا جیسے اصحابِ کہف کے غار پر طاری کیا گیا تھا، علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک مکڑی نے جالا تن دیا، اللہ تعالیٰ کی شان تو دیکھئے کہ وہی مکڑی کا جالا جسے ﴿إِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ﴾ (العنكبوت: ٤١) فرمایا گیا، اسی کمزور جالے کو آہنی قلعہ سے بڑھ کر مضبوط اور حفاظت کا ذریعہ بنا دیا، اسی کے ساتھ ایک کبوتری سے غار کے منھ پر انڈے رکھوا دیے، عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اللہ رب

العزت نے مکڑی اور کبوتری سے محبوبِ دو عالم ﷺ کی حفاظت کا کام لے کر حقیر جانوروں کا حصہ بھی عشق رسول میں شامل فرمالیا، اوراس طرح دشمن نصرتِ الٰہی کے سبب غارِثور کے قریب جا کر بھی حضور اکرم ﷺ کو نہ پا سکے، انہیں یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ ان کا گوہر مقصود اسی کان میں پنہاں ہے، شاعر اسلام حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے اشعار میں فرمایا:

ثَـانِـيَ اثْـنَيْنِ فِیْ الْغَارِ الْمُنِیْفِ وَقَدْ ☆ طَـافَ الْعَدُوُّ بِهٖ إِذْ صَعِدَ الْجَبَلَا

وَكَـانَ حِـبَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَدْ عَلِمُوْا ☆ مِـنَ الْبَـرِيَّةِ لَـمْ يَـعْدِلْ بِـهٖ رَجُلَا

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور انور ﷺ کے یارِ غار، جانثار اور وفادار ہیں، جب وہ غار میں تھے تو دشمن بھی ان کے گرد چکر لگاتے رہے، مگران کو دیکھ نہ سکے۔

یہ بات عیاں ہے دنیا پر کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنی محبت تھی دنیا میں اتنی محبت وعقیدت حضور ﷺ سے کسی اور کو نہیں۔

واقعی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس تاریخی سفر ہجرت میں ایثار ومحبت کی ایسی مثالیں قائم فرمائیں جو رہتی دنیا تک یادگار بن گئی ہیں، غرض رب العالمین نے اپنی خاص نصرت سے نبی اکرم ﷺ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مکمل حفاظت وصیانت فرمائی، اسی کو فرمایا:

﴿ وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ (التوبة : ٤٠)

''اللہ تعالیٰ نے کافروں کی تدبیر کو نیچا کر دیا اور اللہ تعالیٰ ہی کا بول بالا ہو کر رہا، اور اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔''

یہاں سفر ہجرت کا پہلا مرحلہ مکہ مکرمہ سے غارِ ثور تک کا ختم ہوا۔ (مستفاد از: سیرۃ المصطفیٰ:۱/ ۳۷۹ وخطباتِ قاسمی:۱/ ۹۰)

سفرِ ہجرت کا دوسرا مرحلہ:

حضراتِ اثنین کریمین نے تین دن اور تین راتیں غارِ ثور میں گزاریں، اس دوران صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما رات میں تشریف لاکر دن بھر کی خبروں سے آگاہ فرماتے اور رات گزار کر صبح کے قریب نکل جاتے، اسی طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ حسبِ ہدایت عشاء کے وقت وہاں بکریاں لے کر حاضر ہوتے، تاکہ انہیں تازہ دودھ بطورِ غذا کام آجائے، ان کی اس قابلِ تحسین خدمت سے خوش ہو کر سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہمراہ سفرِ ہجرت میں ساتھ رہنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

اس موقع پر مولانا نانوتویؒ کا ایک ایمان افروز واقعہ یاد آتا ہے کہ ۱۸۵۷ھ میں جب انگریز حکومت کی طرف سے گرفتاریاں ہوئیں تو حضرتؒ کے نام بھی گرفتاری وارنٹ جاری ہوا، اس وقت آپؒ بھی صرف تین دن روپوش رہے، اس کے بعد لوگوں کے اصرار اور خطرات کے باوجود روپوش رہنے سے انکار کردیا اور فرمایا: ''حضور اکرم ﷺ غارِ ثور میں تین دن ہی روپوش رہے تھے، اس لیے اس سے زیادہ روپوش رہنا سنت کے خلاف ہے۔'' ''اللہ اکبر کبیرا'' کیا حال اور کس قدر اتباعِ سنت کا خیال تھا۔ (از: اسلاف کے حیرت انگیز واقعات/ص:۴۱)

غرض تین دن کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اجیر عبداللہ بن اُریقط حسب وعدہ وقت مقرر پر دونوں اونٹنیاں لے کر غارِ ثور پر پہنچ گیا اور سفرِ ہجرت کا دوسرا مرحلہ غارِ ثور سے مدینہ طیبہ کا شروع ہوا، ایک اونٹنی پر آگے حضور انور ﷺ اور پیچھے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بیٹھے، گویا خلیفۂ بلافصل کا عملی منظر اونٹنی پر سوار ہے کہ درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں ہے، یہ بلافصل نبی اور صدیق تھے، دوسرے اونٹ پر عامر بن فہیرہ رہے، اور عبداللہ بن اریقط راستہ بتانے کے لیے اپنے اونٹ پر سوار تھے، یہ قافلہ صبح منھ اندھیرے روانہ ہوا اور ایک ایسے راستہ کو اختیار کیا جو غیر معروف تھا، ساحل سمندر کی طرف جو عام شاہراہ نہیں تھی اس طرف سے

قافلہ چلا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کثیر الاحباب تھے، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ راستہ میں ایسے ملے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے تو واقف تھے، مگر حضور اکرم ﷺ سے واقف نہ تھے، جب ان شناسا لوگوں میں سے کسی نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حضور انور ﷺ کے متعلق پوچھا کہ "مَنْ هٰذَا؟" یہ کون ہیں جو آپ کے آگے بیٹھے ہیں؟ یہ موقع بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک آزمائش سے کم نہ تھا؛ کیوں کہ اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بتلاتے ہیں کہ "یہی محمد رسول اللہ ہیں" تو راز راز نہ رہا اور یار یارِ غار نہ رہا، اور اگر کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں، تو ابوبکر صدیق نہ رہا، آخر ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور انور ﷺ ہی کے شاگرد رشید تھے نہ! اس لیے برجستہ فرمادیا: "هٰذَا رَجُلٌ يَهْدِيْنِيْ السَّبِيْلَ". یہ وہ شخص ہیں جو مجھے راستہ بتلاتے ہیں۔ مراد آخرت و ہدایت کا راستہ ہے، مگر وہ اس مراد کو نہ سمجھے اور نامراد واپس ہوئے اور یہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔

سراقہ بن مالک کا واقعہ:

دوسری طرف مکہ میں مشرکوں نے اپنے جھوٹے خداؤں کے سامنے بہت منت سماجت کی کہ کسی طرح محمد ہاتھ آجائیں، لات وعزی کی دہائی دی، ہبل کو پکارا، مگر سب ہاؤ ہو بے کار ثابت ہوئی، تو مجبور ہو کر انہوں نے اعلان کر دیا کہ جو بھی محمد کو گرفتار کر کے یا ان کا سر قلم کر کے لائے گا وہ سو اونٹ انعام پائے گا، اس اعلان واشتہار کو سن کر انعام کے لالچ میں بہت سے لوگ تلاش کے لیے نکل پڑے، جن میں سراقہ بن مالک بن جعشم بھی تھے، (جو بعد میں غزوۂ حنین وطائف سے حضور اکرم ﷺ کی واپسی پر جعرانہ کے مقام پر کلمہ پڑھ کر مشرف باسلام ہوئے) سراقہ اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے قبیلہ "بنی مدلج" کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان ہی میں سے ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ میں نے چند لوگوں کو ابھی ساحل کے راستہ سے جاتے ہوئے دیکھا ہے، میرا گمان ہے کہ وہ محمد اور ان کے رفقاء ہیں، سراقہ کا بیان ہے کہ میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ وہ وہی ہیں، مگر انعام کے لالچ میں یہ کہہ کر

میں نے ٹال دیا کہ وہ کوئی اور ہی ہوں گے، مقصد یہ تھا کہ کوئی اور یا یہ خود ان کی تلاش میں نہ نکل پڑے اور پھر وہ خود انہیں گرفتار کر کے انعام حاصل کر لے۔

تھوڑی دیر کے بعد مجلس سے اٹھ کر میں گھر گیا اور باندی سے کہا کہ گھوڑے کو فلاں ٹیلے کے نیچے لے جا کر کھڑا کر دے، پھر میں نے اپنا زادِ راہ اور نیزہ لیا اور گھر کی پشت کی جانب سے چپکے سے نکل گیا، اور گھوڑا تیز دوڑا دیا، یہاں تک کہ کچھ ہی دیر میں ان کے اتنا قریب پہنچ گیا کہ حضور اکرم ﷺ کی تلاوت سنائی دینے لگی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت میں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بظاہر ان کی حفاظت میں مشغول تھے، بار بار اِدھر اُدھر دیکھتے، جب سراقہ پر نظر پڑی تو پھر بے چین ہو گئے، عرض کیا: ''حضور! دشمن آ گیا،'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ ہمارا محافظ ہے اور وہ پہلے ہی سے ہمارے ساتھ ہے، اس لیے ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ غم نہ کرو، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، پھر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر دعا فرمائی: ''اَللّٰهُمَّ اكْفِنَا بِمَا شِئْتَ''. (فتح الباری:۷/۱۸۷)

الٰہ العالمین! تو جس طرح چاہے ہماری کفایت فرما۔ اس دعا کا اثر یہ ہوا کہ سراقہ کا گھوڑا اسی وقت گھٹنوں یا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا، حالاں کہ وہ زمین نہایت سخت اور پتھریلی تھی، مگر آپ ﷺ کے معجزہ سے وہ گھوڑا زمین میں دھنس گیا، سراقہ نے گھبرا کر معافی طلب کی کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کروں گا، بلکہ جو بھی آپ کی تلاش میں آئے گا اسے واپس لوٹا دوں گا، حضور اکرم ﷺ نے اسے معاف فرما دیا تو فوراً گھوڑا زمین سے نکل گیا، سراقہ نے کہا: اب مجھے یقین ہو گیا کہ عنقریب حضور ﷺ کی شان ظاہر ہو گی اور انہیں غلبہ نصیب ہو گا، چناں چہ میں نے عرض کیا کہ مشرکین مکہ نے آپ کے لیے سو اونٹ کا انعام مقرر کیا ہے اور ان کے تمام حالات سے واقف کر دیا اور اپنا زادِ راہ خدمت اقدس میں پیش کیا، مگر آپ ﷺ نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ بس اتنا کرو کہ ہمارا حال کسی پر ظاہر نہ کرنا، میں نے

درخواست کی کہ مجھے ایک امان نامہ تحریر فرما دیا جائے، آپ ﷺ نے عامر بن فہیرہ کو حکم دیا تو انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر امان نامہ لکھ دیا، جب سراقہ جانے لگے تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کَیْفَ بِكَ إِذَا لَبِسْتَ سِوَارَیْ كِسْرٰی" سراقہ! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم کسریٰ کے کنگن پہنو گے۔ مادیت پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص آپ ﷺ کی اس پیشین گوئی کو سنتا تو مذاق اڑاتا کہ ایک طرف جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور دوسری طرف کسریٰ کے تخت و تاج پر قبضے کے خواب دکھائے جا رہے ہیں، لیکن یہ بھی آپ ﷺ کا ایک معجزہ تھا کہ آپ ﷺ کی یہ پیشین گوئی ہو بہو پوری ہوئی، دورِ خلافت فاروقی میں جب ایران فتح ہوا اور مالِ غنیمت میں کسریٰ کا تاج اور کنگن آئے تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیے (جو بعد میں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیے گئے) اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی پیشین گوئی کو سچ کر دکھایا۔ (سیرۃ المصطفیٰ: ۱/۳۹۴ و خطبات قاسمی: ۱/۱۰۱)

البدایۃ والنہایۃ میں منقول ہے کہ لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بڑی کرامت یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا لشکر دریائے دجلہ کو عبور کر گیا، جب کہ محققین کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بڑی کرامت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے قیصر وکسریٰ کی دولت کے دریا بہے تو وہ اس میں سے ایمان کو بچا کر گذر گئے۔ (تصوف وسلوک/ ص: ۱۸۵)

حضور ﷺ کے دودھ پینے سے حضرت ابوبکرؓ کے خوش ہونے کا واقعہ:

صحیح بخاری شریف میں مروی ہے، سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ غار سے نکل کر رات بھر اور دن میں دوپہر تک چلتے رہے، جب ٹھیک دوپہر کا وقت ہوا تو راستہ خالی تھا، کوئی گزرنے والا نظر نہ آتا، اس دوران ہمیں ایک لمبی چٹان نظر آئی، اس کے سایہ میں حضور ﷺ کے آرام کے لیے میں نے اپنے ہاتھ سے جگہ صاف کی، پھر ایک پوستین

بچھا کر حضور ﷺ سے درخواست کی کہ آپ آرام فرمائیں، میں آپ کی دیکھ بھال اور توشہ کا انتظام کرتا ہوں، جب حضور ﷺ لیٹ گئے تو میں انتظام کے لیے نکلا، اتنے میں ایک چرواہا نظر آیا، جو اسی چٹان کی طرف آرہا تھا، میں نے اس سے پوچھا کہ تو کس کا چرواہا ہے؟ اس نے ایک شخص کا نام لیا، پھر اس سے پوچھا کہ کیا بکریوں میں دودھ ہے؟ اس نے کہا: ہاں، ہے، میں نے کہا: کچھ دودھ نکال کر دے سکتے ہو؟ یعنی تمہیں یوں دودھ نکال کر دینے کی مالک کی طرف سے اجازت ہے؟ اس نے کہا: ہاں، ہے، اب میرے کہنے پر اس نے ایک بکری کی ٹانگیں باندھیں اور تھنوں سے غبار صاف کر کے دودھ دوہنا شروع کیا، میرے پاس ایک چرمی لوٹا تھا، جو میں نے حضور ﷺ کے پینے اور وضو کے لیے رکھا تھا، اس میں دودھ لیا اور حضور ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ آرام فرما رہے تھے اس لیے بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا، جب آپ ﷺ بیدار ہوئے تو میں نے دودھ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس میں ذرا پانی ڈالا، جس سے اس کا نچلا حصہ ٹھنڈا ہو گیا، پھر کپڑے سے چھان کر خدمت بابرکت میں پیش کیا، جس کو آپ ﷺ نے اتنا پیا کہ میں خوش ہو گیا، اس کے بعد ہم اگلی منزل کی طرف چل دیے۔ (از: الرحیق المختوم/ص:۲۶۲)

غور کیجیے! کیا عشق نبوی ہے کہ دودھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نوش فرما رہے ہیں اور خوش حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہو رہے ہیں۔

اُمِ معبد کا واقعہ:

دورانِ سفر کچھ آگے چل کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوک محسوس فرمائی تو اثنائے سفر ہی ام معبد کے خیمہ کے پاس سے گذر ہوا، یہ قبیلۂ خزاعہ سے تعلق رکھتی تھیں، نہایت شریف، مہمان نواز اور خدمت خلق کا بے مثال جذبہ رکھنے والی عورت تھیں، یہ قافلہ جب اس کے خیمے کے پاس سے گزرا تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ”اس بوڑھی خاتون سے کچھ خورد و نوش کا سامان خرید لیا جائے۔“ مگر پوچھنے

پر معلوم ہوا کہ قحط کا زمانہ ہے اور پاس میں کچھ بھی نہیں، اس نے کہا: ''واللہ! اگر میرے پاس کچھ بھی ہوتا تو میزبانی میں ہرگز تنگی نہ کرتی، پھر ہماری بکریاں بھی دور دراز ہیں، اگر وہ ہوتیں تو کم از کم دودھ ہی پلا دیتی، خیمہ میں ایک طرف کو ایک بکری نظر آئی، اس کے متعلق ام معبد نے کہا: ''بیٹا! یہ بکری بے کار بھی ہے اور بیمار بھی، نہ ہی دودھ دیتی ہے نہ ہی چرنے کے لیے بکریوں کے ساتھ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ میرا خاوند اسے یہیں چھوڑ گیا، اگر یہ دودھ والی ہوتی تو میں ضرور حاضر کر دیتی، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اجازت ہو تو اس سے دودھ نکال لیں''، بولیں: اگر نکال سکتے ہو تو نکال لو، فرمایا اجازت دینا تمہارا کام، دودھ دینا اللہ تعالیٰ کا کام! اُم معبد نے بخوشی وہ بکری خدمت اقدس میں پیش فرمائی، آپ ﷺ نے ایک بڑا برتن طلب کیا اور خود ہی بکری کا دودھ دوہنے کے لیے بیٹھ گئے، معلوم ہوا کہ یہ بھی آقا ﷺ کی سنت ہے، لہٰذا اسے حقیر نہ سمجھا جائے، جوں ہی آپ ﷺ نے بسم اللہ پڑھ کر نبوت والا ہاتھ تھن سے لگایا تو اللہ تعالیٰ نے اس لاغر اور بے کار بکری سے دودھ کا چشمہ جاری فرما دیا، ایک بڑا برتن جس سے آٹھ دس آدمی سیراب ہو جائیں دودھ سے بھر گیا، اولاً آپ ﷺ نے اس میں سے اُم معبد کو پلایا، جب وہ سیراب ہو گئیں تو اپنے رفقاء کو دیا، اخیر میں خود آپ ﷺ نے نوش فرمایا، پھر ایک اور پیالہ دودھ کا بھر کے اُم معبد کو دے دیا کہ اسے گھر میں رکھ لینا، ضرورت کے وقت کام آئے گا، اُم معبد یہ نظارہ حیرت و مسرت کی ملی جلی کیفیت سے دیکھتی رہیں، رسالت کے اس عظیم معجزہ نے ان کے دل کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اسے دودھ کا پیالہ عطا فرما کر چل دیے، مگر اُم معبد ایمان و عقیدت کی نظر سے دور تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قافلہ کو دیکھتی رہیں، شام کے وقت اُم معبد کا خاوند جب بکریاں چرا کر واپس آیا تو اپنے گھر کو نورِ نبوت سے روشن و معطر پایا، اُم معبد سے صورتِ حال دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ آج یہاں سے ایک مرد مبارک کا گزر ہوا، واللہ! یہ سب اسی کی برکت ہے، پھر انہوں نے حضور ﷺ کی تشریف آوری کا پورا واقعہ سنایا، خاوند نے کہا: ذرا توصیف و تعریف وضاحت کے ساتھ بیان کیجئے، تو اُم معبد نے

حلیۂ مبارکہ کا نقشہ عجیب انداز میں کھینچا کہ پاکیزہ اور کشادہ چہرہ، خوبصورت ساخت، درمیانہ قد، سرمگیں اور سیاہ وسفید آنکھیں، لمبی اور پتلی پلکیں، چمکدار کالے گھنگھریالے بال، خاموش رہیں تو باوقار اور بات کریں تو پرکشش معلوم ہوں، نہ ترش رو نہ لغوگو، رفقاء آپ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے، کچھ فرمائیں تو توجہ سے سنیں، حکم دیں تو بجالائیں، اُم معبد سے شانِ مصطفیٰ ﷺ کو سن کر ان کا خاوند کہنے لگا: واللہ! یہ وہی قریشی صاحب معلوم ہوتے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے قسم قسم کی باتیں بنارکھی ہیں اور ارادہ کرلیا کہ ان سے جاکر ضرور ملنا ہے، اس کے بعد دونوں میاں بیوی حاضر خدمت ہوکر مشرف باسلام ہوئے اور ہجرتِ مصطفیٰ ﷺ میں شامل ہوئے، اس واقعہ کے بعد مکہ میں ہاتف غیبی نے یہ اشعار پڑھے، آواز سنائی دی، مگر آواز والا نہ دیکھا گیا۔

جَزَا اللّٰهُ رَبُّ النَّاسِ خَيْرَ جَزَائِهٖ ☆ رَفِيْقَيْنِ حَلَّا خَيْمَتَيْ أُمِّ مَعْبَدِ

هُمَا نَزَلَا بِالْبِرِّ وَارْتَحَلَا بِهٖ ☆ وَأَفْلَحَ مَنْ أَمْسٰى رَفِيْقَ مُحَمَّدِ

’’اللہ تعالیٰ ان دونوں رفیقوں کو بہترین بدلہ عطا فرمائے جو اُم معبد کے خیمہ میں اُترے، وہ دونوں خیر کے ساتھ اترے اور خیر کے ساتھ روانہ ہوگئے، اور جو محمد کا رفیق ہوا وہ کامیاب ہوا۔‘‘

سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کدھر کا رخ فرمایا ہے، لیکن جب یہ غیبی اشعار سنے تو ہمیں پتہ چلا کہ حضور اکرم ﷺ نے بھی مدینہ طیبہ ہی کا رخ فرمایا ہے۔ (الرحیق المختوم/ص: ۲۶۵ تا ۲۶۷ وسیرۃ المصطفیٰ: ۱/ ۳۹۵)

مدینہ طیبہ کے قریب کے واقعات:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قافلہ جب اور آگے بڑھا تو سراقہ کی طرح بریدہ اسلمی ملے، جو اپنی قوم کے سردار تھے اور انعام کے لالچ میں ستر سواروں کے ساتھ آپ ﷺ کی تلاش میں نکلے تھے، لیکن جب آپ ﷺ کے قریب پہنچے تو قریب ہی ہوگئے، حضور ﷺ

نے ان سے پوچھا: "مَنْ أَنْتَ"؟ کون ہو؟ کہا: "أَنَا بُرَيْدَةُ" میں بریدہ ہوں، آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوکر نیک فالی لیتے ہوئے فرمایا: "بَرَدَ أَمْرُنَا وَأَصْلَحَ" ہمارا کام ٹھنڈا اور درست ہوگیا، پھر پوچھا: "تم کس قبیلہ سے ہو؟" کہا: "مِنْ أَسْلَمَ" قبیلۂ اسلم سے ہوں، آپ ﷺ نے پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوکر نیک فالی لیتے ہوئے ارشاد فرمایا: "سَلِمْنَا" ہم سلامت رہے، پھر پوچھا کہ قبیلۂ اسلم کی کس شاخ سے ہو؟ کہا: "مِنْ بَنِيْ سَهْمٍ" بنی سہم سے، آپ ﷺ نے فرمایا: "خَرَجَ سَهْمُكَ" تمہارا حصہ نکل آیا، اب تمہیں اسلام سے حصہ ملے گا، بریدہ حضور ﷺ سے ناواقف تھے، اس لیے اس عجیب وغریب گفتگو کے بعد دریافت کیا کہ آپ کون ہیں؟ ارشاد فرمایا: "أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" میں محمد بن عبداللہ اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، فوراً بریدہ نے کہا: "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ" ان کے ساتھ ستر افراد بھی مسلمان ہوگئے، اس کے بعد حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! مدینہ طیبہ میں داخلہ کے وقت آپ کے سامنے ایک جھنڈا ہونا چاہیے" آپ ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور اپنا سفید عمامہ نیزہ سے باندھا اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمادیا، مدینہ طیبہ کے قریب راستہ میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو ملے جو مسلمانوں کے ایک قافلۂ تجارت کے ساتھ ملک شام سے واپس آرہے تھے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضور انور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سفید لباس جو آپ ﷺ کو بہت پسند تھا، عطا فرمایا جس کو زیب تن کیا گیا، ابن ابی شیبہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی دونوں حضرات کی خدمت میں لباس پیش کیا تھا۔ واللہ اعلم۔ (حوالۂ سابقہ)

حضور ﷺ مدینہ طیبہ میں:

اُدھر مدینہ طیبہ والوں کا حال بڑا عجیب تھا؛ کیوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر ان کے لیے سب سے عظیم مسرت تھی، مدینہ والے بڑے جوش وخروش

کے ساتھ مسلسل کئی دنوں سے اس لمحہ کا انتظار کر رہے تھے، جوں ہی انہوں نے سنا کہ حضور اکرم ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہوگئے ہیں، تب سے مدینہ کا ہر فردِ بشر شوقِ دیدار میں مدینہ کے باہر مقامِ ''حَرَّہ'' پر آ کر انتظار کرتا اور پلک جھپکائے بغیر سامنے افق پر نظریں جمائے رہتا جہاں سے حضور ﷺ نمودار ہونے والے تھے، ایک روز حسب معمول اسی کیفیت کے ساتھ شدت سے منتظر تھے کہ ایک یہودی نے پہاڑی کے ٹیلے پر سے آپ ﷺ کو رونق افروز ہوتے ہوئے دیکھ کر پکارا: '' یَا بَنِیْ قَیْلَةَ! هٰذَا جَدُّکُمْ '' اے بنی قیلہ! تمہارے مقصود و مطلوب آ گئے۔ اس ایک جملہ کا کانوں میں پڑنا تھا کہ مدینہ والے خوشی سے جھوم اٹھے، تمام انصارِ مدینہ والہانہ و بے تابانہ حضور اکرم ﷺ کے استقبال کے لیے نکل پڑے، دل اور آنکھیں بچھائے پروانہ وار کھڑے ہوگئے، نعروں سے بنی عمرو بن عوف کی آبادی اور وادی گونج اٹھی، ''اَللّٰهُ أَکْبَرُ جَآءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ، اَللّٰهُ أَکْبَرُ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' اللہ اکبر، رسول اللہ تشریف لے آئے، اللہ اکبر، رسول اللہ تشریف لے آئے، انصارِ مدینہ کی ننھی منی بچیاں استقبالیہ ترانہ دف بجا کر پڑھ رہی تھیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا ☆ مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا ☆ مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ
أَیُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِیْنَا ☆ جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

حضرت حفیظ جالندھریؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا:

زبان پر ''أَشْرَقَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا'' کی صدائیں تھیں
دلوں میں ''مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ'' کی دعائیں تھیں
کہیں معصوم ننھی بچیاں تھیں دف بجاتی تھیں
رسول پاک کی جانب اشارے کر کے گاتی تھیں
نبوت کی سواری جس طرف سے ہو کے جاتی تھی
درود ونعت کے نغمات کی آواز آتی تھی

اس طرح ہجرتِ مصطفیٰ ﷺ کا یہ مقدس سفر ۲۷/صفر بروز جمعرات مکہ مکرمہ سے شروع ہوکر ۱۲/ ربیع الاول پیر کے دن تقریباً پندرہ دنوں میں مکمل ہوا، آپ ﷺ نے مدینہ والوں کے جذبات اور محبت وعقیدت کا احترام کرتے ہوئے بحکم الٰہی مدینہ طیبہ ہی کو اپنا مسکن بلکہ مدفن بنانے کا فیصلہ فرمالیا، اور ایسا ہی ہوا، آپ ﷺ اپنی حیاتِ طیبہ کے ترپن سال تو مکہ میں رہے، مگر مدینہ طیبہ میں حیاتِ طیبہ کے دس سال ہی نہیں، بلکہ قیامت تک رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حضور ﷺ کا جوار نصیب فرمائے۔ آمین۔

۲۰/ رمضان المبارک/۱۴۳۳ھ

مطابق: ۹/ اگست/۲۰۱۲ء/ بروز جمعرات

(خانقاہِ فیضانِ قمر، سراج العلوم اجین)

” اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“.

☆......☆......☆
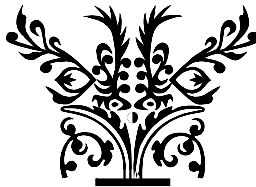
(۳۶)

پیغمبرِ انقلاب ﷺ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنِ ابۡنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: "بُعِثَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ لِأَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً، فَمَكَثَ بِمَكَّةَ ثَلَاثَ عَشۡرَةَ سَنَةً يُوۡحىٰ إِلَيۡهِ، ثُمَّ أُمِرَ بِالۡهِجۡرَةِ، فَهَاجَرَ عَشۡرَ سِنِيۡنَ، وَمَاتَ وَهُوَ ابۡنُ ثَلَاثٍ وَسِتِّيۡنَ سَنَةً." (صحيح البخاری، مشکوٰۃ/ص: ۵۲۱/ باب المبعث وبدأ الوحي)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ "رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں رسالت پر فائز کیا گیا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال مکہ مکرمہ میں رہے، اس دوران آپ ﷺ پر وحی کا نزول ہوتا رہا، پھر آپ ﷺ کو ہجرت کا حکم دیا گیا، تو آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی اور دس سال (مدینہ طیبہ میں) رہے، جب آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو عمر تریسٹھ سال تھی۔"

دنیا کی تاریخ کا سب سے تاریک دور:

یہ حقیقت ہے کہ ہماری اس دنیا کی تاریخ کا سب سے تاریک دور جہالت، ضلالت، ہلاکت اور ظلمت کے اعتبار سے وہ تھا جس کے خاتمہ کے لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، آپ ﷺ جس زمانہ میں پیدا ہوئے اسے آج بھی دورِ جاہلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؛ کیوں کہ جہالت کے سبب اس دور میں طرح طرح کی گمراہیاں اور

خرابیاں پائی جاتی تھیں، تلاشِ حق کا جذبہ رکھنے والے چند نفوس باقی رہ گئے تھے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے اور جن کی حیثیت برسات کی اندھیری رات میں جگنو سے زیادہ نہ تھی، چند گنے چنے نیک لوگوں کو چھوڑ کر ساری دنیا میں جہالت وضلالت کا دور دورہ تھا، انسانی برادری، سماج اور سوسائٹی کفر وبت پرستی، اوہام پرستی، ظلم وزیادتی اور خواہشاتِ نفسانی وہوسنا کی کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، کوئی برائی ایسی نہ تھی جس سے معاشرہ محفوظ ہو۔

دورِ جاہلیت اور بت پرستی:

جہاں تک شرک اور بت پرستی کی بات ہے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں شرک محبت کے عنوان سے آیا ہے اور وہ اس طرح کہ چند اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقرب بندوں کی محبت میں جہالت کے بیمار اعتدال کی حدوں کو پار کر گئے، یہاں تک کہ ان کی وفات کے بعد باقاعدہ ان کی صورت اور مورت بنا کر ان کی عبادت وپرستش کرنے لگے، کہتے تھے کہ

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ (الزمر:۳)

ہم ان کی پرستش اسی لیے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقرب ہیں اور ہم گناہگار وبدکار، اس لیے وہ ہماری سنتا نہیں اور ان کی ٹھکراتا نہیں، لہٰذا ہماری ان کے آگے اور ان کی اللہ کے آگے۔ اس طرح کی گمراہ اور غلط سوچ سے شرک وبت پرستی کی ابتدا ہوئی اور جہلاءِ عرب میں عمرو بن لحی سے بت پرستی شروع ہو کر یہ سلسلہ دورِ جاہلیت میں اس قدر بڑھا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی ذات وصفات میں بہت سوں کو سہیم وشریک کر لیا گیا، باطل خداؤں کی ایک بڑی فوج تیار کر لی گئی تھی، تقریباً ہر فرد کا خدا جدا تھا، ایک ایک گھر بت خانہ بن گیا تھا، حتیٰ کہ بعض علاقوں اور جگہوں پر تو صورتِ حال یہ تھی کہ بت پرستوں کی تعداد کم اور بتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بقولِ مولانا حالی مرحومؒ

قبیلہ قبیلہ کا بت ایک جدا تھا   کسی کا ہبل تھا، کسی کا صفا تھا
یہ عزیٰ پہ، وہ نائلہ پہ فدا تھا   اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا

دورِ جاہلیت اور اوہام پرستی:

پھر اس بت پرستی نے جہالت کے ان بیماروں کو ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست بنا دیا، ان کی اوہام پرستی کا حال یہ تھا کہ بہت سی باتوں اور چیزوں کو نجس، ناپاک اور نحوست والا تصور کرنے لگے، مثلاً صبح صبح سامنے سے کوئی کتا، بلا اور جانور گذر جاتا تو لوگ سمجھتے کہ آج کا دِن منحوس ہے، مہینوں میں ''صفر المظفر'' کو نامبارک اور اَشْبھ خیال کرتے، شوال کے مہینہ میں شادی کرنا پسند نہ کرتے، سفر پر نکلنے سے پہلے پرندوں کو اڑاتے، اگر وہ دائیں جانب اڑتا تو نیک فالی لیتے اور سفر کرتے، لیکن اگر وہ بائیں جانب اڑتا تو بدفالی لیتے اور سفر سے گریز کرتے، اسی طرح اُلو کو منحوس خیال کرتے، وہ بیچارہ بے زبان اگر کسی گھر کی چھت پر آ بیٹھتا تو لوگ سمجھتے کہ یہ گھر اب اجڑ جائے گا، دائیں بائیں آنکھ کے پھڑ کنے پر خوف زدہ ہو جاتے۔

دورِ جاہلیت اور اولاد کُشی:

اس اوہام پرستی نے جہالت کے ان بیماروں کو مختلف طرح کے انجانے اور بے جا خوف و دہشت میں مبتلا کر دیا تھا، منجملہ ان میں سے فقر و فاقہ کا خوف انہیں اس قدر حیران کرتا کہ اس کی وجہ سے وہ اولاد کشی اور بالخصوص دختر کشی کے بدترین جرم کے مرتکب ہو گئے، یہ تصور کہ ''بچے دو ہی اچھے'' کوئی نیا نہیں ہے، دورِ جاہلیت سے چلا آ رہا ہے، اس زمانہ میں عموماً دو سے زائد بیٹوں کو فقر و فاقہ کے خوف سے ذبح کر کے قتل کر دیا جاتا، اس لیے حق تعالیٰ نے کتابِ ہدایت میں کم از کم دو جگہ فقر و فاقہ کے خوف سے اس گھناؤنے جرم کے ارتکاب سے منع فرمایا اور بتایا کہ رزاقِ مطلق ہم ہی ہیں:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (هود : ٦)

''روئے زمین پر جتنی مخلوق ہے ان سب کی روزی بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہی ہے۔''

اللہ تعالیٰ ذرا سی (جائز) کوشش اور (مناسب) تدبیر سے اور کبھی کبھی تو اس کے بغیر بھی انہیں

روزی پہنچادیں گے، اس لیے فرمایا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ﴾ (بنی إسرائیل: ۳۱)

''فقروفاقہ، مفلسی اور رزق کی تنگی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم ہی انہیں اور تمہیں رزق دیتے ہیں۔''

حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر شرک اور عقوقِ والدین کے بعد سب سے بدترین جرم اور گناہ اسی کو بتلایا ہے۔ (بخاری شریف)

فقروفاقہ اور افلاس کی وجہ سے اولاد کشی کے واقعات زیادہ پیش نہ آتے تھے، لیکن ''دختر کشی'' کا رواج دورِ جاہلیت کے عربوں میں بہت ہی زیادہ تھا اور اس کے لیے ایسی شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا کہ پڑھ سن کر آج بھی کلیجہ منھ کو آ لگتا ہے اور دل کانپ اٹھتا ہے، اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ جہلاءِ عرب غیور تھے، مگر ان کی غیرت انتہائی شقاوت اور سنگ دلی کے سانچے میں ڈھل گئی تھی، وہ اپنے گھر میں داماد لانے کو شرم اور عار کی بات سمجھتے تھے، بیٹی کو ایک بڑا بوجھ سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ بیٹی کی پیدائش کے بارے میں سنتے ہی مارے غصہ کے ان کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا، ان کے سامنے دو ہی راستے ہوتے، یا تو اسے متاعِ رسوائی اور بوجھ سمجھ کر زندہ رکھا جائے، یا پھر منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا جائے، اکثر اس معصوم پھول سی بچی کو زندہ ہی زمین میں دفن کر دیا جاتا، قرآنِ کریم نے اسے یوں بیان فرمایا:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ط أَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ أَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ط أَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝﴾ (النحل: ۵۸-۵۹)

''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے، اسے (بیٹی کی پیدائش پر) جو بشارت دی گئی اس کی وجہ سے وہ چھپا ہوا رہتا ہے (اور سوچتا ہے کہ) آیا اسے ذلت پر روکے رہے یا مٹی میں گاڑ دے، خبردار!

ان کے فیصلے (بہت ہی) برے ہیں۔

دورِ جاہلیت اور ہوسنا کی:

دورِ جاہلیت میں جو بچیاں زیرِ زمین دفن ہونے سے بچ جاتیں وہ عموماً رسوائی کی زندگی گذارنے پر مجبور تھیں؛ کیوں کہ اس زمانہ میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی، عورت کو ہوس اور شہوت کی تکمیل کا ایک بہترین کھلونہ اور آلہ سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد مکان کے دوسرے سامان کی طرح یا جانوروں اور مویشیوں کی طرح جہاں چاہتے منتقل کر دیتے تھے، یہاں تک کہ ایک عورت کئی مردوں کی مشترکہ بیوی ہوا کرتی تھی، پھر اس مشترکہ بیوی سے جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو رواج کے مطابق قیافہ شناس کو بلوا کر اس کے سلسلۂ نسب کی شناخت کرواتے، اس زمانہ میں اسے ''نکاحِ رہط'' کہا جاتا تھا۔ (بخاری: ۲/ ۷۶۹)

اس کے علاوہ بھی ہوسنا کی اور خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے لیے انہوں نے بہت سے حرام اور ناجائز طریقے تجویز کر رکھے تھے، بالکل جانوروں کی طرح ان میں بھی کوئی خاص پاس ولحاظ اور پابندی نہ تھی، جو، جب، جہاں اور جس سے چاہتا منھ کالا کر لیتا۔

دورِ جاہلیت اور شراب نوشی:

یہ تو شباب کی مستی کا حال تھا، شراب نوشی کا حال بھی بڑا عجیب تھا، اس لیے کہ شراب تو ان کی گھٹی میں پڑی تھی، جہالت کے بعض بیمار اپنے یہاں پیدا ہونے والے بچہ کے حلق میں پہلے شراب ٹپکایا کرتے، دودھ بعد میں پلواتے، یہی وجہ ہے کہ شراب نوشی ان کا نہایت ہی محبوب اور ایک عام مشغلہ تھا، ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں شراب کے قریب سو نام ملتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم سو قسم کی شراب اس زمانہ میں پائی جاتی تھی۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک مشہور شاعر کے لیے جب قتل کی سزا تجویز ہوئی اور اس

سے پوچھا گیا کہ تم کس طرح قتل ہونا چاہتے ہو؟ تو اس نے یہ تمنا ظاہر کی کہ خوب شراب پی کر جب میں انتہائی مست اور بے خود ہو جاؤں تب مجھے قتل کیا جائے۔ بعض تو ایسے شقی القلب تھے کہ اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی کھوپڑیوں میں مزے لے کر نہایت فخر و غرور کے ساتھ شراب پیتے تھے، اس شراب نوشی نے انہیں نہایت جری و جنگجو بنا دیا تھا۔

دورِ جاہلیت اور قتل و غارت گری:

مگر ان کی جرأت و شجاعت کا سارا زور تقریباً آپس کی خانہ جنگیوں اور خونریزیوں میں صرف ہوتا تھا اور اس طرح گویا جنگ وجدال ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی، ایک معمولی واقعہ اکثر بڑی خون ریزی اور طویل جنگوں کا سبب بن جاتا، مثلاً کسی شخص کا اونٹ دوسرے کی چراگاہ میں چلا گیا، بس اتنی سی بات پر خون خرابہ ہو جاتا، یا گھوڑ دوڑ میں کسی کا گھوڑا دوڑ شروع ہوتے وقت مقرر حد سے ذرا آگے نکل گیا، یا کوئی دوسرا کامیاب ہو گیا تو اس پر تلواریں نیام سے نکل آتیں اور زمین انسانوں کے خون سے رنگین ہو جاتی۔

بقول حالیؔ مرحومؒ:

کہیں تھا مویشی چرانے میں جھگڑا
کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا
کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

قتل و قتال اور جنگ وجدال ان کے لیے ایک کھیل تھا، انسانی جان کی ان کی نگاہ میں کوئی خاص قدر و قیمت نہ تھی، جیسے درختوں کی ڈالیاں اور گھاس کاٹ دی جاتی ہیں بالکل اسی طرح وہ سخت دل بھی ایک دوسرے کا گلا کاٹ دیتے، باہمی قتل و غارت گری اور ظلم و زیادتی معمولی بات تھی، خصوصاً کمزور طبقہ تو طاقتوروں کے لیے لقمۂ تر کے مانند تھا، نہ ان کی جان محفوظ تھی، نہ عزت و آبرو، جس کو طاقت اور وجاہت حاصل ہوتی وہ اپنے ناجائز

مطالبات بھی تلوار اور طاقت کے زور سے منوا لیا کرتا، جب کہ بہت سے ناتواں، عورتیں، غلام اور بچے وغیرہ اپنے جائز حقوق سے بھی محروم تھے۔

بقول حالی مرحومؒ:

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اک لوٹ مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل وغارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

قرآنِ کریم میں دورِ جاہلیت کا اجمالی خاکہ:

مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی جس میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی دنیا کی تاریخ کا اتنا بدترین دور تھا کہ اب تک ہمارے معتبر مؤرخوں اور تاریخ نویسوں نے دورِ جاہلیت کا جو کچھ نقشہ کھینچا ہے حقیقت یہ ہے کہ ساری تفصیلات قلم بند اور جمع کرنے کے باوجود کوئی کما حقہٗ اسے بیان نہیں کر سکا، یہ کلام اللہ کی حقانیت، صداقت و فصاحت کی ایک بڑی دلیل ہے کہ اس نے نہایت ہی اختصار کے ساتھ دورِ جاہلیت کا اجمالی خاکہ پیش فرمایا:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم: ٤١)

کفر و بت پرستی، ظلم وزیادتی، ہوسناکی وخواہشاتِ نفسانی، بدکاری وفحاشی اور سماجی واخلاقی بداعمالیوں کے سبب ساری کائناتِ انسانی میں فساد پھیل پڑا، نہ خشکی میں امن رہا نہ تری میں، نہ مشرق میں نہ مغرب میں، نہ شمال میں نہ جنوب میں، تمام دنیا میں لوگوں کے اعمال کے سبب فتنہ وفساد پھیل گیا، واقعہ یہ ہے کہ آیت کریمہ کو دورِ جاہلیت پر محمول کیا جاسکتا

ہے؛ کیوں کہ جو صورتِ حال اس میں پیش کی گئی وہ دورِ جاہلیت کی ہو بہو تصویر ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماءِ مفسرین نے فرمایا کہ بندوں کی بدکاریوں کی وجہ سے خشکی اور تری میں خرابی کا پھیلنا گو ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، لیکن جس خوفناک عموم اور شمول کے ساتھ بعثت محمدی سے پہلے یہ تاریک گھٹا مشرق و مغرب اور بر و بحر پر چھا گئی تھی دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

یورپ کے محققین نے اس زمانے کی تاریک حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر مسلم مؤرخ بھی اس مشہور و معروف صداقت پر کوئی حرف گیری نہیں کر سکے، شاید اسی عمومِ فتنہ و فساد کو پیش نظر رکھ کر حضرت قتادہؒ نے آیت کا محمل زمانۂ جاہلیت کو قرار دیا ہے۔ (گلدستۂ تفاسیر: ۵/ ۴۴۹)

ایک اور مقام پر دورِ جاہلیت کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿وَ كُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا﴾ (آل عمران:۱۰۳)

دنیا والو! جہالت کے اس دور کو بھی یاد کرو جب تم کفر و عصیان اور ظلم و عدوان کی وجہ سے دوزخ اور گویا آگ کے سمندر میں چھلانگ لگانے کی پوری تیاری کر چکے تھے کہ موت آئے اور اس میں جا گریں، مگر عین انسانیت کے اس جاں کنی کے عالم میں حق تعالیٰ نے اپنی سنت و عادت کے مطابق انسانیت کو ہلاکت و ضلالت سے بچا کر حیاتِ جاودانی بخشنے کے لیے، جہالت و ظلمت کے اس تاریک جنگل کو علم و ہدایت سے روشن کرنے اور خیر و خوبی سے ویران دنیا کی آبادی کو صدق وصفا اور محبت و وفا کی بستی بنانے اور ایک عظیم اور بہترین انقلاب برپا کرنے کے لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، یہ منعم حقیقی کا وہ انعام و احسان ہے جسے خود اس نے جتلایا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ﴾ (آل عمران:۱٦٤)

حق تعالیٰ نے احسان کیا (انسانیت پر بالخصوص) مومنین پر، جو بھیجا ان میں ایک

رسول ان ہی کی جنس کا۔

ولادت سے بعثت تک رونما ہونے والے انقلابات:

پھر دنیا نے دیکھا کہ اس پیغمبر انقلاب کے تشریف لاتے ہی ظاہری و باطنی طور پر آپ ﷺ کی برکت، حکمت، تلاوت، دعوت اور محنت سے انقلاب آنا شروع ہوا اور محروم و بدنصیب دنیا کی قسمت جاگنے لگی، چناں چہ آپ ﷺ کی ولادت سے بعثت تک کے زمانہ میں رونما ہونے والے چند انقلابات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے، مثلاً جس وقت آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی تو حضرت عثمان ابن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت فاطمہ بنت عبداللہ فرماتی ہیں کہ میں اس موقع پر حضور ﷺ کی والدہ بی بی آمنہ کے پاس موجود تھی، میں نے دیکھا کہ تمام گھر نور سے بھر گیا اور دیکھا کہ آسمان کے ستارے جھکے آتے ہیں، علماء نے فرمایا کہ نور اور ستاروں کے زمین کی طرف جھک آنے میں اس طرف اشارہ تھا کہ اب آپ ﷺ کی نبوت کا نورانی سورج طلوع ہونے کے بعد کفر و بت پرستی کی ظلمت اور تاریکی ختم ہوکر انوار و ہدایت سے ساری دنیا روشن اور منور ہو جائے گی۔

﴿ قَدۡ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ نُورٞ وَكِتَٰبٞ مُّبِينٞ ﴾ (المائدة: ۱۵)

”تحقیق کہ تمہارے پاس حق تعالیٰ کی جانب سے نورِ ہدایت اور روشن کتاب آئی ہے۔“ جس سے سارا عالم منور ہونے والا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے عالم وجود میں تشریف لاتے ہی ایوانِ کسریٰ میں زلزلہ آیا جس سے محل کے چودہ کنگرے گر پڑے اور فارس کا آتش کدہ جو ہزار سال سے مسلسل روشن تھا وہ بجھ گیا، اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ اب باطل اور ان کی حکومتیں ختم ہوں گی اور حق کا غلبہ ہوگا۔

﴿ قُلۡ جَآءَ ٱلۡحَقُّ وَزَهَقَ ٱلۡبَٰطِلُ ﴾ (بنی إسرائیل: ۸۱)

اب حق والا آگیا، لہٰذا حق کا ہی غلبہ ہوگا، ولادت کے بعد سب سے پہلے رحمت

عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی والدہ بی بی آمنہ نے دو چار روز تک دودھ پلایا، اس کے بعد حضور ﷺ کے چچا ابولہب کی آزاد کردہ باندی ثُویبہ نے پلایا، ثُویبہ نے آپ ﷺ سے پہلے آپ ﷺ کے سگے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی دودھ پلایا تھا، اس لیے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے رضاعی بھائی بھی تھے، اور آپ ﷺ کے بعد ثُویبہ نے ابوسلمہ کو دودھ پلایا۔ (سیرۃ المصطفیٰ:۱/ ۶۸)

پھر آپ ﷺ کے دادا خواجہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کے اکلوتے فرزند اور یتیم پوتے کے لیے دیہات کی کسی دودھ پلانے والی کی تلاش شروع کی؛ کیوں کہ رؤساءِ عرب اس زمانہ میں اپنے بچوں کی رضاعت اور ابتدائی پرورش کے لیے شہروں سے زیادہ دیہاتوں کو پسند کرتے تھے، اس لیے کہ وہاں کی آب وہوا پاکیزہ اور عمدہ ہوتی اور وہاں کے رہنے والوں کے اخلاق میں اعتدال وسلامتیٔ طبع زیادہ نمایاں ہوتے ہیں، اور وہاں کی زبان بھی صحیح اور فصیح مانی جاتی تھی، اور اس کام کے لیے قبیلۂ بنی سعد کی عورتیں زیادہ مشہور تھیں، اسی دستور کے مطابق ہر سال بنی سعد کی عورتیں شیر خوار بچوں کی تلاش میں مکہ آیا کرتی تھیں، جن میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں، جو نہایت خشک سالی اور پریشانی کے عالم میں اپنے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ اور شیر خوار بچے کے ساتھ آئی تھیں، سواری کے لیے ایک لاغر اور دبلی پتلی اونٹنی تھی جس کے تھن دودھ سے خشک تھے، حضور ﷺ کو ان سب عورتوں کے سامنے پیش کیا گیا، لیکن اکثر نے یہ سوچ کر کہ یہ یتیم بچہ ہے، لہٰذا اس سے نفع کی کوئی امید نہیں، زیادہ التفات نہ کیا اور درِ مصطفیٰ ﷺ پر پہنچ کر بھی محروم رہیں۔

مولانا محمد ضیاء القاسمی نے بڑی عجیب بات فرمائی کہ ”معلوم ہوا کہ بعض درِ مصطفیٰ ﷺ پر پہنچ کر بھی محروم رہتے ہیں، صرف حضوری (اور حاضری) شرط نہیں، عقیدے کا صحیح ہونا بھی شرط ہے، جس طرح کہ مکہ مکرمہ میں دودھ پلانے والی عورتیں خالی جھولی واپس گئیں، اسی طرح آج بھی ہزاروں روپیہ خرچ کر کے جانے والے بعض نام نہاد عاشق رسول خالی دامن

لے کر واپس آتے ہیں۔'' (بدعقیدگی کی وجہ سے) (خطباتِ قاسمی: ۱/۱۷۱)

یہ سعادت حلیمہ کی قسمت میں مقدر تھی، اس لیے ان کے دل میں اس درِ یتیم کو لینے کا شدید داعیہ اور تقاضا پیدا ہوگیا، حلیمہ کہتی ہیں کہ اس مولودِ مسعود کو گود میں لینا تھا کہ پھر ایک بار انقلاب آنا شروع ہوگیا، خیر وبرکت کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہونے لگا، حلیمہ نے جوں ہی آپ ﷺ کو سینہ سے لگایا وہ دودھ سے بھر گیا، سوکھی چھاتیوں میں دودھ اتر آیا، جس سے آپ ﷺ بھی سیراب ہوگئے اور آپ ﷺ کے رضاعی بھائی عبداللہ بھی، پھر ان کے شوہر اونٹنی کا دودھ دوہنے کے لیے اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے تھن بھی دودھ سے بھرے ہوئے ہیں، جب قافلہ کی روانگی کا وقت آیا تو جس دبلی پتلی اونٹنی کو پہلے چابک مار مار کر ہنکارا جاتا تھا، اب وہ برق رفتار ہے اور کسی طرح تھامے نہیں تھمتی، گویا اونٹنی کو پر لگ گئے اور ہوا سے باتیں کرنے لگی؛ کیوں کہ اب سوار بدل چکا تھا، پھر حلیمہ جہاں جہاں ہمارے آقا ﷺ کو لے کر گئیں برکتیں اور رحمتیں ساتھ ساتھ رہیں اور حالات بدلنے لگے۔

﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوٰى﴾ (الضحیٰ: ٦١)

سچ ہی تو کہا ہے:

قدم قدم پہ برکتیں، نفس نفس پہ رحمتیں
جہاں جہاں سے وہ شفیع عاصیاں گزر گیا
جہاں قدم نہیں پڑے وہاں ہے رات آج تک
وہیں وہیں سحر ہوئی، جہاں جہاں گزر گیا

تنصیبِ حجرِ اسود کا واقعہ:

آپ کی بدولت بعثت سے قبل ہی رونما ہونے والے انقلابات میں تعمیر کعبہ کے بعد تنصیبِ حجرِ اسود کا واقعہ بھی بڑا مشہور ہے، خانۂ کعبہ کی عمارت مرورِ زمانہ اور سیلاب کی وجہ سے نہایت بوسیدہ ہوگئی تھی، اس لیے قریش مکہ نے اس کی تعمیر نو کا ارادہ کیا، عمارت کی تعمیر میں

تو سب ہی شامل تھے، مگر جب حجرِ اسود کی تنصیب (اس کو اپنی جگہ پر رکھنے) کا وقت آیا تو سخت اختلاف پیدا ہو گیا، ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ تنہا وہی اس مقدس پتھر کو اٹھا کر اس کو صحیح جگہ نصب کرے، اس پر بات بڑھنے لگی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں، لوگ جنگ وجدال اور قتل وقتال پر آمادہ ہو گئے؛ کیوں کہ دورِ جاہلیت میں اس سے بہت معمولی باتوں میں بھی جنگیں ہوتی رہتیں، پھر یہ تو بہت بڑی بات تھی، اس لیے جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں، جوش بڑھتا گیا، قریش چار پانچ دن تک اسی الجھن میں رہے، اس نازک صورتِ حال کو دیکھ کر پانچویں دن ابو امیہ بن مغیرہ جو قریش میں سب سے زیادہ معمر اور سن رسیدہ تھا اس نے کہا کہ نادانو! اتنے بے قابو کیوں ہوئے جاتے ہو؟ کیا حرم مقدس کی زمین کو خون سے لالہ زار بنانے کا ارادہ ہے؟ یہاں تلوار چل گئی تو پھر رکے گی نہیں، صدیوں تک اس جنگ کے شعلے بھڑکتے رہیں گے، میں کہتا ہوں کہ ہر بات کا فیصلہ تلوار ہی سے نہیں ہوا کرتا، اس کی دوسری صورتیں بھی ممکن ہیں، اس پر سب بولے: اچھا جی! آپ ہی کوئی تدبیر بتائیے، ہم کیا کریں؟ ابو امیہ نے کہا کہ اس مسئلہ کو کسی پنچ پر چھوڑ دینا چاہیے، لیکن یہ بات بھی خود ایک نزاع بن جائے گی کہ ثالث کس کو بنایا جائے، تو اس مشکل کا حل یہ ہے کہ جو شخص سب سے پہلے خانۂ کعبہ میں داخل ہو اس کو حاکم مان لیا جائے اور جو فیصلہ وہ کرے اسے سب لوگ بغیر کسی چون وچرا کے مان لیں، اس پر سب نے حامی بھری کہ ہمیں یہ بات منظور ہے، اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ سب سے پہلے خانۂ کعبہ میں محمد بن عبد اللہ داخل ہو رہے ہیں، آپ ﷺ کو دیکھتے ہی سب نے بے ساختہ کہا کہ ”ھٰذَا مُحَمَّدٌ الْأَمِيْنُ رَضِيْنَاهُ“ یہ تو محمد الامین ہیں، ہم ان کو حکم بنانے پر راضی ہیں، تمام لوگ یہ کہنے کے بعد آپ ﷺ کا چہرہ دیکھنے لگے کہ نہ جانے کس کے حق میں فیصلہ صادر ہوتا ہے، ہر کوئی پُر آرزو بھی تھا اور مایوس بھی، ایسے موقعوں پر تصویر کے روشن اور تاریک دونوں پہلو سامنے آیا کرتے ہیں، مگر آپ ﷺ نے خداداد حسنِ تدبیر اور موقع کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی ردائے رحمت کو فرشِ کعبہ پر بچھا دیا، اور حجرِ اسود کو اپنے دستِ مبارک سے اٹھا کر اس میں رکھا پھر فرمایا کہ

تمام قبیلوں سے ایک ایک سردار اس چادر کو تھام لے، تاکہ تنصیبِ حجر اسود کا شرف تمام قبائل میں مساوی طور پر بٹ جائے، سب نے ایسا ہی کیا، جب اس طرح حجر اسود کو چادر میں اٹھا کر اس جگہ پہنچے جہاں اس کو رکھنا تھا، تو آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر اسے چادر سے نکال کر مطاف کے سرے پر لگا دیا، آپ ﷺ کی اس حسن تدبیر اور حکمتِ عملی سے سب خوش ہو گئے، کھینچی ہوئی تلواریں نیام میں آگئیں، ایک خونریز جنگ رک گئی اور امن وآشتی اور صلح وسلامتی کی فضا قائم ہوگئی، جسے ایک بہترین انقلاب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

محمد بن عبداللہ سے محمد رسول اللہ ﷺ:

اس کے بعد جب آپ ﷺ محمد بن عبداللہ کی حیثیت سے اپنی انقلابی زندگی کے چالیس سال گذار چکے تو آپ ﷺ کو منجانب اللہ "إِظْهَارُ الدِّيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" اور عظیم وبہترین انقلاب برپا کرنے کے لیے منصب نبوت ورسالت سے نوازا گیا، حدیث مذکور میں فرمایا گیا: "بُعِثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِأَرْبَعِيْنَ سَنَةً" آپ ﷺ کی بعثت کا یہ عظیم الشان واقعہ محمد بن اسحاق کے بقول ۱۷/ رمضان المبارک (مطابق: ۶/ اگست ۶۱۰ء) کو اس وقت پیش آیا جب آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال اور چھ ماہ کی تھی، حافظ عسقلانیؒ نے فتح الباری میں اسی قول کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے۔ (سیرۃ المصطفیٰ: ۱/ ۱۴۵)

جب آپ ﷺ محمد بن عبداللہ سے محمد رسول اللہ ہو گئے، تو آپ ﷺ کو منصب رسالت کی تکمیل کے لیے جو وظائف سپرد کیے گئے قرآن کریم نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (ال عمران: ۱٦٤)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیۂ نفوس (۳) تعلیم کتاب وحکمت (اپنے علم وعمل) کے ذریعہ منصب نبوت کے فرائض انجام دیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق: "فَمَكَثَ بِمَكَّةَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ سَنَةً يُوْحٰى

إِلَيْهِ، ثُمَّ أُمِرَ بِالْهِجْرَةِ، فَهَاجَرَ عَشْرَ سِنِيْنَ"

مکی زندگی میں نبوت کے بعد مسلسل تیرہ سال اور مدنی زندگی میں ہجرت کے بعد دس سال یعنی کل تیئیس سال کے عرصہ میں نہایت ہمت وحکمت سے وہ کارنامہ انجام دیا کہ نقشہ ہی بدل گیا۔ مولانا حالیؒ نے کہا:

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

اور کسی عاشق کے بقول:

دنیا کو تم نے آکر پرنور کردیا
اور ظلمتوں کو یکسر کافور کردیا
پیغام حق سناکر مسرور کردیا
وحدت کی مئے پلاکر مخمور کردیا

پیغمبر انقلاب ﷺ نے انقلاب لانے کے لیے تین طریقے اختیار فرمائے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول علامہ خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم اس کام کے لیے تین طریقے اختیار فرمائے:

(۱) دلوں کا تزکیہ کیا اور لوگوں کی فکر وسوچ میں انقلاب پیدا کیا، دلوں میں خوفِ خدا اور فکر عقبیٰ کا جذبہ بیدار کیا، جس کے نتیجے میں صحابہ رضی اللہ عنہم معمولی سی لغزشوں پر بھی تڑپ اٹھتے اور بے چین ہو جاتے، چناں چہ کتب حدیث میں ایک صحابی حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اور صحابیہ حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کا ذکر آتا ہے کہ ازراہِ بشریت ان سے برائی کا صدور ہو گیا، حالاں کہ ان کی غلطی کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی زبان نے ٹوکا، نہ کسی مدعی نے ان کے خلاف بارگاہِ نبوی میں دعویٰ کیا، لیکن احساسِ گناہ نے ان کے زندہ اور باایمان ضمیر کو ایسا تڑپا دیا کہ ازخود دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ اس جرم کی

سزا نہایت سخت ہے، اعترافِ جرم کیا اور باصرار عرض کیا کہ ہمیں پاک کیجئے، یہاں تک کہ ان پر شرعی حد نافذ کی گئی۔

پورے عہد نبوی میں ایسے جرائم کے جن پر شرعی حد مقرر ہے، صرف چھ سات واقعات رونما ہوئے، پھر عام طور پر مجرمانہ اِقدام واقعات مال وزر کے حصول کے لیے پیش آتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کی بے وقعتی اور دنیا کی بے ثباتی صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اس درجہ بڑھا دی کہ وہ دوسرے کا مال لینے سے خوب اجتناب کرتے تھے، چناں چہ ایک صاحب کا مقدمہ دربارِ اقدس میں آیا، گواہ نہیں تھے، اس لیے فریقین کا بیان سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کے حق میں فیصلہ فرمایا، پھر یہ بھی فرمایا کہ ممکن ہے کہ میں نے تمہاری چرب زبانی سے متاثر ہو کر تمہارے حق میں فیصلہ کر دیا ہو، حالاں کہ فی الحقیقت وہ زمین تمہاری نہ ہو، اگر ایسا ہو تو یہ تمہارے حق میں زمین کا نہیں بلکہ جہنم کا ٹکڑا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر وہ صاحب زمین سے دست بردار ہو گئے، اور دوسرے شخص نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا، بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ زمین دونوں کے درمیان برابر تقسیم فرما دی، واقعہ یہ ہے کہ جب تک دل کی دنیا نہ بدلے اور بنیادی فکر وسوچ میں انقلاب نہ آئے سماج کو جرائم سے پاک نہیں کیا جا سکتا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دلوں کا تزکیہ فرما کر دل کی دنیا میں خوفِ خدا وفکر عقبیٰ کا جذبہ بیدار کیا۔

(۲) دوسرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان راستوں کو بند کیا جو آدمی کو گناہ تک لے جاتے ہیں، مثلاً اسلام میں زنا حرام ہے تو اس جرم کو روکنے کے لیے ممکنہ تدبیریں اختیار کرنے کا حکم فرمایا، نکاح کو نہایت آسان اور زنا کو بہت ہی سنگین جرم قرار دے کر نہایت ہی مشکل بنا دیا، اس کے لیے پردہ کا نظام دیا، غیر محرم کے ساتھ تنہائی کو منع کیا، مخلوط تعلیم وعبادت سے روکا، وغیرہ، شراب اور نشہ جو ام الخبائث ہے اس کو سنگین جرم قرار دیا، اس کی خرید وفروخت، اس کی صنعت، نیز اس کے حمل ونقل کو بھی جرم قرار دیا، جس سے اس کی فراہمی ہی

دشوار ہوگئی، غرض سماج میں صالح انقلاب لانے کے لیے دوسرا طریقہ آپ ﷺ نے یہ اختیار کیا کہ ان اسباب ومحرکات کا سد باب فرما دیا جو معاصی اور جرائم میں معاون ہو سکتے تھے۔

(۳) علاوہ ازیں تیسرا طریقہ آپ ﷺ نے یہ اختیار کیا کہ سنگین جرائم پر سخت سزائیں مقرر فرمائیں؛ کیوں کہ بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ کتنی ہی محبت کی زبان استعمال کرلیں اور خیر خواہی وہمدردی کے ساتھ دل کے بند دروازوں پر کتنی ہی مرتبہ دستک دیں، مگر قانون کی تلوار اور طاقت کے سوا کوئی چیز ان کو سرخمیدہ اور جرائم سے باز نہیں کر پاتی، ایسے لوگوں کے لیے سخت قانون بھی ایک سماجی ضرورت ہے، اسی لیے سماج میں انقلاب کے لیے آپ ﷺ نے تیسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ سنگین جرائم پر سخت سزائیں مقرر کیں، یہی طریقۂ کار تھا، جس سے جرائم کے خوگر عرب سماج کی حالت بدلی۔ (مستفاد از: راہِ عمل ص: ۴۳۵، جرائم، مرض اور علاج)

دنیا کا سب سے عظیم انقلاب:

دنیا سے کفر وضلالت کی ظلمت مٹنے لگی اور ہر سو ہدایت ورحمت کی موسلا دھار بارش برسنے لگی، پھر باغِ عالم میں عجب تازہ بہار آنے لگی، اب کل تک جو بدترین دور تھا وہ بہترین اور سعیدترین دور ہوگیا، جو قوم ذرّات سے زیادہ ذلیل تھی وہ آفتاب سے زیادہ عزیز بن گئی، جو لوگ شرک وبت پرستی کے عادی تھے وہ اس کے ماحی (مٹانے والے) اور توحید کے داعی بن گئے، جو شراب پی کر مست رہتے تھے اب وہ یادِ الٰہی میں مست ہونے لگے، جو نفسانی خواہشات پر مرتے تھے اب ربانی مرضیات پر قربان ہونے لگے، جو جان کے دشمن تھے وہ محافظ بن گئے، جو رہزن تھے وہ رہبر بن گئے، اور یہ دنیا کا سب سے عظیم انقلاب معلم کتاب کی تعلیم وحکمت اور تربیت کا ثمرہ ونتیجہ تھا، اسی کو کسی عاشق نے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

کفر کی ظلمت جس نے مٹائی، دین کی دولت جس نے لٹائی
لہرایا توحید کا پرچم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
بزمِ ملل تھی نظم سے خالی، بکھرے ہوئے تھے حق کے لآلی
اس نے کیے سب آ کے منظّم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
باغِ جہاں میں حارس نامی، جس نے مٹائی رسم غلامی
پھر سے سنوارا گلشن آدم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
وہم کی ہر زنجیر کو توڑا، رشتہ ایک خدا سے جوڑا
شرک کی محفل کردی برہم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
فرد و جماعت، امر و اطاعت، کسب و قناعت، عفو و شجاعت
حل کیے جو اَسرار تھے مبہم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
احمد مرسل، فخر دو عالم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
مظہر اول، مرسلِ خاتم، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

ہاں، مگر جو ازلی شقی اور بد بخت تھے انہوں نے آپ ﷺ کے انقلابی پیغام کو قبول نہیں کیا، جس کی وجہ سے وہ محروم ہی رہے، اور ایسے لوگ محروم ہی رہتے ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

صالح انقلاب کے لیے پیغام مصطفیٰ ﷺ کو عام کیا جائے۔

صاحبو! اس میں کوئی شک نہیں کہ روئے زمین پر مختلف اوقات اور مختلف علاقوں میں بڑے بڑے رہبر و فلاسفر آئے، بڑے بڑے داعی و ہادی آئے اور انہوں نے اپنے اپنے اوقات میں عظیم انقلاب برپا کیے، لیکن ہادیٔ اعظم، رحمت عالم، فخر بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم جو عظیم اور بہترین انقلاب لائے، بقول علامہ عبد الماجد دریا آبادیؒ ''اپنے پیچھے ایک منظّم حکومت ۱۲/ لاکھ مربع میل کی چھوڑ گئے اور وہ بھی لاکھوں انسانوں کے قتل کے بعد نہیں، ہزار ہا ہزار جانیں لینے کے بعد نہیں، بلکہ حیرت کے کانوں سے سنئے کہ اس کی ساری (ظلم کو مٹانے

کے لیے کی جانے والی جنگوں اور) لڑائیوں میں دوست ودشمن سب ملا کر کل ملا کر ایک ہزار اٹھارہ انسان کام آئے۔'' (از معارفِ قاسم جدید، سیرۃ النبی نمبر/ص:۵۱)

ظاہر ہے کہ اتنے کم نقصان کے ساتھ ایسا انقلاب تاریخِ انسانی میں نہ آج تک کوئی لایا ہے، نہ لا سکتا ہے، اور اب نہ آپ ﷺ کی تعلیمات وہدایات کے ہوتے ہوئے کسی انقلاب کی ضرورت ہے، بس آپ ﷺ نے جو کتاب وسنت پر مبنی پیغام ونظام ہمیں قیامت تک کی انسانیت کے لیے پیش کیا ہے اسے سچے دل سے قبول کر کے اہل اللہ اور صلحاء سے رسمی نہیں، بلکہ صحیح تعلق قائم کر کے اپنا علاج وتزکیہ کریں، نیز معاصی اور اسبابِ معاصی سے بھی اجتناب کریں، اس کے باوجود اگر کوئی گناہ ہو جائے تو سچے دل سے توبہ کر لیں، یقین جانیں کہ یہی وہ پیغام ہے جسے اگر قولاً وفعلاً عام کیا جائے تو آج بھی جاہلیت قدیمہ کی طرح جاہلیت جدیدہ کو مٹا کر ایک صالح انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے، جس کی زمانہ کو سخت ضرورت ہے، اور صالح انقلاب لانے کے لیے پیغام مصطفیٰ ﷺ کو عام کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔

حق تعالیٰ پیغام مصطفیٰ ﷺ کو عام وتام فرمادیں اور صالح انقلاب برپا کر دے۔ آمین۔

۲/ ربیع الاول/ ۱۴۳۳ھ

مطابق: ۲۶/ جنوری/ ۲۰۱۲ء

(بزمِ صدیقی، بڑودا)

" اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ "

☆......☆......☆

(۳۷)

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَثَلِیۡ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسۡتَوۡقَدَ نَارًا، فَلَمَّا أَضَاءَتۡ مَا حَوۡلَهَا جَعَلَ الۡفَرَاشُ وَهٰذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِیۡ تَقَعُ فِی النَّارِ يَقَعۡنَ فِيۡهَا، فَجَعَلَ يَحۡجُزُهُنَّ وَيَغۡلِبۡنَهٗ، فَيَتَقَحَّمۡنَ فِيۡهَا، فَأَنَا اٰخِذٌ بِحُجَزِكُمۡ عَنِ النَّارِ، وَأَنۡتُمۡ تَقَحَّمُوۡنَ فِيۡهَا". (صحیحین، مشکوٰۃ/ص: ۲۸/ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میری مثال اس شخص کے مانند ہے جس نے (لوگوں کے نفع کے خاطر) آگ روشن کی، اور جب آگ نے اپنے اردگرد کی جگہوں کو بھی روشن کر دیا تو پروانے اور وہ جانور جو (روشنی سے عشق کے باعث) آگ پر گرا کرتے ہیں، (آگ روشن ہوتے ہی) آگ میں گرنا شروع کر دیتے ہیں، آگ روشن کرنے والا انہیں روکتا بھی ہے، مگر وہ (کثیر ہونے کے باعث) آگ میں گرنے میں اس پر غلبہ پا لیتے ہیں، اور آگ میں داخل ہو جاتے ہیں، تو میں بھی (اس طرح سے) تمہاری کمر (آگ سے تمہیں بچانے کے لیے) پکڑے ہوئے ہوں اور تم ہو کہ اس میں گرے جا رہے ہو۔''

سیرۃ النبی ﷺ کلامِ الٰہی کی عملی تفسیر ہے:

”سیرۃ النبی“ کا مطلب ہے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے وصال تک کی حیاتِ طیبہ کے مقدس حالات اور واقعات۔ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی مقدس ذات جامع الصفات والکمالات اور نہایت منفرد و بے مثال ہے، اس لیے یہ موضوع نہایت منفرد، پاکیزہ اور بابرکت ہونے کے ساتھ بہت ہی جامع، وسیع اور ہمہ گیر بھی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۲) تو سیرتِ رسول اللہ ﷺ کی شان بھی یہ ہے کہ اس مقدس ومنفرد موضوع کو مختصر لفظوں میں بیان کرنا ہو تو اس کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ”بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر“ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے عظیم الشان مرتبہ ومقام آپ ﷺ کا ہے، لیکن اگر سیرۃ النبی ﷺ کے مقدس ومنفرد موضوع کو مفصل بیان کرنا ہو تو پھر بقولِ مبلغ اسلام علامہ سید عبدالمجید ندیم شاہ صاحبؒ اس کے لیے تو خادمِ رسول حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کی زبان، عاشق رسول ﷺ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قلب اطہر اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کی عمر چاہیے، پھر بھی اس مقدس اور منفرد موضوع کا حق ادا نہیں ہوسکتا، اور یہ محض عقیدت ہی نہیں، بلکہ حقیقت ہے؛ کیوں کہ جس وقت مریمِ اسلام، عفیفۂ کائنات، ام المومنین والمومنات سیدہ عائشہ صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہما سے سیرۃ النبی ﷺ کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ ”فَإِنَّ خُلُقَ نَبِيِّ اللّٰهِ ﷺ كَانَ الْقُرْآنَ“. (رواہ مسلم، مشکوٰۃ المصابیح/ ص: ۱۱۱/ باب الوتر) آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور اخلاقِ حسنہ قرآن ہے۔ واقعی ”الٓمٓ“ سے لے کر ”والناس“ تک جو قرآن کا ”قال“ ہے وہ آپ ﷺ کا ”حال“ ہے، قرآنِ کریم اگر علمی کتاب ہے تو رسولِ کریم ﷺ کی مقدس ذات عملی کتاب ہے، جو کچھ قرآنِ کریم کے صفحات میں ہے وہ سب کچھ سیرۃ النبی ﷺ کے لمحات میں ہے؛ کیوں کہ سیرۃ النبی ﷺ کلام الٰہی کی عملی تفسیر ہے اور مختلف عناوین ومضامین پر مشتمل آیاتِ قرآنی درحقیقت سیرۃ النبی ﷺ کے مختلف الانواع پہلو ہیں۔

حضرت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''قرآنِ کریم میں ذات وصفات کی آیات آپ ﷺ کے عقائد ہیں، احکام کی آیتیں آپ ﷺ کے اعمال، تکوین کی آیتیں آپ ﷺ کا استدلال، تشریع کی آیتیں آپ ﷺ کا حال، قہر وغلبہ کی آیتیں آپ ﷺ کا جلال اور مہر ومحبت کی آیتیں آپ ﷺ کا جمال ہے، وغیرہ۔''

سیرۃ النبی ﷺ کا موضوع کبھی پرانا ہونے والا نہیں۔

غرض! عشق ومحبت میں مست ہوکر چشم بصیرت سے قرآنِ کریم کو دیکھا اور پڑھا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ اس کی ہر ہر آیت شانِ مصطفیٰ ﷺ کی تعبیر اور سیرتِ مصطفیٰ ﷺ اس کی عملی تفسیر ہے، اسی لیے مولانا جامیؒ نے صحیح فرمایا ہے:

دو عالم روز وشب در گفتگویش
ہمہ قرآن در شانِ محمد ﷺ

قرآنِ کریم کو چشم بصیرت سے دیکھ کر اور عشق ومحبت میں مست ہوکر پڑھو تو سہی، جا بجا تمہیں قرآن میں صاحبِ قرآن ﷺ کی شان نظر آئے گی، اور جب یہ حقیقت ہے تو پھر روئے زمین پر جب تک قرآن موجود رہے گا صاحب قرآن ﷺ کی شان اور سیرت کا بیان بھی ہوتا ہی رہے گا، اور جو حال قرآن کا ہے وہی حال صاحب قرآن ﷺ کا بھی ہے۔ قرآن کی شان صاحبِ قرآن ﷺ کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ ''وَلَا یَخْلُقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ، وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ''. (ترمذی:۲/۱۱۸، مشکوٰۃ/ص:۱۸۶/ کتاب فضائل القرآن) یعنی اگر قرآن کے علوم ومعارف کبھی ختم ہونے والے نہیں اور نہ اس کے مضامین کثرتِ استعمال اور بار بار کی تکرار سے کبھی پرانے ہونے والے ہیں اور نہ اس کے عجائبات کبھی ختم ہونے والے ہیں، تو صاحب قرآن ﷺ کی سیرت کا بھی یہی حال ہے، آپ ﷺ کے خصائص وفضائل کبھی ختم ہونے والے نہیں، اور نہ سیرۃ النبی ﷺ کا موضوع کبھی پرانا ہونے والا ہے ''ھُوَ الْمِسْکُ مَا کَرَّرْتَہٗ یَتَضَوَّعُ'' سیرۃ النبی ﷺ کا موضوع

بھی کستوری کی اس ڈبیہ کے مانند ہے کہ اسے جب بھی کھولا جائے دل ودماغ اور ساری فضا معطر اور خوشگوار ہو جائے، سیرۃ النبی ﷺ کا بھی یہی حال ہے، رسومات اور بدعات سے پاک ہوکر اسے جب بھی اور جہاں بھی بیان کیا جائے ساری فضا معطر اور انوار سے منور ہو جائے، رب العالمین نے ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ کے تقاضوں کو یوں پورا کیا کہ رحمۃ للعالمین ﷺ کے اردگرد پیش آنے والے حالات اور واقعات کو سدا بہار بنا دیا، یہ اسی کا اثر ہے کہ امت کے ہزاروں، لاکھوں افراد آج تک سیرۃ النبی ﷺ کے مختلف گوشے بیان کرتے آئے ہیں، مگر آج تک اس کی رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا، نہ یہ موضوع پرانا ہوا، نہ کبھی اس سے اکتاہٹ پیدا ہوئی، بلکہ عاشقوں کو اس سے ہر مرتبہ نئی روشنی اور روحانیت ولذت محسوس ہوتی رہتی ہے۔

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ﴾

آیئے! ہم اور آپ آج عملی طور پر اس کا مشاہدہ کریں اور سیرۃ النبی ﷺ کے اس بحر ذخار سے چند موتی چنیں، اس کے لیے ہم بطورِ نمونہ قرآنِ کریم سے صرف ایک آیت کریمہ پیش کرتے ہیں، جس میں حق تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی چار صفات اور خصوصیات کا تذکرہ فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (التوبة : ۱۲۸)

’’بلاشبہ تمہارے پاس ایک رسول آئے جو تم ہی میں سے ہیں، تمہیں جو تکلیف پہنچتی ہے وہ ان پر نہایت گراں گذرتی ہے، وہ تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند ہیں، اہل ایمان کے لیے تو بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔‘‘

اس آیت مبارکہ میں سب سے پہلے تو آمدِ رسول ﷺ کی اطلاع دی گئی کہ ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ﴾ تمہارے وہ رسول آئے جس رسول کی آمد کا انتظار صدیوں سے

ہو رہا تھا اور جس کی آمد کے لیے جد الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہما السلام نے بڑے بڑے امتحانات میں سو فیصد کامیابی حاصل کرنے کے بعد عالمی رشد وہدایت کے مرکز بیت اللہ کی تعمیر کے موقع پر دعائیں کی تھیں، جسے کلام اللہ نے یوں بیان فرمایا:

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ٥ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ص وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ٥ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ٥﴾ (البقرة: ۱۲۷ تا ۱۲۹)

''اور اس وقت کا تصور کرو جب ابراہیم بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور اسماعیل (علیہما السلام) بھی ان کے ساتھ شریک تھے اور یہ کہتے جاتے تھے کہ: اے ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرمالے، بے شک تو ہی ہے ہر ایک کی سننے والا ہر ایک کو جاننے والا، اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا مکمل فرماں بردار بنالے اور ہماری نسل سے بھی ایسی امت پیدا کر جو تیری پوری تابع دار ہو اور ہم کو ہماری عبادتوں کے طریقے سکھا دے اور ہماری توبہ قبول فرمالے، بے شک تو ہی ہے معاف کرنے کا خوگر اور بڑی رحمت کا مالک، اور ہمارے پروردگار! ان میں ایک ایسا رسول بھی بھیجنا جو ان ہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاکیزہ بنائے، بے شک تیری اور صرف تیری ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے جس کی حکمت بھی کامل ہے۔''

یہ مقدس نبیوں کی وہ مقدس دعا ہے جو مقدس مقام اور مقدس وقت میں مقدس نبی کے لیے کی گئی کہ دعا کرنے والے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں، اس دعا میں شریک ہو کر

آمین کہنے والے اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام ہیں، جن کے متعلق دعا کی گئی وہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ، دعا قبول کرنے والا خود اللہ تعالیٰ اور گواہی دینے والا کلام اللہ ہے، چناں چہ اس دعا کی قبولیت کا ثمرہ اور اثر صدیوں کے بعد اس طرح ظاہر ہوا کہ نسل ابراہیم علیہ السلام میں جو سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے واسطہ سے چلی اس میں سیدہ آمنہ کے بطن مبارک سے اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ﷺ کا ظہور ہوا، اس لیے حضور ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

”أَنَا دَعْوَةُ إِبْرَاهِيمَ وَبَشَارَةُ عِيسٰى وَرُؤْيَا أُمِّيْ“. (مشکوٰۃ/ص:۵۱۳)

”میں اپنے والد روحانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ بی بی آمنہ کے خواب کی تعبیر ہوں۔“

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہُویدا
دعائے خلیل و نوید مسیحا

﴿مِنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ کی وضاحت:

فرمایا:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ﴾

”تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا (آخری) رسول آیا جو تم ہی میں سے ہے۔“ یہاں بطورِ خاص اصلاحِ عقیدہ کے لیے جس لفظ پر غور کرنا ہے وہ لفظ ﴿مِنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ ہے، اس لفظ کو اگر جمہور کی قرأت کے مطابق ”فا“ کے پیش کے ساتھ پڑھیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ وہ آنے والا اللہ کا آخری رسول کوئی اجنبی اور الگ جنس (نوری یا ناری میں سے) نہیں، بلکہ جنس بشر سے ہے، بشریت اور انسانیت کے تمام لوازمات وخصوصیات کا بھی پابند ہے؛ کیوں کہ اسے انسانیت کے لیے نمونہ بننا ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے اسے انسانوں ہی میں سے انسانِ کامل بنا کر مبعوث فرمایا، اب جسے بھی حقیقی معنیٰ میں انسان بننا ہو وہ اُس انسانِ کامل کا اتباع اور اسوہ اختیار کرے۔

لیکن اگر اس لفظ کو قرأتِ شاذّہ کے مطابق ﴿مِنْ أَنْفَسِكُمْ﴾ "فا" کے زبر کے ساتھ پڑھیں تو معنیٰ ہوں گے کہ وہ آنے والا اللہ تعالیٰ کا آخری رسول انسانیت کے افضل ترین طبقہ اور بہترین خاندان میں سے سب سے افضل واشرف بشر ہے، تو اس میں بھی کوئی شبہ کی قطعاً گنجائش نہیں، آپ ﷺ کی شان تو بلند و بالا ہے ہی، خاندان بھی بہت ہی عمدہ واعلیٰ ہے، شرافت، سیادت اور عفت جس کی پہچان ہے، آپ ﷺ کے تو آباء واجداد میں بھی اوپر سے نیچے تک کسی کا دامن عفت کبھی داغدار نہ ہوا، سب کے سب پاکباز ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس آیت کریمہ کو تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا:

"أَنَا أَنْفَسُكُمْ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَّحَسَبًا، لَيْسَ فِيْ آبَائِيْ مِنْ لَدُنْ آدَمَ سِفَاحٌ، كُلُّنَا نِكَاحٌ". (رواهُ ابن مردويه عن أنس، زرقاني شرح مواهب اللدنية: ۱/۶۷، سيرة المصطفىٰ: ۱/۱۳)

میں باعتبارِ خاندان اور باعتبارِ حسب نسب (بحمد اللہ) تم سب سے بہتر ہوں، میرے آباء واجداد میں حضرت آدم علیہ السلام سے عبداللہ تک کہیں زنا نہیں ہوا، سبھی کے نکاح ہوئے، ہمارے آباء واجداد اور امہات وجدات میں سب کے سب محصنین ومحصنات اور عفیف و پاکدامن ہیں، ان میں کوئی فرد کبھی زنا میں مبتلا نہیں ہوا، پھر یہ وہ حقائق ہیں جن سے اہل مکہ خوب اچھی طرح واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ شاہِ حبشہ کے سامنے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اور شاہِ کسریٰ کے سامنے حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ فِيْنَا رَسُوْلًا مِنَّا نَعْرِفُ نَسَبَهٗ وَصِفَتَهٗ وَمَدْخَلَهٗ وَمَخْرَجَهٗ وَصِدْقَهٗ وَأَمَانَتَهٗ". (ابن كثير: ۲/۴۰۳)

"حق تعالیٰ نے ہم میں ایک رسول مبعوث فرمایا جو ہم ہی میں سے ہے، ہم اس کے حسب ونسب اور حالات کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں، ہم اس کی سچائی وامانتداری سے

بھی اچھی طرح واقف ہیں۔‘‘ مطلب یہ ہے کہ صرف آپ ﷺ کا مرتبہ ومقام ہی بلند و بالا نہیں، بلکہ خاندان اور حسب نسب بھی نہایت اعلیٰ ہے، جیسا کہ لفظ ”مِنْ أَنْفَسِكُمْ“ سے اس طرف اشارہ ملتا ہے، آپ ﷺ کی شان میں کیا خوب کہا گیا ہے:

بعد خدا ہر ایک سے افضل — اشرف واکمل اطیب واجمل
اصدق واعدل اجود واحکم — صلی اللّٰہ علیہ وسلم

﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾

آگے آپ ﷺ کی دیگر صفات اور خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ آپ ﷺ کے قلب اطہر کا حال یہ ہے کہ تمہاری تکلیف آپ ﷺ پر نہایت شاق گذرتی ہے، آپ ﷺ کا حساس دل تمہاری دینی، دنیوی اور اخروی دقت اور دشواری کو فوراً محسوس کر لیتا ہے، اور پھر اس سے تمہیں نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، سیرۃ النبی ﷺ میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً دیکھئے! شب معراج میں جس وقت پچاس نمازوں کا عطیہ لے کر آپ ﷺ خوشی خوشی واپس تشریف لا رہے تھے تو اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے امت کی دینی دشواری کی طرف توجہ دلائی کہ حضور! آپ کے لیے دن رات میں پچاس نمازیں پڑھنا یقیناً دشوار نہیں ہے، آپ کے کمالِ عبدیت اور شوقِ عبادت کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ مگر سوال آپ کی امت کا ہے:

”إِنَّ أُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ“ (بخاری، مشکوٰۃ/ص:۵۲۸/باب المعراج)

آپ کی امت میں اس کی سکت اور طاقت کہاں؟ آپ کی امت کو دن رات کی پچاس نمازوں سے دقت ہوگی، بس جیسے ہی امت کی دشواری کا خیال آیا اسی وقت اُس پاک صفت کا ظہور ہوا جو ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ میں بیان کی گئی، فوراً بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوئے اور امت کی سہولت کے خاطر تخفیف کی بار بار درخواست کی، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے پچاس سے پانچ نمازیں فرض فرما دیں، اور ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ ”محبوبم! اپنی امت کے وفا

داروں کو بتلا دو کہ جو بھی ایمان واحتساب کی کیفیت (یعنی اخلاص واستقامت اور اتباعِ سنت کی رعایت) کے ساتھ ان پانچ نمازوں کو ادا کرے گا اسے پانچ نمازوں کا ثواب پچاس کے برابر دیا جائے گا۔ (حوالۂ سابقہ)

یہ ایک نمونہ ہے آپ ﷺ کی صفت ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ کا۔

(۲) اسی طرح ۸ھ میں جس وقت آپ ﷺ ۱۰/ رمضان المبارک کو دس ہزار قدوسیوں کے لشکر ظفر پیکر کے ہمراہ فتح مکہ کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تو آپ ﷺ اور اصحابِ رسول ﷺ روزہ سے تھے، روزہ بھی نماز کی طرح آپ ﷺ کا پسندیدہ عمل تھا، اسی لیے رمضان کے علاوہ ہر ماہ ایامِ بیض کے روزے، اسی طرح عموماً ہر پیر اور جمعرات کا روزہ آپ ﷺ کا معمولِ مقدس تھا، اس وجہ سے آپ ﷺ کے لیے سفر وحضر میں روزہ رکھنا بہر حال آسان تھا، مگر دورانِ سفر جب آپ ﷺ مقام کدید پہنچے تو آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ دورانِ سفر روزہ رکھنا الحمد للہ میرے لیے آسان ہے، لیکن میری امت کے عام لوگوں کو اس سے دشواری ہوگی، امت کو اس دشواری سے بچانے کے لیے آپ ﷺ نے دورانِ سفر روزہ کی حالت میں پانی منگوایا، اور دست مبارک بلند کرکے لوگوں کو دکھا کر پانی پیا اور افطار فرمایا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی آپ ﷺ کی اقتدا میں روزہ افطار کرلیا۔ (سیرۃ المصطفیٰ/ص:۱۷۶)

ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا یہ عمل بھی امت کو دینی دشواری ومشقت سے بچانے کے خاطر تھا؛ کیوں کہ امت کی مشقت آپ ﷺ پر نہایت شاق گذرتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾

دشمنوں کے حق میں ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ کا ظہور:

اس موقع پر اگر مزید غور کیا جائے تو ایک اور نکتہ واضح ہوگا کہ لفظ ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ میں رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کی پاکیزہ صفت اور خصلت کا تذکرہ

عمومیت کے ساتھ فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بلا کسی فرق وامتیاز کے ہر کسی کی تکلیف کو آپ ﷺ اپنی تکلیف سمجھتے تھے، کیا اپنے اور کیا پرائے، کیا مومن اور کیا کافر، کیا دوست اور کیا دشمن، آپ ﷺ کسی کو کسی تکلیف میں دیکھنا گوارا نہ فرماتے، حتیٰ کہ آپ ﷺ کو ستانے اور تکلیف پہنچانے والے بھی جب تکلیف میں مبتلا ہوئے تو انہیں بھی اس دنیوی تکلیف سے نجات دلانے کی آپ ﷺ نے فکر فرمائی، سیرۃ النبی ﷺ میں اس کی بھی کئی مثالیں ملتی ہیں:

مثلاً جب ۱۳ نبوی ۲۷/ صفر بروزِ پنجشنبہ مطابق: ۱۲/ دسمبر ۶۲۱ء کو مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی، تو اس کے بعد مکہ والوں پر سخت قحط کی شکل میں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا، قحط اس شدت کا تھا کہ بھوک کی وجہ سے مکہ کے کافروں کی بینائی کمزور ہوگئی، اس موقع پر قریش مکہ کے ایک سردار ابوسفیان جو اس وقت مسلمان نہ ہوئے تھے اور آپ ﷺ کی دشمنی میں پیش پیش تھے، مگر قحط سالی نے انہیں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے پر مجبور کیا؛ کیوں کہ آپ ﷺ کے اخلاقِ کریمانہ واوصافِ جمیلہ سے سبھی اچھی طرح واقف تھے، اس لیے حاضر ہوکر اپنی عاجزی وبے بسی کا اظہار کرتے ہوئے عرض کرنے لگے کہ آپ ہمیشہ اپنوں اور پرایوں کے ساتھ بلا کسی فرق کے احسان اور صلہ رحمی کی تعلیم وتاکید کرتے رہے ہیں، یہ وقت ہمارے لیے تکلیف دہ ہے، پھر ہم آپ کے قرابتی بھی ہیں، لہٰذا احسان کیجئے اور صلہ رحمی کا معاملہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے ہمیں اس شدید قحط سے نجات دلائیے۔

صاحبو! قربان جائیے اس رسولِ کریم اور رؤف رحیم ﷺ پر، جس پر دشمنوں کو بھی یہ یقین تھا کہ آپ ﷺ کا کام تکلیف پہنچانا نہیں، تکلیف سے نجات دلانا ہے۔

پڑھیئے گا درود اس پر وہ جس نے کہ دشمن کو
خنجر سے نہیں مارا اخلاق سے مارا ہے

آپ ﷺ نے اپنے جانی دشمنوں کو اس قحط سالی سے نجات دلانے کے لیے سردارِ نجد ثمامہ بن اُثال کو حکم بھیجا کہ فوراً مکہ غلہ پہنچانے کا انتظام کیا جائے، تعمیل حکم میں مکہ غلہ روانہ کیا گیا، جس کے بعد اہل مکہ کو اس تکلیف سے نجات ملی۔ (رحمۃ للعالمین: ۴/ ۶۷)

سیرۃ النبی ﷺ کا یہ واقعہ بھی آپ ﷺ کی صفت ﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ کا ایک بے مثال نمونہ ہے، سیرۃ النبی ﷺ میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن سے آپ ﷺ کا ہر ایک کے حق میں رقیق القلب اور کریم النفس ہونا ثابت ہوتا ہے۔

﴿حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ﴾ کا ثبوت:

یہ اسی کا اثر تھا کہ ایک طرف تو آپ ﷺ امت کو دینی، دنیوی اور اخروی مصائب سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش فرماتے، تو دوسری طرف آپ ﷺ کو امت کے لیے دینی، دنیوی اور اخروی منافع کی بڑی خواہش بھی تھی، اسی کو فرمایا: ﴿حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ﴾ آپ ﷺ اپنی فرطِ شفقت ورحمت سے تمہاری منفعت کے بڑے حریص اور خواہش مند ہیں، اس سلسلہ میں آپ ﷺ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ تمام بنی نوعِ انسان ایمان قبول کرلیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور غصہ سے بچ جائیں اور جہنم سے بچ کر حقیقی نفع اور دارین میں فوز وفلاح کے حقدار بن جائیں، اس کے لیے آپ ﷺ نے نہایت ہمت وحکمت کے ساتھ مسلسل محنت وکوشش کی اور دین کی دعوت دی، جس کو حدیث مذکور میں ایک مؤثر مثال سے سمجھایا گیا، اس سے آپ ﷺ کا منتہائے نظر اپنی قوم کے ایمان کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، اس کے ثبوت میں سیرۃ النبی ﷺ کا ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے:

عتبہ بن ربیعہ کا شمار رؤساءِ قریش میں ہوتا تھا، جاہلیت کے سردار اور صاحب الرائے تھے، ابتداءِ اسلام میں جب آپ ﷺ نے لوگوں کو دین کی دعوت دی اور سعادت مندوں نے اسے قبول کیا اور دن بدن مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی، تو جہلاءِ عرب کو یہ بات ناگوار گذری، انہوں نے اس بارے میں مفاہمت اور بات چیت کے لیے عتبہ بن ربیعہ کو

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، خانۂ کعبہ کے ایک گوشہ میں عتبہ نے رحمت عالم ﷺ سے کہا کہ ”بھتیجے! جو طریقہ اور دین تم لائے ہو اس سے تمہارا مطلوب مال و دولت ہے تو وہ ہم تمہارے لیے اتنا اکٹھا کر دیں گے کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے، اور اگر اس سے تمہارا مقصود عزت وشہرت ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار (بلا کسی الیکشن کے) تسلیم کرلیں گے، پھر کوئی فیصلہ تمہاری مرضی کے بغیر نہیں کریں گے، اور اگر یہ سب باتیں آسیب اور جن کے اثرات سے آپ کرتے ہیں تو اس کے لیے ہم معالجین فراہم کر سکتے ہیں اور تمہارے علاج پر پوری فیاضی کے ساتھ خرچ کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ آپ کو نجاتِ کامل حاصل ہو جائے۔“ جب عتبہ نے اپنی بات مکمل کرلی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے ابو الولید! مجھ کو نہ تمہارا مال و دولت درکار ہے، نہ تمہاری حکومت وریاست کی طمع ہے، میں تو اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، مجھے حق تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کے لیے کتابِ ہدایت دے کر مبعوث فرمایا ہے، تاکہ میں تمہیں (تمہارے دینی، دنیوی اور اخروی نفع کے خاطر) اس کے وعدوں کی بشارت سناؤں اور وعیدوں سے ڈراؤں، اگر تم میری دعوت وہدایت کو قبول کرلو تو وہ تمہارے لیے سعادتِ دارین اور فلاحِ کونین کا باعث ہے اور اگر تم نہ مانو تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرمائے۔“ اس کے بعد آپ ﷺ نے سورۂ (حم السجدہ کی ابتدائی آیتیں تلاوت فرمائیں:

﴿حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾

ان آیتوں میں عتبہ کی زبانی قریش کی جانب سے پیش کی ہوئی باتوں کا جواب تھا، اس کا اثر عتبہ پر اس قدر ہوا کہ وہ ایمان تو نہ لایا، مگر اپنے رفقاء کے پاس آکر کہنے لگا: ”اگر تم میرا کہنا مانو تو محمد کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اللہ کی قسم! جو کلام ان سے میں سن کر آیا ہوں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عنقریب اس کی ایک شان ہوگی۔“ (سیرۃ المصطفیٰ/ص:۱۸۷)

غرض! اس واقعہ سے بھی واضح ہوگیا کہ آپ ﷺ کی محنتوں اور کوششوں کا مقصد

یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کا دین دنیا میں عام ہو جائے، اور تمام ہی بنی نوعِ انسان اسے قبول کر کے سعادتِ ابدی کے حقدار بن جائیں، خود حق تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اس کی گواہی دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ (یوسف:۱۰۳)

''محبوبم! بہت سے بد بخت آپ کی دعوت کے باوجود ایمان لانے والے نہیں، اگر چہ آپ کو ان کے ایمان لے آنے کی بڑی حرص ہے۔'' واقعی انسانیت کی منفعت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہی خواہش مند تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے نام جو کچھ احکامات، پیغامات اور ہدایات پیش فرمائیں وہ بھی دینی، دنیوی اور اخروی نفع ہی کے خاطر تھیں، اسی کو لفظ ﴿حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ﴾ میں بیان فرمایا گیا۔

﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾

آگے قرآنِ کریم میں ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ سے اس حقیقت کی وضاحت فرمائی کہ یوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوقِ خدا کی منفعت عامہ کے بلا کسی فرق کے بڑے ہی طالب، شائق اور خواہش مند ہیں، مگر اہل ایمان کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت بدرجۂ اتم واکمل ہے، اہل ایمان کے لیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت ہی مہربان اور شفیق ہیں، باپ سے زیادہ شفیق اور ماں سے زیادہ مہربان ہیں۔

اس کا اندازہ حدیث پاک کے ایک واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مقدس ومبارک مجلس میں حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں وہ آیت کریمہ پڑھی جس میں فرمایا گیا کہ آپ قیامت کے دن اپنی امت کے متعلق بارگاہِ رب البیت میں عرض کریں گے:

﴿رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ ج فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ج وَمَنْ عَصَانِي

فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (إبراهيم : ٣٦)

''ربِ کریم! یہ بت بہت سے لوگوں کی گمراہی کا سبب بنے ہیں، بس ان لوگوں میں سے جنہوں نے میری اطاعت قبول کی وہ میرے اپنے اور میرے تابعدار ہیں اور جنہوں نے میرا کہنا نہ مانا تو (ان کا معاملہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں) آپ بہت بخشنے والے مہربان ہیں۔'' پھر آپ ﷺ نے اسی سلسلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہ آیت کریمہ پڑھی جس میں یہ بیان ہے کہ آپ قیامت کے دن اپنی امت کے حق میں اللہ رب العزت سے عرض کریں گے:

﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ج وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (المائدة : ١١٨)

''الٰہی! اگر تو ان کو عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو بہرحال وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو انہیں معاف کر دے تو یقیناً تیرا اقتدار بھی کامل ہے حکمت بھی کامل۔''

اس کے بعد حدیث میں ہے کہ ''فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ:'' آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور جھولی پھیلا کر عرض کیا: ''اَللّٰهُمَّ أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ وَبَكىٰ'' یا اللہ! میری امت کو بخش دے، میری امت پر رحم فرما، دعا کے دوران اس خوف سے آپ ﷺ پر رقت طاری ہوگئی اور آنکھیں بہہ پڑیں کہ کیا معلوم قیامت کے دن میری امت کا کیا حشر ہوگا؟ جب رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو اشکبار دیکھا تو آپ ﷺ کی دلجوئی اور اپنی عنایت ورحمت کے اظہار کے خاطر (جاننے کے باوجود) حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کو بھیجا کہ جا کر رونے کی وجہ دریافت کرو! حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور رونے کا سبب دریافت کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جبرئیل! میری امت کے گناہ گار یاد آگئے کہ قیامت میں ان کا کیا ہوگا؟ جبرئیل علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں وجہ بتلائی، تو ارشادِ عالی ہوا: جبرئیل جلدی جاؤ اور یہ بشارت سنا دو:

''إِنَّا سَنُرْضِيكَ فِيْ أُمَّتِكَ وَلَا نَسُوْءُكَ''. (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص:۴۸۹/

باب الحوض والشفاعة/ الفصل الأول، حديث قدسی نمبر : ۸)
''محبوبم! بالیقین ہم آپ کو آپ کی امت (مسلمہ) کے بارے میں راضی کردیں گے اور آپ کو غمگین نہ کریں گے۔'' قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴾ (الضحى : ۵)

''اور آپ کو آپ کا پروردگار اس قدر دے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔'' اس وعدۂ الٰہی کا ظہور جب قیامت کے دن ہوگا تو بعض روایتوں میں آتا ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک میری امت (مسلمہ) کے ایک ایک فرد کو بخش نہ دیا جائے گا۔'' سبحان اللہ!

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم اتباعِ کامل کے ذریعہ اپنے آپ کو حضور ﷺ کا امتی ثابت کردیں تو ان شاء اللہ العزیز نجات کے لیے اتنا بھی کافی ہوسکتا ہے، اور ہمارے لیے اس سے بڑی سعادت کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے کسی استحقاق کے بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ ﷺ کے امتی ہیں، بس ضرورت صرف اتنی ہے کہ ہم اور آپ صحیح معنیٰ میں اپنے آپ کو حضور ﷺ کا امتی بنادیں۔

خاکِ او باش، و بادشاہی کُن
آنِ او باش، و ہرچہ خواہی کُن

حق تعالیٰ اپنے اس مقدس اور معظم گھر اور مطاف کی برکت سے ہمیں اور ہمارے اہل وعیال اور ہماری نسلوں کو اپنا بنالیں، محروم نہ فرمائیں اور اپنے رسول ﷺ کی پاکیزہ سیرت وشریعت کا اتباعِ کامل نصیب فرما کر سعادتِ دارین کا ابدی مالک بنادیں۔ آمین۔

۹/ ربیع الثانی/ ۱۴۳۳ھ
مطابق: ۲/ مارچ/ ۲۰۱۱ء/ قبل الجمعۃ

فی مکة المکرمة بالمسجد الحرام فی المطاف
'' اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ اَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''

(۳۸)

دنیوی زندگی کی حقیقت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: " اَلدُّنۡیَا سِجۡنُ الۡمُؤۡمِنِ وَجَنَّۃُ الۡکَافِرِ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ/ص:۴۳۹)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ ’’دنیا مومن کے لیے (بمنزلۂ) قید خانہ ہے اور کافر کے لیے (بمنزلۂ) جنت‘‘۔

دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہونے کی وجہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا فانی اور اس کی زندگی عارضی ہے، اور اس فانی دنیا میں عارضی زندگی گذارنے والے انسانوں کی مجموعی طور پر دو قسمیں ہیں:

(۱) جو لوگ دنیا کی حقیقت سے باخبر ہوگئے وہ قانونِ الٰہی یعنی شریعت اسلامیہ کی پابندی والی زندگی گذارتے ہیں۔

(۲) اس کے برخلاف جو لوگ دنیا کی حقیقت سے صحیح معنیٰ میں غافل ہیں وہ آزادی والی زندگی گذارتے ہیں۔ انہیں قانونِ الٰہی اور شریعت اسلامیہ کا کوئی پاس ولحاظ نہیں ہوتا، پہلی قسم کے لوگ جو قانونِ الٰہی کی پابندی والی زندگی گذارتے ہیں درحقیقت وہی

مومن ہیں، اور جو آزادی والی زندگی گذارتے ہیں وہ کافر ہیں؛ کیوں کہ دنیا میں شرعی اور پابندی والی زندگی مومنانہ ہے اور غیر شرعی وآزادی والی زندگی کافرانہ ہے، اسی وجہ سے حدیث پاک میں بڑی جامعیت کے ساتھ دنیوی زندگی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اس کو "سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ" فرمایا گیا کہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔

علماءِ محدثین نے اس حدیث کی جامعیت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ دنیوی زندگی کو مومن کے لیے قید خانہ سے جو تشبیہ دی گئی اس کی کئی وجوہات ہیں: مثلاً پہلی وجہ یہ ہے کہ جس طرح قید خانہ میں قیدی قانون کا پابند ہوتا ہے اسی طرح مومن دنیا میں قانونِ الٰہی کا پابند ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ قیدی جو قانون کی پابندی کرتا ہے وہ اس کی مجبوری ہے، جب کہ مومن قانونِ الٰہی کی جو پابندی کرتا ہے وہ مجبوری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنی مرضی سے رضاءِ الٰہی حاصل کرنے کی غرض سے کرتا ہے۔ علاوہ ازیں قید خانہ میں قیدی اپنی زندگی میں آزاد نہیں ہوتا، بلکہ وہ کھانے پینے میں، کہیں آنے جانے میں، حتیٰ کہ کپڑے پہننے اور سونے اٹھنے میں، غرض ہر حال میں قانون کا پابند ہوتا ہے، قید خانہ میں اپنی مرضی نہیں چلتی، قیدی کو چار و ناچار ہر معاملہ میں قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے، تو ذرا سے فرق کے ساتھ یہی حال دنیوی زندگی میں ایک مومن کا ہوتا ہے، وہ دنیوی زندگی میں شرعی حدود وقیود کا پابند بنایا گیا ہے، فرمایا:

﴿وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۷)

آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے اپنا ایک قانون بیان فرما دیا کہ "اور رسول جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔" اس قانونِ الٰہی کی پابندی کی وجہ سے وہ آزادانہ زندگی نہیں گذارتا، اس لیے فرمایا: "اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ" بخلاف کافر، کہ اس نے حکم الٰہی اور قانونِ شرعی کو قبول ہی نہیں کیا، لہٰذا وہ کھانے پینے، رہنے سہنے، کمانے اور زندگی گذارنے میں پوری طرح بظاہر آزاد ہوتا ہے، لہٰذا یہ دنیا کی آزادانہ

زندگی اس کے حق میں جنت ہے، اس وجہ سے فرمایا: ''وَجَنَّةُ الْكَافِرِ''.

قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

﴿ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾

''جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے ان کے لیے دنیوی زندگی بڑی دل کش بنا دی گئی ہے، اور وہ اہل ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں، حالاں کہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا وہ قیامت کے دِن ان سے کہیں زیادہ بلند ہوں گے۔''

اسی کو دانائے رومؒ نے یوں تعبیر فرمایا:

ہست دنیا جنت آں کفار را
اہل فسق وظلم آں اشرار را
بہر مومن ہست زنداں ایں مقام
نیست آں جائے عیش واحتشام

یہ دنیا کافروں، فاسقوں اور شریروں کے لیے جنت ہے؛ کیوں کہ انہوں نے حکم الٰہی اور قانونِ شرعی سے اپنے آپ کو آزاد رکھا ہے، جب کہ مومن اس کا پابند ہوتا ہے، اس لیے مومن کے لیے دنیوی زندگی قید خانہ ہے، اور قید خانہ عیش وعشرت اور حشمت کی جگہ نہیں ہے۔

صاحبو! پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جو مومن دنیوی زندگی کی حقیقت کو سمجھ کر نفسانی خواہشات کو ربانی مرضیات پر قربان کر دیتا ہے وہ ہر حال میں اپنے خالق کی مرضی کا خیال رکھتا ہے، اس کے ہر حکم کا پابند رہتا ہے، تو اس کا خالق ومالک اس کو دنیوی پابندی کے نتیجہ میں اخروی پابندی سے نجات عطا کرتا ہے؛ کیوں کہ حق تعالیٰ نے مومن کو دنیا کے قید خانہ میں کسی گناہ کی سزا کے لیے نہیں بھیجا، بلکہ اس کے کمالات ظاہر کرنے اور درجات بلند کرنے کے

لیے بھیجا ہے، جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ معاملہ ہوا، حق تعالیٰ نے بھی مومن کے لیے دنیا کو قید خانہ اس لیے بنا دیا تا کہ اسے آخرت کے قید خانہ سے نجات مل جائے، اس کی تائید اس حدیث شریف سے ہوتی ہے، جس میں فرمایا گیا: "لَیْسَ عَلَیْهَا عَذَابٌ فِی الْآخِرَةِ". (أبو داوٗد، مشکوٰة/ص: ٤٦٠)

قیدی کو قید خانہ میں مشقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں تو مومن کو دنیا میں مصائب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قید خانہ مصیبت اور مشقت کی جگہ ہے، یہی وجہ ہے کہ خود شریعت مطہرہ میں تادیب اور تعزیر کا ایک ذریعہ "قید وحبس" کو بھی تسلیم کیا گیا ہے، چناں چہ قرآنِ کریم نے راہزنی کی ایک سزا "نَفْيُ الْأَرْضِ" (مائدہ:۳۳) بتائی ہے، تو حنفیہ کے یہاں اس سے سزائے قید مراد ہے۔ (بدائع: ۷/ ۹۵) رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی یہ سزا بعض حضرات کو دی گئی ہے، عام طور پر ایسے قیدیوں کو ستون سے باندھ دیا جاتا تھا؛ کیوں کہ عہد نبوی میں باضابطہ کوئی قید خانہ نہ تھا، یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اولیات میں سے ہے کہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں چار ہزار درہم میں ایک مکان خرید کر اس کو مستقل جیل بنا دیا تھا۔ (الفاروق: ۲/ ۳۰۷ علامہ شبلی نعمانیؒ ، از: قاموس الفقہ: ۴/ ۱۳۸)

غرض! قید خانہ مشقت اور مصیبت کی جگہ ہے، تو جس طرح قید خانہ میں قیدی کو قید وبند کی اور طرح طرح کی صعوبتیں ومشقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اسی طرح مومن کو بھی خصوصیت کے ساتھ اس دنیا میں طرح طرح کے مصائب وشدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

﴿أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُوْلُوا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ﴾ (العنکبوت:۲)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا کہ بس وہ یہ کہہ دیں کہ "ہم ایمان لے آئے" اور ان کو آزمایا نہ جائے؟" یعنی دنیوی زندگی میں دعوئے

ایمان کے بعد اہل ایمان کو مختلف حالات ومصائب سے گذرنا ہوگا۔ یوں دنیوی زندگانی کا حال تو یہ ہے:

دریں دنیا کسے بے غم نہ باشد
اگر باشد بنی آدم نہ باشد

دنیا میں حالات تو سبھی پر آتے ہیں، مگر اہل ایمان پر زیادہ حالات وامتحانات آتے ہیں، ''امتحان عاشق کا ہوتا ہے، منافق کا نہیں۔'' اس لیے جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے عاشق ہیں انہیں دنیوی حالات کے علاوہ طاعات وعبادات کی مشقتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں، نفسانی خواہشات کو روک کر منکرات ومنہیات سے بھی اپنے آپ کو بچانا ہوتا ہے اور اس میں جو مشقتیں آئیں انہیں جھیلنا ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ مومن اپنے آپ کو دنیا کی ناجائز لذتوں میں مشغول نہیں کرتا، بلکہ ان سے اپنے آپ کو بچاتا ہے اور اس میں آنے والی سختیوں کو برداشت کرتا ہے، اس لیے یہ دنیا اس کے لیے قید خانہ کی مانند ہے، جب کہ کافر یہاں کی ہر لذت میں مشغول رہنا چاہتا ہے، اس لحاظ سے دنیا اس کے لیے جنت کے مانند ہے۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ جس (مومن) نے دنیا کی (ناجائز) لذتوں کو چھوڑا اس کے لیے یہ قید خانہ ہے، اور جس نے یہاں کی (ناجائز) لذتوں کو نہ چھوڑا، پھر اس کے لیے یہ قید خانہ کہاں ہے۔ گویا حقیقت کو سمجھانے کے لیے فرمایا: ''اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ'' اس کے برخلاف کافر طاعات وعبادات کی مشقتوں سے آزاد اور نفسانی خواہشات ولذات والی زندگی گذارتا ہے، اس اعتبار سے اس کے لیے دنیوی زندگی کو ''جَنَّةُ الْكَافِرِ'' بتلایا، اس فرمانِ مبارک کے مطابق اگر اہل ایمان دنیوی زندگی کی اس حیثیت کو مدنظر رکھیں تو پھر ان شاء اللہ حالات کی شکایتیں بھی ختم ہوجائیں گی؛ کیوں کہ قید خانہ میں قیدی کو حالات ومصائب کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے، جب دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے تو یہاں مومن کو بھی

حالات ومصائب کا سامنا کرنا پڑے گا، موت کے بعد ہر مومن کو اس قید خانہ سے چھٹکارا اور سارے حالات ومصائب سے نجات مل جائے گی، ان شاء اللہ۔ اور یہی فرق ہے مومن اور کافر میں کہ مومن موت کے بعد حالات سے نجات پائے گا، جب کہ کافر موت کے بعد بھی حالات سے نجات نہیں پائے گا، بلکہ اور زیادہ حالات میں مبتلا ہوگا۔

مومن دنیا کو ایسے ہی ناپسند کرتا ہے جیسے قیدی قید خانہ کو:

تیسری وجہ یہ ہے کہ مومن دنیا کو ایسے ہی ناپسند کرتا ہے جس طرح قیدی قید خانہ کو، قید خانہ میں بود وباش یعنی رہنا سہنا کوئی عقلمند پسند نہیں کرتا، اگر کسی وجہ سے قید خانہ میں رہنے کی نوبت آ گئی (العیاذ باللہ بالعظیم) تو قیدی کا اس میں جی نہیں لگتا، وہ قید خانہ کو اپنا گھر بھی نہیں سمجھتا، بلکہ ہر وقت اس سے نکلنے اور رہائی پانے کی خواہش اور کوشش کرتا ہے۔ چوں کہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے: "اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ" اور ایک باخبر وباتوفیق مومن دنیا کی دنائت اور اس کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے، اس لیے ایک سچا پکا مومن بھی اس فانی دنیا سے جی نہیں لگاتا، اس کے عیش وعشرت اور راحت ولذت کو اپنا مطلوب ومقصود نہیں بناتا، اس کا مطمحِ نظر آخرت ہوتی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا دل لگانے کے لائق ہے بھی نہیں، اسی لیے کہتے ہیں:

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے، تماشہ نہیں ہے

اور جو لوگ اس قید خانہ کو عیش کدہ سمجھ بیٹھے ہیں انہیں علامہ اقبالؒ نے کہا:

اس سرابِ رنگ وبو کو گلستاں سمجھتا ہے تو
اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھتا ہے تو

قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ﴾ (آل عمران: ۱۹۶)

’’دنیا میں کافروں کا آزادی سے رہنا سہنا اور گھومنا پھرنا کہیں تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے۔‘‘ ان کی یہ بہار اور آزادی چند دنوں کی ہے، دنیا کا سرمایہ بہت ہی تھوڑا ہے اور اس کی چمک دمک نہایت ہی مختصر ہے، لہٰذا ان کی طرح اس میں مشغول مت ہو جانا، اس کی حقیقت کو بھول مت جانا، اس کے عیش وعشرت کو اپنا مطلوب مت بنا لینا؛ کیوں کہ اس دنیا کے عیش وعشرت اور مال ومتاع کا کوئی بھروسہ بھی نہیں۔

قرآنِ کریم نے دنیا کی مثال پانی سے دی۔

اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے قرآنِ کریم نے دنیوی زندگی کی مثال پانی سے دی ہے:

﴿وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ﴾ (الکھف: ۴۵)

’’اور ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی یہ مثال بھی بیان کر دو کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا۔‘‘ حدیث شریف میں دنیا کو قید خانہ سے اور قرآن میں پانی سے تشبیہ دی گئی۔ علماء فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حیاتِ دنیا کو پانی سے اس لیے تشبیہ دی کہ دنیا اور پانی میں کئی طرح سے مماثلت پائی جاتی ہے، مثلاً پانی کی صفت وخاصیت ہے کہ وہ ایک جگہ ٹھہرتا نہیں، جہاں بہنے کا موقع ملتا ہے فوراً بہہ جاتا ہے، یہی حال دنیا کا بھی ہے کہ وہ ایک جگہ ٹھہرتی نہیں، موقع ملتے ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہے، کئی لوگوں کے پاس آئی، مگر بالآخر ہاتھ سے نکل گئی، کبھی تو زندگی میں دنیا چھوٹ گئی، یا پھر موت نے دنیا کو چھڑا دیا، پانی کی دوسری صفت یہ بھی ہے کہ جو پانی میں داخل ہوتا ہے وہ ضرور تر ہو کے رہتا ہے، یہی حال دنیا کا بھی ہے کہ جو شخص دنیا میں گھستا ہے، یا جس دل میں دنیا کی محبت داخل ہوتی ہے وہ ضرور اس سے متاثر ہو کے رہتا ہے، اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے کشتی پانی میں، دنیا میں رہنا برا نہیں، دل میں دنیا کو رکھنا برا ہے، دل میں تو اللہ تعالیٰ ہی رہے۔

علاوہ ازیں عاجز کے خیالِ ناقص میں حیاتِ دنیوی کو پانی سے تشبیہ دینے کی ایک

وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پانی زندگی کی ضرورت تو ہے، لیکن مقصد نہیں، اسی طرح دنیا اور اس کے اسباب زندگی کی ضرورت تو ہیں، مگر مومن کے لیے مقصودِ اصلی نہیں۔ ان حقائق کو سمجھانے کے لیے قرآنِ کریم نے دنیا کی مثال پانی سے دی، اس لیے بھی اہل دل دنیا کی ناجائز خواہشات ولذات کو پسند نہیں کرتے، جیسے قیدی قید خانہ کو گھر کے مقابلہ میں پسند نہیں کرتا، ایک سچا مومن بھی آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو پسند نہیں کرتا کہ یہ اس کے لیے قید خانہ ہے۔

ایک عبرتناک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک نہایت عبرتناک واقعہ منقول ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت سالم ایک مرتبہ حرم مکہ مکرمہ میں تشریف لائے، مطاف میں آپ کی ملاقات بادشاہِ وقت ہشام بن عبدالملک سے ہوئی، ہشام نے سلام کے بعد عرض کیا کہ حضرت! کوئی چاہت اور ضرورت ہو تو حکم فرمائیں، تاکہ آپ کی خدمت کی سعادت حاصل ہو سکے، آپ نے فرمایا: ہشام! بیت اللہ میں غیر اللہ کے سامنے حاجت بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے، یہ کہہ کر آپ نے ٹال دیا، جب آپ طواف ونماز وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو ہشام ابن عبدالملک بھی اسی وقت باہر آئے، موقع دیکھ کر پھر قریب آکر عرض کیا: حضرت! اب فرمائیے! کیا خدمت کر سکتا ہوں، آپ نے فرمایا ہشام! بتاؤ! میں تم سے دین کا مطالبہ کروں یا دنیا کا؟ ہشام کو معلوم تھا کہ دین کے معاملہ میں تو آپ میدان کے شہسوار اور وقت کی عظیم ترین ہستی ہیں، لہٰذا عرض کیا: حضرت! آپ مجھ سے دنیا مانگیں، آپ نے فوراً جواب دیا کہ ''دنیا تو میں نے کبھی دنیا کے بنانے والے سے بھی نہیں مانگی، بھلا تم سے کیا مانگوں گا۔'' (البدایہ والنہایہ :۹/ ۲۳۵، بکھرے موتی: ۵/ ۱۵۸)

الغرض! جس طرح ایک قیدی قید خانہ کو ناپسند کرتا ہے بالکل اسی طرح ایک سچا پکا مومن بھی دنیا کو ناپسند کرتا ہے، اس اعتبار سے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ''.

دنیا کی نعمتیں آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

چوتھی عجیب وغریب وجہ علماء نے یہ بیان فرمائی کہ ایک مومن کو اللہ پاک نے اپنے فضل وکرم سے جو کچھ راحتیں اور نعمتیں اس فانی دنیا کی عارضی زندگی میں عطا فرمائی ہیں ان کی حیثیت آخرت کی راحتوں اور نعمتوں کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہے جیسے قید خانہ کا ساز وسامان، آخرت کی جو راحتیں اور نعمتیں ہیں ان کے سامنے دنیا کی راحتیں اور نعمتیں ہیچ ہیں، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ

فَاغْفِرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَةِ

(متفق عليه، مشكوٰة/ص:٤٠٩)

حقیقی عیش وعشرت اور راحت تو بس آخرت ہی میں میسر ہوگی؛ کیوں کہ یہ دنیا تو "سِجْنُ الْمُؤْمِنِ" ہے، یہاں آخرت کے عیش کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، اس کے بالمقابل کافروں کو اس دنیا میں جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے آخرت کے مقابلہ میں وہ بھی ہیچ ہیں، جہنم کے مصائب کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حدیث قدسی ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "يُؤْتٰى بِأَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً، ثُمَّ يُقَالُ: "يَاابْنَ آدَمَ! هَلْ رَأَيْتَ خَيْرًا قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ نَعِيْمٌ قَطُّ؟" فَيَقُوْلُ: "لَا، وَاللّٰهِ يَارَبِّ! وَيُؤْتٰى بِأَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَيُصْبَغُ صَبْغَةً فِي الْجَنَّةِ، فَيُقَالُ لَهٗ: "يَاابْنَ آدَمَ! هَلْ رَأَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ؟ وَهَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةً قَطُّ؟" فَيَقُوْلُ: "لَا، وَاللّٰهِ يَارَبِّ! مَامَرَّبِيْ بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ". (مسلم، مشكوٰة/ص:٥٠٢/ باب صفة النار وأهلها، حديث قدسی نمبر:٩)

"قیامت کے دن دنیا کے سب سے زیادہ عیش والے (کافر) دوزخی کو لایا جائے

گا اور اسے آگ میں ایک مرتبہ غوطہ دے کر پوچھا جائے گا کہ تو نے کبھی (دنیا میں) بھلائی دیکھی تھی؟ یا کوئی نعمت وراحت تجھے ملی تھی؟ وہ کہے گا: واللہ اے میرے رب! کبھی نہیں، پھر دنیا کے سب سے زیادہ شدید مصائب میں مبتلا (مومن) جنتی کو لایا جائے گا اور اسے جنت میں ایک غوطہ دے کر پوچھا جائے گا کہ تو نے کبھی (دنیا میں) تکلیف یا سختی دیکھی تھی؟ وہ کہے گا واللہ اے میرے رب! کبھی نہیں۔''

یعنی آج کے بے ایمان کفار زندگی بھر کی راحت کو آخرت میں عذابِ الٰہی کی ایک جھلک دیکھ کر بھول جائیں گے، جب کہ ایمان والے نعمت الٰہی کی ایک جھلک کو دیکھ کر زندگی بھر کی شدت ومصیبت کو بھول جائیں گے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ایک غریب یہودی نے جب دریافت کیا کہ تمہارے نانا جان نے دنیا کو تمہارے لیے ''سجن'' اور ہمارے لیے ''جنت'' بتایا، تو ان کا یہ قول میرے اور آپ کے حال پر کس طرح صادق آتا ہے؟ اس لیے کہ آپ نعمتوں میں ہیں، جب کہ میں تکلیفوں میں، اس وقت آپ نے یہی جواب دیا کہ بلاشبہ دنیا ہمارے لیے قید خانہ ہی ہے، رہی بات یہاں کی نعمتوں کی تو آخرت کے مقابلہ میں یہ ہیچ ہیں، اور جہاں تک تمہاری تکلیفوں کا معاملہ ہے تو چوں کہ دنیا تمہاری جنت ہے، اس لیے آخرت کے مقابلہ میں یہ تکلیفیں ہیچ ہیں، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں، لہٰذا آخرت کی وہ تکلیفیں جو دنیا کے مقابلہ میں بہت خطرناک ہیں ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے دنیا کی حقیقت کو سمجھ لو اور دنیوی زندگی کے موقع کو غنیمت جان کر آخرت کی تیاری میں اپنے آپ کو مشغول رکھو۔ (مستفاد از: مظاہر حق جدید ج:۵/۶)

دنیا کی حقیقت:

دنیا کی حقیقت کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے:

یہ عالم عیش وعشرت کا، یہ حالت کیف ومستی کی

بلند اپنا تخیل کر، یہ سب باتیں ہیں پستی کی
جہاں در اصل ویرانہ ہے، گو صورت ہے بستی کی
بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خواب ہستی کی

دانائے روم مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

چیست دنیا از خدا غافل بدن ☆ نہ قماش نقرۂ و فرزند و زن

دنیا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے غافل ہوجانے کا نام دنیا ہے، روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ کا نام دنیا نہیں، البتہ یہی ساری چیزیں کسی کو اللہ تعالیٰ اور زندگی کے حقیقی مقصد سے غافل کر دیں تو پھر اس کے حق میں یہ چیزیں دنیا ہیں، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ فرماتے تھے:

"كُلُّ مَا شَغَلَكَ عَنِ اللّٰهِ فَهُوَ صَنَمُكَ".

"جو چیز تمہیں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل اور مشغول کر دے وہی تمہارا بت ہے۔"
(آپ بیتی/حصہ دوم/ص:۵۴)

خلاصۂ کلام یہ کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دے وہ دنیا ہے، اور جو چیز اللہ تعالیٰ کی یاد سے وابستہ رکھے وہ دین ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا کے مکر و فریب سے بچا کر اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

۲۰/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ، قبل الجمعۃ

مطابق: ۱۳/ اپریل/ ۲۰۱۲ء (بزم صدیقی)

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

☆......☆......☆

(۳۹)
موت کی حقیقت اور حکمتیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عُبَادَةَ بۡنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنۡ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ، وَمَنۡ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ". (متفق عليه، مشکوٰة: ۱۳۹)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس کو اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند ہو، تو اللہ تعالیٰ کو بھی اس سے ملنا پسند ہوتا ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات ناگوار ہو، اللہ رب العزت کو بھی اس سے ملنا ناگوار ہوتا ہے۔

موت برحق اور یقینی چیز ہے۔

اللہ جل شانہ کے سوا اس دنیائے دنی میں بقا اور دوام کسی کو حاصل نہیں، اس سرائے فانی میں جو بھی آتا ہے وہ جانے ہی کے لیے آتا ہے، ہمیشہ رہنے والی صرف اور صرف اللہ پاک کی ذات ہے:

﴿كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ ٥ وَيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡإِكۡرَامِ﴾ (الرحمٰن: ۲۶-۲۷)

اس کی ترجمانی کسی نے یوں کی ہے:

ہر صبح کو طائرانِ خوش الحان پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
ذاتِ معبود جاودانی ہے باقی جو کچھ ہے وہ فانی ہے

زمین پر زمانہ سے نوعِ انسانی آباد ہے اور آج بھی لاکھوں کروڑوں نہیں، بلکہ کھربوں انسان اور دیگر مخلوقات اس دنیا میں موجود ہیں، اور دنیا کے سارے انسانوں کا قصہ تقریباً یکساں ہے کہ ہر آنے والا دنیا میں آیا تو بڑوں نے دیکھ بھال کی اور اس کی پرورش ہوئی، پھر ایک مقرر وقت تک وہ زندہ رہا اور بالآخر مرکر پیوند زمین ہو گیا۔

جب سے دنیا وجود میں آئی ہے آنے جانے کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا، ہر آنے والے کو چار و نا چار اپنی مدت اور میعاد پوری کر کے جانا ہی پڑتا ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کو ہر کسی نے تسلیم کیا ہے اور آج تک کسی نے انکار نہیں کیا، کیوں کہ اس دنیا میں موت سے زیادہ قطعی اور یقینی چیز نہ صحت ہے نہ فرصت، نہ مال و دولت ہے، نہ شان و شوکت، نہ حکومت و سلطنت ہے، نہ اولاد و احباب کی کثرت، یہ ساری چیزیں امکانی اور احتمالی ہیں، انتہائی تدبیر اور جد و جہد کے بعد ملنے کا امکان تو ہے، لیکن نہ ملنے کا بھی اندیشہ ہے، جب کہ موت ایک ایسی چیز ہے کہ ہر انسان کو اس کا امکان ہی نہیں، بلکہ ایقان اور اذعان (یقین) ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک میں موت کو یقین سے تعبیر فرمایا:

﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (الحجر: ۹۹)

اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ موت بستر مرگ پر آئے گی یا میدانِ جہاد میں، تنہائی میں آئے گی یا مجمع میں، حالت سفر میں یا اپنے وطن میں، کسی کو کچھ نہیں معلوم، پھر کوئی اس سے بچنا اور بھاگنا چاہے تو یہ ممکن بھی نہیں۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج ان کی، کل اپنی باری ہے

فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِیْكُمْ﴾ (الجمعة : ۸)

عجیب بات یہ ہے کہ انسان موت کی اس حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود موت سے بچنے کی کوشش تو کرتا ہے، مگر جہنم سے بچنے کی کوشش نہیں کرتا، حالاں کہ کوشش کرنے والا جہنم سے تو بچ سکتا ہے، مگر موت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ موت سے بھاگنے والا انسان خود اسی مقام تک جا پہنچے گا جہاں اسے موت آنی ہے۔ کہتے ہیں کراچی میں ایک جگہ پانچ منزلہ عمارت تعمیر ہو رہی تھی، ایک مزدور پانچویں منزل سے نیچے آگرا، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان کہ اسے کچھ بھی نہ ہوا، یہاں تک کہ وہ مزدور نیچے سے اپنی ٹانگوں پر چل کر اوپر جا پہنچا، وہاں اس کے ساتھیوں نے اس کے حیرت انگیز طریقے سے بچ جانے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے مٹھائی کا مطالبہ کیا، ٹھیکہ دار نے اپنی جیب سے پچاس روپے دیے اور کہا کہ مٹھائی لا کر تقسیم کرو، وہ مزدور خوشی خوشی مٹھائی لینے جا رہا تھا کہ سڑک پار کرتے ہوئے اسے ایک گاڑی نے ٹکر ماری اور وہ وہیں مر گیا، اس مزدور کی موت چوں کہ اس وقت ایک دوسری جگہ گاڑی کے ایکسیڈنٹ سے طے شدہ تھی، اس لیے پانچویں منزل سے گرنا بھی اسے کچھ نقصان نہ دے سکا، لیکن عبرت کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے حادثے سے بچ جانے کے باوجود وہ موت سے نہ بچ سکا۔ (از ندائے منبر ومحراب: ۱/ ۳۸۹)

یعنی ''مرتے مرتے بچا، تو بچ بچ کے بھی ضرور مرا۔''

اسی لیے حدیث پاک میں حکم ہے کہ موت کو کبھی نہ بھولو۔

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''أَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ''. (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۱۴۰)

''لذتوں کو ختم کرنے والی چیز موت کو ہمیشہ یاد رکھو۔'' موت برحق ہے اور ضرور

آئے گی، بلکہ دیگر تمام احکام اور موت میں یہی فرق ہے کہ دیگر احکام کو قبول کرنے نہ کرنے کا اختیار ہے، لیکن موت کے متعلق کوئی اختیار نہیں۔

آنے والی کس سے ٹالی جائے گی
جان ٹھہری، جانے والی جائے گی

لہٰذا دانائی اسی میں ہے کہ موت کا نا معلوم وقت آنے سے قبل آج موقع ہے اس کی تیاری کا، جو کچھ تیاری کرنی ہو آج اور ابھی کرنی چاہیے، آئندہ پر نہ ٹالنا چاہیے؛ کیوں کہ موت کے وقت نہ کچھ کر سکتے ہیں، نہ اس سے بچ سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج تک موت کا کوئی دہریہ اور کافر بھی انکار نہ کر سکا، موت کے برحق اور یقینی ہونے کو ہر کسی نے مانا ہے، کسی کو انکار کی مجال نہیں۔

موت کا ٹھیک وقت اور صحیح مقام اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں:

دوسری مسلّم حقیقت یہ ہے کہ موت کا ٹھیک وقت اور صحیح مقام اللہ رب العزت کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں، کون، کب اور کہاں مرے گا؟ یہ کسی کو معلوم نہیں، یہ بھی وہ سچائی ہے جسے آج تک کوئی دہریہ اور کافر بھی نہ جھٹلا سکا، اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ (لقمان: ٣٤)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

عَنْ مَطَرِ بْنِ عُكَامِسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذَا قَضَى اللّٰهُ لِعَبْدٍ أَنْ يَمُوْتَ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهٗ إِلَيْهَا حَاجَةً". (رواه الترمذى، مشكوٰة/ص: ٢٢/ باب الإيمان بالقدر/ الفصل الثانى)

حق تعالیٰ جب کسی بندے کی موت کسی جگہ مقدر فرما دیتے ہیں (جس کا اس بندہ کو بالکل علم نہیں ہوتا) تو اس کے لیے اس زمین میں کوئی (دینی یا دنیوی) حاجت پیدا فرما دیتے ہیں، پھر وہ بندہ بے خبر ہو کر اس ضرورت سے وہاں پہنچ کر لقمۂ اجل بنتا ہے۔ اسی لیے کہتے

ہیں:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں — سامان سو برس کا ہے، پل کی خبر نہیں

اور

ہم نے مانا اجل آئے گی ایک دن — کیا پتہ کہاں روح پرواز ہو؟
دفن ہوگا مقدر میں، ہو جائے گا — ورنہ تربت کا کوئی بھروسہ نہیں

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

سیدنا خالد بن ولید سیف اللہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، جن کی کتابِ زندگی کا سب سے جلی عنوان اور روشن باب جہاد فی سبیل اللہ ہے، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی میں گذرا، ان کے اسی شوقِ جہاد اور بہادرانہ کارناموں کے صلہ میں ان کو دربارِ رسالت ﷺ سے ''سیف اللہ'' کا لقب ملا، تقریباً سوا سو لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے (بال) مبارک ایک ٹوپی میں سلوائے تھے، جس کو پہن کر میدانِ جنگ میں جاتے تھے، شوقِ جہاد میں کہا کرتے تھے کہ ''مجھے میدانِ جنگ کی وہ سخت رات جس میں دشمنوں سے لڑوں اپنی شب زفاف سے زیادہ مرغوب ہے۔'' ساری عمر میدانِ کارزار میں کفار سے تمنائے شہادت میں لڑتے رہے، دعا کرتے تھے کہ ''یا اللہ! میری موت عورتوں کی طرح چارپائی پر نہ ہو، بلکہ ایک مجاہد کی طرح میدانِ جہاد میں جامِ شہادت نوش کرتے ہوئے ہو۔'' لیکن اللہ تعالیٰ کی تلوار کو کون توڑ سکتا ہے؟ اس لیے آپ کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا، جس طرف رخ کرتے آپ کی تلوار دشمن کا شیرازہ بکھیر دیتی اور اس طرح آپ کی آرزوئے شہادت پوری نہ ہوئی، آخری وقت جب اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے تو بڑی حسرت کے ساتھ فرماتے تھے کہ ''افسوس! میری ساری زندگی تو میدانِ جنگ میں گذری اور آج بستر مرگ پر جانور کی طرح ایڑیاں رگڑ کر جان دے رہا ہوں۔'' بالآخر سن ہجری ۲۲ میں مدینہ طیبہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (سیرۃ الصحابہ/ص: ۱۷۰تا۱۷۳، مہاجرین، حصہ دوم)

موت کسی کو مہلت نہیں دیتی۔

تو موت کے متعلق جن حقائق کا قرآن وحدیث میں انکشاف کیا گیا ہے اور جن کا ہر کسی کو اقرار اور اعتراف ہے ان میں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ برحق ہے، دوسری بات یہ کہ موت کا وقت اور مقام کسی کو بھی معلوم نہیں، اور تیسری بات یہ ہے کہ موت اپنے مقرر وقت ہی پر آتی ہے، جس کی موت کا جو وقت اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہے اس میں ذرّہ برابر تقدیم وتاخیر نہیں ہوتی، نہ ایک سیکنڈ آگے، نہ ایک سیکنڈ پیچھے، قرآن کا فرمان ہے:

﴿ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ط إِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴾ (یونس: ٤٩)

موت وقت سے پہلے نہ کسی کو مرنے دیتی ہے اور نہ کسی کو لمحہ بھر کی مہلت دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نصیحت فرمایا کرتے تھے:

"إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ، وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ". (رواه البخاری، مشکوٰۃ/ص: ١٣٩)

''جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو (کیا پتہ صبح تک تم رہو یا نہ رہو) اور جب صبح ہو تو شام کا انتظار نہ کرو (معلوم نہیں کہ شام تک تم زندہ رہوگے یا نہیں) اور تندرستی کی حالت میں بیماری کے لیے اور زندگی میں موت کے لیے کچھ تیاری کرلو؛ کیوں کہ موت کسی کو بھی ذرّہ برابر مہلت نہ دے گی۔''

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود
آں دوا در نفعِ خود گمرہ شود

جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو طبیب کی عقل ماری جاتی ہے، اس کی دوا اور تدبیر اپنے مسلمہ اصول کے بجائے الٹی تاثیر کرتی ہے۔ ہزاروں کوششوں کے باوجود دنیا کا

بہتر سے بہتر ڈاکٹر بھی نہ کسی کی زندگی کو بچا سکتا ہے، نہ بڑھا سکتا ہے، اسی کو فرمایا:
﴿إِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ (یونس:۴۹)

تاریخ ہمیں بتاتی ہے اور ماضی میں ایسا متعدد بار ہوا کہ اچانک پوری کی پوری قوم اس ہنستی کھیلتی زندگی سے محروم ہوگئی، مگر اسے زبان کو جنبش تک دینے کا موقع نہ ملا۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک نہایت عبرت ناک واقعہ ہے کہ یورپ میں حال ہی میں کھدائی کے دوران ایک ایسی پوری قوم کے باقیات ملے ہیں جو سماوی آفت ہی کے نتیجے میں ہلاک ہوئی، اور اتنی تیزی سے کہ جسے لمحہ بھر ہی کہا جا سکتا ہے، اس میں ایک ایسے کمرے کے آثار ملے ہیں جس میں چند افراد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، ان میں سے ایک شخص کا ہاتھ اس کے منھ کے نزدیک ایسے حال میں ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھانا کھا رہا ہے، اس نے نوالہ توڑ تو لیا لیکن ہاتھ منھ تک پہنچنے سے پہلے ہی موت نے اس کو آ پکڑا، اور دنیا کی عبرت کے لیے قدرت نے اسے اسی حال میں محفوظ کر دیا، جسے اب سائنسدانوں نے کھود کر نکالا، یعنی اس شخص کو اتنی بھی مہلت میسر نہ ہو سکی کہ منھ کا نوالہ یا تو وہ چھوڑ دے یا منھ میں ڈال لے۔ (از: صبح دس بجے ص:۸۷، نوید صدیقی)

سچ ہی کہا ہے:

کیسے کیسے گھر اجاڑے موت نے   کھیل کتنوں کے بگاڑے موت نے
سرو قد قبروں میں گاڑے موت نے   پہلواں کیا کیا پچھاڑے موت نے

موت الفجاءۃ (اچانک کی موت) کیا ہے؟

تو قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق ہر ایک کی موت کا وقت اللہ رب العزت کے علم میں پہلے ہی سے متعین ہے اور اسی کے مطابق اس کی موت آتی ہے، البتہ ہمیں چوں کہ اس کا

علم نہیں ہوتا اس لیے بوڑھاپے اور بیماری کے بغیر کسی حادثے یا اکسیڈنٹ وغیرہ سے جب کسی کی موت واقع ہوجاتی ہے تو ہمارے لیے مرنے والے کی وہ موت اچانک کی ہوتی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو پہلے ہی سے اس کی موت کا وقت مقرر تھا، اس علم الٰہی کے اعتبار سے کوئی اچانک نہیں مرتا، ہر ایک اپنے مقرر وقت ہی پر مرتا ہے، لیکن ہمیں اس کا وقت معلوم نہیں ہے اس لیے ہر وقت اس کے لیے تیار رہنے کا حکم ہے۔

اے بےخبر! حیات کا کیا اعتبار ہے؟ ہر وقت موت سر پر بشر کے سوار ہے

اب جو مردِ مومن اس حقیقت سے باخبر ہوکر پہلے ہی سے موت کے لیے تیاری کرلیتا ہے اس کے لیے اچانک کی یہ موت مصیبت نہیں، بلکہ رحمت ہے کہ زندگی کے آخری لمحات واوقات میں کسی کا محتاج نہ ہونا پڑا، البتہ جس نے پہلے سے موت کی کوئی تیاری نہیں کی تھی اچانک کی موت اس کافر وفاجر کے لیے اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور بڑی ہلاکت ومصیبت ہے کہ اس کو توبہ کا موقع نہ ملا۔ العیاذ باللہ العظیم۔ اس لیے حدیث میں ہے:

عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ خَالِدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَوْتُ الْفُجَاءَةِ أَخْذَةُ الْأَسِفِ". (رواه أبو داوٗد، وزاد البیهقی فی شعب الإیمان ورزین فی کتابه: "أَخْذَةُ الْأَسِفِ لِلْكَافِرِ، وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِ". (مشکوٰۃ/ص: ۱۴۰)

ناگہانی موت اللہ تعالیٰ کے غضب وغصہ کی پکڑ ہے۔ (العیاذ باللہ العظیم) بیہقی اور رزین کی روایت میں ہے کہ اچانک کی موت کافر کے لیے اللہ تعالیٰ کے غصہ کی پکڑ ہے اور مومن کے لیے رحمت ہے۔

چوں کہ دنیا کی محبت، اس کی زیب وزینت، عیش وعشرت اور آرزؤں میں پھنس کر اکثر لوگ موت سے غفلت میں مبتلا ہوکر اس کی تیاری سے محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اچانک کی موت سے پناہ مانگنے کی تعلیم وہدایت بھی فرمائی۔

موت کیا ہے؟

بہر حال موت برحق ہے، جس کا وقت اور مقام اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں، لیکن جب موت اپنے مقرر وقت پر آتی ہے تو پھر کسی کو ذرّہ برابر مہلت نہیں دی جاتی، ان حقائق کے بعد اب سوال یہ ہے کہ موت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں تقریباً دوسو جوابات دیے گئے ہیں: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سانس کی آمد ورفت بند ہوجانے کا نام موت ہے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حرکت قلب بند ہوجانے کا نام موت ہے، کسی نے ظاہر کیا کہ گردشِ خون تھم جانے کا نام موت ہے، ایک رائے یہ ہے کہ جسم ناکارہ اور رگیں پتھرا جانے کا نام موت ہے، وغیرہ وغیرہ، حالاں کہ یہ سب موت کے اسباب ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مادی آلائشوں سے آزاد ہونے اور روح کے اپنے جوہر لطیف کی طرف رجوع ہونے کا جو کامیاب وقت ہے اس کا نام موت ہے، اور یہ درحقیقت ایک ختم نہ ہونے والی زندگی کا مقدمہ اور ایک دوسرے عالم وسیع تک لے جانے کا دروازہ ہے؛ کیوں کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق دنیا کا انسان موت کی وجہ سے معدوم ہوکر مٹ نہیں جاتا، بلکہ عالم دنیا سے عالم عقبیٰ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اقبالؒ نے فرمایا:

مرنے والے مرتے ہیں، فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

اور

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے اوجھل تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

ایمان اور علم الٰہی کے نور سے جو لوگ محروم ہیں انہوں نے سمجھا کہ مرنے کے بعد سارا قصہ ختم ہوجاتا ہے۔

﴿إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ﴾ (المومنون:۳۷)

مرنے والا مر کر مٹی میں مل جاتا ہے اور نیست و نابود ہو جاتا ہے، آگے کچھ نہیں ہوتا، حالاں کہ یہ ان کی عقل وفہم کا بنیادی قصور ہے، اسی لیے کہنے والے نے کیا خوب کہا:

موت کو سمجھا ہے غافل اختتامِ زندگی — ہے یہ شامِ زندگی، صبح دوامِ زندگی

مرنے والا موت کے ذریعہ دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوتا ہے، مٹتا نہیں ہے۔

موت کی حکمتیں:

پھر قرآنِ کریم نے کہا کہ زندگی اور موت کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے:

﴿ اَلَّذِیُ خَلَقَ الُمَوُتَ وَالُحَیٰوةَ﴾ (الملك:۲)

اور اللہ رب العزت حکیم مطلق ہے، لہٰذا اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اس نے موت میں بھی بہت سی حکمتیں رکھی ہیں:

(۱) مثلاً ایک تو یہی کہ موت اس دوسری دنیا تک پہنچنے کا ذریعہ اور پل ہے جہاں جزا وسزا کا حقیقی معاملہ ہوگا، اس دنیا میں بہت سے مجرم اور گنہگار ایسے ہیں کہ ان کو ان کے جرائم کی حقیقی سزا نہیں ملتی، جب کہ بہت سے نیکوکار اور پرہیزگار ایسے ہیں کہ ان کی نیکیوں کا حقیقی بدلہ ان کو نہیں ملتا، بعض اوقات ان کی پوری زندگی مصیبت اور کرب والم میں گزرتی ہے، اگر موت نہ ہوتی تو گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی حقیقی سزا اور نیکوکاروں کو ان کے حسن عمل کا حقیقی صلہ کیسے ملتا؟ اس کے لیے حق تعالیٰ نے موت کا سلسلہ جاری فرمایا، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿كُلُّ نَفُسٍ ذَآئِقَةُ الُمَوُتِ ط وَإِنَّمَا تُوَفَّوُنَ أُجُورَكُمُ يَوُمَ الُقِيٰمَةِ﴾ (ال عمران:۱۸۵)

(۲) ایک اور حکمت موت کی یہ بیان کی گئی کہ موت زمین کی آبادکاری کا ذریعہ ہے، اگر موت نہ ہوتی تو زمین پر انسانوں کی آبادی بہت مشکل ہو جاتی، اس لیے کہ اگر پیدائش وافزائش نسل کا سلسلہ تو جاری رہتا، مگر انتقال وارتحال کا سلسلہ نہ ہوتا، تو اس سے

انسانوں کا زمین میں سمانا مشکل ہو جاتا، حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے مواعظ میں حدیث بیان فرمائی کہ ''حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا، تو ان کی کثرتِ تعداد کو دیکھ کر فرشتوں نے حیرت سے عرض کیا: یا اللہ! یہ کیسے زمین میں سمائیں گے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا: ''میں موت کو مسلط کر دوں گا، جس کی وجہ سے اگلے آتے رہیں گے اور پچھلے جاتے رہیں گے، اور آنے والے خالی جگہ میں بستے رہیں گے۔'' بقولِ شاعر:

مسافر خانۂ دنیا میں جو آیا، ہوا راہی
یہ منزل آمد و شد کی ہے، اس میں ہے وطن کس کا؟

اسی لیے دنیا کو سرائے فانی کہتے ہیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک دن حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ''آپ کی عمر سب پیغمبروں سے زیادہ ہوئی ہے، بتلائیے! آپ نے دنیا کو کیسا پایا؟ فرمایا: ''مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک مکان کے دو دروازے ہیں، ایک میں سے اندر گیا اور دوسرے سے باہر نکل گیا۔''

جہاں چیست؟ ہمچوں سرائے دو در ازیں سو بیا، ازاں سو گذر

(ندائے منبر و محراب: ۱/ ۳۸۸)

موت مولیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہے۔

(۳) تیسری اہم حکمت یہ بھی ہے کہ موت مولیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو مولیٰ کی ملاقات کیوں کر ہوتی؟ روایتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق منقول ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا: ''الٰہی! چہ خوش بودے گر چہار چیز بودے و چہار چیز نہ بودے'' یا اللہ! کیا اچھا ہوتا کہ چار چیزیں ہوتیں اور چار چیزیں نہ ہوتیں! (۱) زندگی ہوتی اور موت نہ ہوتی (۲) جنت ہوتی، جہنم نہ ہوتی (۳) مالداری ہوتی، غریبی نہ ہوتی (۴) تندرستی ہوتی اور بیماری نہ ہوتی۔ جواب میں ارشاد باری ہوا کہ

''اے موسیٰ! اگر زندگی ہوتی اور موت نہ ہوتی تو ہماری ملاقات کیسے ہوتی؟ اگر جنت ہوتی اور جہنم نہ ہوتی تو ہمارے عذاب سے کون ڈرتا؟ اگر تونگری ہوتی اور فقیری نہ ہوتی تو ہماری نعمتوں کا شکر کون ادا کرتا؟ اگر تندرستی ہوتی اور بیماری نہ ہوتی تو ہمیں یاد کون کرتا؟ (گلزارِ دبستاں:۲/۳۰)

اسی طرح مسند احمد میں ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا جب وقت موعود یعنی موت کا وقت آیا تو حضرت عزرائیل علیہ السلام (ملک الموت) نے اپنا فرضِ منصبی انجام دینے سے پہلے اجازت لینا چاہی، تو آپ نے فرمایا کہ ''میری طرف سے بارگاہِ رب العزت میں عرض کرنا کہ ''کیا خلیل اپنے خلیل کی بھی جان لیتا ہے؟'' ملک الموت نے دربارِ الٰہی میں عرض رسانی کر دی، تو جواب میں ارشاد ہوا کہ جا کر کہہ دو کہ ''دوست اگر اپنے دوست کو ملنے بلائے تو کیا وہ آنے میں پہلو تہی کر سکتا ہے؟'' ظاہر ہے کہ اب مزید کسی پیغام کی گنجائش ہی نہ تھی، اسی وقت حضرت خلیل علیہ السلام موت کے لیے آمادہ ہو گئے، اس موقع پر صاحب طرز ادیب علامہ عبدالماجد دریا آبادیؒ فرماتے ہیں کہ ''حدیث بہ لحاظِ اسناد جس درجہ کی ہو اسے محدثین جانیں، لیکن یہ جو اپنے اندر رس اور مٹھاس رکھتی ہے وہ وجد آفریں ہے۔'' (ادبی شہ پارے:۲/ ۸۷)

نیز اسی سلسلہ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ''میں تین چیزیں پسند کرتا ہوں: (۱) غریبی، (۲) بیماری، (۳) موت، غربت تو اس لیے پسند ہے کہ اس سے بندہ میں عاجزی اور انکساری آتی ہے جو اللہ رب العزت کو پسند ہے، اور بیماری اس لیے پسند ہے کہ یہ کفارۂ معاصی ہے، اور رہی بات موت کی تو کیوں کہ وہ مولیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہے اس لیے مجھے موت پسند ہے۔'' (روضۃ الصالحین:۱/ ۲۷)

موت مومن کا تحفہ ہے۔

چوتھی اہم حقیقت یہ ہے کہ موت مولیٰ کی ملاقات کا ذریعہ ہونے کے ساتھ بندۂ

مومن کے لیے اپنے مولیٰ کی جانب سے ملنے والے انعامات کے حصول کا ذریعہ بھی ہے۔ صاحبو! موت کی اگر یہ حکمت سمجھ میں آجائے تو پھر واقعی اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے لیے موت سے زیادہ مرغوب شئ اور کوئی نہیں؛ کیوں کہ موت کے بعد مولیٰ ان کو ان کی نیکی اور رب چاہی زندگی کا صلہ عطا فرمانے والا ہے، قرآن کہتا ہے:

﴿ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ﴾ (آل عمران: ۱۹۸)

''اللہ تعالیٰ کے یہاں جو صلہ ملنے والا ہے نیک لوگوں کو وہ بہت بہتر ہے۔'' اور وہ حقیقی صلہ چوں کہ مرنے کے بعد ملنے والا ہے اس لیے حدیث میں موت کو مومن کے لیے ایک بہترین تحفہ قرار دیا گیا ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ''. (رواه البيهقى فى شعب الإيمان، مشكوٰة/ص: ۱٤۰)

کیوں کہ جس اجر وثواب کی امید پر اس نے ساری زندگی مرضئ الٰہی کے مطابق گذاری وہ موت کے بعد ملنے والا ہے، تو موت مولیٰ کی ملاقات اور اس کے انعامات پانے کا بہترین ذریعہ ہے، اس لیے یہ موت مومن کے لیے تحفہ ہوئی، پھر حدیث کے مطابق دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور مصائب کا گھر ہے، جس سے چھٹکارا موت کے بعد ہی ملتا ہے، اس لیے بھی موت مومن کے لیے ایک تحفہ ہے، نیز موت کے بعد مرنے والے مردِ مومن کو لوگوں کی ہمدردی حاصل ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس کا بھلائی سے تذکرہ کرنے کا حدیث میں حکم ہے، اس لیے اسے مرحوم یعنی قابل رحم کہا اور سمجھا جاتا ہے، اس کے لیے دعاءِ مغفرت اور ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے، وغیرہ، تو اس لحاظ سے بھی موت مومن کے لیے ایک تحفہ ہے اور ہر مومن طبعی طور پر تو نہیں مگر عقلی طور پر موت کو پسند کرتا ہے، بالکل اس طرح جس طرح کہ آنکھ وغیرہ کے مریض کو نشتر لگوانا طبعی طور پر بالکل بھی گوارا نہیں ہوتا، لیکن اس امید پر کہ آپریشن کے بعد آنکھ میں روشنی آجائے گی، عقلی طور پر وہ نشتر لگوانے کو محبوب اور مرغوب سمجھتا ہے اور

ڈاکٹر کی فیس دے کر آنکھ میں نشتر لگواتا ہے، بس فرق اتنا ہے کہ آپریشن کا نفع قطعی اور یقینی نہیں، احتمالی ہے، لیکن موت کے بعد مردِ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور پھر اس کا قربِ خاص اور انعامات کا ملنا یقینی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مومن اپنی زندگی میں تو عقلی طور پر موت کو پسند کرتا ہی ہے، لیکن موت کے وقت جب اس کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کے قربِ خاص اور انعامات کی بشارت سنائی جاتی ہے تو طبعی طور پر بھی تو وہ موت کو پسند کرنے لگتا ہے۔

موت کے وقت مومن و کافر کی حالت:

مومن و کافر کی حالت بیان کرتے ہوئے رحمت عالم ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهُ“

جو شخص اللہ رب العزت سے ملنا اور ملاقات کرنا پسند کرتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس سے ملنے کو پسند کرتے ہیں اور جو شخص اللہ رب العزت سے ملاقات میں کراہت محسوس کرتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں، آگے حدیث میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے جب یہ بات بیان فرمائی تو سن کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا یا ازواجِ مطہرات میں سے کسی اور نے عرض کیا کہ حضور! ”إِنَّا لَنَكْرَهُ الْمَوْتَ“ ہم تو فطری اور طبعی طور پر موت سے گھبراتے اور اس کو ناپسند کرتے ہیں، تو اب ہمارا کیا بنے گا؟ تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بات اس طرح نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موت کے بعد ایک مومن کے ساتھ ربِ کریم کی طرف سے اس کی رضا و رحمت اور فضل و کرم کا جو معاملہ ہونے والا ہے موت سے پہلے ہی اس کی بشارت اور خوشخبری اسے سنائی جاتی ہے، جس کی طرف قرآنِ کریم نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ○ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ○﴾ (الفجر: ۲۸ تا ۳۰)

تو اس وقت مومن کے نزدیک موت سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہوتی، پھر یہ ہوتا ہے کہ موت کے وقت بندۂ مومن اپنے مولیٰ سے ملاقات اور اس کے انعامات کے لیے بے چین ہو جاتا ہے، اس کا داعیہ اور شوق و جذبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جلد از جلد اُسی عالم میں اور اپنے مولیٰ کی آغوشِ رحمت میں پہنچ جائے، حدیث میں ہے: "فَأَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ، وَأَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ" اس طرح موت کے وقت مومن عالمِ آخرت کے حقائق کا مشاہدہ کر کے موت سے طبعی طور پر بھی محبت کرنے لگتا ہے، اور مولیٰ کی ملاقات وانعامات کا مشتاق ہو جاتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا پسند کرتے ہیں، اس کے برعکس جو بندۂ کافر یا فاجر اپنی بد اعمالی و بدبختی کی وجہ سے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے غضب و عذاب کا مستحق ہوتا ہے تو موت کے وقت اس کے اس برے انجام پر موت کا فرشتہ اُس کو مطلع کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ موت اور مولیٰ کی ملاقات کو سخت ناپسند سمجھتا ہے، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا نہیں چاہتا؛ کیوں کہ اس کو اپنے حق میں سخت مصیبت سمجھتا ہے، اس لیے حدیث میں ہے: "فَكَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ وَكَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ". (متفق عليه، مشكوٰة: ۱۳۸) کہ وہ موت اور اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، تو ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ بھی (محبت و رحمت سے) ملنا پسند نہیں کرتے۔ مگر ظاہر ہے کہ موت مولیٰ کی ملاقات کا اصل ذریعہ اور وسیلہ ہے، لہٰذا ہر مرنے والا اللہ تعالیٰ سے ملاقات تو کرتا ہی ہے، بس فرق یہ ہے کہ مردِ مومن اپنے مولیٰ سے خوشگوار حالت میں ملتا ہے، اور کافر و فاجر جب ملتا ہے تو اس کا رب اس پر غضبناک ہوتا ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

موت اور دخولِ جنت میں آسانی کے لیے تین اعمال:

ضرورت اس بات کی ہے کہ موت سے قبل اس کی تیاری کی جائے، جس کے لیے توبہ کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا اہتمام اور گناہوں سے اجتناب لازم ہے، اور اگر پھر خدانخواستہ کبھی گناہ ہو جائے تو سچی و پکی توبہ کا التزام ضروری ہے۔

حدیث میں ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے موت اور اس کے بعد دخولِ

جنت میں آسانی ہوجاتی ہے:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ يَسَّرَ اللّٰهُ حَتْفَهُ وَ أَدْخَلَهُ جَنَّتَهُ: رِفْقٌ بِالضَّعِيفِ، وَشَفَقَةٌ عَلَى الْوَالِدَيْنِ، وَ إِحْسَانٌ إِلَى الْمَمْلُوكِ". (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۲۹۱)

جس شخص میں تین باتیں پائی جائیں اللہ تعالیٰ اس کی موت کو آسان کردیں گے اور اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں: (۱) کمزور اور ضعیف (خواہ جسامت یا دینی و دنیوی اعتبار سے یا عقل وفہم کے اعتبار سے ہی کیوں نہ ہو اس) کے ساتھ نرمی کرنا۔ (۲) والدین کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنا۔ (۳) نوکروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا۔ (یعنی مالک پر جو حقوق ومعاوضہ وغیرہ لازم ہیں ان سے زائد سلوک کرنا) اگر ان تین اعمال کا التزام کرلیا جائے تو حدیث کے مطابق اس سے موت اور اس کے بعد دخولِ جنت کا معاملہ آسان ہوجائے گا۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرما کر اپنی رضا والی موت عطا فرمائے۔ آمین۔

۵/ رمضان المبارک/۱۴۳۳ھ/ بروز جمعرات

مطابق: ۲۶/ جولائی/۲۰۱۲ء (بزم صدیقی، بڑودا)

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ أَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

☆......☆......☆
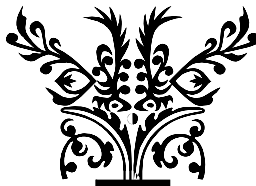
(۴۰)

ذکر اللہ کے فضائل قرآن وحدیث کی روشنی میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ، خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ". (رواه البخاری:۱۱۲۹/۲، مشکوٰۃ/ص:۲۰۰/ باب ثواب التسبیح)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "دو کلمے ایسے ہیں جو اللہ جل شانہ کے نزدیک نہایت محبوب اور پسندیدہ ہیں اور زبان پر بہت ہی ہلکے پھلکے ہیں، لیکن میزانِ عمل میں بہت ہی وزنی اور بھاری ہیں اور وہ دو مبارک کلمے یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ".

ذکر اللہ منظوم

نتیجۂ فکر: جناب حضرت مولانا قاری احسان محسنؔ صاحب دامت برکاتہم

دل کو اگر چمکانا ہے، گر ایمان بنانا ہے
ملت کو بتلانا ہے، نگری نگری گانا ہے

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

گلیوں میں، چوباروں میں، کوچوں میں، بازاروں میں
شام و سحر اور رات اور دِن، ہر دم یہی کلمہ گن

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

وحدت کے مئے خانوں میں، رندوں میں، پیمانوں میں
مرشد کے دیوانوں میں اور دھن ہے یہی مستانوں میں

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

گلہائے گلشن میں ہے، فنکاروں کے فن میں ہے
ہر دل کی دھڑکن میں ہے، ہر مومن کے من میں ہے

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ، لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

پرواز و طیاروں میں، خورد و کلاں سیاروں میں
سورج، چاند، ستاروں میں، قدرت کے حسیں نظاروں میں

لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ
لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ

بالائی میں، پستی میں، ویرانوں میں، بستی میں
آگ لگا کر ہستی میں کہتا پھر تو مستی میں:

لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ
لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ

شوقِ شہادت دل میں رکھ، ذوقِ عبادت پیدا کر
تو حرصِ دنیا پیچھے ڈال اور حسن شریعت پیدا کر

لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ
لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ

بوندوں کی بوچھار میں ہے، پھولوں کی مہکار میں ہے
سالک کے افکار میں ہے، محسنؔ کے اشعار میں ہے

لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ
لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ لا الہ الا اللّٰہ

ذکر اللہ کی حقیقت اور اقسام:

اللہ رب العزت کی بندگی اور عبادت کے جتنے طریقے ہیں بلا شبہ ان میں سب سے افضل و اہم، مگر نہایت ہی آسان عمل و عبادت ذکر اللہ ہے، اسی لیے اس کی کثرت کا حکم بھی دیا اور اس میں سہولت پیدا فرما کر اس کی فضیلت بھی سب سے زیادہ بڑھا دی۔

ذکر کے اصل معنیٰ تو یاد کرنے کے ہیں اور ذکر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے جس کا اصل تعلق دل سے ہے، رہی بات زبان سے اس کا ذکر کرنے کی تو اسے بھی ذکر اللہ کہا جاتا ہے، اس لیے کہ متعدد احادیث میں اس کی ترغیب آئی ہے، منجملہ ان کے حدیث مذکور بھی

ہے اور چوں کہ زبان دل کی ترجمان ہے، ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

إِنَّ الْكَلَامَ لَفِي الْفُؤَادِ وَإِنَّمَا ☆ جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَى الْفُؤَادِ دَلِيْلًا

''یعنی کلام تو بلا شبہ دل ہی میں ہوتا ہے، زبان کو تو دل کا ترجمان بنایا گیا ہے۔'' اس لیے ذکر اللہ کی افضل ترین شکل یہی ہے کہ حضورِ قلبی کے ساتھ زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے، تاکہ ذکر قلبی اور ذکر لسانی دونوں جمع ہو جائیں، لیکن اگر کوئی شخص بے دلی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تب بھی اس کا مقدس ذکر نفع اور فائدہ سے خالی نہیں ہوتا، اس لیے ہمارے بعض بزرگوں نے مثنوی کے اشعار میں ذرا سی ترمیم کرتے ہوئے اس مضمون کو یوں بیان فرمایا ہے:

بر زباں تسبیح ودر دل گاؤ خر ☆ ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر

حضرت ابوعثمانؒ سے کسی نے عرض کیا کہ ہم زبان سے ذکر اللہ کرتے ہیں، مگر دل میں اس کی کوئی حلاوت محسوس نہیں کرتے، فرمایا: ''اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو یعنی زبان کو اپنی یاد اور طاعت میں لگا دیا، یہ بھی بڑی بات ہے۔'' (قرطبی، معارف القرآن: ۱/ ۳۳۶)

پھر چوں کہ ذکر اللہ تمام شرعی احکام کی اصل اور جڑ ہے، اس لیے اس کے معنیٰ ومفہوم میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، مناجات، تلاوت، دعا، درود اور توبہ واستغفار وغیرہ تمام اعمال وعبادات داخل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ارشادِ باری: ﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي﴾ (طٰہٰ: ۱۲٤) میں ذکر سے مراد قرآن اور صاحب قرآن ﷺ یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تمام احکام ہیں۔ (معارف القرآن: ٦/ ۱۵۹)

یہ سب درحقیقت ذکر اللہ ہی کی مختلف شکلیں ہیں، جو شخص ان اعمال میں مشغول ہے وہ ذکر اللہ ہی میں مشغول ہے، اور اسے ذکر جسمانی کہتے ہیں، یعنی نیک اعمال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اس طرح ذکر اللہ کی تین قسمیں ہیں: (۱) ذکر قلبی، (۲) ذکر لسانی، (۳)

ذکر جسمانی۔ البتہ مخصوص عرف واصطلاح میں کسی صاحب توفیق انسان کا حق تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس، توحید وتمجید، تکبیر وتعظیم اوراس کی صفاتِ کمال وجلال کے بیان ودھیان کو ذکر اللہ کہتے ہیں۔

ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ نے فرمایا کہ ''تسبیح عام ہے، ذکر خاص ہے، تسبیح تو کائنات کی ہر چیز کرتی ہے، مگر اس میں نیت اور ارادہ شامل نہیں، جب کہ ذکر صرف انسان کرتا ہے، جس میں نیت اور ارادہ شامل ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْ أَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرة: ۱۵۲) کائنات سے نہیں فرمایا: ''سَبِّحُوْنِيْ أُسَبِّحْكُمْ'' البتہ یہ شرف صرف انسان کو حاصل ہے کہ وہ ذکر اللہ کے ساتھ اس کی تسبیح بھی بیان کرتا ہے۔

ذکر اللہ کی عظمت وفضیلت:

اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ذکر اللہ کو ہر عمل وعبادت پر عظمت وفوقیت حاصل ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر عظمت وفوقیت حاصل ہے اسی طرح اس کے ذکر کو بھی ہر عمل وعبادت پر فوقیت حاصل ہے، قرآن پاک میں فرمایا: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ (العنكبوت: ٤٥) اور یہ یقینی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت ہی عظیم چیز ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑا کوئی نہیں تو ذکر اللہ سے بڑھ کر عظمت اور فضیلت والا کوئی عمل نہیں اور اس سے ذاکر کو جو عظمت نصیب ہوتی ہے وہ کسی اور عمل سے نہیں ہوتی۔

احیاء العلوم: (جلد: ۱/صفحہ: ۴۶۶) میں ہے کہ رئیس المفسرین سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں، ایک تو یہی کہ ذکر اللہ تمام اعمال وعبادات میں سب سے عظیم الشان عمل ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات سب سے بڑی ہے، تو اس کی یاد بھی سب سے بڑی ہے، فرمایا: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی عظمت کے لحاظ سے سب سے بڑا عمل ہے۔

ذکر اللہ روحِ شریعت:

اس کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کتاب وسنت میں جن اعمال کا ذکر ملتا ہے غور کیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ ان سب کی روح اور جان ذکر اللہ ہی ہے؛ کیوں کہ ان سب کا اصل مقصد ذکر اللہ ہی ہے، مثلاً دیکھئے! بدنی اعمال میں سب سے افضل عمل نماز ہے، تو قرآنِ کریم نے نماز کا مقصد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَ أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰہٰ: ١٤) ''میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہو تو نماز پڑھو، نماز کا اصل مقصد ذکر اللہ ہے، نماز ایک شکل اور جسم ہے، تو ذکر اللہ اس کی روح اور جان ہے، اس کے بغیر نماز بے جان ہے، محض ایک اٹھک بیٹھک اور ایکسر سائز ہے، اور نماز میں شروع سے اخیر تک جو اعمال ہیں وہ دراصل اسی ذکر اللہ کی مختلف شکلیں ہیں، اصل اس میں ذکر اللہ ہے، اور یہی حال دیگر اعمال کا بھی ہے، چناں چہ حج کے متعلق بھی قرآنِ کریم نے فرمایا: ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ أَيَّامٍ مَعْدُوْدٰتٍ﴾ (البقرة: ٢٠٣) ''حج کے چند ایام میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت کثرت سے کیا کرو۔'' یہ حکم اس لیے ہے کہ اس کے بغیر حج بھی ایک بے روح عمل اور محض سیر اور دینی پکنک (Picnik) ہے، معلوم ہوا کہ جیسے نماز کا اصل مقصد ذکر اللہ ہے اسی طرح اعمالِ حج کا اصل مقصد بھی ذکر اللہ ہی کو قرار دیا گیا، حدیث میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: " إِنَّمَا جُعِلَ رَمْيُ الْجِمَارِ وَالسَّعْيُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ لِإِقَامَةِ ذِكْرِ اللّٰهِ". (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ٢٣١)

یعنی رمی جمار اور سعی بین الصفا والمروہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو قائم کرنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔

پھر یہ تو بطورِ مثال دو مہتم بالشان اعمال کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے علاوہ بھی جتنے اعمال ہیں ان سب کا اگر قرآن وحدیث میں تحقیقی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ذکر

اللہ روحِ شریعت ہے، تمام اعمالِ صالحہ اور عباداتِ شرعیہ کی جان اور لب لباب وخلاصہ ذکر اللہ ہے، دیگر اعمال وعبادات اس کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں، اصل مقصود ذکر اللہ ہے، اس لیے فرمایا: ﴿ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ ﴾ سب سے بڑا عمل اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے ویسے ہی اس کی بنائی ہوئی کائنات میں سب سے عظیم چیز بھی اس کا ذکر ہے اور یہ ساری سجائی ہوئی دنیا دراصل ذکر اللہ سے ہی قائم اور باقی ہے۔

ذکر اللہ روحِ کائنات:

اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ ذکر اللہ روحِ شریعت ہی نہیں، بلکہ ساری کائنات کی بھی روح ہے، یہ دنیا اس وقت تک قائم رہے گی جب تک اس میں روح یعنی ذکر اللہ ہے، جس وقت اس کا ذکر دنیا سے ختم ہوا بس سمجھو کہ اسی دن یہ عالم بھی ختم ہوا، ساری کائنات کا نظام درہم برہم ہوکر قیامت قائم ہو جائے گی، حدیث شریف سے اس کی تائید ہوتی ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْأَرْضِ:" اَللّٰهُ، اَللّٰهُ". (رواهُ مسلم، مشكوٰة/ص: ٤٨٠)

''قیامت اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ دنیا میں ایک شخص بھی ''اللہ اللہ'' کہنے والا باقی ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ روحِ کائنات ہے؛ کیوں کہ حدیث شریف کی پیشین گوئی کے مطابق جب ذکر اللہ کرنے والا اس دنیا میں کوئی نہ رہے گا تو قیامت قائم کردی جائے گی، اور قیامت درحقیقت کائنات کی موت ہے، یہی وجہ ہے کہ جیسے مرنے کے بعد بدن گل سڑ کر ریزہ ریزہ اور بکھر جاتا ہے، یہی حال قیامت کے دن اس کائنات کا بھی ہوگا، زمین ریزہ ریزہ ہو جائے گی، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح بکھرے اور اڑتے پھریں گے، آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، پانی مٹی میں تو مٹی پانی میں ہو جائے گی، غرض یہ کہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، لیکن یہ اس وقت ہوگا جب ''اللہ اللہ'' کہنے والا

کوئی اللہ والا دنیا میں نہ ہوگا، تب یہ عالم بے روح ہو جائے گا اور اس کی موت واقع ہو جائے گی، کیوں کہ ہر چیز کی بقا اس کی روح پر موقوف ہے اور کائنات کی روح ذکر اللہ ہے، لہٰذا اسی پر اس کی بقا موقوف ہے، اس لیے فرمایا: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ ذکر اللہ سے بڑھ کر ساری کائنات میں اور کوئی چیز نہیں، گویا سارا نظام اسی کی برکت سے جاری ہے۔

ذکر اللہ دل کی حیات:

پھر جس طرح ذکر اللہ روحِ کائنات ہے، یعنی دنیا کی زندگی ذکر الٰہی کی وجہ سے ہے، اسی طرح خود قلب انسانی کی زندگی بھی ذکر الٰہی سے قائم ہے، ذکر اللہ سے مردہ دل اسی طرح زندہ ہو جاتے ہیں جس طرح بارانِ رحمت سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے، چناں چہ فرمایا:

﴿اِعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (الحدید:۱۷)

''جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کی موت کے بعد۔''

آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ نسفیؒ فرماتے ہیں:

"قِيْلَ: "هٰذَا تَمْثِيْلٌ لِأَثَرِ الذِّكْرِ فِي الْقُلُوْبِ، وَ إِنَّهٗ يُحْيِيْهَا كَمَا يُحْيِي الْغَيْثُ الْأَرْضَ". (تفسیر نسفی:۳/۱۷۶)

''کہا گیا کہ اس آیت میں ایک مثال بیان کی جا رہی ہے کہ ''ذکر کا اثر دل پر ہوتا ہے، اور ذکر اللہ سے دل اس طرح زندہ ہو جاتے ہیں جس طرح بارش کے پانی سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے۔'' (یہی مضمون تقریباً انوار البیان/ ج:۷ص:۳۰۴ میں بھی وارد ہوا ہے) حدیث میں گویا اس کی تشریح اس طرح بیان کی گئی:

عَنْ أَبِيْ مُوْسٰى رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَثَلُ الَّذِيْ يَذْكُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِيْ لَا يَذْكُرُ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ". (متفق علیه، مشکوٰة/ص:۱۹۶)

جو شخص ذکر اللہ کا اہتمام کرتا ہے اور جو نہیں کرتا ان دونوں کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے، ذکر اللہ کرنے والا زندہ ہے اور ذکر اللہ نہ کرنے والا زندہ ہو کر بھی مردہ ہی کے مانند ہے، اس لیے کہ ذکر اللہ دل کی حیات ہے، لہٰذا جو ذکر اللہ سے محروم رہا در اصل وہ دل کی حیات سے محروم ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

اللہ اللہ ہے تو یارو! جان ہے ورنہ یارو! جان بھی بے جان ہے
اللہ اللہ کر لے اس قدر اللہ اللہ رہ جائے اور نفس جائے مر

صاحبو! واقعہ یہی ہے کہ دلوں کی دنیا ذکر اللہ ہی سے آباد ہے، اور جن کے دلوں کی دنیا ذکر اللہ سے خالی ہوتی ہے، اگر چہ ظاہری طور پر ان کی دنیا پر رونق اور آباد نظر آتی ہے، مگر حقیقۃً ان کی زندگی ویران اور اجڑی ہوئی ہوتی ہے، ان کا ظاہری حال حقیقت کے موافق نہیں ہوتا، ان کا چہرہ تو مسکراتا ہوا نظر آتا ہے، مگر دل اندر سے روتا ہے، ان کے منھ میں اگر کباب ہے تو دل میں عذاب ہے، ان کے جسم ان کے مردہ دلوں کی قبریں ہیں، عربی کے ایک شاعر نے اسی کو کہا ہے:

فَنِسْيَانُ ذِكْرِ اللّٰهِ مَوْتُ قُلُوْبِهِمْ ☆ وَأَجْسَامُهُمْ قَبْلَ الْقُبُوْرِ قُبُوْرُ
وَأَرْوَاحُهُمْ فِي وَحْشَةٍ مِنْ جُسُوْمِهِمْ ☆ وَلَيْسَ لَهُمْ حَتّٰى النُّشُوْرِ نُشُوْرُ

ذکر اللہ سے غافل ہو جانا دلوں کی موت ہے، اور ان کے جسم زمین والی قبروں سے قبل ان کے مردہ دلوں کی قبریں ہیں، (قبر میں مردہ ہوتا ہے تو ان کے جسم میں مردہ دل ہے) ان کی روحیں سخت وحشت میں ہیں ان کے جسموں سے اور ان کے لیے قیامت اور حشر تک زندگی نہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا حال ہے جو ذکر اللہ سے غافل ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ ط أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (الحشر:۱۹)

”اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا، (جو ذکر قلبی،

ذکرلسانی اور ذکر جسمانی سے غافل ہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے (اس کی سزا ان کو یہ دی کہ) ان کے نفس ان کو بھلا دیے (انہیں آخرت یاد نہ رہی، اور اس طرح خدا فراموشی کے نتیجہ میں وہ خود فراموش ہوگئے) یہی لوگ فاسق ہیں۔‘‘

اس کے برعکس وہ مومنین جو ذکر اللہ کا اہتمام کرتے ہیں وہ دارین میں سرخرو ہوں گے، وہ زندہ دل مرکر بھی زندہ رہتے ہیں، اسی لیے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے اس حدیث کے تحت صوفیہ کا قول نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ’’اس سے ہمیشہ کی زندگی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے اخلاص کے ساتھ کرنے والے مرتے ہی نہیں، بلکہ وہ اس دنیا سے منتقل ہونے کے بعد بھی زندوں ہی کے حکم میں رہتے ہیں، جیسا کہ قرآنِ مجید میں شہید کے متعلق وارد ہوا ہے:

﴿بَلْ أَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (اٰل عمران : ۱۶۹)

(جیسے شہداء کے لیے خاص زندگی ہے) اسی طرح ان (ذکر کرنے والوں) کے لیے بھی ایک خاص زندگی ہے۔ (فضائل ذکر/ص:۲۲)

ذکر اللہ کی عظیم الشان فضیلت:

ان حقائق سے ثابت ہوگیا کہ ذکر اللہ تمام اعمال وعبادات نیز کائنات اور قلوب کی حیات اور روح ہے، اس لیے فرمایا: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ ذکر اللہ سے افضل اور کوئی عمل نہیں ہوسکتا، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ’’أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ أَعْمَالِكُمْ وَأَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيْكِكُمْ وَأَرْفَعِهَا فِيْ دَرَجَاتِكُمْ، وَخَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ إِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ وَخَيْرٍ لَّكُمْ مِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوْا أَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوْا أَعْنَاقَكُمْ؟‘‘ قَالُوْا: ’’بَلٰى‘‘ قَالَ: ’’ذِكْرُ اللّٰهِ‘‘. (رواہ أحمد والترمذی وابن ماجه، مشكوٰة/ص : ۱۹۸)

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ ”کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتاؤں جو سارے اعمال میں بہتر ہے اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے پاکیزہ ہے اور تمہارے درجات کو دیگر تمام اعمال سے زیادہ بلند کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں سونا چاندی خرچ کرنے سے بھی زیادہ تمہارے لیے بہتر ہے، حتیٰ کہ اُس جہاد سے بھی زیادہ جس میں تم اپنے (وہ دشمن جو درحقیقت اللہ اور اس کے رسول کے) دشمن (ہیں) کو موت کے گھاٹ اتار دو اور وہ تم کو شہید کریں؟ یعنی تمام اعمال میں سب سے زیادہ فضیلت والا عمل بتلاؤں، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ یا رسول اللہ! ایسا عظیم الشان فضیلت والا عمل آپ ہمیں ضرور بالضرور بتلائیے، تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ مبارک اور عظیم المرتبت فضیلت والا عمل ذکر اللہ ہے۔

یہ حدیث دراصل ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ کی تفسیر اور تشریح ہے کہ ذکر اللہ سے بڑھ کر فضیلت والا عمل اور کوئی نہیں، اس لیے مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

پس بزرگی ہست اندر یادِ او　　　　یادِ او کن، یادِ او کن، یادِ او

ساری بزرگی اور فضیلت اسی کی یاد میں ہے، لہٰذا ذکر الٰہی سے وابستگی اختیار کرلو۔

حدیث بالا میں ذکر اللہ کو جو سب سے افضل عمل بتلایا، تو علماءِ محدثین نے اس کی دو وجہیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) ایک یہ کہ ذکر اللہ کی یہ عظیم الشان فضیلت (بشرطیکہ اخلاص واحسان اور خشوع وخضوع کی کیفیت کے ساتھ کیا جائے) عام حالات اور اوقات کے اعتبار سے ہے، اس لیے کہ دیگر تمام اعمال میں ذکر اللہ ہی وہ عمل ہے جس کے لیے کوئی حد، ہیئت اور وقت مقرر نہیں ہے، ہر حال میں اور ہر وقت کیا جا سکتا ہے، دیگر جتنے بھی اعمال ہیں ان کا حال اس سے مختلف ہے، نماز ہر وقت نہیں پڑھی جا سکتی، روزہ بھی ہر وقت نہیں رکھا جا سکتا، زکوٰۃ بھی ہر وقت ادا نہیں کی جاتی، نیز حج بھی ہر وقت ادا نہیں ہوتا، جہاد بھی ہر وقت نہیں کیا جاتا، یہ تمام

اعمال اپنی جگہ بڑی فضیلت بلکہ فرضیت کے حامل ہیں، لیکن ہر وقت انہیں ادا نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ذکر اللہ وہ مقدس عمل ہے جو دن رات کے ہر وقت اور ہر ہیئت میں کیا جا سکتا ہے، قیام میں، رکوع میں، بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے، باوضو، بے وضو، گھر میں، مسجد میں، تندرستی میں، بیماری میں، سفر میں، حضر میں، تنگی میں، فراخی میں، ہر وقت اور ہر حالت میں ہر کوئی کر سکتا ہے، اس لیے اس کی فضیلت دیگر اعمال سے زیادہ ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ ذکر اللہ دراصل ہر عمل کا مقصد ہے اور اللہ رب العزت کی رضا و قرب کا سب سے قریبی و یقینی ذریعہ ہے، اس لیے بھی یہ دیگر اعمال وعبادات سے بہتر و بالاتر اور عظیم الشان فضیلت والا عمل قرار پایا۔

ذکر اللہ تقرب الی اللہ کا سب سے قریبی و یقینی ذریعہ:

اور اس کی تائید کلامِ الٰہی سے بھی ہوتی ہے کہ ذکر اللہ تقرب الی اللہ کا سب سے قریبی و یقینی ذریعہ ہے، فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِیْ أَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۵۲) اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم مجھے یاد کرو (طاعت یعنی ذکر جسمانی کے ساتھ) میں تمہیں یاد کروں گا'' (اپنی عنایت کے ساتھ)۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے یاد کرو فرشِ زمیں پر، میں تمہیں یاد کروں گا عرشِ بریں پر۔ ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ''. کسی بھی بندہ کے لیے اس سے بڑی نعمت اور سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ساری کائنات کا خالق و مالک اس کو یاد کرے اور یاد در کھے، قرآن کہتا ہے کہ یہ مقام عظیم کسی بھی صاحب توفیق بندہ کو ذکر اللہ کی وجہ سے حاصل ہو جاتا ہے، فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِیْ أَذْكُرْكُمْ﴾ مرشدی حضرت شیخ الزماں مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ ''ذکر اللہ ذاکر کو مذکور بنا دیتا ہے'' ایک حدیث قدسی میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

''عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: '' يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: ''أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ، وَ أَنَا مَعَهٗ إِذَا ذَكَرَنِیْ، فَإِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ

فِيْ نَفْسِيْ، وَ إِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَأٍ ذَكَرْتُهٗ فِيْ مَلَأٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ". (متفق عليه، مشكوٰة /ص:۱۹۶ حديث قدسى نمبر :۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "میرا بندہ جس طرح میرے ساتھ گمان رکھے گا، (مراد مغفرت یا عذاب وغیرہ کا) تو میں اس کے ساتھ اسی کے مطابق معاملہ کروں گا، (لہٰذا ایمان واعمال کے ساتھ حق تعالیٰ سے حسن ظن رکھنا فرض ہے) پھر ارشاد ہوا کہ میں بالکل بندہ کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی خاص معیت اور خاص قرب نصیب ہوتا ہے، آگے ارشاد ہے کہ جب بندہ مجھے چپکے چپکے (مراد مراقبہ وذکر خفی ہے) خلوت میں اس طرح یاد کرتا ہے کہ میرے سوا کسی اور کو اس کی خبر نہیں ہوتی، حتیٰ کہ فرشتوں کو بھی۔ بقولِ شاعر:

میانِ عاشق ومعشوق رمزیست کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

تو میں بھی اس کو اسی طرح یاد کرتا ہوں اور اس کے ساتھ مخفی طور پر عنایت کا معاملہ کرتا ہوں، لیکن جب بندہ جلوت میں لوگوں کے سامنے میرا ذکر کرتا ہے (جس میں ذکر جلی وجہری اور دعوت وارشاد وغیرہ بھی داخل ہیں) تو میں اس بندہ (کے ساتھ اپنے تعلق اور اس کی مقبولیت کا ذکر) فرشتوں کے مجمع میں (بطورِ فخر) کرتا ہوں۔

اس روایت میں ذکر اللہ کی جن دو کیفیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کے متعلق علماء نے فرمایا کہ یہ دونوں ہی ذکر اللہ کی مختلف قسمیں ہیں جو حالات کے اعتبار سے مختلف ہیں، ان میں سے ایک کو "ذکر سری" اور دوسری کو "ذکر جہری" کہتے ہیں، دونوں کی گنجائش ہے، (البتہ اپنے شیخ سے مشورہ کرنے کے بعد ان کی تلقین کے مطابق ذکر اللہ کا اہتمام کیا جائے)

الغرض ذکر سے اللہ تعالیٰ کا تعلق اور تقرب نصیب ہوگا، یوں سمجھیں کہ جس طرح دورِ حاضر میں موبائل کے ذریعہ بآسانی سب سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے، ﴿وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ

بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ (النساء : ۷۸) اگرچہ کسی مضبوط قلعہ ہی میں کیوں نہ ہو، بالکل اسی طرح ذکر اللہ کے ذریعہ رب تعالیٰ سے بآسانی رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے، بلکہ موبائل سے رابطہ کرنا اتنا آسان نہیں جتنا ذکر اللہ کے ذریعہ رب العالمین سے رابطہ کرنا آسان ہے، کیوں کہ موبائل میں تو نمبر بھی ملانا پڑتا ہے، پھر کبھی بیلنس نہیں ہوتا، تو کبھی لائن بزی (Busy) ہوتی ہے، لیکن ذکر اللہ والی لائن اتنی ایزی (Easy) ہے جو کبھی انگیج بھی نہیں ہوتی، ہر وقت ہر حال میں ہر کوئی اس کے ذریعہ اپنے رب سے رابطہ کر سکتا ہے، فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْ أَذْكُرْكُمْ﴾ معلوم ہوا کہ تعلق مع اللہ اور تقرب الی اللہ کا سب سے قریبی و یقینی ذریعہ اگر کوئی ہے تو وہ ہے ذکر اللہ، اس لیے رئیس المفسرین سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہمانے ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ کا دوسرا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ ”تم جس قدر اللہ جل شانہ کا ذکر کرتے ہو اور اس کی تعظیم و تعریف بیان کرتے ہو (تو یہ بھی بڑی بات ہے، لیکن) اس سے کہیں زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو یاد کرتا ہے اور تمہارا ذکر کرتا ہے۔“ فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْ أَذْكُرْكُمْ﴾ (یعنی ”وَلَذِكْرُاللّٰهِ“ میں ”اللّٰهِ“ فاعل ہے، نہ کہ مفعول) کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ہم یاد کریں، وہ ہمیں یاد کریں گے ☆ یوں دلِ برباد کو آباد کریں گے

صاحبو! ذکر اللہ روح کی غذا ہے اور دل کی دوا ہے: ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد: ۲۸) قلب سلیم کو بالآخر اسی سے تسکین نصیب ہوگی، اس لیے اگر ذکر اللہ میں مزہ آئے تو اس کو غذا سمجھیں، ورنہ دوا سمجھیں اور بہر حال ذکر اللہ کا اہتمام کریں۔

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ:

بعض علماء نے اس کی ایک تفسیر یہ بیان فرمائی کہ ”فَاذْكُرُوْنِيْ فِيْ يُسْرِكُمْ أَذْكُرْكُمْ فِيْ عُسْرِكُمْ“ ”تم مجھے یاد کرو فراخ دستی کے وقت، میں تمہیں یاد کروں گا تمہاری تنگ دستی کے وقت۔“ کیوں کہ تنگدستی میں تو ہر کوئی اسے یاد کرتا ہی ہے مگر خوشحالی میں بھی

اسے یاد رکھنے والے باکمال کم ہوتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ جب بندہ خوشحالی میں بھی اسے نہیں بھولتا تو پھر اللہ تعالیٰ اسے تنگ حالی میں ضرور یاد رکھتا ہے۔

چناں چہ سیدنا یونس علیہ السلام کا واقعہ اس کا شاہد ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نینویٰ (جو سرزمین عراق کے ایک شہر موصل میں ہے اس) بستی کے رہنے والوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے، انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور دعوت وتبلیغ میں بہت محنت کی، لیکن وہ برابر سرکشی پر تلے رہے، بالآخر حضرت یونس علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ دیکھو! تین دن کے اندر تم پر عذاب آجائے گا، وہ آپس میں کہنے لگے کہ اس شخص نے کبھی جھوٹ تو بولا نہیں، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تیسری رات کو یہ یہیں رہتے ہیں یا نہیں، اگر یہ رات کو رہ گئے تو ہم سمجھیں گے کہ عذاب کچھ نہیں، صرف دھمکی ہے، اور اگر انہوں نے ہمارے ساتھ رات نہ گذاری تو ہم سمجھ لیں گے کہ صبح کو عذاب آنے والا ہے، اس کے بعد دو دن تک انتظار کیا، تیسرے دن بھی انتظار میں تھے، لیکن عذاب آنے میں ذرا دیر لگی، جب یہ صورتِ حال سامنے آئی تو یہ سمجھ کر کہ اگر عذاب نہ آیا تو میں جھوٹا کہا جاؤں گا، آپ اسی رات وہاں سے روانہ ہو گئے، آپ نے وحی الٰہی کا انتظار نہیں کیا اور اجتہادی طور پر یہ گمان کر لیا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا، یہ اگرچہ کوئی گناہ کی بات نہیں تھی، مگر حضرات انبیاء علیہم السلام کے مقام رفیع کے خلاف ہے، جو ان کی شان کے اعتبار سے ایک زلت یعنی لغزش ہے۔ اور یاد رکھو! حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی زلات کا جہاں کہیں قرآن وحدیث میں ذکر آیا ہے ان کو آیت یا حدیث کی تشریح کے ذیل میں بیان کرنا تو درست ہے، لیکن ان باتوں کو اڑانا یا ان حضرات کی طرف خطا اور قصور کی نسبت کرنا اور اس پر مضمون لکھنا یہ امت کے کسی بھی فرد کے لیے جائز نہیں ہے۔ فافہم۔

حضرت یونس علیہ السلام کے بستی سے نکل جانے کے بعد جب صبح ہوئی تو ان کی قوم نے اپنی آنکھوں سے عذابِ الٰہی کے آثار دیکھ لیے کہ آسمان پر سخت سیاہ بادل چھا گئے، دھواں

نازل ہونے لگا جوان کی بستی اور گھروں کی چھتوں پر چھا گیا، جب ان کو اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا تو سب سے پہلے انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کیا، لیکن جب آپ کو کہیں نہ پایا تب اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو توبہ کی طرف متوجہ فرما دیا، وہ اپنی عورتوں، بچوں اور جانوروں کو لے کر میدان میں نکل گئے، ٹاٹ کے کپڑے پہن لیے، خوب چیخے چلائے، اللہ تعالیٰ کی طرف عاجزی کے ساتھ متوجہ ہوئے، اخلاص کے ساتھ توبہ کی اور کہنے لگے کہ حضرت یونس علیہ السلام جو کچھ لے کر آئے تھے ہم اس پر ایمان لائے، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا، ان کا ایمان قبول فرما لیا اور عذاب ہٹا دیا، قومِ یونس علیہ السلام کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی تھی، ورنہ عادۃ اللہ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر ان کے کفر کی وجہ سے عذاب آ جائے تو اس وقت اس قوم کا ایمان قبول نہیں ہوتا اور عذاب نہیں ٹلتا، لیکن چوں کہ حق تعالیٰ قانون ساز اور قادرِ مطلق ہیں، اسے پورا اختیار ہے کہ اپنی مخلوق کے بارے میں جو چاہے تکوینی اور تشریعی قانون نافذ فرمائے اور جس کو چاہے عذاب دے اور جس کو چاہے نجات دے۔

الغرض! عذابِ الٰہی کے نازل ہونے کے بعد ایمان و توبہ کی قبولیت امت یونس علیہ السلام کی خصوصیت تھی، قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

﴿ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيْمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ط لَمَّا اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ إِلٰى حِيْنٍ ﴾ (یونس:۹۸)

"بھلا کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایسے وقت ایمان لے آتی کہ اس کا ایمان اسے فائدہ پہنچا سکتا؟ البتہ صرف یونس کی قوم کے لوگ ایسے تھے کہ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دنیوی زندگی میں رسوائی کا عذاب ان سے اٹھا لیا اور ان کو ایک مدت تک زندگی کا لطف اٹھانے دیا۔"

اُدھر یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کو چھوڑ کر روانہ ہوئے تو چلتے چلتے دریا کے کنارے پہنچے، وہاں جو کشتی والے تھے وہ سواریوں کو بٹھا کر ایک کنارہ سے

دوسرے کنارے تک پہنچاتے تھے اور مسافروں سے کرایہ بھی لیتے تھے، انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو پہچان لیا اور بغیر اجرت کے کشتی میں بٹھا لیا، آپ کشتی میں سوار تو ہو گئے، لیکن عجیب ماجرا یہ ہوا کہ کشتی روانہ ہو کر بیچ دریا میں جا کر رک گئی، نہ چلانے سے چلتی ہے نہ ہلانے سے ہلتی ہے، اس موقع پر آپ نے خود ہی دریافت فرمایا کہ اس کشتی کو کیا ہوا؟ انہوں نے کہا: ہمیں تو پتہ نہیں، آپ نے فرمایا: لیکن مجھے اس کا سبب معلوم ہے، اس میں کوئی ایسا غلام ہے جو اپنے آقا کی فرمانبرداری چھوڑ کر بھاگ آیا ہے، اور جب تک اس شخص کو سمندر میں نہ ڈال دو یہ کشتی ٹھہری ہی رہے گی، اور وہ بھاگا ہوا غلام کوئی اور نہیں، میں ہی ہوں۔ (کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوم کو چھوڑ کر چلے جانے کا حکم نہیں ہوا تھا، اس لیے آپ نے یہ سمجھ لیا کہ عبد آبق یعنی بھاگنے والا غلام میں ہی ہوں) لوگوں نے کہا: یا نبی اللہ! ہم آپ کو دریا میں نہیں ڈال سکتے، فرمایا: اچھا تو پھر قرعہ ڈال لو، جس کے نام کا قرعہ نکلے اسے دریا میں ڈال دینا، چناں چہ انہوں نے تین بار قرعہ ڈالا، ہر بار آپ ہی کا نام نکلا، لہٰذا آپ نے خود ہی دریا میں چھلانگ لگا دی، جیسے ہی آپ سمندر میں پہنچے ایک مچھلی اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلے ہی سے تیار تھی، اس نے آپ کو لقمہ بنا لیا، لیکن چبایا نہیں، صحیح سالم نگل لیا، آپ مچھلی کے پیٹ میں تین تاریکیوں میں مبتلا ہوئے، ایک تاریکی رات کی، دوسری سمندر کی اور تیسری مچھلی کے پیٹ کی، ان تین اندھیروں میں آپ نے جس چیز سے روشنی حاصل کی وہ ہے ذکر اللہ، اس وقت بھی آپ اللہ تعالیٰ کو نہیں بھولے، پھر اللہ تعالیٰ آپ کو کیسے بھول سکتا تھا، جب کہ اس کا تو وعدہ ہے: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ أَذْكُرْكُمْ﴾ آپ نے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی، قرآن کہتا ہے:

﴿فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الأنبياء: ۸۷)

’’پھر انہوں نے اندھیریوں میں سے آواز لگائی کہ (یا اللہ!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ہر عیب سے پاک ہے، بے شک میں قصوروار ہوں۔‘‘ پھر کیا تھا، اس تسبیح کی برکت

سے حق تعالیٰ نے آپ کو نجات عطا فرما دی:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الأنبياء:۸۸)

”اس پر ہم نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں گھٹن سے نجات عطا کی اور اسی طرح ہم ایمان رکھنے والوں کو نجات دیتے ہیں۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿فَلَوْلَا أَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ○ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ (الصّٰفٰت:۱۴۳-۱۴۴)

”اگر یونس ہمیں یاد نہ کرتے تو ہم بھی قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں قید رکھتے۔“ یونس نے ہمیں یاد کیا، تو ہم نے انہیں مچھلی کی قید سے رہا کیا۔ (مستفاد از: انوار البیان: ۲/ ۶۶۰، ج:۳/ص:۵۷۳، ج:۴/ص:۵۵۱)

حدیث شریف میں ہے کہ جو بندہ یہ کلمہ پڑھ کر دعا مانگتا ہے تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ (مسند احمد و ترمذی، مشکوٰۃ)

ذکر اللہ کی کثرت اور اس کا طریقہ:

اس واقعہ سے بھی ذکر اللہ کی نہایت عظمت، اہمیت اور فضیلت ثابت ہوئی اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ خود رب العالمین کا فرمانِ عظیم الشان ہے کہ ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ ذکر اللہ سے بڑھ کر عظمت، اہمیت اور فضیلت والا اور کوئی عمل نہیں ہے، قرآنِ کریم نے اگر عذابِ الٰہی کے متعلق فرمایا کہ وہ بہت بڑی چیز ہے:

﴿فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ﴾ (الغاشية:۲۴)

تو ذکر الٰہی کے متعلق بھی یہی فرمایا کہ وہ بہت بڑی چیز ہے: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ گویا اللہ تعالیٰ کا ذکر اس عذاب کا مقابلہ کرسکتا ہے، عذابِ الٰہی کا علاج ذکر الٰہی کے

علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ حدیث شریف میں ہے:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "مَا عَمِلَ الْعَبْدُ عَمَلاً أَنْجٰى لَهٗ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ". (رواه مالك والترمذي وابن ماجه، مشكوٰة/ص: ۱۹۹)

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی عذابِ الٰہی سے نجات کا ذریعہ ہے، لہٰذا جس قدر ممکن ہو ذکر اللہ کا اہتمام کرنا چاہیے، یہی ایک ایسا عمل ہے جس کی کثرت کا حکم قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ (الأحزاب: ۴۱)

اے حسن ازل سے پیمانِ وفا باندھنے والو! اے راہِ الفت میں قدم بڑھانے والو! اگر اپنے کریم آقا اور رحیم مولیٰ سے کچھ بھی محبت ہے تو اس کا ثبوت اس طرح پیش کیجئے کہ اپنے قول وعمل اور قلب وقالب سے ہر وقت اسے یاد رکھا کرو! اسی میں دارین کی فلاح ہے۔

فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (الجمعة: ۱۰)

"ذکر اللہ کی کثرت کرو، تاکہ تم فلاح یاب ہوجاؤ۔"

حدیث شریف میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی فرمایا:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلاً قَالَ: "يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ أَبْوَابَ الْخَيْرِ كَثِيْرَةٌ، وَلَا أَسْتَطِيْعُ الْقِيَامَ بِكُلِّهَا، فَأَخْبِرْنِيْ عَنْ شَيْءٍ أَتَشَبَّثُ بِهٖ، وَلَا تُكْثِرْ عَلَيَّ فَأَنْسٰى" قَالَ: "لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ". (ترمذی، مشکوٰۃ/ص: ۱۹۸)

(جس وقت) ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ حضور! ابوابِ خیر یعنی نیکی اور بھلائی کے کام تو بہت زیادہ ہیں، اور یہ بات میری طاقت سے باہر ہے کہ میں ان سب کو بجالاؤں، لہٰذا آپ مجھے کوئی ایسی بات بتلادیجئے جس کو میں مضبوطی

سے تھام لوں اور پھر اسی پر کاربند ہو جاؤں (اور وہی میری نجات وکامیابی کے لیے کافی ہو جائے) صحابی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر یہ بھی درخواست فرمائی کہ حضور! آپ مجھے فلاحِ دارین کا جو نسخہ ارشاد فرمانے والے ہیں وہ مختصر ہو، ورنہ تو خطرہ ہے کہ میں اسے یاد نہ رکھ سکوں، تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بس اس بات کا اہتمام کرو اور اس کی عادت ڈالو کہ تمہاری زبان ذکر اللہ سے تر رہے؛ کیوں کہ ذکر اللہ کی کثرت فلاح وکامیابی کے لیے کافی ہے۔

الحمدللہ! کتاب وسنت سے یہ واضح ہو گیا کہ تمام احکامِ شرعیہ واعمالِ صالحہ ذکر اللہ میں داخل ہیں، اس لیے اب ذکر اللہ کی کثرت کا مطلب یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ واعمالِ صالحہ کی پابندی کے ساتھ موقع بموقع کی جو مسنون دعائیں ہیں ان کا اہتمام کیا جائے، نیز خالی اوقات میں حسبِ توفیق چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، حضورِ قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید اور تکبیر وتمجید کے کلمات کا ورد کیا جائے، عاجز کے خیالِ ناقص میں ﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرَاتِ﴾ میں شامل ہونے کا یہی آسان طریقہ ہے، اس سے ان شاء اللہ ہم ﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرَاتِ﴾ (الأحزاب: ۳۵) میں شامل ہو کر مغفرت اور اجرِ عظیم کے مستحق ہو جائیں گے۔

"سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ" کی عظمت وفضیلت:

بالخصوص حدیث پاک میں جن دو مقدس ومبارک کلمات کی تلقین کی گئی ہے ان کا اہتمام کرنا تو بہت ہی آسان ہے، اس لیے کہ خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

"كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ، خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ".

دو کلمے ایسے مقدس ہیں جو رحمٰن یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کو بہت ہی زیادہ پیارے اور پسند ہیں اور (آج دنیا میں) زبان پر (پڑھنے کے اعتبار سے بھی) نہایت ہی ہلکے پھلکے ہیں،

(لیکن کل قیامت کے دن جب میزانِ عمل قائم کیا جائے گا تو اس دن) اعمال کے ترازو میں وہ نہایت وزنی اور بھاری ہوں گے اور وہ دو کلمے یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ" ان کلمات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی ذات تمام قسم کے عیوب ونقائص سے بالکلیہ پاک ہے (اور جیسے اس کی ذات پاک ہے اس کے احکامات بھی ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہیں) اور ہر قسم کی تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، پاک ہے اللہ اور بڑی شان والا ہے۔

حضراتِ محدثین نے اس میں عجیب وغریب نکات بیان فرمائے ہیں: (۱) مثلاً سب سے پہلے "حَبِیْبَتَانِ إِلَی الرَّحْمٰنِ" میں غور کیجیے! "إِلَی اللّٰہِ" نہیں فرمایا، حالاں کہ رحمٰن سے مراد بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن اللہ پاک کے اس صفتی نام کو استعمال فرما کر اس کی رحمت والی صفت کا حوالہ دیا، پھر لطف کی بات یہ ہے کہ رحمت والی صفات میں بھی "رحیم" کے بجائے "رحمٰن" کو ذکر فرمایا گیا، کیوں کہ "رحمٰن" کا مبارک لفظ ایسا ہے جو اللہ رب العزت کے علاوہ کسی اور پر نہیں بولا جاتا، اور "رحمٰن" میں رحمت کی بے انتہا وسعت ہے، کہ "رحمٰن" وہ ذات ہے جس کی رحمت ساری کائنات کی مخلوق کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس سے یہ بتا دیا کہ یہ کلمے اس ذات کو پسند ہیں جس کی رحمت کی کوئی حد اور انتہا نہیں اور جب یہ کلمے اسے محبوب ہیں تو ان کا ورد کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوگا؛ کیوں کہ محبوب کا محبوب بھی تو محبوب ہی ہوتا ہے نا!

(۲) ان کلموں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ زبان پر نہایت آسان، یاد کرنے میں بھی آسان اور پڑھنے میں بھی آسان ہیں۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جب میزانِ محشر میں ان دو کلموں کو عمل کے ترازو میں وزن کے لیے رکھا جائے گا تو یہ نہایت وزنی ہوں گے، جس کی وجہ سے نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔

وہ کلمات یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ" ان دوکلموں میں ایسی جامعیت ہے کہ ہر قسم کی صفاتِ باری پر صادق اور تسبیح وتحمید اور بیانِ عظمت پر مشتمل ہیں، اس لیے بھی یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور یہی اس کی بڑی فضیلت ہے، اگر ان کا اور کوئی فائدہ نہ بھی ہوتا تو اس سے بڑھ کر کیا فائدہ ہوسکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہیں اور ان کا اہتمام کرنے والا اللہ تعالیٰ کا محبوب اور رحمٰن کی صفت رحمت کا مستحق ومورد بن جاتا ہے، ساتھ ہی ان سے اعمال میں بے شمار اجر وثواب کا اضافہ بھی ہوجاتا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے ایک روایت نقل فرمائی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "جو شخص ان میں سے صرف پہلا جملہ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ" دن میں سو مرتبہ پڑھے، تو اس کے سارے (صغیرہ) گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں، اور اگر اس کے گناہ نہیں ہوں گے تو اسی کے بقدر یعنی سمندر کے جھاگ کے برابر اسے نیکیاں مل جائیں گی، پھر اس نے دوسرا جملہ: "سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ" بھی پڑھ لیا تو پہلے جملہ سے گناہ معاف ہوکر دوسرے جملہ سے اس کے برابر نیکیاں مل جائیں گی۔ (خطباتِ فقیہ الاسلام: ۷/ ۳۸)

لہٰذا ان پاکیزہ کلمات کو اللہ رب العزت کا مقدس انعام اور عطیہ سمجھنا چاہیے اور دن رات اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے، پھرتے ان کا خوب اہتمام کرنا چاہیے، بظاہر یہ معمولی کلمات ہیں، لیکن اللہ رب العزت کے یہاں قلت وکثرت یعنی کمی وزیادتی کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ عمل اور ذکر خواہ کتنا ہی معمولی اور مختصر ہو، لیکن اگر اتباعِ سنت اور اخلاص وللّٰہیت سے بھرپور ہو تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بڑی قدر وقیمت ہے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حضرت امام بخاریؒ نے سب سے اخیر میں اس حدیث کو نقل فرما کر بخاری شریف کو ختم فرمایا ہے، پہلی حدیث تو "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" والی ہے اور آخری حدیث یہ ہے، ان دونوں میں ایک لطیف ربط یہ ہے کہ اگر انسان اپنی نیت پہلے ہی

درست کر لے تو پھر اتباعِ سنت اور خلوصِ نیت کے ساتھ کیا جانے والا مختصر عمل بھی اجر وثواب کے اعتبار سے بہت ہی عظیم ہے، جس کی عمدہ مثال یہ دو پاکیزہ کلمات ہیں: "سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمۡدِہٖ سُبۡحَانَ اللّٰہِ الۡعَظِیۡمِ" ان کی عظمت وفضیلت اخلاصِ نیت ہی کی وجہ سے ہے، اس لیے ذکر اللہ اور تمام ہی اعمالِ صالحہ میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حق تعالیٰ ہمیں نیک نیتی اور حضورِ قلب کے ساتھ ذکر الٰہی سے کامل اور مکمل وابستگی نصیب فرما کر دارین میں اپنی رضا وخوشنودی عطا فرمادیں۔ آمین یا رب العالمین والحمد للّٰہ رب العالمین.

"اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّ أَنۡزِلۡهُ الۡمَقۡعَدَ الۡمُقَرَّبَ عِنۡدَكَ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ".

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین

تم الجزء الثالث من دروس الحديث الشريف، وذالك فی الثامن وعشرين من رمضان ۱۴۳۳ھ ليلة الجمعة.

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم، وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم.

الخادم النادم والراقم الاثم

ابو خلیق محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی، غفر لہ الہادی

نزیل: جامعہ سراج العلوم، مسجد الشیخ زکریا، خانقاہ فیضانِ قمر، اجین

تمت بحمد اللہ